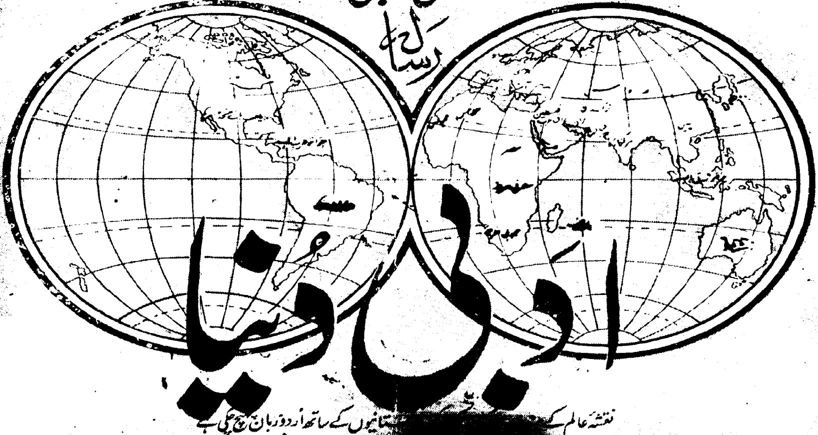
TEXT PROBLEM WITHIN THE BOOK ONLY

ہندوستان کے محکمہائے تعلیم میں منظور شدہ

اردو کا علمی و ادبی ماہوار

رسالہ



ادبی دنیا

نقشہ عالم کے [illegible] ستانیوں کے ساتھ اردو زبان پہنچ چکی ہے

مشرق و مغرب کے جدید و قدیم ادبیات کا مرقع

JANUARY
1931.

ڈائرکٹر:- آنریبل جسٹس سر عبدالقادر

صہ (۴)

ایڈیٹر:- تاجور نجیب آبادی

سالانہ چندہ چار روپے بارہ آنے محصول وی پی ۴ر

Copies. 5000. Price As. 6-6.

رجسٹرڈ ایل نمبر ۲۴۸۲

فہرست مضامین

جلد (۳) بابت ماہ اگست ۱۹۳۰ء نمبر (۲)

تصاویر:- سہ رنگی۔ شکنتلا۔ (یک رنگی) پھول اور تیتری - سبزہ زار۔ ہسپانوی حسن۔ مسولینی کی دست راست - ایثار حسن - سید عابد علی - تحفہ -

(مولوی [illegible] اللہ خاں صاحب ارشد نے مرکنٹائل پریس ریلوے روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر ادبی دنیا کشمیر بلڈنگ میکلوڈ روڈ لاہور سے شائع کیا)

حال وقال

ہمارے مخلص ناظرین یہ سن کر خوش ہونگے کہ اُن کا "ادبی دنیا" اس وقت اردو ادب کے تمام ماہوار رسالوں، تمام ہفتہ وار اور ایک آدھ کو چھوڑ کر تمام روزانہ اخبارات سے زیادہ تعداد میں شایع ہو رہا ہے۔

ادبی دنیا کی کثرتِ اشاعت کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ ادبی دنیا کے ہر نمبر کی اشاعت پر تینتیس ۳۳ من کاغذ صرف ہوتا ہے۔ کاغذ کی یہ کثیر مقدار اردو کے کسی اخبار یا رسالے کے ایک نمبر پر کبھی صرف نہ ہوئی ہوگی۔

ملک کے ہر حصے اور ہر طبقے میں اس کی مانگ بڑھ رہی ہے۔

ہندوستان بھر کے محکمہائے تعلیم کسی تحریک کے بغیر تعلیمی اداروں کے لیے اسے منظور کر رہے ہیں۔

غیر ملکوں کے ہندوستانی دنیا کے ہر آباد خطے سے تحفہ وطن کے طور پر "ادبی دنیا" کو خرید رہے ہیں۔

ادبی دنیا کی اس عالمگیر ہر دلعزیزی کو دیکھ کر ہم خدائے برتر کا شکر اور اُس کے قدر شناس بندوں کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

مسٹر محمد اقبال بی۔اے۔ نے ادبی دنیا کے حصۂ خاص "دنیائے ادب" کے لیے "جرمن زبان سے" کے عنوان سے ایک مختصر سا مضمون بھیجا تھا۔ ہم نے اُسے زبانوں کے تراجم کے سلسلے میں شایع کر دیا۔ چودھری محمد اکبر صاحب ایم۔اے کے خط سے معلوم ہوا کہ مضمون نگار نے اُن کی کتاب "ماہ نو" سے اقتباس کر کے اس پر "جرمن زبان سے" کا عنوان جڑ دیا تھا۔

چودھری صاحب کو خط کے جواب میں لکھ دیا گیا تھا کہ آپ کا خط مضمون نگار کے پاس بھیجا جا رہا ہے اور اُس کا جواب آنے پر "ادبی دنیا" میں اس غلطی پر اظہار معذرت کیا جائے گا۔

مضمون نگار نے ہمیں کوئی جواب نہیں دیا۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم سے دانستہ طور پر ایک اصولی غلطی ہو گئی۔

"ادبی دنیا" کے رکنِ ادارہ سید عابد علی صاحب امسال پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔اے کے امتحان میں دوم درجے پر کامیاب ہوئے ہیں۔ سید صاحب کی اس قابلِ عزت کامیابی پر ہم اپنی جانب سے اصالتاً اور ناظرین ادبی دنیا کی طرف سے نیابتاً مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

عابد صاحب دورِ جدید کے ایک بلند پایہ صاحب طرز سحر نگار ہیں۔ ان کی شاعری اردو کے چند معیاری شعرا کی خصوصیات کا ایک جلوہ زار ہے۔ ادبی دنیا کی سہ رنگی تصاویر پر ان کی بے مثل نظمیں اُن تصاویر سے زیادہ رنگین خوبصورت اثر انگیز اور اُن تصاویر کی اہمیت کو دوبالا کرنے والی ہوتی ہیں۔

ملک کے ادبی نقاد مسٹر رام بابو سکسینہ نے اردو ادبیات پر اپنی مشہور انگریزی تصنیف "ہسٹری آف اردو لٹریچر" میں اردو زبان کے منتخب افسانہ نگاروں کا ذکر کرتے ہوئے پنجاب سے صرف دو افسانہ نگاروں سید عابد علی اور حکیم احمد شجاع کو کامیاب افسانہ نگار بتایا ہے۔

عابد صاحب کی توجہ اور کوشش سے ہر ماہ سات آٹھ اردو کے معیاری افسانے ادبی دنیا کو نصیب ہو جاتے ہیں۔ اور اس امتیاز میں اس کا کوئی حریف نہیں ہے۔

ہم کبھی آئندہ فرصت میں عابد کی شاعری اور افسانہ نگاری پر ایک سیر حاصل مضمون شائع کر کے اردو ادب کے اس ذہین طباع اور فاضل انشا پرداز کی ساحرانہ خصوصیات کو تفصیلی طور پر ناظرین سے روشناس کرائیں گے۔

اس نمبر میں سید عابد علی عابد ایم۔اے۔ ایم۔او۔ایل۔ ایل۔ایل۔بی منشی فاضل۔ ادیب فاضل ایڈیٹر رسالہ ادبی دنیا کی تصویر سرمۂ نظر فروز کے طور پر ہدیۂ ذوقِ نظر کی جاتی ہے۔

ہز ہائی نس نواب سر سید حامد علی خاں بہادر سابق والیٔ ریاست رام پور اور ہز ہائی نس نواب سر ابراہیم علی خاں سابق والیٔ ریاست ٹونک کی وفات سے ہندوستانی ریاستیں دو اچھے حکمرانوں سے محروم ہو گئیں۔ یہ دونوں حکمران اردو زبان کے شاعر اور اردو ادب کے حامی تھے۔

نواب سر ابراہیم علی خاں مرحوم کا تخلص خلیلؔ تھا۔ اور نواب سر سید حامد علی خاں مغفور رشکؔ تخلص کرتے تھے۔ اِن دونوں حضرات کی دلکش اردو غزلیات سادگی، سلاست اور خیال آفرینی کی مثال میں پیش کی جاسکتی ہیں۔ نواب سر سید حامد علی خاں اپنی روایتی ادب پروری اور ادیب نوازی کے لئے مشہور تھے۔ اِن کے حکم سے "حامد اللغات" کے نام سے اردو زبان کی ایک مکمل اور مبسوط ڈکشنری ترتیب دی جارہی ہے۔ اِن دونوں حکمرانوں کے درباروں سے ملک کے نامور اردو شعراء ہمیشہ وابستہ رہے ہیں۔

ہم ان کے قابل قدر جانشینوں ہز ہائی نس نواب سید علی رضا خاں بہادر موجودہ والیٔ رامپور اور ہز ہائی نس نواب سعادت علی خاں بہادر والیٔ ریاست ٹونک کی خدمت میں ان کی تخت نشینی کی مبارکباد پیش کرتے ہوئے مودبانہ طور پر یہ التماس کرتے ہیں کہ وہ اپنی ریاستوں کی علم پروری کو قائم رکھ کر غریب اردو زبان کو بھی اپنی مربیانہ توجہات کا حصہ دار بنائیں گے۔

غزل

جب سے پہلو میں ہمارے دلِ نالاں نہ رہا — ایک بھی دکھ نہ رہا ایک بھی ارماں نہ رہا
دل سے تنگ اس لئے دردِ غمِ پنہاں نہ رہا — میزباں بن کے رہا صورتِ مہماں نہ رہا
تیرے دیوانوں کو آتی نہیں ترتیبِ لباس — جیب اگر رہ گئی ثابت تو گریباں نہ رہا
دردِ دل پوچھنے بیٹھے ہیں دمِ نزع وہ کیا — اب دوا کرتے ہیں جب قابلِ درماں نہ رہا
اُن کو آشفتہ مزاجوں کی خبر کیا رہتی — جن کا گیسو بھی کسی وقت پریشاں نہ رہا
عبرت انگیز تھا عالم مری تنہائی کا — ایک تارا بھی فلک پر شبِ ہجراں نہ رہا
کیا بٹھائی ہے مری آبلہ پائی نے سبیل — تشنہ لب آج کوئی خارِ مغیلاں نہ رہا
حُسن کے فیض سے دنیا کبھی خالی نہ رہی — تو ہے موجود اگر یوسفِ کنعاں نہ رہا

احسنؔ گوشہ نشیں سے کوئی واقف کیا ہو
کہ کبھی نام و نمائش کا وہ خواہاں نہ رہا

(غیر مطبوعہ) — احسنؔ

آئینۂ عالم

ایتھر اور رُوح انسانی

سر آلیور لاج جو برطانیہ کے مشہور ترین سائینسدان ہیں - اپنی تازہ ترین کتاب ماورائے طبعیات میں رقمطراز ہیں :-

"مجھ پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ مَیں نے سائینس کے میدان عمل سے علیحدہ ہو کر نفسی اور روحانی مظاہر کی تحقیقات شروع کر دی ہے -

حقیقت یہ ہے کہ میری تحقیقات اور میرے نتائج واقعات پر مبنی ہیں - اس میں کوئی شک نہیں کہ میرے رفقائے کار اور اکثر حضرات ان واقعات کی صحت سے انکار کرتے ہیں - لیکن ایک محدود گروہ ایسا بھی ہے - جو ان واقعات کے وجود پر یقین رکھتا ہے - یہی وجہ ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی مکمل فلسفیانہ نظام عمل ان واقعات کی متعلقہ بحث سے خالی نہیں رہ سکتا - مَیں نے کوشش کی ہے کہ طبعیات اور نفسیات کو مجتمع کر دوں - اس سلسلے میں ایتھر جیسے عالمگیر ذریعہ اجتماع کی اہمیت کی طرف توجہ دلانا مناسب معلوم ہوتا ہے -

میرا خیال ہے کہ ایتھر آخر کار فلسفے اور نفسیات کی تمام تحقیقات میں ایک اہم عنصر ثابت ہوگا - روحانی رہبری اور مشینیت" کو جمع کرنے کا واحد ذریعہ ثابت ہوگا -

اگر یہ ایک امر واقعہ ہے کہ ایتھر کی وسعت عالمگیر ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہی شے روح و ذہن انسانی کی مسکن ہے - ایتھر اور مادے کے درمیان ایک ایسا تعلق قایم ہے جس کی تشریح و توضیح ابھی تک نہیں ہو سکی -

تجربہ شاہد ہے کہ ذہن انسانی کسی طبعی مسکن کا متقاضی ہے - اور از بسکہ کوئی مادی صورت یہ کام نہیں دے سکتی -

ذہن مطلق کا وجود صرف ایتھر ہی میں ہو سکتا ہے - اس میں کوئی شک نہیں کہ ذہن ایتھر سے بالاتر ہے - لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ذہن ایتھر کو اپنا آلۂ کار اور مسکن بناتا ہے -

میری نظر میں مکان کی تمام فضا ایتھر سے لبریز ہے - اس عالمگیر شے کے اجزائے ترکیبی دریافت نہیں ہو سکتے - اس کو ایک نہ دبنے والی سیالی شے سے تشبیہ دی جا سکتی ہے - جو متحرک بھی ہو اور مستدیر بھی اس اعتبار سے ایتھر سب اجزا طاقتوں کا مرکز ہے - وہ تمام قوتیں اور طاقتیں جو مادے کے مختلف مظاہر میں مشاہدہ کی جاتی ہیں اس آفتاب کی ایک کرن ہیں جو ایتھر میں جلوہ افگن ہے - میرا خیال ہے کہ طاقت اور قوت کا یہ عالمگیر مرکز زندگی سے لبریز ہے - زندگی اور ذہنِ انسانی کے وہ تمام مظاہر جو دنیا میں نظر آتے ہیں اس زندگی کا ایک معمولی جزو ہیں جو ایتھر میں پنہاں ہے -

مَیں اس نتیجے پر کسی استدلال کی بنا پر نہیں پہنچا بلکہ تجربے - مشاہدے اور وجدان نے مجھ پر ثابت کر دیا ہے کہ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے کسی طرح جھٹلایا نہیں جا سکتا - اور جسے ایکدن تمام دنیا تسلیم کریگی -

---

عجیب و غریب حساب

پچھلے دنوں - آثار قدیمہ کا کھوج لگانیوالوں کی ایک جماعت کو توم کا رینچ کے پرانے کھنڈروں میں ایک چھوٹی سی تھیلی ملی - اس میں کچھ پرانے سکے تھے جنکی قیمت تقریباً پانچ شلنگ ہوتی تھی - نیشنل بنک آف نیویارک کے منیجر مسٹر چارلس نے اس تھیلی کو خرید لیا - انہوں نے اپنے بنک کے ایک ہوشیار محاسب کو بلا کر یہ تھیلی اس کے سپرد اور اس سے کہا کہ وہ حساب لگا کر بتائے کہ اگر اس رقم پر ½ ۵ فی سینکڑہ کے حساب سے برابر نفع حاصل ہوتا رہا ہوتا تو یہ رقم اب کتنی ہو جاتی ؟

اس محاسب نے نفع جوڑ کر - رقم کی جو مجموعی تعداد بتائی ہے، اس کا تصور ایک انسان کے لئے اتنا ہی دشوار ہے - جتنا چیونٹی کے لئے پہاڑ کا - سنئے رقم کا مجموعہ اتنے ڈالر ہوئے - دائیں جانب تین کا ہندسہ لکھئے - اور اس کے برابر میں چھ کا ہندسہ لکھئے - پھر اسکے بعد انسٹھ صفر لگا جائیے اسطرح

......................۳۶ ڈالر -

مسٹر چارلس نے اس مجموعہ کو پھر ایک دوسرے محاسب کے سپرد کیا اور اس سے کہا کہ وہ حساب لگا کر بتائے، کہ اتنی رقم سے کتنا سونا خریدا جا سکتا ہے ؟

اس نے حساب لگا کر بتایا کہ اس رقم سے سونے کا ایک اتنا بڑا کرہ خریدا جا سکتا ہے جس کے دائرہ کا قطر ....۵ میل ہوگا - اگر اس سونے کے کرہ کا زمین کے کرہ سے مقابلہ کیا جائے تو دونوں کی مقدار کا تناسب یہ ہوگا -



سونے کا کرہ

تاجور

شکنتلا

شاعر اعظم کالیداس کے غیر فانی شاہکار شکنتلا کا ایک منظر
بھارت ورش کے مہاراج دُشنت شکار کرتے ہوئے شکنتلا کے پتا کی کٹیا کے پاس آ نکلتے ہیں۔

مہاراج (اپنے آپ سے) سنو! درختوں کے اس جھنڈ سے بانوں کی آواز آ رہی ہے۔ میں اس طرف جاؤنگا۔

جاتا ہے۔

دیکھو۔ آشرم کی کنیائیں بوٹوں کو پانی دینے کے لئے اسطرف آ رہی ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں پانی کے باسن ہیں۔ کسقدر سندر ہیں! راج بھون میں ایسی موہنی مورتیں کہاں۔ بن کے بوٹے پھلواری کے پھولوں سے زیادہ خوبصورت ہیں۔ میں چھپ جاتا ہوں اور انہیں دیکھتا ہوں۔

شکنتلا اپنی دو سہیلیوں کے ساتھ داخل ہوتی ہے۔

شکنتلا۔ اس طرف آؤ۔ پیاری سکھیو!

انسویا۔ پیاری شکنتلا۔ کوئی دیکھے تو یہ سمجھے کہ سوامی کنواجی کو آشرم کے بوٹوں سے تم سے زیادہ پریم ہے۔ تم، موتیا کے تازہ کھلے ہوئے پھولوں سے زیادہ نازک ہو اور سوامی جی نے تمہارے ذمے ان بوٹوں کو پانی دینے کا کام لگا دیا ہے۔

شکنتلا۔ پیاری انسویا۔ اگرچہ یہ کام میرے سپرد کیا گیا ہے۔ لیکن مجھے یہ کام نہیں معلوم ہوتا۔ مجھے ان بوٹوں سے بہت پریم ہے۔

بوٹوں کو پانی دیتی ہے۔

مہاراج وشنت۔ (اپنے آپ سے) کیا یہ سندر کنیا کنواجی کی سپتری ہے۔ اس کا لباس اس کے روپ کو دوبالا کر رہا ہے۔ کنول کے گرد سیوالا لپٹا ہوا ہو تو کنول کی خوبصورتی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ ٹھنڈی کرنوں والے چاند کی جوت کو سیاہ داغ اور بھی جگمگا دیتے ہیں۔

شکنتلا۔ دیکھو وہ کیسر کا بوٹا اپنی ننھی ننھی ٹہنیوں سے مجھے بلا رہا ہے۔ ہوا میں اس کی ٹہنیاں ہلتی ہوئی اس طرح معلوم ہوتی ہیں۔ جیسے نازک نازک انگلیاں.........

بوٹے کی طرف جاتی ہے۔

پریام ودا۔ پیاری شکنتلا ذرا اسی طرح کھڑی رہو!

شکنتلا۔ کیوں سکھی؟

پریام ودا۔ تم کیسر کے بوٹے پر جھکی ہوئی ہو اور اس طرح دکھائی دیتا ہے گویا کیسر کے بوٹے کے اردگرد نازک بیل ہو۔

شکنتلا۔ سکھی۔ تجھے پریام ودا کا نام ٹھیک دیا گیا ہے۔

وشنت۔ (اپنے آپ سے) پریام ودا سچ کہتی ہے۔ اس کے سرخ ہونٹ کھلتی ہوئی کلی سے زیادہ خوبصورت ہیں۔ اس کا جسم جوانی کی جوت سے جگمگا رہا ہے۔

انسویا۔ دیکھو شکنتلا۔ یہ وہ موتیے کا بوٹا ہے جسے تم "باغ کی چاندنی" کہا کرتی ہو۔ کیا تم اسے بھول گئیں؟

شکنتلا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں اپنے آپ کو بھول سکتی ہوں۔ لیکن اس بوٹے کو نہیں۔ اوہ! ایک بھنورا پانی دینے کی وجہ سے اپنی جگہ سے اُڑ کر میرے چہرے پر بیٹھنا چاہتا ہے۔

بھنورے کو ہٹانا چاہتی ہے

وشنت۔ آہ! خوش نصیب بھنورا ہے۔ تو دلیری سے اس کی چمکتی ہوئی آنکھوں کی جوت چرانا چاہتا ہے۔ اور تو گھوم گھوم کر اس کے کانوں کے پاس آتا ہے تاکہ اسے اپنے دل کا راز سنا سکے۔

شکنتلا۔ یہ بھنورا تو دم نہیں لینے دیتا۔ میں کہیں اور چلی جاتی ہوں۔ آہ! یہ بھنورا تو میرے پیچھے آتا ہے۔

وشنت۔ اب میں اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہوں۔

آگے بڑھکر

کون ہے جو آشرم کی کنواریوں کو تنگ کرتا ہے۔

سہیلیاں مہاراج کی طرف دیکھکر شرما جاتی ہیں۔

انسویا۔ کچھ نہیں۔ کچھ نہیں۔ صرف بھنورا ہماری پیاری سکھی کو ستا رہا ہے۔

وشنت۔ (شکنتلا سے مخاطب ہوکر) آشرم کا کیا حال ہے۔

شکنتلا خاموش رہتی ہے۔

انسویا۔ سب ٹھیک ہے۔ آپ ایسا مہماں آجائے تو ہمارے دھن بھاگ۔ پیاری شکنتلا۔ جاؤ۔ مہمان کے لئے پھل۔ پھول اور چانول لاؤ۔ ہمارے پاس جل ہے لہذا ہم اس سے اپنے مہمان کے پاؤں دھوئینگے۔

وشنت۔ آؤ بھگت ہو چکی۔ آپکے پریم بھرے شبدوں نے میری خوب

چاند کا سفر

کیا ہم آئندہ سال چاند کا سفر کر سکیں گے؟ یہ ایک اہم سوال ہے جو اس وقت تمام دنیا کے لئے محل نظر بنا ہوا ہے۔ جن لوگوں کی گردنیں سائنس کے سامنے جھک چکی ہیں اور جنہوں نے اسے قادر مطلق تسلیم کر لیا ہے وہ بلا پس و پیش جواب دیں گے "ضرور بالضرور"۔

لیکن وہ لوگ جو کسی بات کو ماننے کے لئے تیار نہیں۔ جب تک کہ وہ اسے اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں۔ صاف کہدیں گے۔ "ناممکن"۔ مگر دنیا میں ایک تیسری جماعت بھی ہے۔ اور غالباً "ادبی دنیا" کے اکثر ناظرین اسی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو فوراً کسی بات کو تسلیم کر لینے یا اس کا انکار کر دینے کے عادی نہیں۔ بلکہ ہر بات کو غور و فکر کی کسوٹی پر کستے ہیں وہ اس کا جواب دیں گے۔ "علم کے سامنے کوئی چیز ناممکن نہیں ہے۔"

بے شک علم کے سامنے کوئی چیز ناممکن نہیں ہے۔ کل کی بات ہے کہ ہوا میں اڑنے کو شیخ چلی کا منصوبہ خیال کیا جاتا تھا مگر آج ہم اپنی آنکھوں سے انسانوں کو پرندوں کی طرح ہوا میں اڑتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ ہماری نظروں میں آج ہوائی جہاز کی وہی حیثیت ہے۔ جو کل ہمارے بزرگوں کی نظروں میں شکرم یا بہلی کی تھی۔

جب انسان نے زمانہ ماضی میں سرخ اونٹوں کی شکرم اور سپید بیلوں کی خوبصورت بہلی پر اکتفا نہ کیا، تو کون کہہ سکتا ہے کہ مستقبل میں وہ زمانہ حال کے ہوائی جہازوں پر اکتفا کرے گا؟ نہیں، ہرگز نہیں بلکہ وہ کوئی ایسی سواری ایجاد کریگا جو اسے یورپ سے امریکہ تک، دو دن میں نہیں، بلکہ دو منٹ میں پہنچا دے۔ موجودہ زمانہ کے ہوائی جہاز اور آئندہ زمانہ کے اس ہوائی جہاز کی رفتار کا تناسب، گذشتہ زمانے کی بہلی اور موجودہ زمانے کے ہوائی جہاز کی رفتار کے تناسب سے زیادہ نہ ہوگا۔

کیا آپ کو معلوم ہے کہ برلن میں اس سلسلہ میں کیا کیا نئے تجربات کئے جا چکے ہیں اور کئے جا رہے ہیں؟ وہاں کے ایک مشہور کارخانے نے ایک ایسے ہوائی جہاز کا نمونہ طیار کر لیا ہے جو پٹرول کے ذریعے سے نہیں، بلکہ گیس کے ذریعے سے اُڑا کریگا۔ اس کی مشینری میں مخصوص نالیوں کے ذریعے سے گیس پہنچائی جایا کریگی اور وہ گیس کی قوت سے حیرت انگیز تیزی کے ساتھ اڑ سکیگا۔ اس قسم کے ایک ہوائی جہاز کا جب تجربہ کیا گیا تو اس کی رفتار آٹھ سیکنڈ میں سو کیلو میٹر نکلی۔

اس کارخانہ نے مشہور جرمن ہواباز "راب" کو اس بات پر آمادہ کر لیا ہے کہ وہ اس قسم کے ایک چھوٹے سے ہوائی جہاز پر بطور تجربہ پرواز کرے۔ یہ ہوائی جہاز زمین سے ۵۰ کیلو میٹر فی منٹ کی رفتار سے اٹھیگا اور پھر بتدریج اس کی رفتار ترقی کرتے کرتے ۴۰۰ کیلو میٹر فی منٹ تک پہنچ جائیگی۔ اس میں کامیاب ہو جانے کے بعد پھر ایک دوسرے ہوائی جہاز کا تجربہ کیا جائیگا جو ۱۰۰۰ کیلو میٹر فی منٹ کی رفتار سے اڑے گا۔ اگر یہ تجربہ بھی کامیاب ثابت ہوا، تو اس کے یہ معنی ہونگے کہ ہم زمین سے چاند تک محض چالیس گھنٹے میں پہنچ سکیں گے۔

اس حیرت انگیز ایجاد کا سہرا جرمن سائنسدان ماکس فالیہ کے سر ہے۔ اس کے بعد پھر جس شخص نے اس کی قائم کی ہوئی بنیادوں پر عمارت کھڑی کی۔ وہ مشہور جرمن مہندس فریڈرک سنڈر ہے۔

یہ بات واضح رہے کہ جو لوگ ان جہازوں کے تجربے کر رہے ہیں ان کا مقصد یہی نہیں کہ وہ چاند تک پہنچ جائیں۔ بلکہ ان کا مقصد یہ بھی ہے کہ وہ یہ بات جاننے سے پہلے کہ چاند کی فضا میں کیا ہے، یہ بات معلوم کریں کہ دنیا کی فضا میں کیا کچھ ہے؟ یہ تجربہ کرنے والے ۱۰۰۰۰ میٹر بلندی پر پہنچ کر یہ معلوم کریں گے کہ وہاں ہوا کا زور کتنا ہے۔ اور اسے کیوں کر مغلوب کیا جا سکتا ہے؟ اور چونکہ جہاں تک قیاس کیا گیا ہے۔ وہاں اتنی بلندی پر ہوا کا زور یقیناً کم ہوگا۔ اس لئے یہ لوگ کوشش کرینگے کہ اس بلندی پر، یورپ اور امریکہ کے درمیان ایک خط مستقیم بنا سکیں، تاکہ ہوائی جہاز ان دونوں براعظموں کی درمیانی مسافت کم سے کم وقت میں قطع کر سکیں۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ اس قسم کے ہوائی جہازوں کی رفتار نہایت تیز ہوگی۔ اور کچھ اس وجہ سے بھی کہ اتنی بلندی پر ہوا کا زور بہت کم ہوگا۔

اگر گیس سے چلنے والی مشین کی اسکیم کامیاب ہوگئی، تو کوئی شک نہیں کہ اس سے دنیائے حمل و نقل پر ایک انقلاب پیدا ہو جائے گا۔

ہوائی جہاز، سٹیمر، موٹریں، یہ سب پٹرول کی بجائے گیس سے چلا کریں گی۔ اور عالم اقتصادیات میں حکمرانی کا تاج پٹرول کے سر سے اتار کر گیس کے سر پر رکھدیا جائے گا۔ جیسا کہ اس سے پہلے کوئلے کے سر سے اتار کر پٹرول کے سر پر رکھا جا چکا ہے۔ آئندہ زمانہ میں ہم دیکھیں گے کہ جہاز بغیر عملۂ جہاز کے سمندر کے سینے کو چیرتے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔ بعد ہوائی جہاز لمحوں میں دنیا کے گرد چکر لگا آتے ہیں۔ ذرا قارئین کرام آنکھیں میچ کر اس وقت کی دلچسپیوں کا تصور تو کریں۔

جب انسان کرہ ہوائی کے رازوں کو معلوم کر لے گا، تو وہ اپنے فکر کے گھوڑے اس سے آگے کے میدانوں میں دوڑائیگا اور کوشش کریگا کہ چاند تک پہنچ جائے۔ یہ کوشش پہلے پہل تو علمی پیاس بجھانے کے لئے ہوگی لیکن اگر یہ کامیاب ہوگئی تو پھر اس سے پیٹ بھی بھرا جا سکیگا۔ جیسا کہ اس سے پہلے امریکہ کی دریافت کے سلسلہ میں ہو چکا ہے۔

اس قسم کے ہوائی جہازوں کے تجربوں کے ابتدائی نتائج آئندہ موسم گرما تک معلوم ہو جائیں گے۔ اس سلسلہ میں اگر یہ پہلا قدم کامیاب رہا تو پھر دوسرا قدم ہوا کے اونچے طبقات کے مطالعہ کے لئے اٹھیگا۔ اگر وہ بھی کامیاب رہا تو پھر تیسرا قدم چاند کی دنیا میں داخل ہونے کے لئے اٹھایا جائیگا۔ اور اس طرح جول ورن کے اس خواب کی تعبیر جو اس نے چاند کی دنیا میں داخل ہونے کے متعلق دیکھا تھا پوری ہو جائیگی۔

اگر چاند کی دنیا دریافت ہوگئی تو پھر محاسبین کے دماغ دنیا کی آبادی کے بڑھنے کے فکر کے بوجھ سے بھی ہلکے ہو جائیں گے۔ اور انہیں اس غم سے چھٹکارا مل جائیگا کہ اگر دنیا کی آبادی اسی تناسب سے بڑھتی رہی تو پھر رہنے والوں کے لئے جگہ کہاں سے آئیگی؟

اس وقت سے پہلے کہ دنیا دنیا والوں پر تنگ ہو اور اس کے عطیے اس کے رہنے والوں کے لئے ناکامی ثابت ہوں۔ وہ سیاروں میں نئی بستیاں ڈھونڈ نکالیں گے اور یہاں سے ترک وطن کر کے ان نو آبادیوں کو جا بسائیں گے۔ اور اس طرح اس بیچاری دنیا کا بوجھ کچھ ہلکا ہو جائے گا۔

سیاروں کی دنیاؤں کی دریافت کے بعد ڈاک کا کام بھی بڑھ جائے گا۔ ڈاکخانے والوں کو ہدایت جاری کرنی پڑیں گی کہ خط بھیجنے والے اس امر کی بھی تصریح کریں کہ مکتوب الیہ کس دنیا میں رہتا ہے۔ اس وقت محض یہ لکھنا کافی نہ ہوگا کہ مصر یا جرمنی یا انگلستان بلکہ اس کا بھی اضافہ کرنا پڑیگا کہ زمین یا چاند یا مریخ۔

کیا قدرت ہمیں موقع دیگی کہ ہم ان عجائبات کا جن کا ہم اس وقت تصور کر رہے ہیں اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر لیں یا یہ ہمارے بیٹوں اور پوتوں ہی کے مقدر کا ہے۔ اور ہمارے لئے اتنا ہی کافی سمجھا جائیگا جتنا کہ ہم اب تک دیکھ چکے ہیں۔

اس ایجاد کے کتنے ہی منافع سہی، لیکن عمرانی دنیا کے لئے مفید نہ ہوگی۔ انسان حصول معاش کی سہولتوں کی وجہ سے شہری زندگی اختیار کرتا ہے۔ وہ شہروں میں اس لئے گھر بساتا ہے کہ دفتروں، کارخانوں، اور دکانوں پر آنے جانے میں (جو بالعموم شہر ہی میں ہوتے ہیں) زیادہ مسافت نہ قطع کرنی پڑے۔ جب شہروں میں زمین کے اوپر جگہ نہیں رہتی، تو پھر زمین کے نیچے سرنگیں کھود کھود کر ریلیں چلاتا ہے۔ ہوٹل اور دکانیں لگاتا ہے۔ کارخانے قائم کرتا ہے۔ اور بڑی بڑی عظیم الشان عمارتیں تعمیر کرتا ہے جن میں ہزاروں کاریگروں اور مزدوروں کی گنجائش ہوتی ہے۔ اور اب تو یہ صورت بھی ناکافی ثابت ہو رہی ہے اور کوشش کی جا رہی ہے کہ بازار پاٹ کر، ان کے اوپر ریلیں اور ٹرام کاریں چلائی جائیں۔ چنانچہ بعض بڑے بڑے شہروں میں اس تجویز پر عمل کرنے کے لئے تدبیریں سوچی جا رہی ہیں۔

یہ سب کچھ کیوں ہے؟ اس لئے کہ انسان کو کسب معاش کے لئے شہروں کی محدود آبادی ہی میں گھر بنانا ہے۔ لیکن اگر یہ گیس سے چلنے والی سواریوں کی اسکیم کامیاب ہوگئی، تو پھر ان لوگوں کو جو آج شہروں میں رہنے پر مجبور ہیں۔ شہروں میں رہنے کی ضرورت باقی نہ رہیگی۔ کیونکہ یہ تیز رفتار سواریاں سفر کی تمام مشکلات کا خاتمہ کر دیں گی۔ اور ایک انسان جو مثلاً دہلی کے کسی کارخانہ میں کام کرتا ہے۔ اس کے لئے برابر ہوگا کہ وہ دہلی ہی میں رہے یا میرٹھ میں اپنا مکان بنالے۔ اس لئے کہ جس قدر وقت دہلی میں رہتے ہوئے، اسے اپنے گھر سے کارخانہ تک آنے میں صرف کرنا پڑیگا۔ اسی قدر وقت اسے میرٹھ سے دہلی تک آنے میں صرف کرنا پڑے گا۔

یہ ایجاد قرض داروں اور قرضخواہوں، مزدوروں اور سرمایہ داروں محکوموں اور حاکموں کی آپس کی اجنبیت کو دور کرنے میں بھی بہت موثر ثابت ہوگی۔ اور مختلف قوموں کے درمیان تعلقات کو خوشگوار بنا دیگی۔ اس لئے کہ اس کی بیگانگی اور اجنبیت کا باعث بعد مسافت ہے۔ جب مسافت کا مسئلہ حل ہو جائے گا تو وہ روڑے جو تعلقات کی عمدگی میں

حائل ہیں، خود بخود راستہ سے صاف ہو جائیں گے۔

یہ ایجاد دنیا سے خونریزی اور فتنہ و فساد کا خاتمہ کر دیگی۔ اس لئے کہ اس کا اصلی باعث مختلف قوموں کی آپس کی غلط فہمیاں ہوتی ہیں، اور یہ غلط فہمیاں بعد مسافت کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ جب بعد مسافت کا مسئلہ حل ہو جائے گا تو دنیا کی ایک قوم دوسری قوم کے ساتھ بآسانی تبادلہ خیالات کر سکے گی اور ایک جماعت دوسری جماعت کے جذبات وحسیات سے صحیح طور پر واقف ہو سکیگی اور پھر وہ صورتیں پیدا نہ ہونگی جو دنیا کے اسٹیج پر جنگ عظیم جیسے ہولناک ڈرامے دکھا سکتی ہیں۔ دنیا میں ایک انسان دوسرے انسان کے احساسات کی پرواہ کیا کریگا اخوت انسانی کے نظریہ کو بطور ایک اصول کے تسلیم کر لیا جائیگا۔ سیاست چالاکی۔۔۔۔۔۔۔۔ اور عیاری کا نام نہ رہیگا۔ بلکہ وہ مختلف قوموں کے درمیان صلح و آشتی پیدا کرنے کا باعث ہوگی۔ دنیا میں سب انسان بھائی بھائی ہونگے اور دنیوی زندگی کا مفہوم اس وقت محبت اور پریم ہوگا۔ وہ پریم جس پر فرشتے بھی حسد کریں گے۔

زین العابدین سجاد (میرٹھی)

تحفہ

(یہ نظم اُس تصویر کو دیکھکر فکر کی گئی ہے جو "ادبی دنیا" میں تحفے کے نام سے شائع ہو رہی ہے)

میرے سر آنکھوں پہ تیرا تحفہ اے جانِ بہار
اے گلِ گلزارِ عشرت۔ اے گُلِ افشانِ بہار

یہ تکلف کس لئے۔ اے لالۂ فردوسِ حسن
تُو نے آخر کیوں اُٹھایا ہے یہ احسانِ بہار

تُو تو خود ہی تحفۂ باغِ شباب و حسن ہے
جلوۂ رنگیں ہے تیرا زیبِ دامانِ بہار

تیری رعنائی کے عشوے۔ رنگ تصویرِ شباب
تیری پیشانی کے جلوے رشکِ عنوانِ بہار

تری نزہت سے گلستانِ تمنا لالہ رنگ
تری نکہت سے جنوں پرور خیابانِ بہار

اب نہ وہ محفل نہ وہ ساغر نہ وہ ساقی رہا
باغ سے جب تُو نکل آئی تو کیا باقی رہا

(غیر مطبوعہ)

شاطر (غزنوی)

پندرھویں صدی میں مسلمانوں کے تعلیمی نظریات

علوم و فنون کے قریب قریب ہر شعبہ میں جو بیش بہا خدمات مسلمانوں نے سر انجام دی ہیں۔ ان کے احسان سے علمی دنیا کبھی سبکدوش نہیں ہوسکتی۔ اور جبتک انسان ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ ان کے نقوش پا ہمیشہ آئندہ نسلوں کی رہبری کرتے رہیں گے۔ اور تحقیق و تدقیق کے میدان میں اس قوم کے گزشتہ علمی کارناموں کا مطالعہ ناگزیر رہیگا۔

دور حاضرہ میں جبکہ محققین یورپ کی جدوجہد کے بدولت تعلیم نے ایک باقاعدہ اور مکمل فن کی شکل اختیار کرلی ہے۔ آئندہ ترمیم و تنسیخ اور ترقی کے لئے ہر تعلیمی نظریہ کی اصل و ابتدا اور اُس کی مختلف ارتقائی منازل کا کھوج لگانا لازمی سمجھا جاتا ہے اور اس غرض کے لئے تاریخ کے اوراق پارینہ کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ زمانۂ حال کے ماہرین فن تعلیم بالعموم تمام تعلیمی نظریات کی بنیاد کمینیس لاک روسو وغیرہم معلمین یورپ کے قائم کردہ اصولوں پر رکھتے ہیں یا حکماء یونان کے فلسفہ پر۔

موخر الذکر ماخذ کے متعلق تو اتنا ہی کہدینا کافی ہے کہ فلسفۂ یونان کے احیاء کا باعث صرف مسلمان ہیں اور جو کچھ روشنی ان علوم کی آج ہم تک پہنچ رہی ہے وہ محض عرب مترجمین کے ذوق علمی کی رہین منت ہے۔

بلاشبہ گزشتہ پانچ صدیوں سے تعلیمی دنیا میں لاک۔ روسو۔ ہربارٹ وغیرہم کے نظریات ہی کا سکہ جاری ہے۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ ان معلمین یورپ سے قبل بھی نسل انسانی یا اسکی کسی ایک شاخ میں جو اُس وقت تہذیب انسانی کی حامل تھی کوئی نظام تعلیم موجود تھا یا نہیں۔

یورپ کی ذہنی علمی اور سیاسی ترقیوں کا حصہ ان ہی گذشتہ پانچ صدیوں پر مشتمل ہے۔ ان سے قبل سات سو برس کی مدت تاریکی کا زمانہ خیال کیا جاتا ہے۔ جس میں یورپ کی جہالت حد سے گزر گئی تھی یہی وہ طویل مدت ہے جس میں مسلمان انسانی تہذیب کے علمبردار تھے۔ اسی دور میں جبکہ مسلمانوں کے علمی کارنامے دنیا کو محو حیرت کئے ہوئے تھے۔ کیا یہ امر قابلِ یقین ہے۔ کہ ان کے پاس کوئی مستقل نظام تعلیم نہ ہوگا یا ان کے حکماء نے اس میدان کو قطعاً خالی چھوڑ دیا ہوگا؟ ان میں علماء کی کثرت اُن کی تحقیقات کی موشگافیاں اور اُن خیالات کی بلند پروازیاں ان کے نظام تعلیم کی خوبی پر خود شاہد ہیں۔

یورپ میں عام بیداری اور اُس کے ساتھ احیاء و ترویج علوم و فنون کی ابتداء ۱۴۵۳ء میں ترکوں کے فتح قسطنطنیہ کے فوراً بعد شروع ہوجاتی ہے۔ خوش قسمتی سے ایک اسلامی تصنیف ایسی موجود ہے جو اسی دور کی یادگار اور اس صدی میں مسلمانوں کے تعلیمی نظریات کا مرقع ہے۔

اخلاق جلالی پندرھویں صدی کے اوائل میں تصنیف ہوئی۔ اگرچہ اس تصنیف کا اصلی مبحث تعلیم الاخلاق ہے۔ لیکن چونکہ اخلاق کو فن تعلیم سے گہرا تعلق ہے۔ اس کی وسعت میں جابجا تعلیمی نظریات کے جواہر ریزے بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جن کو بنظر غائر چُن چُن کر علیحدہ ترتیب دیا جائے تو فن تعلیم کے نظریات پر ایک مستقل رسالہ بن سکتا ہے۔

یہ امر کسی ثبوت کا محتاج نہیں کہ ایک تنہا فاضل و محقق سے زمانہ جسقدر استفادہ کرتا ہے۔ اس سے کہیں زیادہ وہ زمانہ کے مروجہ علوم و فنون اور تحقیقات و انکشافات سے مستفید ہوتا ہے۔ پس اگر ہم یہ کہیں کہ اخلاقِ جلالی کے پیش کردہ اصول ایجاد و اختراع کا نتیجہ نہیں۔ بلکہ اس موضوع پر وہ تمام مسائل جو اس زمانے کے مسلمانوں میں پایۂ ثبوت کو پہنچ چکے تھے نہایت دلچسپ اسلوب بیان۔ مشرح و مدلل طرز تحریر اور عمدہ ترتیب کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں۔ تو اس

سے اخلاقِ جلالی کی توقیع میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی - بلکہ اس کی اہمیت اور فائدہ میں اس حیثیت سے مزید اضافہ ہو جاتا ہے - کہ محض اس کا مطالعہ پندرھویں صدی میں مسلمانوں کے تعلیمی نظریات کی نمایندگی کرنے کے لئے کافی ہے -

افسوس ہے کہ اس قابلقدر تصنیف کے مصنف مولینا جلال الدین کے متعلق بجز چند امور مندرجہ ذیل کے کچھ معلوم نہیں :-

آپ ایران کے ایک مردم خیز قریہ دوآن کے رہنے والے تھے - اور ابو الغازی حسین مرزا والی ہرات کے دربار میں علماء و فضلاء کے اُس حلقہ میں شامل تھے جو شاہ موصوف کی قدردانی اور دریا دلی نے اپنے گرد جمع کر لیا تھا -

تعلیم کا نصب العین (۱) مصنفِ اخلاقِ جلالی نے اس کتاب کے دیباچہ میں تعلیم کا نصب العین یوُں بیان کیا ہے :-

انسان اشرف المخلوقات کو حضرت حق سبحانہٗ تعالیٰ نے اپنی امانت تفویض فرمائی - یہ امانت خلافتِ الٰہی تھی - خلافت الٰہی پر انسان کا حق بوجہ متضاد صفات کا حامل ہونے کے قائم ہوا - اس خلافت کا مستحق ہونے کے لئے انسان کو کمال علمی و عملی کی ضرورت ہے جو تعلیم اور تربیت سے حاصل ہو سکتا ہے -

اس سے یہ خوب ظاہر ہو جاتا ہے کہ تعلیم کا نصب العین بچے کی اخلاقی جسمانی اور ذہنی تربیت ہے - اور اس تربیت سے کمال علمی و عملی اور اُس سے استحقاق بخلافت الٰہی حاصل ہوتا ہے - اور انسان اپنی تخلیق کا منشا پورا کر دیتا ہے - اور مکمل انسان کہلانے کے قابل بن جاتا ہے -

اس نصب العین کا کمینیس کے پیش کردہ نصب العین سے مقابلہ کریں تو معلوم ہوگا - کہ یہ دونوں قریب قریب ایک دوسرے سے منطبق ہیں - دونوں کا منتہائے مقصود آخرت کی تیاری ہے - دونوں نے جسمانی تربیت اور صحت کو ذہنی و اخلاقی تربیت کے لئے لازمی قرار دیا ہے - کمینیس کے نزدیک علم - تقوےٰ - اور اخلاق کا مادہ انسان میں ودیعت کیا گیا ہے - جو بذریعہ تادیب و تربیت ترقی دیا جا سکتا ہے - مگر اخلاقِ جلالی کے مصنف فرماتے ہیں - کہ " قابلیت ایشاں (اطفال) بر کمال ست - و میل طبیعت بر رذائل در نفوس مرکوز ست" اور پھر فرماتے ہیں کہ " نفوس بمنزلہٗ لوح سادہ باشد و قبول صورت بسہولت نماید" اس لحاظ سے ملا جلال الدین دوانی جان لاک اور اُس کے معاصرین حکماء فرنگ کے ہمخیال ہیں - جو بچے کے دماغ کو ایک ایسے لوح سادہ کے مانند سمجھتے ہیں جس پر ماحول سے ہر قسم کے اثرات بآسانی مرتسم ہو سکتے ہیں -

فی الحقیقت ان سب کا ماخذ فلاسفۂ یونان ہیں - اور یہ نظریہ انیسویں صدی تک ناقابل تردید سمجھا جاتا رہا ہے - یہاں تک کہ ہربارٹ نے فیکلٹی تھیوری کی لغویت کو دنیا پر ثابت کر دیا -

تعلیمی نصب العین میں کمینیس اور صاحب اخلاقِ جلالی کا تطابق محض اتفاقی نہیں بلکہ یقینی طور پر یہ ثابت کرتا ہے کہ ان درمیانی دو صدیوں میں مشرق و مغرب کے مابین تبادلۂ خیالات کا زبردست سلسلہ جاری تھا - دنیا کی تاریخ میں یہ اہم ترین زمانہ ہے - یہ وہ انقلابی دور ہے جس میں مغرب بحیثیت شاگرد کے مشرق کے سامنے زانوئے ادب تہ کئے ہوئے تھا - شاگرد کی بیدار مغزی اور استاد کی غفلت نے اُن کی باہمی حیثیت کو الٹ دیا

اصول تعلیم

(۱) آغاز تربیت کا زمانہ صاحب اخلاقِ جلالی بچے کی تربیت کو مدتِ اصناع کے بعد ہی شروع کر دینا لازمی سمجھتے ہیں - بلکہ اس سے بھی قبل مرد بچے کی تربیت کے لئے دایہ کا موزوں ہونا لازمی خیال کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ دایہ کی کیفیت مزاجی و نفسانی بچے میں سرایت کرتی ہے

(۲) مذہبیت مسلمانوں کے تمام ذہنی کارنامے مذہبی مرکز کے گرد گھومتے ہیں - چنانچہ ان کے نظام تعلیم میں بھی مذہبیت کی روح جاری و ساری ہے - اکثر مسائل قرآن و حدیث سے ثابت کئے گئے ہیں - تعلیمی نصب العین بھی مذہبی رنگ سے رنگا ہوا ہے - اور نصاب میں بھی مذہبی و اخلاقی تعلیم ہر بچے کے لئے لازمی ہے -

(۳) عمومیت مصنفِ اخلاقِ جلالی نے جو تعلیمی نصب العین پیش کیا ہے - اُس سے واضح ہوتا ہے - کہ تعلیم و تربیت ہر انسان کے لئے خواہ مرد ہو یا عورت - امیر ہو یا غریب شہری ہو یا دیہاتی ہر ایک کے لئے لازمی ہے - بچے کی تعلیم و تربیت کو والدین پر فرض بتایا گیا ہے -

(۴) اعلیٰ علوم و فنون کی تعلیم قدرت نے مختلف انسانوں کو

مختلف استعداد ذہنی عطا فرمائی ہے۔ بعض بچے میں فطرۃً صنعت وحرفت میں ترقی کرنے کی استعداد ہوتی ہے اور بعض خلقاً اعلےٰ ذہنی کاموں شلاً طبابت۔ معلمی۔ انجنیری۔ وکالت وغیرہ کے لئے موزوں ہوتے ہیں۔ ماحول اور تربیت ان کاموں میں ان کی مساعدت کرتے ہیں اُن کاموں کے علاوہ جن کے لئے فطری طور پر موزوں ہوں اگر کسی دوسرے فن کی تحصیل پر مجبور کئے جائیں تو عموماً کامیابی یا تو قطعاً نہیں ہوتی یا کم از کم خاطر خواہ نہیں ہوتی۔ اگر کامیابی نہ ہو تو عمر ضائع ہوتی ہے اور زندگی برباد ہو جاتی ہے۔ انسان بجائے سوسائٹی کا مفید رکن بننے کے اس پر بار اور اُس کے لئے خطرناک ثابت ہوتا ہے۔

علاوہ بریں نظام عالم ہی اسی توازن پر قائم ہے کہ مختلف لوگ مختلف پیشے بخوشی اختیار کریں ورنہ اگر سب لوگ ایک ہی طریق معاش اختیار کریں گے مذہبیت بیکار اور انسانی زندگی وبال ہو جائیگی۔ اور علوم و فنونِ انسانی کی ترقی رُک جائیگی اور بالآخر اُن کا یکے بعد دیگرے خاتمہ ہو جائیگا۔

اس وقت ہندوستان کے لئے یہ ایک زبردست خطرہ درپیش ہے کہ روز بروز لوگ صنعت وحرفت اور دیگر پیشوں سے توجہ ہٹا کر کالجوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اور تعلیم کی غرض محض تحصیل ملازمت ہوتی ہے۔ چنانچہ اس کے نتائج بدیہ رونما ہو رہے ہیں۔ کہ ایک جانب تو ملک کی صنعت وحرفت کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ اور دوسری جانب ملک میں بیکاری اور اُس سے عام بےچینی اور بدامنی بڑھتی جاتی ہے۔

ان ہی وجوہ کی بناء پر صاحبِ اخلاقِ جلالی نے جہاں ابتدائی تعلیم اور اخلاقی وجسمانی تربیت کو تمام انسانوں کے لئے لازمی قرار دیا۔ وہاں اعلےٰ علوم و فنون کی تعلیم ہر بچے کی ذہنیت کے مطابق دینی تجویز کیا ہے۔

اس کے بعد مفصل بحث اس امر میں کی ہے کہ ہر بچے کی تعلیم یکساں نہ ہونی چاہیئے۔ بلکہ بچے کی فطرت کا مطالعہ کرنے کے بعد اُس کے لئے موزوں تعلیم تجویز کرنی چاہیئے۔ اس بحث کا خلاصہ اس عنوان کے ابتدا میں ہم دے چکے ہیں۔ تمام عبارت کو یہاں نقل کرنا خالی از طوالت نہیں۔

کمینیس نے بھی اس نظریہ کو تسلیم کیا ہے۔ وہ بھی پرائمری تعلیم اور مذہبی اخلاقی اور جسمانی تربیت کو ہر بچے کے لئے اور اعلےٰ ذہنی تعلیم یا تحصیل فنوں کو خواص تک محدود رکھتا ہے۔ کمینیس نے یہ اصول قریب قریب نظر انداز کر دیا گیا۔ چنانچہ لاک نے تعلیم عوام پر بالکل توجہ نہ کی۔ روسو نے بھی عوام کے لئے تعلیم وتربیت غیر ضروری قرار دی اور پسٹلائزی۔ ہربارٹ فربیل وغیرہ نے عوام کی تعلیم پر توجہ دی تو یہ تخصیص نہ کی کہ عوام کی توجہ اعلےٰ ذہنی تعلیم سے ہٹا کر صنعت وحرفت کی جانب مبذول کرنی چاہیئے۔

(۵) تقلید فطرت

کمینیس روسو اور دور حاضرہ کے تمام ماہرین فن تعلیم تقلید فطرت کی پُرزور سفارش کرتے رہے ہیں مگر ان میں سے ہر ایک تقلید فطرت سے جداگانہ مطلب نکالتا ہے۔

(ا) کمینیس تقلید فطرت کا مطلب یوں سمجھاتا ہے۔ کہ معلم کو چاہیئے کہ غیر انسانی فطرت کا مطالعہ کرے۔ اور پھر اصول تعلیم بنانے میں اس کی تقلید کرے۔ مثلاً فطرت ہر شے کی نشو ونما بسہولیت اور تبدریج کرتی ہے۔ ایک بیج ایک عرصہ کے بعد پودہ بنتا ہے۔ اور بیضۂ مرغ ایک مدت کے بعد بچے کی شکل اختیار کرتا ہے۔ پس معلم کو بھی تربیت اطفال میں جلدی نہ کرنی چاہیئے۔ اور تبدریج ترقی کرنی چاہیئے۔

(ب) روسو نے تقلید فطرت کا یہ منشا سمجھا ہے کہ بچے کو تمدن کی مصنوعی فضا سے دور کر کے جنگل کی قدرتی فضا میں تربیت دینی چاہیئے۔ تاکہ بچے کی فطرت غیر انسانی فطرت کے ماحول میں اپنے کمال کو پہنچ سکے۔

(ج) موجودہ زمانے میں تقلید فطرت کا منشار یہ خیال کیا جاتا ہے۔ کہ معلم کو بچے کی فطرت کا بغایر نظر مطالعہ کرنا چاہیئے اور اس کی تعلیم وتربیت میں اسی فطرت کو ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ غیر انسانی فطرت کو آجکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

صاحبِ اخلاقِ جلالی بھی ان آخری معنوں میں تقلید فطرت کی حمایت کرتے ہیں۔ یعنی معلم کا فرض ہے کہ تعلیم میں فطرتِ اطفال کی مطابقت عمل میں لائے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ

"اولی آنست کہ در طبیعتِ کودک نظر کنند واز احوالِ اُو تفرس جویند"

(۶) جاذبیت

مصنفِ اخلاقِ جلالی سفارش کرتے ہیں کہ طریقِ تعلیم و نصاب تعلیم بچے کی ذہنیت اور استعداد کے مطابق ہونا چاہیئے۔ نیز جسمانی سزا سے بھی منع

کرتے ہیں۔ اور دیگر دلچسپ ذرائع استعمال کرنے کی ترغیب دلاتے ہیں۔ بچوں کی صحت درست رکھنے کے لئے ورزش جسمانی اور کھیلوں کی سفارش کرتے ہیں۔

(۷) تعلیم زیر اتالیق کمینیس نے مدرسوں میں اجتماعی تعلیم پر زور دیا مگر یورپ نے اُس کی سفارش پر عمل نہ کیا۔ لاک اور روسو اتالیق کے ماتحت انفرادی تعلیم دینے کے حامی تھے۔ پسٹلائزی اور ہربارٹ نے پھر مدرسے کی تعلیم اجتماعی پر توجہ کی اور یورپ نے اس طریق کو اختیار کر لیا مگر بیسویں صدی میں پھر انقلاب ہوا اور نظام مانٹسوری اور ڈالٹن پلین نے افتراقِ انفرادی کو ملحوظ رکھتے ہوئے مدرسوں اور جماعتوں کو محض بخیال نظام قائم رکھا۔ اور لغرض تعلیم انفرادی توجہ لازمی قرار دی۔

صاحبِ اخلاقِ جلالی نے اسی آخری طریقہ کی حمایت کی ہے اور یہ ہی طریقہ مسلمانوں کی مذہبی تعلیم میں آجتک جاری ہے آجکل جو نقائص اس مذہبی تعلیم میں نظر آتے ہیں وہ اس طریق عمل کا نتیجہ نہیں بلکہ معلمین کی ناقابلیت۔ نصاب کے غیر متعین ہونے اور نظام کے فقدان کے باعث ہیں۔

(۸) جسمانی تعلیم جسمانی تعلیم پر مصنفِ اخلاق جلالی نے کافی زور دیا ہے۔

مندرجہ بالا اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ کھیل اور ورزش بچے کی تعلیم وتربیت کا اہم ترین جزو ہیں۔ مگر معلم کی نگرانی وہاں بھی لازمی ہے تاکہ بُرے نتائج نہ پیدا ہوں۔ اسی سلسلے میں لاک کے "ہارڈننگ پروسس" (جفاکشی کی عادت ڈالنا) کا ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہیں۔

لاک نے بچے کو جفاکشی کی عادت ڈالنے کے لئے مندرجہ ذیل تجویز کی ہے:-

"انسان کی قوت کا انحصار طاقت برداشت وضبط پر ہے۔ پس بچے کو اُن اثرات سے محفوظ رکھنا چاہیئے جو اس کو کمزور دل کم حوصلہ اور عیش پرست بنادیں۔ غذا سادہ ہونی چاہیئے۔ شراب ودیگر مسکرات ومنشیات سے قطعاً پرہیز کرنا چاہیئے۔ دوا صرف انتہائی مجبوری کی حالت میں دینی چاہیئے۔ لباس اتنا گرم نہ ہونا چاہیئے کہ سردی سے پوری طرح محفوظ رکھ سکے۔ جوتے ایسے ہوں کہ اُن کے تلوں سے پانی بھی تھوڑا تھوڑا آتا رہے۔ بستر سخت ہونا چاہیئے۔ بچوں کو دھوپ میں ننگے سر اور ننگے پیر پھرانے کی بھی عادت ڈالنی چاہیئے۔"

جلالی اور لاک کا مقابلہ کرنے کے بعد یہ امر اظہر من الشمس ہو جاتا ہے کہ لاک پر مسلمانوں کے نظام تعلیم کا کسقدر گہرا اثر تھا۔ اس کا یہ مقصد نہیں کہ لاک نے براہِ راست اور بلاواسطہ ان نظریات کو مسلمان حکماء سے حاصل کیا تھا۔ بلکہ مسلمان حکماء سے لاک تک یہ خیالات بالواسطہ بطور وارثت ذہنی پہنچے تھے۔

لاک نے اس امر میں قدرے مبالغہ سے کام لیا ہے۔ اور ایسی سفارشات بھی کی ہیں جو صحت کے لئے مفید ہونے کے بجائے باعث ضرر ہوسکتی ہیں۔ مثلاً دھوپ میں برہنہ سر و برہنہ پا پھرانا۔ ٹوٹے ہوئے جوتے پہنانا جن کے اندر پانی جا سکے۔ وغیرہ — اخلاقی جلالی کی سفارشات ایسی لغویات سے پاک ہیں۔

(۹) مذہبی واخلاقی تعلیم مذہبی واخلاقی تعلیم کو تمام تعلیم وتربیت کی بنیاد خیال کیا ہے۔ اور اُس کے عملی پہلو پر زیادہ زور دیا ہے۔

اخلاقی تعلیم کا ایک بھدا مگر عام طریقہ یہ ہے کہ بچے سے کہا جائے کہ ایسا کرو اور ایسا نہ کرو۔ جدید سائیکالوجی کے مطابق اس طریقہ کی انتہائی مخالفت کیجاتی ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ بچے کو طبعاً ان چیزوں کی طرف زیادہ رغبت ہوتی ہے۔ جن سے منع کیا جاتا ہے۔ اس معاملے میں مصنف اخلاقی جلالی کا نظریہ جدید ترین تحقیقات سے مطابقت رکھتا ہے۔

چونکہ تہذیب الاخلاق کتاب کا اصلی موضوع ہے اس لئے بہت تفصیل وبسط کے ساتھ اس مضمون پر بحث کی گئی ہے۔ اور تمام اخلاقی خوبیوں اور برائیوں کی کیفیت بیان کرکے ہر خوبی کے پیدا کرنے اور ہر برائی کو دور کرنے کا علاج پیش کیا گیا ہے۔

(۱۰) سزا سزا کے متعلق مندرجہ ذیل اصول قائم کئے ہیں۔
(ا) علوم وفنون کے سکھانے میں اور علمی کمزوریوں پر سزا نہ دینی چاہیئے۔ بلکہ اخلاقی غلطیوں یا مذہب کے فرائض ترک کرنے پر سزا دینی چاہیئے۔

(ب) جہاں تک ممکن ہو جسمانی سزا سے احتراز کرنا چاہیئے۔ اور محض شبہ پر جبتک کہ استاد اپنی آنکھوں سے طالب علم کو اخلاقی غلط

کا ارتکاب کرتے ہوئے نہ دیکھے سزا نہ دینی چاہیئے۔ اور جب اس کی نوبت آئے تو تعداد میں کم اور تکلیف میں زیادہ سزا دینی چاہیئے تاکہ عبرت ہو اور دوبارہ اُس فعل کے ارتکاب کی جرأت نہ کر سکے۔

(ج) سزا خلوت میں دینی چاہیئے۔ تاکہ بے شرم اور ڈھیٹ نہ ہو جائے۔

(د) جب سزا دی جائے تو بچے کو رونے چیخنے سے اور فریاد کرنے سے منع کرنا چاہیئے۔ کیونکہ یہ ذلیل حرکت ہے۔

(۱۱) **نصاب تعلیم** اخلاقی مذہبی اور جسمانی تعلیم کے علاوہ ہر بچے کے لئے ابتدائی ذہنی تعلیم لازمی قرار دی ہے۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد کسی فن یا اعلےٰ ذہنی تعلیم کی تحصیل ضروری خیال کی ہے۔

تعلیم علوم میں حسب ذیل ترتیب کی سفارش کی ہے:۔

اوّل منطق پھر ریاضی اور اس کے بعد طبیعی اور اس کے بعد الٰہی کی تعلیم دینا لازم ہے مگر بعض حکما کے قول کے مطابق ریاضی منطق سے پہلے پڑھانی چاہیئے۔ اور اس موخر الذکر ترتیب کی خود بھی تصدیق کی ہے۔

(۱۲) **فیکلٹی تھیوری** اس سے مراد یہ ہے کہ یورپ کے حکماء قدیم کا خیال تھا کہ انسانی دماغ ایک لوح سادہ کی مانند ہے۔ جس پر ماحول سے نقوش مرتسم ہوتے رہتے ہیں۔ نیز دماغ مختلف قوتوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اور ہر قوت کو کسی خاص علم میں مشق کرنے سے نشو و نما حاصل ہوتی ہے۔ اور ایک بار ایک قوت کے ترقی کر جانے کے بعد یہ قوت ہمیشہ ہر حالت میں کام آسکتی ہے۔ ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں۔ کہ یہ نظریہ انیسویں صدی میں ہربارٹ نے غلط ثابت کر دیا۔ مگر اس سے قبل یہ مسلم الثبوت خیال کیا جاتا تھا۔

بسلسلہ نصاب تعلیم جو اقتباس ہم نے اخذ کیا ہے اُس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف اخلاق جلالی بھی اس نظریہ کو تسلیم کرتے ہیں۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ لاک وغیرہ معلمین اور حکماء یورپ تک یہ نظریہ ان ہی مسلمان علماء سے پہنچا ہوگا۔ اور مسلمان حکماء نے یہ نظریہ فلاسفۂ یونان سے اخذ کیا ہوگا۔

تعلیم نسواں آجکل بالعموم مسلمانوں میں تعلیم نسواں کا خیال جدید سمجھا جاتا ہے۔ اور فی الواقع مسلمان اس میدان میں آجکل بہت پیچھے نظر آتے ہیں۔ مگر ہمیشہ سے یہ کیفیت نہ تھی اور مسلمانوں کے اقبال کے زمانے میں تعلیم نسواں کی کثرت اور خوبی پر اوراق تاریخ شاہد ہیں۔

دور حاضرہ میں عورتوں کی تعلیم پر تو بہت کچھ زور دیا جاتا ہے۔ مگر مرد و عورت کے نصاب تعلیم میں کوئی امتیاز نہیں کیا جاتا۔ اس لئے تعلیم یافتہ عورتوں میں ایسی خوفناک برائیاں عام طور پر نظر آتی ہیں۔ جو سوسائٹی کے لئے اہم خطرات کا موجب ہیں۔ اور اگر آئندہ اس طرف توجہ نہ کی گئی اور یہ سیلاب یوں ہی بڑھتا رہا تو ایک دن نظام سوسائٹی کا شیرازہ اسی تعلیم نسواں کی بدولت ورق ورق ہو جائیگا۔

اس سے تو انکار نہیں کیا جاسکتا کہ تعلیم کی ضرورت مرد اور عورت دونوں کے لئے برابر ہے۔ مگر دونوں کے لئے نصاب تعلیم اُن کی زندگی کی جداگانہ ضروریات کے مطابق جداگانہ ہونا چاہیئے۔ چنانچہ صاحب اخلاق جلالی نے اس کو ملحوظ رکھتے ہوئے تعلیم نسواں کے مندرجہ ذیل اصول بیان کئے ہیں۔

"در تربیتِ دختران بانچہ لائق ایشاں باشد از ملازمتِ خانہ و مبالغت در حجاب و عفت و حیا و خصال کہ در زناں بیان رفت ترغیب باید نمود۔ و ہنرہائے لائق آموخت۔ و از خواندن و نوشتن بکلی منع باید کرد۔"

اس اقتباس کے آخری جزو سے شاید بعض حضرات کو یہ دھوکا ہوگا کہ عورت کو قطعاً علم سے بے بہرہ رکھنے کی سفارش کی گئی ہے۔ مگر ہم اوپر صاحبِ اخلاق جلالی کا بیان نقل کر آئے ہیں کہ انسان ہونے میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں۔ اس لئے اپنی پیدائش کا منشاء پورا کرنے کے لئے عورت کو بھی اخلاقی۔ مذہبی جسمانی اور ابتدائی ذہنی تعلیم و تربیت کی ضرورت ہے۔ پس "خواندن و نوشتن" سے مراد اعلےٰ ذہنی تعلیم ہے۔ جس سے منع کیا گیا ہے۔ چونکہ یہ نصاب تعلیم عوام کے لئے ہے۔ اس لئے خاص صورتوں میں عورتوں کو اعلےٰ تعلیم دینے سے بھی منع نہیں کیا گیا۔ بلکہ مدعا صرف یہ ہے کہ بالعموم عورتوں کو اعلےٰ تعلیم دیکر اعلےٰ ذہنی مشاغل میں مصروف کرنا سوسائٹی کے مفاد کے لئے مضر ہے۔

کمینیس نے مرد اور عورت دونوں کو تعلیم دینا ضروری خیال کیا ہے مگر دونوں کے لئے ایک مدرسہ ایک معلم ایک نصاب تعلیم اور ایک ہی طریق تعلیم اختیار کیا ہے۔ جس کی غلطی ہم اوپر بیان کر آئے ہیں۔

لاک نے تعلیم نسواں کو قطعاً نظر انداز کر دیا ہے۔ مگر روسو

نے تعلیم نسواں کا جو معیار قرار دیا ہے۔ وہ لفظ بلفظ اخلاق جلالی کے معیار کے مطابق ہے۔

(۱۴) معلم کی خصوصیت

آجکل معلم کا انتخاب اُس کی تعلیمی سندات کے بنا پر ہوتا ہے۔ مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایک کامیاب معلم کے لئے کچھ اور خصوصیات بھی لازم ہیں۔ محض نفسِ مضمون سے واقف ہونا یا دوسرے الفاظ میں تبحرِ علم کافی نہیں۔

صاحبِ اخلاق جلالی معلم کی خصوصیات ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:-

”معلم دیندار و عاقل باشد و بر ریاضتِ اخلاق واقف و بطہارتِ ذیل و وقار و ہیبت و مروت مشہور و از اخلاق ملوک و آداب مجالست و مواکلت با ایشاں و محاورت با ہر طائفہ از طوائف مرموم باخبر“ ۱۲

یعنی مختصراً معلم کو علاوہ عالم و فاضل ہونے کے خوش اخلاق دیندار۔ ذہین۔ ماہر تعلیم الاخلاق (جس کے ساتھ ماہر علم النفس ہونا لازمی ہے) اور بارعب (یعنی عمدہ ڈسپلن قائم رکھنے والا) ہونا چاہئے۔

(۱۵) سفر ذریعہ تعلیم

لاک اور روسو کی طرح صاحب اخلاق جلالی بھی تکمیل تعلیم و تربیت کے لئے سفر کرنا لازمی خیال کرتے ہیں۔ مگر فرق یہ ہے کہ متذکرہ بالا فرنگستانی معلمین ۲۱ سال کی عمر کے بعد سفر کی سفارش کرتے ہیں۔ حالانکہ صاحب اخلاق جلالی کا خیال ہے کہ اوائل عمر میں اگر بچہ کو گھر سے دور بخیال تربیت بھیجدیا جائے تو گھر کے مضر اثرات سے محفوظ رہتا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

”ملوک فرس فرزنداں را درمیان خدم و حشم تربیت نکردندے بلکہ با ثقات بطرفے فرستادندے تا بخشونت عیش عادت کردندے کسے کہ بہ ایں طریق نشو و نما یافتہ باشد اصلاح اُو مشکل بود“

موجودہ زمانے میں ہوسٹلوں کے قائم کرنے کے وجوہ میں سے مندرجہ بالا وجہ بھی خیال کیجاتی ہے۔ یعنی گھروں کے مضر اثرات سے دور رہ کر بچہ اپنی قوتوں پر بھروسہ کرنا سیکھ جاتا ہے۔

تنقید و تبصرہ

مصنفِ اخلاقِ جلالی نے تعلیم کا جو نصب العین پیش کیا ہے وہ اس لحاظ سے قابل تعریف ہے کہ اس میں تعلیم و تربیت کے ہر پہلو پر مناسب زور دیا گیا ہے۔ جسمانی تعلیم و تربیت کو اخلاقی و ذہنی تعلیم کی بنیاد خیال کرنا بھی موجودہ نظریات کے بالکل مطابق ہے۔ بچے کی تربیت کا آغاز پیدائش کے وقت سے کرنا۔ ہر بچہ کے لئے بلا امتیاز جنس۔ قوم و مراتب زندگی وغیرہ تعلیم کی ضرورت ظاہر کرنا۔ مطالعہ فطرتِ اطفال کی سفارش کرنا۔ تعلیم کو دلچسپ بنانے کی رغبت دلانا۔ جسمانی تربیت کے سلسلے میں کھیلوں اور ورزش کو لازمی قرار دینا۔ سزا کے متعلق خیالات اور مدرس کی خصوصیات پر نظر ان تمام امور میں جدید نظریات کے ساتھ اخلاق جلالی کا تطابق حیرت انگیز ہے۔

انہی خوبیوں کے ساتھ ساتھ اس نظام تعلیم میں چند بدیہی نقائص بھی ہیں مگر وہ اس زمانے کی خصوصیات تھیں اور بہر حال علم انسانی کی ترقی ہمیشہ پرانے نظریات کو غلط ثابت کرتی رہتی ہے۔

چنانچہ علم النفس کی ترقی کے ساتھ فیسکلٹی تھیوری کی لغویت ثابت ہو چکی ہے۔ اسی علم سے عدم واقفیت کا نتیجہ تھا۔ کہ جہاں مصنف اخلاق جلالی نے بچے کی فطرت کا مطالعہ کرنے کی سفارش کی ہے۔ وہاں یہ بھی فرماتے ہیں کہ بچے کے لئے تعلیم علوم و فنون کا انتخاب کرتے ہوئے نجوم سے مدد لینی چاہئے۔ اسی طرح ایک جگہ بچے کے متعلق کہتے ہیں کہ ”میل طبیعت بر ذائل در نفوس مرکوز ست“ یعنی بچے کی طبیعت فطرتاً برائی کی طرف مائل ہوتی ہے۔ علم النفس کی جدید تحققات نے اس فرسودہ خیال کو بھی غلط ثابت کر دیا ہے۔ فطرۃً بچہ نہ نیکی کی طرف مائل ہوتا ہے نہ بدی کی جانب بلکہ ماحول میں نیکی یا بدی جس کے لئے بھی بڑے زور دار اثرات موجود ہونگے۔ وہی بچہ بآسانی قبول کریگا۔

مختلف پہلوؤں پر غور کرتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ پندرھویں صدی میں مسلمانوں کے پاس ایک شاندار نظام تعلیم موجود تھا۔ حکومت کے زوال کے ساتھ ساتھ اس قوم کے حوصلے پست خیالات تنگ اور وسائل محدود ہوتے گئے۔ بالآخر یہ اعلےٰ نظام تعلیم بجائے ترقی پانے کے رفتہ رفتہ حوالۂ طاقِ نسیاں ہو گیا۔ مگر جیسا ہم اوپر ثابت کر آئے ہیں۔ تبادلۂ خیالات کے ذریعہ اس کے اثرات بالواسطہ یورپ میں رونما ہوئے۔ یہ مبارک پودہ ایشیا سے لاک یورپ کی سرزمین میں لگایا گیا۔ اور وہاں کی زندگی بخش فضا میں نشو و نما پاکر ایک ایسا شاندار درخت تیار ہوا کہ آج ہم اُس کے زیر سایہ اُس کے اثمار کی شیرینی سے لذت گیر ہو رہے ہیں۔

محمد عبدالسلام فضلی بی۔ اے
(دہلی)

غزل

تری بزمِ ناز میں تھا جو دل کبھی شمعِ روشنِ آرزو
ستمِ زمانہ سے بن گیا وہی آج مدفنِ آرزو

مرا دل ازل کا فسردہ ہے مجھے شوق سے سروکار کیا
نہ ہوائے میکدۂ ہوس نہ دماغ گلشنِ آرزو

وہ اُمیدیں خاک میں ملگئیں وہ تمام نشۂ اُتر گیا
نظر اس نے کی جو عتاب کی، ہوئی برقِ خرمنِ آرزو

گئی یک بیک مری خستگی ہوئی دور ساری شکستگی
کبھی آئی بھول کے سوئے دل جو نسیمِ گلشنِ آرزو

نہ خدنگِ ناز نے رُخ کیا کبھی جانبِ دلِ بینوا
نہ گل مراد سے پُر ہوا کبھی اپنا دامنِ آرزو

مجھے یاد آتا ہے اپنا دل کہ بہار جس سے تھی منفعل
وہ نہالِ تازۂ رنگ و بو وہ چراغِ روشنِ آرزو

نہ کوئی ہوس ہے نہ ولولہ یہ ہے حال وحشتِ خستہ کا
ہے فریب خوردۂ آرزو، وہ بناہی دشمنِ آرزو

(غیر مطبوعہ)

رضا علی وحشت

سُنہری جزائر کا بادشاہ

افراد

سنہری جزائر کا بادشاہ .... شاہ ہاماران
سیاست دان ....
شہنشاہ اعظم کا سفیر ....
شہنشاہ اعظم کا کارندہ ....
سورج کے پجاری ....
شاہ ہاماران کے جلاد ....
سفیر کا حبشی غلام ....
شہنشاہ کا بونا ....
شاہ ہاماران کا ساغر بردار

ہاماران کا سیاست دان - ایک شخص شہنشاہ اعظم کے ملک سے مفرور ہو کر آپ کے ملک میں پناہ گزیں ہے اور اس مقام میں چھپا ہے - جسکو "مقدس" کہتے ہیں -

ہاماران - ہمیں چاہیئے کہ اُسے شہنشاہ کے حوالے کر دیں -

سیاست دان - آج ہی ایک قاصد یہ حکم لایا تھا کہ مفرور کو گرفتار کر لیا جائے -

ہاماران - ہمیں چاہیئے کہ اسے شہنشاہ کے حوالے کر دیں -

سیاست دان - اس کے علاوہ اس کے پاس ایک فرمان شاہی ہے - جس میں مندرج ہے کہ مفرور کا سر کاٹکر شہنشاہ کے پاس بھیجدیا جائے -

ہاماران - بھیجدیا جائے -

سیاست دان - حضور پر نور شہنشاہ اعظم کے باجگذار نہیں ہیں -

ہاماران - شہنشاہ کے فرمان کی حکم عدولی نہیں کیجا سکتی -

سیاست دان - تاہم ....

ہاماران - آج تک کسی نے ایسا نہیں کیا -

سیاست دان - یہی وجہ ہے کہ شہنشاہ مغرور ہو گیا ہے اور دوسرے بادشاہوں کا مذاق اڑاتا ہے - اگر حضور پر نور اس کے فرمان کو تسلیم نہ کریں تو وہ کانپنے لگیگا -

ہاماراں - آہ!

سیاست دان - شہنشاہ اپنے دل میں کہیگا - "کس قدر عظیم الشان بادشاہ ہے - میری حکم عدولی کرتا ہے - اور وہ لرزنے لگیگا -

ہاماراں - اور اگر......

سیاست دان - شہنشاہ آپ سے ڈر جائیگا -

بادشاہ - مَیں چاہتا ہوں کہ عظیم الشان بادشاہ کہلاؤں لیکن ....

سیاست دان - شہنشاہ کی نظروں میں آپ کی عزت بڑھ جائیگی -

بادشاہ - لیکن شہنشاہ کا غصہ قیامت ہے - خوفناک ہے - گذشتہ زمانہ میں اس کا غصہ خوفناک تھا -

سیاست دان - شہنشاہ بوڑھا ہو گیا ہے -

بادشاہ - کسی بادشاہ سے اس پناہ گزیں مفرور کو طلب کرنا جو دربار کے مقدس حصوں میں چھپا ہوا سلامتی اور امن کا خواہاں ہو اس بادشاہ کی بڑی توہین ہے - بڑی تذلیل ہے -

سیاست داں - بڑی توہین - بڑی تذلیل ہے -

کارندہ داخل ہوتا ہے۔

کارندہ ۔ اے بادشاہ ۔ میں اس آدمی کی تلاش میں ہوں جو شہنشاہ اعظم کے دربار سے فرار ہو کر آپ کے محل کے اس حصے میں پناہ گزیں ہے جسے "مقدس" کہتے ہیں۔ میرے پاس جستجو کا نیزہ ہے۔

بادشاہ ۔ میرے خاندان کے بادشاہوں کا یہ وطیرہ نہیں رہا کہ پناہ گزینوں کو مقدس مقامات سے نکال دیں۔

کارندہ ۔ شہنشاہ کا حکم ہے۔

بادشاہ ۔ لیکن میں اس حکم کو پسند نہیں کرتا۔

کارندہ ۔ اے بادشاہ شہنشاہ کا فرمان دیکھ!

بادشاہ فرمان لے لیتا ہے۔ کارندہ دروازے کی طرف جاتا ہے۔

کارندہ ۔ میں اپنا نیزہ لیکر محل کے اس حصے کے سامنے بیٹھا رہونگا جسے مقدس کہتے ہیں۔

کارندہ چلا جاتا ہے۔

بادشاہ ۔ فرمان شاہی ۔ فرمان شاہی ۔ ہم پر اس کی پابندی لازمی ہے۔

سیاست دان ۔ شہنشاہ بوڑھا ہے۔

بادشاہ ۔ بالکل درست ۔ ہم اس کی حکم عدولی کریں گے۔

سیاست دان ۔ وہ کچھ نہیں کر سکتا ۔ وہ کچھ نہیں کریگا۔

بادشاہ ۔ تاہم فرمان ۔ ......

سیاست دان ۔ اس کی کوئی اہمیت نہیں۔

بادشاہ ۔ سنو ۔ میں شہنشاہ کی حکم عدولی کرونگا۔ میں اسے اپنے مقدس مقامات کی تذلیل کی اجازت نہیں دونگا ۔ ہم مفرور آدمی کو اپنے ملک سے نکال دینگے۔

(اپنے کارندے سے مخاطب ہو کر)

ادھر آ کارندے ۔ سیاہ ہاتھی دانت کا نیزہ لے جو جلاوطنی کا نشان ہے ۔ اور میرے تخت کی بائیں جانب رکھا ہے۔ اور اس نیزے سے مغرور شخص کی طرف اشارہ کر ۔ اس کے بعد اسے خاص دروازے سے باہر نکال دے تاکہ وہ شہنشاہ کے غضب سے محفوظ رہے۔

کارندہ چلا جاتا ہے۔

(سیاست دان سے مخاطب ہو کر)

پس ہم شہنشاہ کے غضب سے محفوظ رہیں گے اور ہمارے مقدس مقامات کی توہین کبھی نہ ہوگی۔

سیاست دان ۔ اگر حضور پر نور نے صاف طور پر شہنشاہ کے احکام کی خلاف ورزی کی ہوتی تو بہتر تھا ۔ شہنشاہ بوڑھا ہے اور انتقام لینے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

بادشاہ ۔ بس ۔ میرا حکم صادر ہو چکا ۔ اور مفرور ملک سے نکال دیا گیا۔

قاصد داخل ہوتا ہے ۔ قرنا بجاتا ہے۔

قاصد ۔ سفیر شہنشاہ!

سفیر شہنشاہ داخل ہوتا ہے دروازے میں کھڑا ہو کر بادشاہ کو آداب بجا لاتا ہے۔

بادشاہ ۔ شہنشاہ اعظم نے اپنا سفیر بھیجنے کی تکلیف گوارا فرمائی؟

سفیر ۔ میں شہنشاہ کی طرف سے بادشاہ کے لئے ایک تحفہ لایا ہوں۔ تاکہ بادشاہ کو احکام شہنشاہی کی تعمیل کے انعام میں شاد کام کیا جائے۔

بے بہا شراب لعل گوں کا ایک جام

سفیر اشارہ کرتا ہے اور ایک ملازم جام شراب لیکر داخل ہوتا ہے ۔ ملازم کا چہرہ جاذب نظر ہے ۔ اور اس کے سنہرے بال اس کے کندھوں پر بکھرے ہوئے ہیں۔

میرے شہنشاہ کا حکم ہے کہ آپ اس شراب سے لذت اندوز ہوں۔ اس کا فرمان ہے کہ میں آپ کو اس امر کی اطلاع دے دوں کہ اس شراب کے کشید کرنے والے خاک میں مل گئے ۔ اور جس جگہ اس شراب کے خوشہ ہائے تاک پیدا ہوئے تھے وہ مہیب اور خوفناک لڑائیوں کے بعد صرف افسانہ بنکر رہگئی ۔ اب اس جگہ کا ذکر صرف کہانیوں میں آتا ہے۔

بادشاہ ۔ تو یہ تحفہ احکام شہنشاہی کی تعظیم کے لئے ہے۔

سفیر ۔ ہاں ۔ سورج کے قدیم باغوں کی شراب

بادشاہ ۔ شہنشاہ کو یہ بات کیسے معلوم ہوئی کہ میں نے اس کے احکام کی تعمیل کر دی ہے۔

سفیر ۔ لوگ شہنشاہ کے احکام کی خلاف ورزی نہیں کرتے۔

بادشاہ ۔ اور اگر میں نے مفرور کو پناہ دی ہوتو!

سفیر ۔ اس صورت میں شہنشاہ کا حکم ہے کہ آپ اس (لونا سفیر کے اشارے پر ایک بد ہیئت اور مکروہ جام شراب لے کر آگئے

آتا ہے) جام شراب سے غراب پئیں اور پھر آخری سلام۔
بادشاہ - آخری سلام - ؟
سفیر - آخری سلام!
بادشاہ - اس جام میں کیا ہے -
سفیر - اس میں کوئی معمولی زہر آلود شراب نہیں ہے - بلکہ ایسی مہلک اور قاتل شے کہ افریقہ کے سانپ اس کا نام سن کر مسموم ہو جائیں - اور دور ہی سے اس جام کو دیکھ کر اپنے بلوں میں گھس جائیں -
بادشاہ - میں نے مفرور آدمی کو پناہ نہیں دی -
سفیر - تو پھر اس شاہی تحفے کی ضرورت نہیں -
بادشاہ - لیکن میں نے یہ حکم بھی نہیں دیا - کہ مفرور کا سر کاٹ کر شہنشاہ اعظم کے بھیج دیا جائے -
سفیر - تو پھر ان دونوں تحفوں کی کوئی ضرورت نہیں -
پہلے جام زہر آلود کی شراب زمین پر گرا دیتا ہے -
سنگ مرمر کے فرش سے دھواں اٹھتا ہے -
پھر دوسرا جام بھی انڈیل دیتا ہے -
آہ! یہ شراب خوشگوار!
بادشاہ - میں نے مفرور شخص کو اپنے ملک سے نکال دیا ہے - میں نے بادشاہ کے حکم کی خلاف ورزی بھی نہیں کی - اور تعمیل بھی نہیں -
سفیر - تو پھر آپ اپنا تحفہ خود چن لیجئے -
سفیر اشارہ کرتا ہے - ایک حبشی دو پیالے لیکر داخل ہوتا ہے -
سفیر - شہنشاہ کا فرمان ہے کہ آپ ان دونوں پیالوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کریں -
سیاست دان دبے پاؤں چلا جاتا ہے -
بادشاہ - دونوں پیالے ایک ہی طرح کے ہیں -
سفیر - کوئی شک نہیں - شہنشاہ کے دارالخلافے میں صرف ایک صناع ایسا تھا جو ان دو پیالوں میں تمیز کر سکتا تھا - اور شہنشاہ نے اُسے مروا ڈالا - چنانچہ اب دنیا میں ان دو پیالوں کا فرق کوئی نہیں بتا سکتا -
بادشاہ - کیا جو شے ان دونوں پیالوں میں ہے وہ ایک ہی طرح کی ہے -
سفیر - ہاں - حیرت انگیز طور پر ایک ہی طرح کی - شہنشاہ کا فرمان ہے کہ ان میں سے ایک پیالہ آپ انتخاب کریں -
بادشاہ - کیا شہنشاہ نے دو پیالوں میں بھی زہر ڈال دیا ہے -
سفیر - نہیں صرف ایک پیالے میں زہر ہے -
بادشاہ - تم کہتے ہو کہ صرف ایک پیالے میں زہر ہے!
سفیر - ہاں - اور کون کہہ سکتا ہے کہ زہر کس پیالے میں ہے!
بادشاہ - اور اگر میں اس حکم ماننے سے انکار کر دوں -
سفیر - کئی ایسے عذاب ہیں - جن کا نام لینے سے روح انسانی کانپتی ہے - شہنشاہ بہت کم عذاب دیتا ہے - لیکن جب اس کا حکم ہوتا ہے اسوقت ....
بادشاہ - (اپنے آپ سے) پیالوں میں کیا شے جلوہ آفریں معلوم ہوتی ہے - بالکل شراب کی طرح -
سفیر - ایک پیالے میں شراب ہے - روح پرور - جانفزا -
بادشاہ - اور دوسرے پیالے میں -
سفیر - کوئی کیا کہہ سکتا ہے - یہ بادشاہ کا ایک راز ہے -
بادشاہ - میں اپنے ذائقہ شناسوں کو طلب کرتا ہوں - وہ دونوں پیالوں میں سے چکھیں گے -
سفیر - افسوس - ایسا خطرہ نہیں برداشت کیا جا سکتا -
بادشاہ - خطروں کی برداشت بادشاہ کے ذائقہ شناسوں کے فرائض میں داخل ہے -
سفیر - اگر اتفاق سے "ذائقہ شناس" زہر آلود پیالہ پی جائیں تو خیر - چنداں مضائقہ نہیں - لیکن اگر کہیں وہ شراب والا پیالہ پی جائیں - تو شہنشاہ کے تحفے کی ایسی توہین ہوگی جس کی تلافی نہیں ہو سکتی -
بادشاہ - کم از کم اس بات کی اجازت تو مجھے ضرور ہوگی کہ میں اپنے مندر کے پجاریوں کو بلا کر ان سے پوچھ لوں کہ مجھے کون سا پیالہ انتخاب کرنا چاہئے -
سفیر - اجازت ہے -
بادشاہ - پجاریوں کو بلاؤ -
بادشاہ - (اپنے آپ سے) پجاری فیصلہ کریں گے - وہ میرے لئے انتخاب کا ناخوشگوار اور خوفناک فرض ادا کریں گے -
(سفیر سے مخاطب ہو کر)
میرے پجاری بہت دقیق النظر ہیں - وہ ان دیوتاؤں کی

پوجا کرتے ہیں ۔ جو سنہری جزائر کے محافظ ہیں ۔

سفیر ۔ لیکن شہنشاہ کے دیوتا اور ہیں ۔

سورج کے دو پجاری داخل ہوتے ہیں ۔
ایک ملازم ایک تپائی لئے ہوئے داخل ہوتا ہے ۔

بادشاہ ۔ شہنشاہ نے یہ دو پیالے بھیجے ہیں ۔ میرے لئے انتخاب کرو ۔ خوشبودار لوٹیاں جلاکر دیوتاؤں کو خوش کرو ۔ اور ان کے فیصلے سے مجھے آگاہ کرو ۔

پہلا پجاری ۔ ہم دیوتاؤں کو خوش کرینگے ۔ خوشبودار لوٹیوں سے ان کی طبع لطیف کو شاداں وفرحاں کردیں گے ۔ اور پھر وہ ہمارے سوالوں کا جواب دینے کے لئے تیار ہوجائیں گے ۔

سفیر اور حبشی غلام کی خاموشی خوفناک طور پر بڑھ رہی ہے ۔ پجاری تپائی پر جھک جاتے ہیں ۔ خوشبو آتی ہے پجاری اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں ۔

پہلا پجاری ۔ دیوتا محوخواب ہیں ۔

بادشاہ ۔ دیوتا محوخواب ہیں ۔ وہ دیوتا جو سنہرے جزائر کی حفاظت کرتے ہیں ۔

دوسرا پجاری ۔ دیوتا محوخواب ہیں ۔

بادشاہ ۔ انہیں جگاؤ ۔ میں ہزاروں بھیڑیں قربانی چڑھاؤنگا ۔ میں سورج کے پجاریوں کو زمرد انعام میں دونگا ۔

پجاری پھر تپائی پر جھک جاتے ہیں ۔
خوشبو کا ایک طوفان برپا ہوجاتا ہے ۔

پہلا پجاری ۔ دیوتاؤں نے اپنا پیغام ادا کردیا ہے ۔

بادشاہ ۔ کیا کہتے ہیں دیوتا ۔

پہلا پجاری ۔ حبشی کے بائیں ہاتھ کا پیالہ انتخاب کیا گیا ہے ۔

بادشاہ حبشی کے ہاتھ سے پیالہ چھین لیتا ہے ۔ سفیر کی طرف دیکھتا ہے ۔ اس کا چہرہ جذبات سے بالکل خالی نظر آتا ہے ۔ پجاری کی طرف دیکھتا ہے یکایک وہ چونک اٹھتا ہے ۔ اُسے ایک پجاری کے چہرے پر ایک عجیب کیفیت منظر آتا ہے ۔ وہ پیالہ رکھدیتا ہے ۔ ایک قدم آگے بڑھکر وہ پجاری کی طرف غور سے دیکھتا ہے ۔

بادشاہ ۔ پجاری ۔ پجاری ۔ یہ تیری آنکھوں میں کیسی چمک ہے ؟

پجاری ۔ دیوتاؤں کا پیغام

بادشاہ ۔ مجھے شک ہے ۔

پجاری ۔ دیوتاؤں کا پیغام

بادشاہ ۔ میں دوسرا پیالہ لے لونگا ۔

بادشاہ حبشی کے دائیں ہاتھ والا پیالہ لے لیتا ہے ۔ اور پجاری کی طرف دیکھتا ہے پھر سفیر کی طرف دیکھتا ہے ۔ لیکن اس کا چہرہ پہلے کی طرح جذبات کے آثار سے عاری ہے ۔ یکایک بادشاہ دائیں ہاتھ والا پیالہ پی جاتا ہے ۔ سفیر اور حبشی کے چہرے آثار جذبات سے خالی رہتے ہیں ۔

بادشاہ ۔ خوب شراب تھی ۔

سفیر ۔ جان پرور ۔ رُوح فزا ۔

بادشاہ ۔ جلادوں اور عذاب کرنے والوں کو بلاؤ ۔

جلاد حاضر ہوتے ہیں ۔

بادشاہ ۔ پجاری سے سات سوال پوچھو ۔ اور کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرو ۔

سفیر رخصت ہوتا ہے ۔

ایک پیالہ خالی ۔ دوسرا لبریز بادشاہ کے قریب رکھا ہے ۔

جلاّد داخل ہوتا ہے ۔

جلاد ۔ سات سوال پوچھے جا چکے ۔

بادشاہ ۔ پھر ۔

جلاد ۔ جواب نہیں ملتا ۔

بادشاہ ۔ کیا ۔

جلاد ۔ پجاری نے اعتراف گناہ نہیں کیا ۔

بادشاہ ۔ آخری سوال پوچھو !

جلاّد چلا جاتا ہے ۔

بادشاہ ۔ پجاری چاہتے تھے کہ میں زہر بھرا پیالہ پی جاؤں تعجب ہے ۔ کیوں ؟ دیوتاؤں کا نام لیکر انہوں نے جھوٹ کیوں بولا ۔

جلاّد داخل ہوتا ہے ۔

جلاّد ۔ آخری سوال پوچھا جاچکا ۔

بادشاہ ۔ پھر

جلاّد ۔ انہوں نے اعتراف گناہ نہیں کیا۔

بادشاہ ۔ وہ آخری سوال کا جواب دینے سے انکار کرتے تھے؟

جلاّد ۔ وہ بولے ۔لیکن مہمل ۔ فضول ۔

بادشاہ ۔ انہوں نے کیا کہا؟

جلاّد ۔ جو کچھ انہوں نے کہا وہ بادشاہ کی سماعت کے سزاوار نہیں ہے ۔

بادشاہ ۔ کیا کہا انہوں نے؟

جلاّد ۔ مہمل ۔ فضول ۔

بادشاہ ۔ کیا ان کا کہا کسی کی سمجھ میں نہیں آیا ۔؟

جلاّد ۔ وہ بولے ۔لیکن حضور پرنور کے گوش مبارک کے لئے ان کے الفاظ موزوں نہیں ۔

بادشاہ ۔ بولو ۔ بتاؤ ۔ انہوں نے کیا کہا؟

جلاّد ۔ جو پجاری میرے حوالے کیا گیا تھا ۔ اس نے کہا "جو شخص دیوتاؤں کے مشورے کی قدر کرتا ہے ۔ ان دیوتاؤں کے مشورے کی جو مستقبل کے متعلق جو کچھ جانتے ہیں وہ کبھی یہ نہیں سمجھ سکتا کہ بادشاہ کو زہر آلود پیالہ پینے کا پیغام دیکر انہوں نے غلطی کی تھی"۔ اس کے بعد میں نے سیدھے سادے طریق پر سوال پوچھا اور وہ مر گیا ۔

بادشاہ ۔ دیوتا! اس نے دیوتاؤں کا نام لیا ۔

دوسرا جلاّد ۔ اے بادشاہ ۔ دوسرے پجاری نے بھی یہی کہا ۔

بادشاہ ۔ سوال ان سے علیحدہ کمروں میں پوچھے گئے تھے ۔

پہلا جلاّد ۔ میں نے پجاری کو "سرخ کمرے" میں بند کیا تھا ۔

دوسرا جلاّد ۔ اور میں نے "چوہوں کے کمرے" میں ۔

بادشاہ ۔ جاؤ ۔

جلاّد چلے جاتے ہیں ۔

بادشاہ ۔ تو یہ پیغام دیوتاؤں کا تھا ۔

زیر لب بڑبڑانے لگتا ہے ۔

بادشاہ ۔ دیوتا! دیوتا! انہوں نے مستقبل میں کیا تاریک اور خوفناک راز پنہاں کر دئے ہیں ۔ مستقبل قبر سے زیادہ خوفناک اور مہیب ہے ۔ قبر میں صرف ایک راز ہے ۔ اور مستقبل رازوں کا مدفن ۔ پجاری کہتے ہیں کہ دیوتاؤں کے خیال میں میرا اس وقت مرجانا اچھا ہوتا ۔ آہ! دیوتا کیا دیکھ رہے ہیں؟ ان کے سامنے کیا ہے جو میری نظروں سے پوشیدہ ہے ۔ تقدیر تنہا بیٹھی ہے ۔ اور برے دن تخلیق کر رہی ہے ۔ ہاں ۔ میں ان آدمیوں کو جانتا ہوں جن کو دیوتاؤں نے پہلے سے میری طرح متنبہ نہیں کیا ۔ وہ یکایک چکنا چور ہو گئے ۔ جس طرح نازک کشتی پتھر سے ٹکرا کر چکنا چور ہو جاتی ہے ۔ آہ! دیوتا! ان لوگوں کے لئے زہر کا پیالہ پی لینا بہت زیادہ خوشگوار ہوتا! دیوتاؤں نے مجھے اشارتاً مرجانے کے لئے کہا ۔ اور میں نے ان کا کہا نہ مانا ۔ اب میں مستقبل کے راستے پر تنہا چل رہا ہوں ۔ خطرناک تاریک مستقبل ۔ کیا کروں!

دوسرے پیالے کی طرف دیکھتا ہے ۔

اب بھی وقت باقی ہے پیالہ خوابوں کی دنیا کی طرح شیریں اور مبہم سا نظر آتا ہے ۔ خوابوں کی دنیا ۔ طلسمی شیریں مبہم ۔

بادشاہ دوسرا پیالہ اٹھا کر غٹ غٹ چڑھا جاتا ہے ۔

سیاست دان داخل ہوتا ہے اور بادشاہ کے ہاتھ سے پیالہ چھین لینا چاہتا ہے ۔ لیکن بادشاہ کے ہاتھ ۔ اس کے بازو ۔ اس کا جسم سب سخت ہو چکے ہیں ۔ موت کی سختی ان پر چھا گئی ہے ۔

سیاست دان ۔ آہ!

باہر نکل کر اعلان کرتا ہے

بادشاہ ہمارا مر گیا ۔ خدا بادشاہ زر بادنیر کو سلامت رکھے ۔

پردہ گرتا ہے ۔

عابد

فلسفۂ یونان ماقبل افلاطون

اگر آپ یورپ کے نقشہ کی طرف دیکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یونان ایک انسانی ہاتھ کی طرح ہے۔ جس کی انگلیاں بحیرۂ روم میں پھیلی ہوئی ہیں، اُس کے جنوب میں جزیرۂ کریٹ واقع ہے۔ جہاں سے تہذیب و تمدن کی شعاعیں یونان پر چمکی تھیں۔ مشرق میں بحرایجین کے اُس پار، ایشیائے کوچک واقع ہے۔ آجکل یہ خطہ اقتصادی لحاظ سے پست حالت میں ہے۔ لیکن افلاطون سے پہلے یہ ملک تجارت۔ صنعت، اور فلسفہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ مغرب میں، آیونین کے اُس پار، ملک اٹلی واقع ہے۔ اس کے جنوب میں جزیرۂ صقلیہ ہے۔ شمال میں تھسلی ایپا یرلس اور مقدونیا کے صوبے واقع ہیں جو اس زمانہ میں نیم مہذب اور جنگجو اقوام کا مسکن تھے۔

یونان کا ساحل بیحد شکستہ ہے جس کی وجہ سے قدم قدم پر خلیجیں اور کھاڑیاں بنگئی ہیں۔ سطح اندرونی عموماً مرتفع ہے۔ جابجا پہاڑیاں اور پہاڑ پائے جاتے ہیں۔ ان دونوں باتوں کی وجہ سے یونان کا ملک بہت سے قدرتی حصوں میں منقسم ہوگیا ہے اور اس زمانہ میں بمقابلۂ حال، آمدورفت اور باہمی رسم وراہ کا سلسلہ بیحد دشوار تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر خطہ میں ایک مستقل حکومت اور جداگانہ اقتصادی۔ تمدنی، معاشی اور مذہبی دستورالعمل قائم ہو گیا۔ رفتہ رفتہ جسقدر مشہور اور بڑے بڑے شہر تھے۔ سب کے سب مستقل حکومتوں کا مرکز بن گئے۔ ان شہری مملکتوں میں سے ایوبیا۔ لوکرس۔ ایٹولیا۔ فوکس۔ بوشیا۔ ایکیا۔ آرگالس۔ ایلس۔ آرکیڈیا۔ سینیا۔ لیکونیا (جس میں اسپارٹا اور ایٹیکا۔ جس میں ایتھنز واقع ہے) زیادہ مشہور ہیں۔ ایتھنز جو آئندہ چلکر یونان کا علمی مرکز بنگیا۔ مشرقی ساحل پر واقع ہے۔ گویا یہ وہ دروازہ ہے جس میں ہوکر اہل یونان، مشرقی فتوحات کی طرف متوجہ ہوئے، اور اسی میں ہوکر مشرقی صنعت و حرفت اور سامان آسایش یونانی گھروں میں پہونچتا تھا۔ اس کی بندرگاہ نہایت عمدہ تھی جس کو پائیریس کہتے تھے اور اس میں ایک دو نہیں بونت ضرورت سیکڑوں جہاز پناہ لے سکتے تھے۔ یونانیوں کا جنگی بیڑہ بھی اسی میں پڑا رہتا تھا۔ سنہ ۴۹۰ء تا سنہ ۴۸۰ ق م میں ایتھنز اور اسپارٹا نے قدیمی رقابت کو بالائے طاق رکھکر ایرانی افواج کو پے در پے شکستیں دیں اور دنیا کو دکھا دیا کہ مٹھی بھر انسان اگر ہمت کر جائیں تو ناممکن کو ممکن بنا سکتے ہیں اگر یونانی پسپا ہوجاتے تو غالباً دنیا کی آئندہ تاریخ قطعاً بدل جاتی۔ یونان کے علاوہ اور کوئی طاقت اس وقت یورپ بھر میں ایسی نہ تھی جو ایرانی تلوار کی تاب لاسکتی لہذا ایشیا۔ یورپ پر بے غل وغش حکمران ہوجاتا۔ بہرکیف بعد اختتام جنگ، اسپارٹا نے اپنی فوج برطرف کردی۔ لیکن ایتھنز نے اپنے جنگی بیڑے کو تجارتی کاموں پر لگا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ عرصہ کے بعد اسپارٹا تو پھر قدیمی حالت پر آگیا۔ لیکن ایتھنز تجارت کی بدولت طاقتور اور مالدار ہوگیا علاوہ بریں، مختلف ممالک کے باشندے تجارت کے سلسلہ میں یہاں آنے جانے لگے جن سے میل جول کی وجہ سے قدرتی طور پر ایتھنز کے باشندوں میں عقلی سرگرمی علمی بیداری اور ذہنی ترقی کا آغاز ہوگیا۔

ان حالات میں جبکہ مختلف اقوام باہمدگر ارتباط پذیر ہوتی ہیں لوگ محض روایات اور افسانوں کو مدار یقین نہیں بنایا کرتے بلکہ انہیں تحقیق وتدقیق کا مادہ پیدا ہوجاتا ہے۔ چنانچہ ایتھنز میں بھی یہی ہوا۔ یہاں مختلف مذاہب اور خیالات کے لوگ ایک جگہ اکھٹے ہوتے تھے۔ باہمی تبادلۂ خیال کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں میں "تشکیک" کا رنگ جھلکنے لگا۔ قاعدہ کی بات ہے کہ جب ایک شخص کے سامنے مختلف اقسام کی سو، پچاس چیزیں ڈالدی جائیں تو وہ ان میں سے کسی کو بھی بآسانی انتخاب نہیں کرسکتا۔ ایتھنز میں بھی بہت سے مذاہب اور خیالات موجود تھے۔ اس لئے یہ کہنا بعید از قیاس نہیں کہ طبقۂ تجار میں سب سے پہلے لاادریت پھیلی ہوگی۔ ان لوگوں نے مختلف ممالک میں مختلف مذاہب اور طریقے دیکھے ہونگے۔ اس لئے حیران رہ گئے ہونگے کہ کسے رد کریں اور کسے قبول کریں اور چونکہ سوداگر بلحاظ پیشہ لوگ بآسانی دوسروں کی باتوں پر اعتبار نہیں کرتے اس

لئے انہوں نے ہر مذہب کے متعلق شکوک وشبہات ظاہر کئے ہونگے۔ گویا یونان میں سائینس کی بنیاد انہی لوگوں کی بدولت پڑی کیونکہ ہر چیز کو دیکھ اس کے متعلق سوالات پیدا کرنا ہی سائینس کی ابجد کہلاتی ہے۔ شرح مبادلہ کی روز افزوں پیچیدگیوں کے باعث ریاضی کی نشو ونما ہوئی۔ جہازرانی کی بدولت۔ ہیئت کو ترقی ہوئی دولت کی فراوانی نے لوگوں کو اسقدر سکون اور فرصت عطا کی کہ تنہائی میں بیٹھکر زمین وآسمان کے متعلق غور وفکر کرسکیں۔ چنانچہ لوگوں نے اب محض جہازرانی ہی کی خاطر ستاروں کی چال پر غور نہیں کیا بلکہ اس لئے بھی کہ شاید معمائے کائینات کے حل کرنے میں ان سے مدد مل سکے۔ یہ امر بھی غور طلب ہے کہ اولین یونانی فیلسوف، ہیئت داں بھی تھے۔ ارسطو لکھتا ہے۔ "ایرانیوں کو شکست دینے کے بعد یونانیوں کے حوصلے بہت بڑھ گئے۔ انہوں نے "علم وحکمت" کو اپنی ملکیت سمجھ لیا۔ اور ہر فن میں غور وفکر کرنا شروع کردیا۔ پہلے جن باتوں کو دیوتاؤں سے منسوب کیا جاتا تھا۔ اب اُن کی تشریح عقلی طور پر ہونے لگی۔ جادو اور منتر کی جگہ فلسفہ اور سائینس سے کام لیا جانے لگا۔ یعنی علمی زندگی پیدا ہوگئی۔

شروع میں، فلسفہ زیادہ تر طبیعاتی مسایل ہی تک محدود تھا۔ لوگ جب اس مادی دنیا پر نظر ڈالتے تھے تو یہی سوال انکے دل میں پیدا ہوتا تھا کہ اشیائے مادی کس چیز سے بنی ہیں؟ رفتہ رفتہ اسی سلسلۂ خیال سے دیمقراطیس کے فلسفہ کا ظہور ہوا جس نے یہ رائے ظاہر کی کہ کائینات میں سالمات اور خلاء کے سوائے اور کچھ نہیں جو کچھ ہورہا ہے سب انہی سالمات مادہ کا کرشمہ ہے اور یہ سالمات ایسے ہیں کہ تقسیم نہیں ہوسکتے۔ اسی لئے ان کو "اجزائے لایتجزیٰ" کہتے ہیں۔ یہ فلسفہ مادیت یعنی (materialism) کے نام سے موسوم ہے۔ اگرچہ ارسطو اور افلاطون کی وجہ سے یہ فلسفہ کچھ عرصہ کے لئے نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ لیکن جب افلاطون کے خیالات کا زور کم ہوا، تو پھر از سرِ نو اُبھرا، ابی قورس ۳۴۲ تا ۲۷۰ ق م اور لکریشیئس ۹۸ تا ۵۵ ق م اس فلسفہ کے بڑے زبردست حامی گزرے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ مادہ پرستی خدا پرستی کے ساتھ ساتھ چلی آرہی ہے۔ ہر زمانہ میں اس کے حامی موجود رہے ہیں۔ تفصیل کے لئے تاریخ مادیت مولفہ لینگ کا مطالعہ مفید ہوگا۔

لیکن یونانی فلسفہ کا خصوصی نشو ونما، سوفسطائیوں کے خیالات کی بدولت ہوا۔ یہ پہلے حکما ہیں جنہوں نے مادہ اور طبیعات، ہیئت اور ریاضی، سب سے یکسو ہوکر اپنی توجہ تمامتر نفسیات اخلاقیات اور مابعد الطبیعات پر مبذول کی۔ اس طبقہ میں گورجیاس، ہپیاس۔ پروٹاگورس اور پراڈیکس بہت مشہور فلاسفہ گزرے ہیں۔ جنہوں نے تمام فلسفیانہ مسایل میں عجیب وغریب موشگافیاں کی ہیں۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ آج کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہے جس کے متعلق ان لوگوں نے خامہ فرسائی یا حاشیہ آرائی نہیں کی ہے۔ مختصر طور پر یوں سمجھ لیجئے کہ ان لوگوں نے خدا سے لیکر چیونٹی تک ہر چیز کو محل بحث و تمحیص قرار دیدیا تھا۔ وہ کون سی شے ایسی تھی جس کے متعلق انہوں نے سوالات نہیں کئے؟ اگر ان میں کوئی عیب تھا تو یہ کہ انہوں نے فلسفہ جیسے شریف اور پاکیزہ فن کو، روٹی کمانے کا آلہ اور عوام پر اپنی قابلیت ثابت کرنے کا ذریعہ بنالیا۔ یہ لوگ بیخوف وخطر ہر قابل اعتراض بات پر اعتراض کردیتے تھے۔ ہر بات کے متعلق سوالات پوچھ بیٹھتے تھے۔ مذہبی اور سیاسی کسی جماعت سے انکو ہراس نہ تھا جملہ عقاید مروجہ کو عقل کی کسوٹی پر کسنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ خواہ کوئی برا مانے یا بھلا۔ سیاسیات میں یہ لوگ دو گروہوں میں منقسم تھے۔ ایک گروہ جس کا حامی روسٹیو گزرا ہے۔ یہ کہتا تھا کہ فطرت نیک اور اچھی ہے۔ لیکن مروجہ تمدن مذموم اور موجب خرابی ہے۔ فطرت کی رو سے جملہ بنی نوع آدم مساوی الدرجہ ہیں۔ یہ امتیازات، فطری نہیں ہیں بلکہ خود غرض افراد نے قائم کئے ہیں۔ اور قانون کچھ نہیں مگر کمزوروں پر حکومت کرنے کا آلہ۔ دوسرے گروہ کا، جس کی تقلید نیٹشا نے کی ہے، یہ خیال تھا کہ "فطرت" نہ اچھی ہے نہ بری اور فطرت کی رو سے تمام انسان غیر مساوی الدرجہ ہیں۔ اور اخلاق کچھ نہیں مگر زبردستوں پر قیود عاید کرنے کا ذریعہ۔ "طاقت" سب سے بڑی انسانی خوبی ہے۔ اور سب سے اعلیٰ انسانی خواہش ہے۔ اور اشرافیت بہترین طرز حکومت ہے۔

سنہ ۴۳۰ ق م سے لیکر سنہ ۴۰۴ ق م تک ایتھنز اور اسپارٹا باہم برسرپیکار رہے۔ بالآخر اسپارٹا کو فتح ہوئی۔ اس پر ایتھنز میں معدودیت کے حامیوں نے جمہوریت کے مٹانے کی تحریک

کی یہ طرزِ حکومت میدان جنگ میں ناکامی کا موجب ہوئی ہے اس تحریک میں ایک دولتمند شخص کیر یفاز نامی پیش پیش تھا۔ یہ شخص سقراط کا شاگرد تھا۔

سقراط

اگر ہم سقراط کی اس تصویر کی طرف دیکھیں جو فرانس کے عجائب خانہ میں محفوظ ہے۔ تو ہم کو معلوم ہوگا کہ اگرچہ یہ حکیم، بلحاظ صورت دلکش نہ تھا لیکن سیرت ایسی پاکیزہ پائی تھی کہ یونانی عموماً اور ایتھنز کا نوجوان طبقہ خصوصاً اس کا گرویدہ ہوگیا تھا۔ اگرچہ سقراط کے سوانح حیات، انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ لیکن افلاطون اور دوسرے مصنفین نے جو کچھ بھی اس کے متعلق لکھا ہے۔ وہ اسقدر صحیح اور واضح ہے کہ جب ہم ان تحریروں کو پڑھتے ہیں تو سقراط کی شکل ہو بہو ہمارے سامنے آجاتی ہے۔

آج سے تیئس سو ۲۳۰۰ سال پہلے، ایک معمر شخص جس کا حلیہ یہ تھا "اونچا ماتھا۔ چندیا صاف۔ گول اور بارعب چہرہ، تیز نگاہیں۔ پھلکی ناک، موٹے موٹے ہونٹ، گویا دیکھکر یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ شخص کوئی حمال یا باربردار ہے" لبادہ اوڑھے ہوئے، بلا تکلف ایتھنز کے بازاروں میں پھرا کرتا تھا، نوجوانوں کا جھمگٹا اس کے چاروں طرف لگا رہتا تھا، اور وہ ان سب کو گھیر سمیٹ کر کسی باغ یا سایہ دار مقام میں لیجا کر، یا تو عقل و حکمت کی باتیں سناتا تھا یا ان سے سوالات کیا کرتا تھا کہ جو مصطلحات تم لوگ استعمال کرتے ہو ذرا اُن کی تعریف تو کرو۔ یہ شخص سقراط تھا جو فلسفۂ یونان کا باوا آدم ہی نہیں ہے بلکہ سچائی کی راہ میں پہلا شہید اور جان نثار بھی ہے۔

یہ نوجوان جو دنرات سقراط کی صحبت میں رہتے تھے اور جن کی بدولت یورپین فلسفہ کی بنیاد قائم ہوئی۔ مختلف طبقات سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں سے بعض تو مالدار تھے مثلاً افلاطون اور الیسابیڈیز جو سقراط کی جمہوریت کے خلاف طنز آمیز گفتگو کو مزے لیکر سنتے تھے۔ بعض اشتراکی تھے مثلاً اینٹستھینیز جو اُس کی سادہ اور غریبانہ زندگی پر فریفتہ تھے۔ اور اس کے نقوش قدم پر چلنے کو دین و ایمان سمجھتے تھے۔ بعض انارکسٹ تھے۔ مثلاً ایرسٹیپس جو اُس حکومت کے خیالی پلاؤ پکایا کرتے تھے جس میں نہ کوئی حاکم ہوگا نہ کوئی محکوم بلکہ سب لوگ اُسی طرح تفکرات سے آزاد ہونگے۔ جیسے سقراط تھا۔ وہ تمام مسایل، جن کی بدولت متمدن دنیا میں آج بھی ایک طوفان بے تمیزی برپا ہے، اور جن کی بدولت غیر مختتم بحثوں کا سلسلہ چھڑا ہوا ہے۔ اُس زمانہ میں بھی نوجوانوں کے دل و دماغ میں جاگزیں تھے اور وہ لوگ اس پر یقین کامل رکھتے تھے کہ زندگی کا سارا لطف، بحث و مباحثہ ہی میں مضمر ہے۔

سقراط کی بسر اوقات کے ذرائع کسی کو معلوم نہ تھے۔ لیکن اس کا خرچ بھی کچھ نہ تھا۔ نہ پاؤں میں جوتی نہ سر پر ٹوپی، صرف ایک لمبا سا کرتہ یا جُبہ ستر پوشی کے لئے کافی تھا۔ جب وہ سال دو سال کے بعد بوسیدہ ہوگیا تو کسی شاگرد نے دوسرا نذر کر دیا۔ جب بھوک لگی تو کسی شاگرد نے کھانا کھلا دیا۔ بھلا کون شخص اس بات کو دل و جان سے پسند نہ کرتا ہوگا کہ سقراط اس کے یہاں ایک، دو وقت کھانا کھالے اور اپنی دلچسپ گفتگو سے تمام حاضرین ضیافت کو محظوظ کر دے۔ ہاں دنیا میں اگر کوئی شخص اس کا روادار نہ تھا یا اس کو دیکھکر آگ بگولہ ہو جاتا تھا تو وہ اس کی زوجہ زینتھیپ تھی، جو اُسے ننگ خلائق سمجھتی تھی اور کہا کرتی تھی کہ وہ بھی کیا آدمی، جسے اپنے بیوی بچوں کا خیال نہ ہو۔ انہی وجوہات کی بناء پر سقراط بہت کم گھر کے اندر جایا کرتا تھا۔ زینتھیپ بھی سقراط سے کچھ کم بولنے والی نہ تھی۔ اور جب کبھی میاں سقراط بھولے بھٹکے گھر کی طرف آنکلتے تو وہ ایسی کھری کھری سناتی تھی کہ سارا فلسفہ غایب ہو جاتا تھا۔ افسوس کہ افلاطون نے اور مکالمات تو قلمبند کئے مگر اُن مکالمات کو جو میاں بیوی کے درمیان ہوا کرتے ہونگے، بالکل نظر انداز کر دیا!!!

سقراط کے شاگرد، اس کی بیحد عزت کرتے تھے بلکہ اکثر اس کو دل و جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ یہ وہ خصوصیت ہے جو دنیا میں بہت کم لوگوں کو حاصل ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ سقراط علاوہ فیلسوف ہونے کے "مردِ میدان" بھی تھا۔ پیلاپنشئین جنگ سنہ ۴۳ تا سنہ ۴۰ ق م میں یہ فلاسفر، ادنیٰ سپاہیوں کے دوش بدوش بارہا دادِ شجاعت دے چکا تھا، اور اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر السیبائڈیز (صدر جمہوریہ ایتھنز) کی جان بچا چکا تھا، اور سب سے بڑھکر یہ کہ دوسرے حکماء اور فلاسفہ کی طرح اس کو اپنی علمیت پر کسی قسم کا گھمنڈ نہ تھا۔ وہ اس بات کا مدعی نہ تھا کہ مجھے کچھ آتا ہے یا میں اسرارِ کائنات کو حل کر سکتا ہوں بلکہ وہ اپنے آپکو محض ایک "طالبعلم" قرار دیتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ ڈیلفیک آریکل نے اُسے یونان میں سب سے زیادہ عقلمند آدمی قرار دیا تھا لیکن سقراط نے اس اعزاز کی تشریح یہ کی تھی کہ میں صرف ایک بات جانتا ہوں اور

وہ یہ کہ "کچھ نہیں جانتا۔"

جب کوئی شخص اپنے قدیمی معتقدات، تحکمانہ عقاید، اور مسلمہ اصولوں کی صحت میں شک کرنے لگتا ہے اور ان کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنا چاہتا ہے۔ تو گویا فلسفہ کی سرحد میں داخل ہو جاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ جو باتیں آج مسلمہ طور پر داخلِ ایمانیات ہیں اُن کے متعلق یہ کس طرح یقین کر لیا جائے کہ جن لوگوں نے اُن کو مدارِ یقین بنایا تھا انہوں نے سب سے پہلے عقلی پہلو سے ان کی صحت کا امتحان کر لیا تھا؟ اکثر ایسا بھی تو ہوتا ہے کہ ایک شخص ذاتی خواہشات کی بنا پر کسی بات کو مدارِ ایمان بنا لیتا ہے۔ اُس کے بعد، لوگ اس بات کو تقلیدی طور پر صحیح تسلیم کر کے داخلِ عقاید کر لیتے ہیں اور عرصہ دراز کے بعد وہ "خیال" "عقیدہ" بنجاتا ہے جن سے انحراف کرنا مستوجب عذاب اُخروی یقین کیا جاتا ہے۔ الغرض جبتک انسان اپنے تمام معتقدات کو عقل کی کسوٹی پر نہ پرکھ لے اس وقت تک "فلسفہ" کا وجود ثابت نہیں ہو سکتا، اور نہ کوئی شخص فلاسفر کہلا سکتا ہے۔ اسی لئے سقراط کا تکیہ کلام یہ تھا:۔

"حقیقت خود بشناس"

سقراط سے پہلے بھی بہت سے فلاسفہ گزر چکے تھے۔ مثلاً طالیس انکزیمنڈر۔ انکزیمنیز۔ فیثاغورث۔ زینوفینیز۔ پارمینا ئیڈیز۔ ملی سس زینو۔ ہرقلیطوس۔ لیوسی پس۔ دیمقراطیس۔ ایمپیڈاقلیز۔ انکساغورث ڈایوجینز۔ گورجیاس پروٹاغورث وغیرہ، لیکن اُن میں سے اکثر محض طبیعات سے بحث کیا کرتے تھے۔ یونانی فلسفہ کی ابتداء اس سوال سے ہوئی:۔ "دنیا کی اصل ([illegible]) اور اُس کا ابتدائی اصول کیا ہے؟" یونانی حکماء اشیائے خارجی کی ماہیت، دریافت کرنے میں منہمک رہتے تھے۔ نیز یہ کہ اس مادی دنیا میں کون سے قوانین جاری و ساری ہیں جن کی بناء پر یہ کارخانہ چل رہا ہے؟

سقراط نے ان امور کے متعلق صرف اسقدر کہا کہ یہ باتیں سب اچھی ہیں۔ لیکن ایک بات ان سب سے اچھی ہے وہ یہ کہ "خود انسان کیا ہے؟" درختوں، ستاروں اور دریاؤں سے بڑھکر "انسانی دماغ" لائق توجہ ہے یعنی یہ امر لائق تحقیق ہے۔ کہ انسانی دماغ کن اصولوں پر کاربند ہے۔ اور کہانتک اُس کی رسائی ہو سکتی ہے؟ یعنی انسان کی منزل مقصود کیا ہے؟

لہذا اُس نے اپنی توجہ تمامتر روحِ انسانی کی ماہیت۔ خاصیت اور تاثیر دریافت کرنے، مفروضات و روایات کی قلعی کھولنے، اور معتقدات کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنے میں صرف کر دی۔ اگر لوگ "عدل وانصاف" کے متعلق بہت یاوہ گوئی کرنے لگتے تو وہ اُن سے آہستگی کے ساتھ پوچھتا " T o T L ? " "یعنی "عدل" کسے کہتے ہیں! "عدل" کی تعریف کرو۔ آخر تم لوگ جو رات دن اصطلاحات مجردہ مثلاً عدل۔ نیکی، عزت، اخلاق، وطنیت، وغیرہ استعمال کرتے رہتے ہو۔ ان کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟ بلکہ "خودی" سے تمہارا کیا مطلب ہے! تم اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہو؟ تم خود کیا ہو۔ فی الجملہ سقراط اسی قسم کے اخلاقی اور نفسیاتی سوالات کیا کرتا تھا۔

بعض لوگ جو اس اسلوب سقراطی کے زخم خوردہ تھے، یعنی جن لوگوں سے سقراط یہ کہا کرتا تھا کہ بلا سمجھے بوجھے کوئی لفظ منہ سے مت نکالو وہ عام طور سے اس کے اوپر یہ الزام لگایا کرتے تھے۔ کہ یہ شخص بھی عجیب ہے! سوائے اعتراضات کرنے کے، اسے اور کچھ آتا ہی نہیں؟ پوچھتا بہت ہے بتاتا کم ہے، اور اس کے پاس آنے سے پہلے اگر دماغ میں دو شبہات ہوتے ہیں تو ملنے کے بعد دس ہو جاتے ہیں۔

بہرحال سقراط نے دو اہم سوالات کے جوابات نہایت معقول دئے ہیں۔ ایک تو یہ کہ "نیکی کا اصلی مفہوم کیا ہے؟" دوسرا یہ کہ "بہترین حکومت کی نوعیت کیا ہو گی؟" اور اس میں شک کیا ہے کہ اُس زمانہ کے نوجوانوں کی نظر میں ان سوالات سے بڑھکر اور کوئی سوال ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ سوفسطائیوں نے اُن کے معتقدات کو جو المپس کے دیوی دیوتاؤں سے وابستہ تھے، قطعاً زائل کر دیا تھا۔ اور اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ اخلاقیات کے دستور العمل کو پس پشت ڈال دیا گیا۔ کیونکہ جب خدا کا وجود ثابت نہیں تو پھر صرف ایک ہی بات کی پابندی کی ضرورت رہ جاتی ہے یعنی مروجہ قانون (Penal Code) کی۔ اس کے علاوہ جو جی میں آئے کرو۔ کوئی مواخذہ نہیں کر سکتا۔ صرف ملکی قانون کی پابندی کرتے رہو۔ باقی تمام معاملات میں آزاد ہو!!! ایتھنز کے نوجوانوں کا کریکٹر، اس تعلیم سے بھی بہت کمزور ہو گیا تھا کہ ہر شخص صرف اپنا ہی ذمہ وار ہے۔ دوسروں سے کوئی سروکار نہیں۔ اس انفرادیت ہی کی وجہ سے یہاں کے باشندے اسپارٹا والوں کے سامنے ہتھیار ڈال بیٹھے تھے۔ رہا حکومت کا مسئلہ، تو جو حالت ایتھنز میں اسوقت رونما تھی اس سے بدتر حالت کا تصور بھی مشکل ہے۔ مجلس مشاورت کیا تھی اچھی خاصی ڈبیٹنگ سوسائٹی تھی، مجلس منتظمہ میں دو نہیں، چار نہیں، پورے ایک ہزار ارکان شامل تھے اور ظاہر ہے کہ جب اسقدر انبوہ کثیر کسی امر کا فیصلہ

کرنے بیٹھیگا تو کسقدر طوالت پیدا ہوگی؟ یہی وجہ ہے کہ آجکل مجلس وضعِ قانون میں سو کی جگہ دو سو افراد شریک ہو سکتے ہیں لیکن مجلس منتظمہ میں چند نفوس سے زیادہ نہیں ہوتے کیونکہ جسقدر زیادہ مشیر ہونگے اُسی قدر زیادہ بحث و شنید ہوگی۔

الغرض سقراط کے زمانہ میں ایتھنز کی کیفیت یہ تھی کہ نہ تو وہاں کے باشندوں کے اخلاق درست تھے اور نہ وہاں کی طرزِ حکومت پسندیدہ تھی۔ سقراط نے ان دونوں خرابیوں کے انسداد کی تجویز پیش کی یا یوں سمجھئے کہ جو اہم سوالات، اُسوقت وہاں کے سنجیدہ مزاج انسانوں کو بیچین کر رہے تھے۔ اُن کے جوابات، باشندگانِ ایتھنز کی خدمت میں پیش کئے۔ اور انہی جوابات کی بدولت سقراط کو زہر کا پیالہ اور غیر فانی شہرت کا تاج نصیب ہوا۔

اگر سقراط اپنے متبعین کو مذہبِ سلف (بُت پرستی) کی طرف مائل کر دیتا اور ان کو مندروں میں لیجا کر مایصنعون[4] کے سامنے جھکا دیتا، تو شہر کے تمام بڑے بوڑھے اُسے اپنا سرتاج بنا لیتے اور پاؤں دھو دھو کر پینے لگتے۔ لیکن اُن کی بدقسمتی کہ سقراط محبِ الآفلین[5] میں سے نہ تھا بلکہ خدائے واحد کا پرستار اور "دینِ حنیف[6]" کے نشہ میں سرشار تھا اور برخلاف عوام الناس کے، یہ یقین رکھتا تھا کہ "روحِ انسانی" مرنے کے بعد بھی زندہ رہتی ہے۔ ان باتوں کے علاوہ وہ یہ بھی کہتا تھا کہ حکومت کرنے کے اہل وہ لوگ نہیں ہیں جو محض اپنی قوتِ بیان سے لوگوں کو متاثر کر سکیں بلکہ وہ لوگ، جو دُور اندیش اور عقلمند ہوں، کیونکہ حکومت کے معاملات آنی اور وقتی نہیں ہوتے۔ اور جب تک طرزِ حکومت ایسے قوانین پر مبنی نہ ہو جو عامۃ الناس کی بہبودی اور ترقی کا باعث ہوں۔ اسوقت تک ملک میں بدنظمی ہی رہیگی اور کوئی شخص سچے دل سے اُن قوانین کی عزت نہ کر سکیگا۔

گویا سقراط نے مذکورہ بالا دونوں سوالات کا جواب اس پیرایہ میں دیا، جو رائے عامہ اور برسرِ اقتدار دونوں طاقتوں کے منشاء کے خلاف تھا۔ جماعت اشرافیت کے ارکان قلیل تعداد میں۔ اور اگرچہ یہ لوگ در پردہ سقراط کے طرفدار تھے لیکن ان کا زور نہ تھا۔ بہرکیف انقلاب برپا ہوا لیکن سقراط کی توقعات کے موافق اس کا نتیجہ جمہوریت کے حق میں نکلا۔ × × × × — اس نتیجہ کے ساتھ ساتھ سقراط کی قسمت کا بھی فیصلہ ہو گیا۔ میلی لٹس اور اینی لٹس، نمائندگانِ جمہور نے دار العوام میں تقریر کی اور ایتھنز کے باشندوں سے کہا کہ اس تمام خرابی کا ذمہ دار سقراط ہے۔ لہذا اُسے موت کی سزا دیجانی چاہیئے۔

الغرض ۳۹۹ق م میں جبکہ سقراط کی عمر ستر سال کی تھی۔ اُسے اختلاف عقاید کی وجہ سے زہر کا پیالہ پینا پڑا۔ افلاطون نے یہ تمام واقعات نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کئے ہیں۔ اس لئے اُن کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ ہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ سقراط پہلا شخص ہے جس نے جان دینی قبول کی۔ مگر اپنے معتقدات سے سرِ مو انحراف نہ کیا۔ اور اسی لئے جب تک دنیا قائم ہے اس کی شاندار قربانی، صاحبدلوں سے خراجِ تحسین وصول کرتی رہیگی۔

حواشی متعلقہ مضمون ھذا :-

[1] ہمارے زمانہ میں بھی منطق سے یہی کام لیا جاتا ہے۔ ہندوستانی مناظرین، اس شریف فن کو احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کے لئے استعمال نہیں کرتے بلکہ محض عوام کے قلوب پر اپنی علمیت اور قابلیت کا سکہ جمانے کے لئے۔ یہی وجہ ہے کہ مناظروں اور مباحثوں سے کوئی خاص فائدہ مرتب نہیں ہوتا۔ مناظرہ ختم ہونے کے بعد ہر فریق اپنے ہی آپ کو فتحمند سمجھتا ہے۔ ۱۲

[2] روسیو ۱۷۱۲ء میں بمقام جینوا پیدا ہوا تھا۔ اس کی تصانیف نے کبنٹ کو بیحد متاثر کیا۔ جس کا خود اس کو اعتراف ہے۔ روسیو اپنے زمانہ کی کلیسائی حالت سے بہت بیزار تھا۔ یہی وجہ ہے کہ رومن کیتھولک اُسے لامذہب قرار دیتے ہیں ۱۷۷۸ء میں وفات پائی۔ ویبر لکھتا ہے کہ روسیو ایک مخصوص "روحانی" مذہب کا پابند تھا۔ اور "نیچر" کو خدا کا مظہر یقین کرتا تھا۔ اس کی تصنیفات۔ فلسفۂ اخلاقیات۔ تمدن و معاشرت، اور اقتصادیات و سیاسیات جملہ فنون پر حاوی ہیں اور فرانس پر اُن کا بہت گہرا اثر پڑا تھا۔

[3] یہی جانا کہ کچھ نہ جانا ہائے :: سو بھی اک عمر میں ہوا معلوم (میر درد)

[4] لفظی معنیٰ ہیں "جو کچھ وہ (اپنے ہاتھوں سے) بناتے ہیں" مراد اصنام وغیرہ۔

[5] لفظی معنیٰ ہیں "غروب ہو جانے والوں کو دوست رکھنے والا" مراد اصنام پرست۔

[6] "دینِ حنیف" سے مراد وہ مذہب جس میں کسی قسم کی کجی نہ ہو۔ یعنی وہ مذہب جو انسان کو خالص خدا پرستی کی تلقین کرے۔ ۱۲

کی تعریف قرآن مجید نے یوں فرمائی ہے " فاقم وجہک للدین حنیفا، فطرت اللہ التی فطر الناس علیہا، لا تبدیل لخلق اللہ، ذالک دین القیم، ولکن اکثر الناس لا یعلمون ٥ یعنی انسان کو لازم ہے کہ اپنا مُنہ " دینِ حنیف " کی طرف کرے یعنی اللہ تعالیٰ کی فطرت پر کاربند ہو جس پر اس نے انسان کو پیدا کیا ہے اور اس کی پیدائش میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی یہی سچا اور قائم رہنے والا دین ہے لیکن بہت سے لوگ اس حقیقت کبریٰ سے ناواقف ہیں۔ ۱۲

پروفیسر یوسف سلیم

امواج وساحل

اسقدر خشک لب ہے کیوں ساحل		خستہ تن، ناتواں شکستہ دل
کس لئے بیقرار ہیں موجیں؟		مضمحل، دل فگار ہیں موجیں
رات دن جھیلتی ہیں وہ کڑیاں		کاٹتی ہیں عذاب کی گھڑیاں
لعل و گوہر سے کھیلتی ہیں وہ		اس پہ بھی رنج جھیلتی ہیں وہ
ان کے دل میں ہزار ارماں ہیں		ان کے سینے میں لاکھ طوفاں ہیں
چاہتی ہیں کہ مار کر شبخوں ؛		لوٹ لیں ساغر و خمِ گردوں
بند کر دیں نجوم کی آنکھیں		طشتِ زر ماہتاب کی لوٹیں
ساحل پیر بھی ہے ان کے ساتھ		اور ہاتھوں میں ان کے ڈالے ہاتھ
گھورتا ہے سہیل و پرویں کو		اور فلک کی بساطِ رنگیں کو ؛
چاہتا ہے کہ اوجِ ماہ ملے		محفلِ ناز میں پناہ ملے ؛
ماہ و زہرہ سے ہم بغل ہو وہ ؛		کہکشاں ہو وطن تو نل ہو وہ

(غیر مطبوعہ)

کلیم

چکّر

عزیز کسان بارگاہ ایزدی میں مضمحل صورت بنائے کھڑا تھا۔ مقدس فرشتے حلقہ کئے ہوئے تھے۔ آواز آئی لاؤ! لاؤ! اس بندے کو آگے لاؤ۔ عزیز آگے بڑھا۔ فرشتوں کے پر پھڑپھڑا گئے۔ کسان آگے بڑھا۔

"ظلم۔ الٰہی ناقابل برداشت ظلم۔ زندگی کے ستائیس سال۔ صرف ستائیس۔ پروردگار! پہلے بارہ سال کیسے تھے؟ کاش وہی زندگی تھی۔ اس سے اگلے تین سال۔ آہ! کیا خوشگوار دن تھے۔ ہر قدم پر نئی امنگ، نیا ولولہ، آخری بارہ سال۔ پروردگار کیا کچھ کہنے کی ضرورت ہے۔ تو جانتا ہے الٰہی۔ یہ دن کس طرح گزرے؟ کونسی مصیبت تھی جس سے میں دوچار نہ ہوا۔ آہ کس قدر دل گداز تھا آخری دن میں بستر مرگ پر دم توڑ رہا تھا۔ قرض خواہ گھر کا سامان نیلام کرا رہے تھے۔ بارہ سال یوسف کے کھیت تھے۔ اور میں نفع اور محنت کی یہ کونسی تقسیم تھی۔ کہ سب کچھ یوسف کی نذر ہوتا تھا۔ اور میں فاقے پر فاقہ کرتا تھا ——— انصاف! الٰہی انصاف ———!" فرشتے نے نامۂ اعمال پیش کیا۔

ایک چوری .... فدیر کے کھیت سے گھاس .... ایک گناہ جسکی تلافی بھی دنیا ہی میں ہوگئی .... اور موت! کسان کانپ گیا۔ مقدس فرشتے ٹکٹکی باندھے ہوئے عزیز کی طرف دیکھ رہے تھے۔

خداوند کائنات کی بارگاہ میں قہقہے کی ایک گونج بلند ہوئی۔ اور آواز آئی لے جاؤ! اس مظلوم بندے کو! یوسف کو بلاؤ ———!

(۲)

یوسف بارگاہِ خداوندی میں حاضر تھا۔ سر جھکا ہوا۔ اس کے پاؤں کانپ رہے تھے۔ مقدس فرشتے اُسے گھسیٹے ہوئے اور آگے لے گئے۔ پُر جلال آواز آئی، نامۂ اعمال!

مقدس فرشتہ بڑھا۔ یوسف نے نامۂ اعمال اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔ ایک طرف سے بالکل سیاہ دوسری جانب سے کہیں کہیں سفید ——— یوسف نے جھٹ نامۂ اعمال دوسری طرف سے بدل کر پڑھنا شروع کیا۔

تین اپاہجوں کی مدد۔ مسجد کا چندہ۔ ماں کی خدمت! .... موت! بس تین ہی۔ صرف تین نیکیاں! اُف! یوسف لرز کر چپ ہوگیا۔ نامۂ اعمال اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔ فرشتے اس کی جرأت پر حیران تھے۔ یکایک وہ متبسم ہوگئے۔ کاتب اعمال بڑھا۔ اس نے نامۂ اعمال پڑھا۔

پُرہیبت و جلال آواز آئی۔ عزیز کو لاؤ۔ کسان اب قدرے آسودہ تھا۔ یوسف کو دیکھتے ہی چلایا۔ ہاں ہاں پروردگار یوسف ایسی یوسف ہے۔ الٰہی! انصاف!

یوسف نے کسان کی طرف دیکھا اور سر جھکا کر بولا۔ پروردگار حکومت کا خوف ان مظالم کا باعث ہوا۔ کسان اور یوسف چلے گئے۔

(۳)

بادشاہ مقدس فرشتوں کے حلقے میں کھڑا تھا۔ چہرے پر رعب و جلال نظر چاروں طرف منتشر۔ نامۂ اعمال پیش ہوا۔ قانون اور انصاف، نیکی، بہادری، موت کاتب اعمال خاموش ہوگیا۔

یوسف آیا۔ اور چلایا پروردگار۔ اس کا خوف میرے مظالم کا باعث تھا۔ اس کی حکومت کا خزانہ بھرنے کے لئے زیردستوں پر ظلم کئے۔

ایک قہقہہ ———! آواز آئی۔ نہیں! بادشاہ کا نامۂ اعمال بالکل صاف ہے۔

یوسف۔ عالم الغیب! بادشاہ خود روپیہ وصول نہیں کرتا۔ حاکم اور افسر ظلم ڈھاتے ہیں۔

یوسف چلا گیا۔ بادشاہ کو مقدس فرشتے ایک نامعلوم جگہ پر لے گئے۔

(۴)

اہلکار دربار خداوندی میں سرنگوں حاضر تھے۔ نامۂ اعمال پیش ہو رہے۔ کاتبِ اعمال وفاداری۔ انصاف پسندی۔ ضبط و انتظام کے ساتھ خودغرضی۔ بے جا سختی۔ رشوت اور حق تلفی کے واقعات بھی پڑھ رہا تھا۔

دلاور اہلکار کو آگے لاؤ ———! آواز آئی! اور ساتھ ہی

یوسف حاضر ہو گیا۔

دلاور! پروردگار وفاداری۔ انصاف پسندی ضبط و انتظام یہ تو میرے فرائض میں داخل تھے۔ باقی الزامات کی نسبت میرا ایک عذر ہے۔ صرف ایک عذر!

ہاں! ہاں!! کہے جاؤ۔

میرا ایک رشتہ دار عزیز جو غربت و افلاس کی زندگی بسر کر رہا تھا ایک روز قدیر زمیندار کے کھیت میں چوری کرتا ہوا پکڑا گیا۔ وہ میرے پاس آیا۔ میں نے مقدمہ اپنے ہاتھ میں لیا اور پروردگار اس کو بچانے کے لئے اور اس جرم کی تلافی کے لئے جو کچھ کیا وہ میرے نامۂ اعمال میں لکھا گیا۔ میں اپنے تعلقات سے مجبور تھا۔

ایک ہلکے سے قہقہے کے ساتھ آواز آئی۔ بلاؤ عزیز کو۔ عزیز حاضر تھا ———!

ناظرین ——— آپ ہی بتائیں کہ خدا کیا فیصلہ کرتا ———؟

وقار (انبالوی)

سیرِ کوہسار

یہ ترا کیف آفریں جوشِ فراواں اے بہار! — یہ ہجومِ سبزہ و گُل، یہ ہوائے فرح بار

یہ تری رعنائیاں کہسار کے آغوش میں — اب دِلِ شوریدہ کا مشکل ہے رہنا ہوش میں

ہر طرف حدِّ نظر تک اِک صفِ کہسار ہے — دور، اونچی چوٹیوں پر برف کا انبار ہے

کوہ پر شبنم کا ہر قطرہ دُرِ نایاب ہے — اور دُرِ نایاب میں محفوظ اِک مہتاب ہے

جھومتی ہیں ایک مستانہ ادا سے ڈالیاں — جھولتی ہیں یا اُمنگوں میں بھری متوالیاں

ہر شگوفے کی چٹک اِک نغمۂ ہنگامہ ساز — شاخِ گُل پر بلبلِ شوریدہ مصروفِ نیاز

نالۂ جانسوزِ بلبل کا وہ آنا جوش میں — درد بن کر پھر سما جانا دلِ مدہوش میں

کلکِ نقاشِ ازل کے نقش یعنی تتلیاں — چوستی پھرتی ہیں رس پھولوں کا ہو کر شادماں

یا مگر کچھ شوخ پریاں تتلیوں کے بھیس میں — آ گئی ہیں سیر کرنے آدمی کے دیس میں

یہ عروسانِ بہاری، یہ نقوشِ جاں نواز — یہ نشاط آور سماں، یہ عالمِ کیف و گداز

(غیر مطبوعہ)

نجمہ (انصاری دہلوی)

بھوک پیاس کا فلسفہ

"بھوک" کا احساس تمام حیوانات کی ایک عام، نمایاں، اور مشترک خصوصیت ہے۔ جب تک آدمی زندہ رہتا ہے یہ احساس اس کے اکثر کاموں پر اثر ڈالتا رہتا ہے۔ علماء کی رائیں اس امر میں مختلف ہیں کہ "کیا دوسرے حیوانات بھی اسی طرح بھوک محسوس کرتے ہیں جس طرح انسان محسوس کرتا ہے؟" لیکن اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ جو تاثرات زندگی پر تسلط ہوتے ہیں ان میں بھوک سب سے زیادہ اہم ہے اور اس سے کوئی مستثنیٰ نہیں ہے۔

اس شعور کی عمومیت کے باوجود ہمارا علم اب تک اس کی واقعی حقیقت دریافت کرنے سے قاصر رہا ہے۔ اس کی جزوی تفصیلات بیان کرنا آسان نہیں ہے۔ جب ہم کہیں کہ پیٹ خالی ہونے کے احساس کا نام "بھوک" ہے تو دراصل ہم اپنے احساسات کی حقیقت بیان نہیں کرتے بلکہ اپنے اس علم کا اظہار کرتے ہیں کہ بھوک معلوم ہونے کے وقت معدہ غذا سے خالی ہوتا ہے۔

بھوک کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اگرچہ معدہ مسلسل عرصہ تک خالی رہے لیکن بھوک معینہ وقفوں کے بعد اپنے اوقات پر "دورے" کی طرح معلوم ہوتی رہتی ہے۔ اکثر بھوک کے ساتھ کمزوری، سستی، دردِ سر، تشنج، متلی، اور بیہوشی کا بھی حملہ ہوتا ہے۔ لیکن تندرست آدمی اور وہ شخص جس کے قوائے عصبی مضبوط ہوتے ہیں۔ بھوک معلوم ہونے کے وقت ان عوارض سے محفوظ رہتا ہے۔

ہمیں جب بھوک لگتی ہے تو ہم غذا مانگتے ہیں کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ کھانا بھوک کی تکلیف سے نجات دیتا ہے۔ لیکن یہ ہمیں کیونکر معلوم ہوا؟ نوزائیدہ بچہ بھوک کے [illegible] وقت کھانے کی [illegible] سے ناواقف ہوتا ہے کیونکہ غذا ہنوز اس کے معدے میں داخل نہیں ہوئی ہے۔ پس اس حالت میں غذا طلب کرنے پر اسے کونسی چیز ابھارتی ہے؟ اسے موروثی احساس ابھارتا ہے! یا فطرت کا وہ جذبہ ابھارتا ہے جو اس میں ولادت کے وقت موجود ہوتا ہے۔ اور جس کے ذریعہ سے اُسے معلوم ہوجاتا ہے کہ کھانا اس تکلیف وہ احساس کو سکون و راحت میں تبدیل کر دیگا!

اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ بھوک لگنے کا سبب پوری صحت کے ساتھ دریافت نہیں ہو سکا، لیکن اس کے متعلق ایک مشہور نظریہ ہے جسے نظریہ محیطی (peripheral) کہتے ہیں۔ اس کا ماحصل یہ ہے کہ بھوک کا سبب ایک خاص احساس ہے جو اعصاب جسمیہ کے اطراف خصوصاً معدے کے بالائی حصوں اور چھوٹی آنتوں کے نچلے حصوں میں محسوس ہوتا ہے۔ مگر بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بھوک کا احساس "دماغ میں بھوک کے مرکز" سے شروع ہوتا ہے۔ جسے خون اور عروق دماغیہ میں غذا کی قلت متحرک کر دیتی ہے۔ تجربہ سے ثابت ہوا کہ غالباً معدے کے پورے طور پر طعام سے خالی ہونے سے کچھ دیر پہلے اور خون اور عروق دماغیہ میں غذا کی کمی سے بہت دیر پہلے بھوک لگنا شروع ہوجاتی ہے۔ اسی طرح تجربہ بتاتا ہے کہ بھوک کی تکلیف کے ساتھ اسی حالت میں ایک قسم کی شدید اینٹھن پیدا ہوجاتی ہے جو اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب سے معدہ غذا سے خالی ہونے لگتا ہے اور اس وقت تک مسلسل اس کے دورے پڑتے رہتے ہیں جب معدے میں کچھ داخل ہوجائے یا کسی غیر معمولی طریقہ سے اس کا تدارک ہوجائے مثلاً کوئی قوی جذبہ طاری ہو جائے یا کوئی دوا اپنی تاثیر سے معدے کی حالت تبدیل کر دے۔ اس اینٹھن کو "بھوک کی اینٹھن" کہتے ہیں۔

اینٹھن کا دورہ ایک معمولی انسان پر ہر آدھ گھنٹہ یا پون گھنٹہ بعد نصف منٹ کے لئے پڑتا رہتا ہے۔ معدے میں حس و حرکت کے کئی اعصاب ہوتے ہیں جن کی شاخیں مرکزی نظام عصبی سے پھوٹتی ہیں۔ مرکزی نظام کے ساتھ عصبی اتصال کے بالکل انقطاع پر بھی یہ اینٹھن باقی رہتی ہے اور آدمی ہر حالت میں بھوک کا احساس کرتا رہتا ہے۔ بھوک کی اینٹھن کے دورے نیند کی حالت میں بیداری کی بہ نسبت زیادہ شدت اور تسلسل کے ساتھ پڑتے ہیں۔ شدید جذبات مثلاً خوف، غصہ، یا خوشی سے یہ دورے رک جاتے ہیں۔ حالاتِ عقلیہ مثلاً مطالعہ اور غور و فکر بھوک کے

دوروں کی مدت میں کوئی خاص فرق پیدا نہیں کرتے۔ اسی طرح ـــــ عام اعتقاد کے خلاف ـــــ کھانے کا دیکھنا اور اس کی خوشبو سونگھنا بھی ان پر اثر نہیں ڈالتا بلکہ اگر ان امور کا کوئی اثر ہوتا بھی ہے تو برعکس!!!

امتحان سے معلوم ہوا کہ خون کے عناصر کیمیائی میں سے جو عنصر بھوک کے احساس اور بھوک کی اینٹھن پر اثر ڈالتا ہے وہ "شکر" ہے جب خون میں شکر کی مقدار بہت کم ہو جاتی ہے تو بھوک زیادہ معلوم ہونے لگتی ہے اسی طرح بالعکس۔ غالباً اس تشریح کے بعد شکر اور دوسری میٹھی چیزوں سے فوراً بھوک کم ہو جانے کا سبب معلوم ہونا مشکل نہ ہوگا۔ کیونکہ شکر فوراً خون میں شامل ہو جاتی ہے۔

ذیابطیس وغیرہ امراض میں بھوک کی شدت ہوتی ہے اور بخاروں اور اکثر ہیجانات میں، جو نظام عصبی پر اثر ڈالتے ہیں، بھوک اڑ جاتی ہے۔ مقویات کے استعمال سے اصولاً بھوک میں کوئی نمایاں تغیر بلاواسطہ پیدا نہیں ہوتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "اشتہا" غذا کے متعلق ہمارے گزشتہ تجربات کی یاد کا نام ہے اور وہ ایک ایسا احساس ہے جو صاحب احساس کو ایک لذت یاد دلا دیتا ہے۔

جب انسان طویل روزہ رکھے تو وہ معدے کی اینٹھن سے پیدا ہونے والی بھوک کی تکلیف کو محسوس کرتا رہیگا۔ اس اینٹھن کا دورہ فاقہ کی وجہ سے مرنے والوں پر زندگی کے آخری لمحوں تک پڑتا ہے۔ اس لئے یہ قول کہ "چند دن کے روزے کے بعد بھوک باقی نہیں رہتی" صحت سے خالی ہے اور واقعات اس کی تردید کرتے ہیں۔

"بھوک" کے متعلق یہ ایک اجمالی بیان تھا اور اب ہم **"پیاس"** کی نسبت چند الفاظ کہنا چاہتے ہیں:۔

انسان کے جسم میں ۷۰ فیصدی پانی ہے اور وہ کھانے کے بہ نسبت پانی کا زیادہ شدت سے محتاج ہے۔ نہ صرف تندرستی کے قیام اور حصول آسائش کے لئے بلکہ زندگی قائم کرنے کے لئے!۔ ایک اوسط درجہ کا تندرست آدمی بغیر کچھ کھائے ۶۰ دن تک زندہ رہ سکتا ہے۔ اس مدت کے دوران میں اس کی قوت طبیعی تو آہستہ آہستہ گھٹتی رہیگی مگر حالت اس حد تک نازک نہیں ہو گی جس سے کسی خطرہ کا احتمال ہو۔ لیکن اگر پانی نہ دیا جائے تو دو یا تین دن کے بعد حالت غیر ہو جائیگی، پھر حرارت کا درجہ بلند ہوتا جائیگا۔ اور غالباً آٹھویں دن سے بارہویں دن تک مر جانا لازمی ہے۔

پیاس کے عوارض اپنے ظہور اور کیفیت کی شدت میں ہوا کے درجۂ حرارت اور درجۂ رطوبت پر موقوف ہیں۔ کیونکہ انسان کے جسم سے بہت سا پانی جلد کے راستے سے پسینہ بن کر اور سانس کے راستہ سے بخارات بن ضائع ہوتا رہتا ہے۔ اسی بنا پر اگر ہم دیکھتے ہیں کہ انسان و حیوان ثقیل اور خشک غذا سے بچکر زیادہ مدت تک بغیر پانی کے زندہ رہ سکتے ہیں تو یہ کوئی تعجب کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کیونکہ گردے ..... خشک غذاؤں کے فضلات خارج کرنے میں زیادہ پانی کے محتاج ہوتے ہیں۔

پیاس کا سب سے پہلا اور سب سے زیادہ نمایاں اثر یہ ہوتا ہے کہ منہ اور حلق میں خشکی اور جلن محسوس ہونے لگتی ہے۔ پیاس کی زیادتی کے ساتھ تمام جسم میں بےچینی اور گھبراہٹ بڑھ جاتی ہے جس کی وجہ سے غیر معمولی ہیجان اور اضطراب سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ پیاس بجھانے کے لئے پانی پی لینے کے علاوہ عمل کے ذریعہ سے معدہ یا موٹی آنت میں، یا انجکشن کے ذریعہ سے براہ راست خون میں پانی پہنچایا جاسکتا ہے۔ حلق اور منہ میں پیاس کے احساس کو منہ اور ہونٹوں کے پانی سے تر کر لینے سے وقتی طور پر خفیف کیا جا سکتا ہے۔

پیاس کی اصلیت اور اس کے اسباب کے متعلق علماء کے تین نظریے ہیں۔ یہ سب اس امر میں متفق ہیں۔ کہ جب زیادہ مدت تک جسم میں نیا پانی نہ پہنچے تو خون میں خشکی یا گاڑھاپن پیدا ہو جاتا ہے۔ اور جب وہ کثیف ہو جاتا ہے تو اس کی خاصیتیں تبدیل ہو کر اس میں زیادہ "شوریت" پیدا ہو جاتی ہے۔ اس وقت وہ "خلایائے حسیہ" سے پانی کھینچنا چاہتا ہے جسکی وجہ سے ان کے خواص متغیر ہو کر ساتھ ساتھ تمام جسم کے نظام ترکیبی میں خلل پڑ جاتا ہے۔ یہ تغیرات لعاب دہن پسینہ، پیشاب، رطوبت معدہ، اور آنسوؤں کی کمی بن کر نمودار ہوتے ہیں۔ یہ گویا جسم کا ایک مطالبہ ہوتا ہے جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ احتیاط کے ساتھ "مائیت" کی حفاظت کی جائے۔

جن نظریات کا تذکرہ کیا جا چکا ہے ان میں **پہلا نظریہ** یہ ہے کہ لعاب دہن کی کمی سے خشکی پیدا ہو جاتی ہے جو منہ اور حلق میں اعصاب حسیہ کے اطراف کو ہیجان میں لے آتی ہے اور یہی پیاس کا سبب ہے۔ **دوسرا نظریہ** یہ ہے کہ خون کا گاڑھاپن دماغ کے ایک مرکز کو متہیج کر دیتا ہے۔ اور اس کے ساتھ بہت سے اعصاب حسیہ میں بھی ہیجان پیدا ہو جاتا ہے۔ اس مذہب کے معتقدین منہ اور حلق میں خصوصیت سے پیاس کے شدید احساس کا سبب بیان نہیں کر سکتے۔

تیسرا نظریہ یہ ہے کہ پیاس اعضائے ہضمیہ میں ایک تشنج کی وجہ سے معلوم ہوتی ہے۔ جو خون کے گاڑھے پن سے پیدا ہوتا ہے۔

یہ سب بجا ہے لیکن ظاہر ہے کہ درحقیقت صرف پہلا نظریہ توجیع اور قبول کا مستحق ہے۔ کیونکہ جو دوائیں تھوک کو خشک کر دیتی ہیں مثلاً اتروبین، وہ پیاس بھی پیدا کرتی ہیں حالانکہ ان سے خون میں گاڑھاپن پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ اس کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ اتروبین کھانے یا طویل تقریر کرنے کے بعد منہ میں جو عارضی خشکی پیدا ہو جاتی ہے وہ حقیقی پیاس نہیں ہوتی۔ نیز نمکین غذا کھانے کے بعد جو صحیح خواہش پیاس کی پیدا ہوتی ہے وہ لعاب دہن کم ہونے اور منہ اور حلق خشک ہونے سے بہت پہلے محسوس ہونے لگتی ہے۔

خیال غالب یہ ہے کہ پیاس کی شدت کے بعد حرارت کی زیادتی کا یہ سبب ہے کہ پسینہ نکلنا بند ہو جاتا ہے اور پسینہ کے افعال طبعی میں بالاتفاق حرارت جسمی کے تخفیف بھی شامل ہے۔ لیکن خون کا گاڑھاپن نظام عصبی اور دماغ کے خانوں میں ایک حد تک ہیجان کو زیادہ کر دیتا ہے۔ حرارت جسم کا اعتدال قائم رکھنے کے لئے دماغ میں ایک مخصوص خانہ ہے جسے "ثلاموس" کہتے ہیں اس لئے خون کا گاڑھاپن لازمی طور پر براہ راست اس میں اثر کر کے ہیجان پیدا کر دیتا ہے۔

جو حالات جسم کی" مائیت کے اتلاف میں زیادتی کا باعث ہوتے ہیں۔ وہ پیاس کو بھی زیادہ کر دیتے ہیں۔ خواہ یہ اتلاف پسینہ کے غدود کے راستہ سے ہو، خواہ معدہ کے راستہ سے مثلاً قے اور دست، خواہ گردوں کے راستہ سے مثلاً ذیابطیس!

(ترجمہ) **منظور سروش** (بھوپالی)

اشعار

(۱)

محبّت، عشق، یہ سب منزلیں ہیں راہِ عرفاں کی
جسے سمجھے ہو دردِ دل حلاوت ہے وہ ایماں کی
کتاب عشق کا باب محبّت جب سے کھولا ہے
کتاب عقل زینت بن گئی ہے طاق نسیاں کی

(غیر مطبوعہ) تپاں

(۲)

ہوشیاری ہے فریبِ عاشقی کھانے کا نام
عاشقی ہے بند آنکھیں کر کے لُٹ جانے کا نام
قیس اور فرہاد نے تعظیم کا سجدہ کیا
بزمِ وحشت میں جو آیا تیرے دیوانے کا نام
سرفروشی عاشقی میں کامیابی کا ہے راز
شمع کل روتی رہی سُن سُن کے پروانے کا نام
خام کارِ عشق ہیں دلدادۂ شہرت ریاضؔ
عاشقی ہے بندہ پرور گھُٹ کے مر جانے کا نام

غیر مطبوعہ ریاضؔ

انقلاب

کمپنی باغ میں آج شاندار دعوت تھی۔ میں کپڑے پہن کر بالکل تیار باہر نکلا ہی تھا کہ دروازہ کے پاس ایک آدمی کو کھڑے پایا۔ کمزور۔ ضعیف و ناتواں آنکھوں میں حلقے پڑے ہوئے۔ کپڑوں اور چہرہ سے صاف غربت کا اظہار ہو رہا تھا۔ میں بچکر نکلنا ہی چاہتا تھا کہ اس نے میرے سامنے آکر نہایت لجاجت سے کہنا شروع کیا۔

"حضور کئی دن ہوئے قسم لے لیجئے جو کچھ بھی کھایا ہو۔ ایک دانہ بھی نہیں۔ سڑک پر رات بسر ہوتی ہے۔ سردی میں مرا جاتا ہوں مدرسہ میں پڑھتا تھا۔ لوگوں نے نہ جانے کیوں جھوٹی جھوٹی شکایتیں کر کے مدرسہ سے نکلوا دیا۔ کچھ دے دیجئے۔ عنایت ہوگی"۔

میں نے اس کے لباس اور چہرے کو غور سے دیکھنا شروع کیا۔ اس کو سر سے لیکر پاؤں تک دیکھا مجھے یقین ہوگیا۔ میں نے اسکو کہیں ضرور دیکھا ہے۔ اس دوران میں وہ برابر کہتا رہا:۔

"مجھے مانگتے ہوئے شرم آتی ہے لیکن مجبوری ہے کہیں نوکری بھی تو نہیں ملتی۔ بس کچھ دلوا دیجئے۔ پھر کبھی نہ مانگونگا"۔

میں نے اس کو اچھی طرح سے دیکھا۔ آخر مجھے یاد آگیا اور بول اٹھا۔

"تم بڑے مکار ہو جی۔ مجھے بھی دھوکہ دیتے ہو۔ ابھی ایک ہفتہ ہوا تم نے مجھ سے کچھ مانگا تھا اور کہا تھا میں اجنبی ہوں۔ وطن تک کا کرایہ چاہیئے۔ جھوٹے بدمعاش"۔

"نہیں حضور، نہیں ...... میں طالبعلم ہی ہوں، آپ مدرسہ سے دریافت کر سکتے ہیں۔ سرکار جھوٹ بولنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اگرچہ مصیبت میں ہوں لیکن دھوکہ نہیں دینا چاہتا"۔

"فضول باتیں مت بناؤ۔ بکواس مت کرو۔ بدمعاش کہیں کے۔ کبھی اجنبی بنتے ہو۔ کبھی طالبعلم۔ کچھ کام نہیں کرتے اور اس طرح لوگوں کو لوٹتے ہو۔ بس ہٹو"۔

لیکن اس نے رونا شروع کیا "نہیں سرکار، خداوند۔ میں جھوٹ نہیں بولتا۔ آپ تحقیق کر سکتے ہیں"۔

"جی ہاں اب میں تجھ سے پاجی کے لئے تحقیق کرتا پھروں۔ میرے پاس فالتو وقت نہیں ہے۔ اگر تم جاؤگے نہیں تو پولیس کے حوالہ کر دونگا۔ سمجھ گئے"۔

میں اُسے دھکا دیکر آگے بڑھا۔ مجھے اس سے نفرت سی ہوگئی تھی۔ کتنا جھوٹا ہے۔ کذاب۔ لیکن اُس نے بھاگ کر میرا دامن پکڑ لیا۔ اور ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"حضور معاف فرمائیے۔ میں واقعی جھوٹ بولتا تھا۔ نہ ہی طالبعلم ہوں نہ اجنبی، ایک سوداگر کے ہاں نوکر تھا۔ شراب پینے کی بری لت پڑگئی۔ اُس نے مجھے نکال دیا۔ دربدر دھکے کھاتا پھرتا ہوں جھوٹ نہ بولوں تو کھاؤں کہاں سے"۔

"ہاں اب تم صحیح راستہ پر آئے۔ کچھ کام کرو کام۔ دنیا میں ہزاروں قسم کے کام ہیں"۔

"ٹھیک ہے صاحب بالکل ٹھیک، لیکن کیا کام کروں، کہاں، کوئی کام نہیں ملتا"۔

"جھوٹ۔ جھوٹ کی تو تم کو عادت پڑگئی ہے۔ ہزاروں کام ہیں، ہزاروں، سنتے ہو۔ مزدوری کرو۔ بوجھ اٹھاؤ۔ کسی کارخانہ میں نوکری کر لو"۔

"حضور مجھے کوئی کام نہیں دیتا۔ کوئی نہیں۔ جہاں جاتا ہوں لوگ منہ پھیر لیتے ہیں۔ کوئی دستکاری بھی تو نہیں آتی۔ آہ مر جاؤں تو اچھا"۔

"اوہو۔ خوئے بدرا بہانۂ بسیار۔ سمجھتے ہو اس کا مطلب۔ تمہارے جیسے آدمی کے لئے ہزاروں بہانے ہو سکتے ہیں۔ اچھا برتن صاف کرنے کا کام کسقدر آسان اور سہل ہے"۔

"جی ہاں سہل اور آسان تو ہے۔ لیکن کوئی کام بھی ملے۔ سیٹھ ڈپٹی صاحب کے ہاں گیا کسی کو ضرورت نہیں ہے"۔

"اچھا ضرورت ہو یا نہ ہو۔ اگر تم کو یہ کام دے دیا جائے تو کر لوگے"۔

"کرنے کی ایک ہی کہی۔ دل و جان سے کرونگا"۔

میں نے گھر کی خادمہ عباسی کو آواز دی۔ دیکھو عباسی میں نے کہا۔ ان کو باورچی خانہ میں لے جاؤ۔ جتنے برتن ہیں یہ صاف کرینگے۔

فقیر جھجکتا جھجکتا عباسی کے پیچھے ہو لیا۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ اسے

کام کی رغبت نہیں ہے وہ صرف اسوجہ سے رضامند ہوگیا تھا کہ کہیں پھر اس کو ڈانٹ نہ بتائی جائے   اُسے نہ کام کا شوق تھا نہ مرنے کا ڈر۔ درحقیقت اس پر شراب کا اسقدر اثر تھا کہ اس کے تمام اعصاب کمزور ہو چکے تھے۔

میں نے دعوت میں جانا ملتوی کردیا اور دوسری منزل کے ایک کمرہ میں چلا گیا تاکہ کچھ دیر کے لئے تمام کیفیت دیکھ سکوں۔

عباسی اسے باورچی خانہ کی طرف لے گئی لیکن وہ اس پر عجیب نظریں ڈال رہی تھی۔ سخت نفرت کی نگاہوں سے اُسے دیکھتی تھی اور اس کے پاس تک نہ جاتی تھی۔ وہ باورچی خانہ کا دروازہ کھولکر برتن نکالنے اندر چلی گئی۔

فقیر زمین پر بیٹھ گیا اور کچھ سوچنے لگا۔ عباسی نے برتن لاکر زور سے زمین پر پٹک دئے۔ فقیر برتنوں کو صاف کرنے لگا لیکن اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

میرا غصہ اب فرو ہو چکا تھا میں نے سوچا اس کڑا کے کی سردی میں اور اسقدر ظلم۔ لیکن پھر میں نے خیال کیا یہ اُسی کے فائدے کے لئے ہے۔

کوئی ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد عباسی نے آکر کہا کہ برتن صاف ہوگئے۔ میں نے ایک روپیہ عباسی کی طرف پھینک کر کہا یہ اُسے دیدو اور کہو دوسرے تیسرے دن آجایا کرو۔

اب فقیر دوسرے تیسرے دن آجاتا۔ کبھی برتن صاف کرتا۔ کبھی لکڑیاں چیرتا کبھی فرش وغیرہ صاف کرتا۔ اس کے معاوضہ میں کبھی اسے پیسے مل جاتے، کبھی کھانا اور کبھی کپڑے۔

چند ماہ کے بعد دو سال کے لئے مجھے لکھنؤ جانا پڑا۔ اسٹیشن تک اسباب وہی فقیر اٹھا کر لے گیا۔ جب گاڑی میں اسباب رکھا جا چکا تو میں نے اس سے پوچھا تمہارا نام کیا ہے۔

"حضور اس بدقسمت کا نام قمرو ہے"۔

"اچھا قمرو میں دیکھتا ہوں اب تم شراب نہیں پیتے اور میرے الفاظ کا تم پر کافی اثر ہوا ہے۔ اب تم کام سے جی نہیں چراتے۔ تمہیں معلوم ہے میں بمبئی جارہا ہوں۔ اس لئے تمہارے لئے کوئی اور کام تجویز کرنا ہوگا۔ کیا تم لکھنا جانتے ہو؟"

"جی ہاں"۔

"اچھا یہ لو خط۔ ڈپٹی صاحب کے ہاں بلی ماراں چلے جاؤ جو تمہیں کام بتائیں محنت سے کرنا"۔

جب گاڑی روانہ ہوئی تو مجھے فخر تھا کہ میں نے ایک حیوان کو انسان بنا دیا ہے۔

دو سال کے بعد میں دہلی واپس لوٹا۔ اس روز الفنسٹن سینما میں ایک زبردست کھیل تھا۔ کھیل شروع ہونے میں کچھ دیر تھی میں ٹہلنے لگا۔ یکایک آخری دروازہ کے پاس ایک آدمی کو کھڑے دیکھا۔ اوہو یہ تو قمرو ہے۔ میں اس کے پاس گیا اور کہا "کہو قمرو اچھے تو ہو"۔

"اچھا ہوں۔ اللہ کا شکر ہے۔ ڈپٹی صاحب آجکل تیس روپے تنخواہ دیتے ہیں"۔

"مجھے بڑی خوشی ہے" میں نے فخریہ کہا "میں نے ہی تمہیں انسان بنایا۔ کہو یاد ہے نہ؟"

"جی ہاں اچھی طرح یاد ہے۔ اگر آپ اسوقت میری مدد نہ کرتے تو اس وقت بھی اپنے آپ کو اجنبی یا طالبعلم ہی بتاتا۔ لیکن گستاخی معاف آپ سے زیادہ مدد آپ کی خادمہ عباسی نے کی۔ اس نے مجھے نجات دلائی"

مجھے بہت غصہ آیا لیکن میں نے تحمل سے پوچھا۔ "عباسی نے۔ وہ کس طرح"؟

"جناب اس طرح جب میں آپ کے ہاں کام کرنے آتا تو وہ کہتی شرابی۔ بدقسمت، مرگیا ہوتا۔ بدنصیب۔ پھر مجھے سمجھاتی۔ تم مسلمان ہو، شراب پیتے ہو۔ خدا کے قہر سے ڈرو۔ اس کے بعد وہ میرے سامنے آبیٹھتی اور خوب روتی اور کہتی۔ او بدنصیب، آخرت میں بھی تو جہنم میں جائیگا اور اس دنیا میں بھی تیرا ٹھکانا جہنم ہی ہے۔ گنہگار۔ کمینے انسان۔ بس صاحب اس نے میری وجہ سے تکالیف اٹھائیں میری ہمدردی میں بیچے آنسو بہائے اور ان سب سے بڑھکر وہ میری جگہ سب کام کرتی۔ سب کام اسی نے کیا۔ میں نے کبھی کسی کام کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ سب کام وہی کرتی۔ اسی کے اثر سے میں نے شراب سے توبہ کرلی۔ اس کے شریفانہ اور ہمدردانہ برتاؤ سے مجھ میں ایک انقلاب ہوگیا۔ عظیم الشان انقلاب۔ اسی نے میری اصلاح کی۔ مجھے آگ سے نکالا........"

وہ کچھ اور ہی کہنے والا تھا کہ گھنٹی کی آواز آئی میں یہ کہتا ہوا وہاں سے روانہ ہوا "اچھا اب تو کھیل شروع ہونے والا ہے۔ پھر کبھی سہی۔"

سید نصیر احمد

قومی ملّاحوں کا گیت

(از قلم جناب فاخرؔ ہریانوی بی۔ اے)

فرشتے اپنے نورانی پروں کو پھڑپھڑاتے ہیں　　فضا کی وسعتوں میں زرد قندیلیں جلاتے ہیں
مناظر شام کی ظلمت میں غائب ہوتے جاتے ہیں　　پہنچ جائیں گے ہم بھی رات سے پہلے کنارے پر
لئے جاتے ہیں اپنی ناؤ کو موجوں کے دھارے پر

شعاعیں اپنے عکس آتشیں پر مسکراتی ہیں　　سفید آئینے میں عُریاں بدن کرنیں نہاتی ہیں
کہ پریاں چادر آبِ رواں پر گل کھلاتی ہیں　　چڑھایا ہے کسی صناع نے سونے کو پارے پر
لئے جاتے ہیں اپنی ناؤ کو موجوں کے دھارے پر

افق کی خوشنما گہرائیوں میں آفتاب اُترا　　حسیں شہزادہ قصرِ نور میں با آب و تاب اُترا
شفق کے چہرۂ گلفام سے رنگیں نقاب اُترا　　نگاہیں پڑ رہی ہیں شام کے روشن ستارے پر
لئے جاتے ہیں اپنی ناؤ کو موجوں کے دھارے پر

یونہی بچتے ہوئے رستے کی پوشیدہ چٹانوں سے　　سفر طے کر رہے ہیں چپوؤں سے بادبانوں سے
مٹاتے ہیں سفر کی ماندگی قومی ترانوں سے　　کئے جاتے ہیں ہمت ناخداؤں کے سہارے پر
لئے جاتے ہیں اپنی ناؤ کو موجوں کے دھارے پر

فاخرؔ

(غیر مطبوعہ)

مبارزت[۱]

(شہرہ آفاق فرانسیسی افسانہ نگار موپسان کا ایک دلچسپ افسانہ)

سوسائٹی میں وہ "حسین نواب زادہ" کہلاتا تھا۔ مگر اس کا اصلی نام "نواب گوتران جوزف و سے سوکز" تھا۔ اس کے ماں باپ انتقال کر چکے تھے اور چونکہ کافی دولتمند تھا اور مرضی کا مختار اس وجہ سے متوقع طور پر فضول خرچ اور عیاش تھا۔

وہ بھڑکیلا لباس زیب تن کرتا تھا۔ اس کی گفتگو لچھے دار اور عامیانہ ہوتی تھی۔ جس میں غرور و تمرد کے علاوہ اپنی نوابی کی شان کا بیجا اظہار ہوتا تھا۔

اس کی محبت کے واقعات گو بہت تو نہ تھے مگر جو بھی تھے عام طور پر کافی مشہور تھے۔ اس وقت اس کی بیوی خوش و خرم تھی اور اطمینان و چین کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ وہ خوش خور و خوش پوش تھا۔ چین کی نیند سوتا تھا۔ غرض اس کی تمام زندگی انتہائی آرام و آسائش کا نمونہ تھی۔ اسے کبھی تلخ تجربات سے واسطہ نہ پڑا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ زندگی کی کشمکش کا مقابلہ کرنے سے بکسر عاری تھا۔

وہ تیغ زنی کی حیثیت سے بھی کافی مشہور ہو چکا تھا۔ اس کے متعلق مشہور تھا کہ اس کا نشانہ پورا پڑتا ہے۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا "جب مجھے کسی کے ساتھ مبارزت کا موقعہ پیش آئیگا تو میں پستول کا انتخاب کرونگا۔ کیونکہ اس قسم کے ہتھیار سے میں اپنے مقابل کو مار سکونگا۔"

ایک شام وہ اپنے دوستوں کے ہمراہ تھیئیٹر سے واپس آ رہا تھا کہ اس نے انہیں "تورتن رستوراں" میں کچھ ملائی کی برف کھانے کی دعوت دی اور انہیں اندر لے گیا۔

انہیں رستوراں میں بیٹھے ہوئے ابھی چند منٹ سے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ نواب نے محسوس کیا کہ ایک شخص اس کی پارٹی کی ایک عورت کی طرف بہت دیر سے حریفانہ نظروں سے مسلسل دیکھ رہا تھا۔

عورت اس نظر بازی سے گھبرا کر نظریں نیچی کر کر لیتی تھی۔ بالآخر اس نے اپنے خاوند سے کہا "وہاں ایک شخص بیٹھا ہوا ہے جو میری طرف ٹکٹکی باندھے ہوئے گھورے جا رہا ہے۔ میں تو اس سے واقف نہیں ہوں، کیا تم اسے جانتے ہو؟"

خاوند جس نے اس وقت تک اس شخص کی طرف نظر نہ ڈالی تھی اس طرف دیکھ کر کہنے لگا: "میں اس سے مطلقاً واقف نہیں۔"

اس کی بیوی اس پر کسی قدر مسکرا کر اور کسی قدر ترشرو ہو کر بولی۔

"افسوس ہے کہ کوئی لمحہ بھی ایسا نہیں مل سکتا کہ لوگ آرام سے تفریح کر سکیں۔ ایسے ایسے بدمعاش ——"

خاوند نے اپنے کندھے ہلا کر کہا "اگر ایک شخص ایسی ایسی باتوں کے انسداد کی فکر میں جائے تو ضرور دیوانہ ہو جائے اگر دنیا میں ایسے بداخلاق لوگ ہیں تو ان کا کیا کیا جائے۔"

نواب کو یہ گفتگو سنکر تاب نہ رہی اکڑ کر کرسی پر سے اٹھا۔ کیونکہ وہ اس بات کو ہرگز روا نہیں رکھ سکتا تھا۔ کہ ایک عورت کی جو اس کی مدعو اور دوست ہو اس کی اس طرح ایک عام مقام پر توہین ہو۔ اور وہ چپکا بیٹھا دیکھا کرے۔

چونکہ اس عورت کو اس نے اس رستوراں میں مدعو کیا تھا اس وجہ سے اس کا فرض تھا کہ اگر اس کی یہاں کوئی توہین کرے تو وہ اس کا بدلہ لے۔ چنانچہ وہ بپھر کر اٹھا اور اس بدطینت آدمی کے پاس پہنچا۔

"جناب! آپ ان خواتین کی طرف بہت نازیبا طریق سے گھور رہے ہیں۔ یہ شرافت نہیں۔ میں اس قسم کی حرکت ہرگز روا نہیں رکھ سکتا۔ آپ اپنی اس بدتہذیبی کی مجھ سے معافی چاہیئے۔"

اس شخص نے نہایت اطمینان سے جواب دیا "جاؤ جاؤ اپنا کام کرو۔ مجھے اپنے حال پر چھوڑ دو۔"

نواب نے لال پیلے ہو کر غصے کے مارے ہونٹوں کو چباتے ہوئے کہا "بس بس زبان کو لگام دو۔ ورنہ مجھے انتہائی سلوک کرنا پڑیگا۔"

آدمی نے اس کا جواب صرف ایک لفظ سے دیا ——— جو بہت ہی نازیبا اور شرمناک تھا اور جو کمرہ کے اس سرے سے لیکر اس سرے تک ہر شخص نے بخوبی سن لیا اور ہر شخص اس طرف متوجہ ہو گیا۔

جس جس کی پشت تھی اس نے پیچھے مڑ کر دیکھنا شروع کر دیا۔ اکثر نے اپنے سر اٹھا اٹھا کر دیکھا خدام یکایک ٹھٹھر کر اس طرح ڑے

[۱] ڈوئیل Duel

جیسے لٹو۔

کمرہ میں خاموشی تھی کہ دفعتاً فضا میں ایک تڑاق کی آواز گونجی۔
نواب نے اس شخص کے گلے پر چپت رسید کیا تھا۔

(۲)

ہر شخص اپنی اپنی کرسی پر اٹھ کھڑا ہوا اور فریقین کے درمیان بیچ بچاؤ کرا دیا گیا۔ اس واقعہ کے بعد جب نواب زادہ اپنے گھر واپس آیا تو کمرہ میں ٹہلنا شروع کیا اور پندرہ بیس منٹ تک آج کے واقعہ پر غور کرتا رہا۔ اُبلتی ہوئی کیتلی کے مانند وہ کسی صحیح نتیجہ پر پہنچنے یا ٹھنڈے دل سے غور کرنے کے بالکل ناقابل تھا۔ ہاں اس وقت صرف ایک خیال تھا جو اس کے دماغ پر مستولی تھا ——— یعنی اسے اس بدتہذیب شخص سے انتقام لینا تھا۔ اور اس کا ذریعہ مبارزت قرار پایا تھا۔

یہ خیال ابھی تک نیم پختہ تھا اور وہ مطمئن تھا کہ اس وقت تک اس نے کسی قسم کی زیادتی سے کام نہیں لیا تھا۔ ایک شریف النفس میزبان کی حیثیت سے اپنی مدعو خاتون کی توہین کا جواب دیا تھا اور اپنا وقار قائم رکھنے کی کوشش کی تھی۔

"کیا ہی وحشی آدمی تھا!"

یہ جملہ وہ بار بار دہراتا تھا۔

جب ٹہلتے ٹہلتے تھک گیا تو وہ بیٹھ گیا اور مبارزت کے متعلق غور کرنے لگا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد اسے اپنے دو دوستوں کے نام یاد آئے۔ جنہوں نے بہت سی دست بدست لڑائیوں میں اس کی معاونت کی تھی۔

پہلا شخص مارکوئیس دے، لا، تورنوائیر تھا جو ایک مشہور پہلوان تھا۔ دوسرا کولونیل بوردین ایک جری سپاہی تھا اور دونوں اس کے گہرے دوست تھے۔ اسے کامل امید تھی کہ اس مقابل سے لڑنے میں بھی وہ اسے مدد دیں گے۔

دماغی ہیجان اور مسلسل گشت کی وجہ سے اسے سخت پیاس محسوس ہوئی۔ اور اس نے پے درپے تین پانی کے گلاس چڑھائے مگر پھر بھی تسکین نہیں ہوئی۔ پانی پینے کے بعد اس کے دماغ میں یہ خیال چکر لگانے لگا:—

"میرا مدِمقابل مقابلہ کی تاب نہیں لاسکتا اور ضرور بہانے بنا کر جھگڑے سے بچ جائیگا۔"

اس نے جیب میں سے وہ وزیٹنگ کارڈ نکالا جو اس نے اس شخص سے چھین لیا تھا۔

میز پر پڑے ہوئے کارڈ پر یہ عبارت درج تھی۔

"جارج لامل، ۵۱۔ رو مونسی، پیرس"

نواب متعجب تھا کہ جارج لامل کون شخص تھا۔ اور آخر اس نے اس عورت کو کیوں گھورنا شروع کیا تھا۔ آخر کیا وجہ تھی کہ یہ معمولی سا واقعہ دو شخصوں کی زندگیوں میں ایک انقلاب عظیم پیدا کرنے کا باعث ثابت ہو ——— یکایک اس کی زندگی ایک اجنبی کی زندگی سے متصادم ہو جائے ....! اُسے تعجب ہوتا اگر یہ سنتا کہ جارج لامل بھی اس وقت اسی قسم کا خیال کر رہا تھا۔

نواب نے اپنے تئیں مخاطب کر کے کہا "خواہ کچھ ہو مجھے اس سے لڑنا پڑیگا۔ سوال صرف یہ رہجاتا ہے کہ لڑائی کے لئے پستول کا انتخاب کروں یا تلوار کا!"

تلوار سے لڑنا کوئی نئی بات نہ تھی پستول مبارزت میں بہت کم استعمال ہوتے تھے اس وجہ سے اس نے پستول کا انتخاب کیا کیونکہ اسے نشانہ کی بہت مشق تھی اور اس وجہ سے کامیابی کی زیادہ امید۔

اس نے دل میں ٹھان لیا کہ "مجھے مضبوط رہنا چاہیئے، خواہ کچھ ہی ہو! اگر میں نے سختی کا اظہار کیا تو مقابل کا بھاگ جانا کوئی بڑی بات نہیں۔"

(۳)

اپنی ہی کرخت آواز سے نواب چونک پڑا۔ خیالات منتشر ہو گئے اور اس نے ہکا بکا ہو کر اپنے اردگرد دیکھنا شروع کیا ——— وہم دور ہو گیا اور اس نے تشنگی سے مغلوب ہو کر ایک اور پانی کا گلاس پیا اور پھر پلنگ پر جا لیٹا۔ اسے نیند آ رہی تھی۔

کمرہ کی روشنی گل کر کے جب وہ پلنگ پر آنکھیں بند کر کے لیٹا تو یہ خیالات دماغ پر مستولی رہے۔ "چونکہ کل مجھے مبارزت کے سلسلہ میں بہت سے کام سرانجام دینے ہیں اس وجہ سے اس وقت بہت گہری نیند کی ضرورت ہے تاکہ کل صبح تروتازہ اور پختہ جاگوں اور مقابلہ کے لئے مستعد نظر آؤں۔"

بستر بہت گرم ہو گیا اور اسے اچھی طرح نیند نہیں آئی اور پڑا پڑا کروٹیں بدلتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد وہ پلنگ پر سے پھر اٹھا اور ایک اور پانی کا گلاس پیا .... اس وقت اسے خیال آیا کہ "معلوم ہوتا ہے خوفزدہ ہو رہا ہوں!"

اگر اسے لڑنے سے خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا تو اس اضطراب

و پریشانی کی کیا وجہ تھی۔ اس کے ہونٹ کیوں تھر تھرا رہے تھے تشنگی کیوں غالب تھی۔ دل کیوں دھڑک رہا تھا ——— مگر نہیں وہ بزدل نہ تھا۔ اسے ڈرپوک نہیں کہا جاسکتا، بزدل کبھی مبارزت کے لئے آمادہ نہیں ہوسکتا۔ اس نے متعدد بار ایسی لڑائیاں جیتی تھیں۔

مگر پھر بھی وہ اسقدر مضطرب تھا کہ بار بار دل کو ڈھارس دیتا تھا "ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں صرف اپنی ذات سے ڈرو اور کسی سے مت ڈرو ——— اور اپنی ذات سے کیا ڈرنا!"

لیکن اسے خدشہ تھا کہ اس کی پریشانی عین وقت پر ظاہر نہ ہو جائے اور یہ بوکھلاہٹ اسے جان دینے پر مجبور نہ کر دے، مقابلہ کے وقت اس کا ہاتھ نہ لرز جائے۔ یا مضطرب ہو کر وہ لڑکھڑا کر نہ گر پڑے۔

"کیا میں ڈر گیا! نہیں۔ کل دیکھا جائیگا!" وہ چلایا۔ بستر پر سے اٹھا۔ موم بتی پھر روشن کی اور آئینہ کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اس کی آنکھیں چمکدار اور متورم نظر آتی تھیں۔ چہرہ اترا ہوا تھا اور دلی افکار کا پتہ دیتا تھا۔

اس نے اپنے دل میں سوچا "پرسوں میں اس خبیث سے جنگ کرونگا ——— اور" میں "ہمیشہ کے لئے فنا ہو جاؤنگا۔ میں ہار جاؤنگا اور یہ جسم اس پلنگ پر مردہ اور سرد پڑا ہوا نظر آئیگا"۔

اس نے پیچھے مڑ کر پلنگ کی طرف دیکھا اس کے تخیل نے اپنے مردہ جسم کو پلنگ پر پڑا دیکھا ——— اسے اپنے پلنگ سے خوف محسوس ہونے لگا۔ اس نے پردہ چھوڑ دیا اور تمباکو نوشی کے کمرہ چلا گیا۔

ایک سگار نکالا اور کش لینا شروع کیا۔ اس وقت اسے سردی محسوس ہو رہی تھی۔ اس وجہ سے نوکر کو آگ جلانے کے لئے حکم دیا۔

پھر سوچنا شروع کیا "نہیں ——— اچھی طرح معلوم ہو جائیگا۔ کہ کسی سے مقابلہ ہوا تھا!"

آگ روشن ہوگئی اور وہ گرم ہو کر مزے سے سگار پیتا رہا اور دل ہی دل میں کہتا رہا "مجھے اب کیا کرنا چاہئیے؟ اب میرا کیا حشر ہوگا۔ کہیں ہار تو نہیں جاؤنگا؟"

وہ کرسی پر سے اٹھا اور کھڑکی کھول کر باہر دیکھنا شروع کیا۔ موسم گرما کی ایک خوشگوار صبح نمودار ہونی شروع ہوگئی تھی۔ تمام پریں پر ایک ہلکا قرمزی غازہ پھر گیا۔ اور جونہی نوزائیدہ آفتاب کی منور کرنیں زمین پر چمکیں نواب کے سینہ میں امید کی ایک نورانی کرن پیدا ہوگئی۔ نئے جوش اور نئے ولولہ کے ساتھ اس نے کہا "میں بھی کیا بیوقوف ہوں کہ لڑنے سے پہلے ڈرے جاتا ہوں، جبتک کوئی واقعہ نہ ہوجائے قبل از وقت واویلا کے مصداق خوف زدہ ہونا کہاں کی دانشمندی ہے۔"

(۴)

صبح ہوگئی اور اس نے غسل کر کے نئے کپڑے زیب تن کئے اور کافی مضبوط دل کے ساتھ گھر سے نکلا۔

دل میں صرف یہ خیال جاگزیں تھا "مجھے مضبوط رہنا چاہئیے اگر میری طرف سے ذرا سے خوف کا اظہار ہوا تو وہ غالب آجائیگا"۔

اس کے دونوں دوستوں نے اس کی امداد کرنے کا یقین دلایا۔ اور سب نے ملکر مبارزت کی تیاریوں کے متعلق تفصیل پر غور کرنا شروع کیا۔

"آپ ایک خوفناک مبارزت کرنا چاہتے ہیں؟"

"ہاں ——— بہت خوفناک ——— فیصلہ کن!"

"پستول ضرور استعمال کروگے؟"

"ہاں!"

"کیا آپ باقی تمام امور ہمارے ہاتھوں میں چھوڑتے ہیں؟"

نواب نے ایک خشک آواز سے جواب دیا "ہاں"

"آپ بہت اچھے نشانہ باز ہیں"۔

تفصیلات سمجھانے کے بعد نواب نے ان دوستوں کو رخصت کردیا اور خود گھر واپس آیا۔ اس کا حلق خشک ہوا جارہا تھا اور وہ بار بار اپنی زبان لبوں پر پھیر رہا تھا ——— اس نے لنچ کھانے کی کوشش کی مگر دماغی تفکرات نے کچھ کھانے نہ دیا۔ پھر شراب (رم) منگوائی اور پے در پے چھ گلاس پئے اب اس کے دماغ کی مشین تیزی سے حرکت کرنے لگی۔

"مجھے کامل یقین ہے کہ اب سب کام ٹھیک ہو جائیگا!"

اس نے سوچا ایک گھنٹہ بعد صراحی ختم ہوچکی تھی مگر اس کا ذہنی اضطرا برابر بڑھ رہا تھا۔

رات شروع ہوگئی۔

دونوں دوست پھر آئے اور اس سے کہا "نواب صاحب ہم آپ کا چیلنج لیکر اس کے پاس پہنچے تھے اس نے فوراً قبول کرلیا

ہے۔ اور سب کام ٹھیک ٹھاک ہو گیا ہے۔ جس جگہ مبارزت کا مقابلہ ہوگا وہاں ایک مکان کرایہ پر لے لیا گیا ہے جہاں زخمی کو بھیجا جائیگا۔ کیونکہ یہ یقین ہے کہ مقابلہ بغیر جراحت کے انجام نہیں پائیگا۔ اب ہمیں جانے کی اجازت دیں تاکہ ایک اچھے ڈاکٹر کی خدمات حاصل کرنے کا بندوبست کر سکیں۔"

دونوں چلے گئے۔

جب وہ چلے گئے تو اس نے یہ محسوس کیا کہ وہ دیوانہ ہو رہا تھا۔ وہ اس ڈیسک پر جا کر بیٹھا جس پر اس کا ملازم ابھی ابھی موم بتیاں روشن کر گیا تھا۔

ایک کاغذ نکال کر اس نے لکھا:۔

"یہ میری آخری وصیت اور عہد نامہ ہے۔"

ان الفاظ کو دیکھتے ہی وہ ڈر کر اُچھل پڑا۔ دلی اضطراب اور ان الفاظ نے موت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھینچ دیا اور وہ اب اس قابل نہ رہا کہ کسی چیز کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم کر سکے۔ یا وصیت نامہ تحریر کر سکے۔

وہ لڑنے کے لئے تیار تھا ——— تہیہ کر لیا تھا۔ خود اس نے مبارزت اور لڑائی مول لی تھی۔ جوش میں آکر اس نے ایک ایسا چیلنج دے دیا تھا جس کے پورا کرنے کے لئے اب وہ اپنے اعصاب میں پوری قوت نہ پاتا تھا۔

اس نے الماری میں سے "چتو بر بینڈ" صاحب کی کتاب "مبارزت کے قاعدے" نکالی اور اس کی ہدایات پڑھنی شروع کیں۔

اس میں مندرجہ ذیل سوالات درج دکھائی دئے:۔

"(۱) کیا وہ شخص جس سے تم لڑنا چاہتے ہو پستول چلانے کا عادی ہے؟"

(۲) کیا وہ اس فن میں ایک مشہور کھلاڑی ہے؟"

(۳) یہ کیونکر معلوم کیا جا سکتا ہے؟"

یہ پڑھنے کے بعد اس نے "مبارزت کی ڈائریکڑی" نکالی اور اس میں جارج لال کا نام تلاش کرنا شروع کیا۔ مگر اس کا نام باوجود تلاش کے نہیں ملا مگر یہ امر یقینی تھا کہ وہ اس فن کا ماہر معلوم ہوتا تھا کیونکہ اس نے بے چون و چرا چیلنج قبول کر لیا تھا اور وہ بھی اس خوفناک ہتھیار سے اور پھر ایسی شرائط کے ساتھ!۔

اس نے ایک پستولوں کا بکس کھولا اور اس میں سے ایک پستول نکالا اور اس طرح تن کر کھڑا ہو گیا گویا سامنے اس کا مقابل کھڑا ہوا تھا اور وہ اس سے لڑنا چاہتا تھا۔

اس نے پستول اٹھایا اور نشست باندھی مگر اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ پیروں میں بھی لرزش تھی۔ اس پر اس نے اپنے دل کو دلاسہ دیتے ہوئے کہا "ناممکن ہے اگر یہی حالت ہے تو میں ہرگز اس قوی جوان سے نہیں لڑ سکتا!"

اس نے پستول کی نالی کو دیکھا ——— وہ ایک تاریک غار معلوم ہوتی تھی اُسے دوستوں کا خیال آیا ان کے مذاق کلب کے لوگوں کے مضحکہ، عورتوں کی تالیاں اور اخبارات کے نوٹ غرض ہر وہ چیز یاد آنی شروع ہو گئی جو مبارزت سے انکار کرنے کا نتیجہ ہوتی ہے ——— لوگ اُسے بزدل کہیں گے!

اس نے پھر پستول کو دیکھا۔ اس کی نالی اور دستہ چمک رہے تھے۔ پستول بھرا ہوا تھا۔ اور نہ معلوم کس خیال سے اس کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا۔

اب اسے اچھی طرح یقین ہو گیا کہ مبارزت کیلئے بہت دلیری کی ضرورت تھی اور اس میں اتنی جرأت نہ تھی کیونکہ وہ محض اس کے خوف سے لرزہ براندام تھا۔ ایسی حالت میں اب سوائے سوسائٹی کے سامنے شرمندہ ہونے کے کچھ باقی نہ تھا۔ اس کی تمام روائتی بہادری اور شرافت کے افسانے جن پر وہ شیخیاں مارا کرتا تھا اب مہمل ثابت ہونے والے تھے۔

کیا وہ ایک بزدل تھا؟

(۵)

کسی نہ کسی صورت سے **ہمت** کی ضرورت تھی ورنہ مبارزت کیا معنی؟

اس نے اپنے آپ میں اس ہمت کو نہ پایا یا وہ سوسائٹی کے سامنے شرمندگی بھی نہ اٹھا سکتا تھا۔ اس کا وقار اور شان خطرے میں تھی۔ چنانچہ مسلسل سوچ بچار کے بعد اس نے کچھ فیصلہ کیا اور میز پر سے پستول اٹھا کر اس کی نالی حلق میں رکھکر لبلبی دبا دی۔

جب نوکر نے "دھوں" کی آواز سنی وہ گھبرایا ہوا کمرہ میں آیا۔ دیکھا کہ اس کا آقا پشت کے بل فرش پر مردہ پڑا ہوا تھا۔

خون کے ایک چھینٹے نے اس سفید کاغذ کو جو میز پر رکھا ہوا تھا ملوث کر دیا تھا۔

اس قرمزی دھبہ کے نیچے یہ الفاظ تھے:۔ "یہ میری آخری وصیت اور عہد نامہ ہے"

ہلمر اشکی (امریکی)

رات کے بھوت

جب میں نے پرانی سرائے کی دہلیز پر قدم رکھا۔ تو معمول سے زیادہ دیر ہوگئی تھی۔ کیونکہ ہیگستان کے اس چھوٹے سے گاؤں میں مناظر اسقدر دلچسپ ہیں۔ خصوصاً مغرب کے وقت ایسا شاندار نظارہ ہوتا ہے۔ کہ قیامگاہ کو واپسی کا خیال بھی نہیں رہتا۔ جب میں سرائے میں پہنچا تو میرے نئے رفیق میرا انتظار کر رہے تھے۔

یہ گاؤں کے ممتاز لوگ تھے۔ یعنی پٹواری، چوکیدار، ڈاکٹر اور ارغنونی یہ سب ایک کھردری میز کے گرد بیٹھے لمبے لمبے مٹی کے پائپ میں اپنے ہی باغوں کا تمباکو پی رہے تھے۔ میز پر ایک لمپ رکھا ہوا تھا۔ جس پر ایک سبز رنگ کا گلوب تھا۔ مجھے دیکھکر انہوں نے دوستانہ طور سے اس تاخیر پر ملامت کی۔ میں کوئی جواب نہ دینے پایا تھا کہ سرائے کا مالک تاش اور ایک سلیٹ کی تختی لیکر آیا جس سے اسپنج اور ایک سلیٹ کا قلم لٹکا ہوا تھا۔ ہم سب تاش کھیلنے بیٹھ گئے۔ پتے تقسیم ہی کئے گئے تھے کہ دہلیز پر ایک بوڑھا آدمی نظر آیا۔ جو نیلی عبا اور ڈھیلی خاکی پتلون پہنے تھا۔ اس کے پیروں میں موٹی موٹی کھڑاویں تھیں۔ اس شخص نے تانبے کی لالٹین جو ہاتھ میں لئے تھا۔ دہلیز پر رکھدی اور ٹوپی آتار کر میز کے پاس آیا۔ اور ڈاکٹر سے کہا میری [illegible]یک بیمار ہوگئی ہے۔ اس لئے مہربانی فرماکر میرے ساتھ ہمسایہ گا[illegible] تشریف لے چلئے۔

ڈاکٹر [illegible] سے تاش کے پتے رکھکر) ماسٹریان میں ابھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ یہ میرا فرض ہے

یہ کہکر ڈاکٹر نے اپنی ٹوپی سر پر لگائی اور چھڑی ہاتھ میں لیکر دہقانی سے پوچھا۔!!

"ہم جنگل سے چلیں گے نا اس راستہ میں مسافت بہت کم ہے"!

ماسٹریان۔ اس وقت اور جنگل سے گذرنا۔ کل صبح اگست کی ۱۵ ہے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ اس وقت جنگل میں سے قلعہ رہوڈ کے پاس جانا اچھا نہیں۔؟؟

ارغنونی۔ تم سچ کہتے ہو۔ اس کے متعلق لوگ عجیب وغریب قصے بیان کرتے ہیں۔

پٹواری صاحب نے یوں گل فشانی فرمائی۔........

"گاؤں کے بڑے بوڑھے کہتے ہیں۔ کہ جب سے پادری کی موت کا حادثہ ہوا ہے۔ اس دن سے قلعہ کے مالک کی روح ہر سال رات کے وقت قلعہ کے گرد پھرتی ہے۔ اور کاغذات میں بھی ایسا ہی لکھا ہوا ہے۔ لیکن آجکل کے نوجوان ان باتوں پر اعتبار نہیں کرتے۔"

میں نے یہ قصہ سننے کے شوق میں اور تازہ ہوا کا لطف اٹھانے کے لئے ڈاکٹر کے ہمراہ جانا چاہا۔ اس نے منظور کر لیا۔ سرائے کے مالک نے ہم کو تانبے کی ایک گول لالٹین دیدی۔ کہ واپسی کے وقت ضرورت ہوگی۔

یہ لالٹین لیکر ہم تینوں روانہ ہوگئے۔ دہقانی شخص نے کہا ہم کو لالٹینوں کی ضرورت نہیں؟ "لیکن تارے خوب چمک رہے ہیں۔ شاید موسم بدل جائے۔"

یہ کہکر اس نے دیا سلائی سے اپنا پائپ جلالیا۔

ڈاکٹر نے اس سے کہا "ماسٹریان یہ تو کہو کیا واقعی تم ایسی صاف اور روشن رات کو ہمارے جنگل میں سے گزرتے ہوئے ڈرتے ہو؟"

ماسٹریان۔ جناب میں ڈرپوک تو نہیں ہوں۔ لیکن اگر مجھے تمام دنیا کا سونا دیدیا جائے تب بھی آج رات کو قلعہ کے پاس نہ جاؤنگا؟

میں۔ آخر نقصان کیا ہے؟

دہقانی۔ جناب مجھ کو معلوم ہوتا ہے کہ آپ یہاں کے رہنے والے نہیں ہیں۔ اگر آپ ہمارے گاؤں میں پیدا ہوتے تو یہ سوال نہ کرتے سب جانتے ہیں کہ رہوڈ کے بیرن کے کتوں کا غول ہر سال غراتا اور بھونکتا ہوا کھیتوں میں دوڑتا پھرتا ہے۔ اور شکی گھوڑوں کا گلہ زنجیریں کھینچتا ہوا جنگل میں سے گذر جاتا ہے۔ شکاری نرسنگھوں تیروں اور گولیوں کی سنسناہٹ زخمی شکاروں کی آواز ہوا میں گونجنے لگتی ہے۔ اور بڑا دہشتناک شور پیدا ہوتا ہے۔ خدا نہ کرے کہ کسیکو یہ غول راستہ میں ملے۔ یہ گفتگو کرتے ہوئے ہم جنگل کے پاس پہنچ گئے۔

ڈاکٹر نے کہا "اچھا شاید بیمار لڑکی ہمارا بے چینی سے انتظار

کر رہی ہوگی۔ اس لئے ہمیں مختصر راستہ سے جانا چاہئے۔" میں نے توماں کہدیا۔ لیکن گاؤں والے کا چہرہ فق ہوگیا۔ اگرچہ اس کی بھی یہی خواہش تھی کہ جلد سے جلد لڑکی کے پاس پہنچ جائیں۔ تاہم اس نے سختی سے روکا کہ ہم اس قسم کی جرأت نہ کریں۔ ایک جوان شخص کے لئے کسی قدر شیخی نامناسب نہیں ہوتی۔ اور بجائے اس کے کہ اس سیدھے آدمی سے بحث کی جائے میں نے اپنی لالٹین روشن کی اور جنگل میں پگڈنڈی پر قدم بڑھایا۔ ڈاکٹر نے اپنے رہنما کو ہاتھ کے اشارہ سے خدا حافظ کہا۔ اس نے نہایت افسوس کے لہجہ میں جواب دیا۔

"خدا آپ کی حفاظت کرے"

اور وہ دوسرے راستہ سے قدم بڑھاتا ہوا چلا گیا۔ اور ہم جنگل میں داخل ہوگئے۔ جنگل کے گھنے درختوں میں سے چاند کی بہت کم شعاعیں آرہی تھیں۔ صرف لالٹین کی زرد روشنی ہمارے چند قدم آگے تک راستہ کو روشن کرتی تھی۔

گاؤں والوں کے عجیب و غریب توہمات ہماری گفتگو کے موضوع تھے۔ ڈاکٹر نے چند مثالیں بیان کیں اور کچھ دیر کے بعد اس نے جیب سے گھڑی نکال کر میری لالٹین کی روشنی میں دیکھکر کہا۔

"اوہو گیارہ بج گئے۔ ہم یقیناً راستہ بھول گئے یہ جنگل اسقدر وسیع نہیں ہے۔ ہم رہوڈ کی طرف آگئے" ہم کچھ ٹھہر گئے۔ لیکن جنگل کے وسط میں جگہ معین کرنا غیر ممکن تھا۔ ہم سمت بھی نہیں معلوم کرسکتے تھے۔ کیونکہ چاند کے نقرئی کرّے پر بادل چھائے ہوئے ہوئے تھے۔

ہوا سے درختوں کے پتے بج رہے تھے۔ اور صنوبر کے درختوں کی خشک ڈالیاں کھڑکھڑا رہی تھیں۔ کبھی کبھی اُلّو یا کوئی اور شکاری پرندکی آواز آجاتی تھی۔ وہ صبر جو ابتدا میں بڑی بہادری سے شروع کی گئی تھی۔ اب بیحد طویل اور دشوار معلوم ہونے لگی۔ میں افسوس کرنے لگا کہ ہم گاؤں والے کے ساتھ ہی کیوں نہ چلے گئے اتنے میں کچھ روشنی ہوئی تو ہم کو جنگل کا کنارہ نظر آگیا۔ ہم دونوں اسی طرف چلے گئے۔ وہاں پہنچے تو ہماری آنکھوں کے سامنے جو تاریکی سے مانوس ہوگئیں تھیں وسیع کھیت تھے ان کے چاروں طرف پہاڑیاں تھیں۔ اور یہ پہاڑیوں پر گھنے جنگل کھڑے تھے۔ کھیتوں کے درمیان جو تقریباً میل کی جگہ میں شاندار رہوڈ کا قلعہ کھڑا تھا۔ اور اس قلعہ پر ایک مربع برج بنا تھا۔ اس قلعہ سے گاؤں کے پل تک سڑک کے دونوں طرف بڑے بڑے درختوں کی قطار تھی۔ انہی درختوں میں سے ہمکو بیمار لڑکی کے مکان تک جانا تھا۔ اس تمام فضا میں دل پر اثر کرنے والا گہرا سناٹا ماتمی پردہ کی طرح چھایا ہوا تھا۔ بکھرے بادل کبھی بکھرے ہوئے کبھی جمع آسمان پر اڑتے پھر رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد چاند ابر میں سے نکل آیا۔ جس کی روشنی سے پورا قلعہ روشن ہوگیا۔ اور اس کے ہر دریچہ پر کسی قدر نیلے رنگ کی نقرئی آگ کی روشنی نظر آرہی تھی۔ ہمارے چاروں طرف چمگادڑیں پیچ و خم کھاتی ہوئی اُڑ رہی تھیں۔ اور ہوا میں ایک عجیب شور سنائی دینے لگا۔

گھوڑوں کی ہنہناہٹ اور ان کی ٹاپوں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ یہ خوفناک شور بڑھتا جاتا تھا اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہمارے قریب ہوتا جارہا ہے۔ اور زنجیروں کی کھڑکھڑاہٹ اور ہُو ہُو ہُو ہُو کی مخلوط آواز بھی کان میں آنے لگی۔ ہم کو بجز قلعہ کے بیچ کے حصہ میں ایک لرزتی روشنی کے جو کبھی نمودار ہو جاتی تھی اور کبھی غائب ہوجاتی تھی۔ اور کوئی چیز نظر نہیں آئی۔

اس کے بعد پھر سناٹا چھا گیا۔ لیکن سناٹا شور و غل سے زیادہ ہیبتناک تھا۔ میں نے ڈاکٹر کا بازو پکڑ کر آہستہ سے کہا۔

"یہ کیا ہورہا ہے ...."

ڈاکٹر نے کچھ سکوت کے بعد متفکرانہ انداز میں کہا۔

"رہوڈ کے قلعہ کے متعلق لوگ حیرت انگیز واقعات بیان کرتے ہیں ...... لیکن گاؤں والے مجھ سے اچھی طرح بیان کرینگے"

چند منٹ کے بعد ہم نے ایک مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا جس کے آس پاس اور کوئی مکان نہ تھا۔ ہمارے رہنما نے خود دروازہ کھولا اور ہمارے زرد چہرے دیکھکر کہا۔

خوش آمدید .... ہم ڈر رہے تھے کہ کوئی مصیبت آگئی۔

ایک بڑھیا جو چولہے کے پاس بیٹھی ہوئی مریض لڑکی کے لئے کوئی پینے کی چیز تیار کر رہی تھی۔ بولی

جناب ہم آپ کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ اگرچہ میری بیٹی کی حالت اب اچھی معلوم ہوتی ہے۔

لڑکی کا باپ میز پر سے لیمپ اٹھا کر ڈاکٹر کو قریب کے کمرہ میں لے گیا۔ جہاں اس کی لڑکی لیٹی ہوئی تھی۔ لڑکی کی ماں بھی وہ پینے کی چیز لیکر دونوں کے پیچھے لے گئی۔ میں تھوڑی دیر کے لئے تنہا رہ

گیا۔ یہاں اسوقت لکڑیوں کی سُرخ روشنی ہو رہی تھی۔ میں آج رات کے واقعات پر غور کر رہا تھا۔

اتنے میں لڑکی کی ماں مسکراتی ہوئی آئی اور اس نے آہستہ مجھ سے کہا۔

"اب وہ آرام سے لیٹی ہوئی ہے۔ خدا کا شکر ہے۔ ہمیں امید ہوگئی ہے کہ وہ بچ جائیگی۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے کہا ہے کہ جبتک اس کو نیند نہ آجائیگی ہمیں یہیں ٹھیرا رہونگا۔"

اس کے بعد وہ کافی تیار کرنے بیٹھ گئے۔ میں نے یہ موقعہ غنیمت سمجھا اور اس سے ان دہشتناک آوازوں کے متعلق سوال کیا۔ جو راستہ میں ہم نے سنی تھیں جب اس نے کہا۔

ہم نے بھی اس خونی بگھی کی آواز سنی ہے جس میں جہنمی گھوڑے جُتے ہوئے تھے۔ ہم نے وہ بگھی کھڑکی میں سے دیکھنے کی جرأت نہیں کی ورنہ ہم دیکھتے ہی مرجاتے۔ لیکن ہم آپ کے لئے دعا کر رہے تھے۔ اور مقدس عذراء نے ہماری دعا سُن لی کہ آپ ہمارے گھر تک پہنچ گئے۔ ہم کو خوف تھا کہ آپ کی بھی وہی حالت نہ ہو۔ جو پن چکی والے کی لڑکی سسکا کی ہوئی۔

"اسے کیا ہوگیا تھا؟"

یہ بہت ہیبتناک واقعہ ہے۔ میں نے اپنی جوانی میں سنا تھا۔ ہوا یہ کہ گاؤں میں تہوار کا دن تھا۔ دن بھر ناچ گانا ہوتا رہا۔ رات کو پن چکی والے کی شوخ لڑکی سسکا جس کی عمر سترہ برس کی تھی۔ ناچ کے بعد چند اور لڑکوں اور لڑکیوں کے ساتھ گھر واپس جا رہی تھی۔ راستے میں یہ سب گاتے بجاتے چلے جارہے تھے۔ اتنے میں بارہ بجے اور چار گھوڑوں کی بگھی کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ اور ذرا دیر بعد وہ بگھی ان کے قریب آگئی۔ ایک لڑکے نے چلا کر کہا۔

اے کوچبان بگھی ٹھیرا، اس کے ساتھ سب نے چلا کر یہی کہا۔ بگھی ٹھیرا۔ اور شوخ لڑکی سسکا خیال سے زیادہ تیز دوڑ کر بگھی کے پیچھے پائدان پر کھڑی ہوگئی اور چلا کر بولی۔ لو میں تو گھر جاتی ہوں۔ وہ قلعہ کی طرف درختوں کی قطاروں میں غائب ہوگئی۔ گھوڑے غیض وغضب سے بھرے ہوئے کھیتوں اور سبزہ زاروں پر دوڑتے رہے۔ اور تین مرتبہ قلعہ رہوڈ سے قلعہ کرانیتنبرگ تک جو کبھی پہاڑوں پر بنا ہوا تھا۔ گئے اور آئے۔ ہر مرتبہ قلعہ کے پھاٹک بگھی کے واسطے خود بخود کھل گئے اور زور کی آواز کے ساتھ بند ہو گئے۔ ایک لمحہ کے بعد سسکا جادو کے قلعہ میں پہنچ گئی۔ اور بگھی سے نیچے گر گئی۔ صبح کو گاؤں والوں نے اس کی لاش قلعہ رہوڈ کے پھاٹک کے سامنے پل پر پڑی ہوئی دیکھی۔ لاش پر جگہ جگہ خون کے داغ تھے۔

بوڑھی عورت جب قصہ بیان کر رہی تھی ڈاکٹر اور لڑکی کا باپ خاموش آکر کمرہ میں کھڑے ہو گئے تھے۔ لیکن میں قصے میں ایسا محو تھا کہ مجھے کچھ نہ معلوم ہوا۔ کہ یہ دونوں بھی یہیں کھڑے ہیں یا نہیں۔ جب قصہ ختم ہوگیا تو بوڑھی عورت نے اٹھکر الماری میں سے چار پیالیاں نکالیں اور کافی بھر کر ہمارے سامنے رکھدیں۔

ڈاکٹر نے لڑکی کے ماں باپ کو اطمینان دلایا کہ اب کوئی خطرہ نہیں۔ اور کچھ طبی مشورے دئے اور دوائیں تبلائیں۔ میں نے ڈاکٹر کی ایک بات بھی نہیں سنی۔ میں ہوا کی سنسناہٹ اور آگ کی بھڑک میں خونی بگھی کی گڑگڑاہٹ گھوڑوں کی ٹاپیں، ہنٹروں کی پھٹکار اور کتوں کے غول کا بھونکنا سن رہا تھا۔ اور دہوئیں میں مجھے بھتنے نظر آرہے تھے۔ ڈاکٹر نے میری اس حالت کا اندازہ کرلیا اور بطور مذاق بولا۔

"دوست کیا بڑی بی نے رہوڈ کا ایسا خوفناک قصہ بیان کیا۔ کہ تم کو نیند آگئی؟"

بے شک میں ان عجیب واقعات پر غور کر رہا ہوں جو میں نے سنے ہیں لیکن میں نہیں سمجھ سکتا کہ ان واقعات کا سبب کیا ہے؟

بوڑھی عورت نے کہا "میں بیان کرسکتی ہوں لیکن میرے شوہر مجھ سے زیادہ اچھی طرح بیان کریں گے۔"

چنانچہ عورت کے شوہر نے حسب ذیل قصہ بیان کیا۔

رہوڈ کا بیرن نہایت مغرور اور متکبر آدمی تھا۔ اور شکار کا اسکو اسقدر شوق تھا کہ وہ خوشی سے اپنی روح شیطان کے ہاتھ بیچ دیتا۔ قریباً روزانہ وہ اپنے خدم وحشم کے ساتھ اس جنگل میں شکار کھیلا کرتا تھا جو آرام اور عبادت کے لئے مخصوص ہے۔ اور باوجود پادری کی فہمائش کے وہ نہیں مانتا تھا اور برابر اتوار کو بھی گھوڑے پر سوار ہوکر شکار کو چلا جایا کرتا تھا۔

ایک مرتبہ اتوار کو علی الصبح شکار کو جانے لگا اور اپنے پادری سے وعدہ کیا کہ نماز تک واپس آکر شریک ہوجاؤنگا لیکن اسی کے ساتھ اس نے پادری سے یہ بھی تاکید کی کہ میری واپسی تک نماز شروع نہ کیجائے۔

پادری نے منظور کرلیا۔ اس باہمی قرارداد سے مطمئن ہوکر وہ

کھیتوں اور جنگلوں میں دیوانہ وار شکار کے لئے پھرتا رہا۔ وقت سرعت کے ساتھ گزرتا رہا۔ اور قلعہ سے گیارہ بجے کے گھنٹے کی آواز سنائی دی۔ بیرن کو اپنا وعدہ یاد آیا۔ کہ مجھے اب گھر پہنچ کر نماز میں شریک ہونا ہے کیونکہ قانون کلیسا کے مطابق نماز ۱۲ بجے سے قبل شروع ہوجانا چاہیئے۔ یہ خیال کر کے اس نے واپسی کا ارادہ کیا ہی تھا کہ دو تین خرگوش جنگل میں بھاگتے ہوئے نظر آئے۔ بیرن نے دل میں کہا ان کو ذرا دیر میں مار کر چلا جاؤں گا۔ لیکن خرگوش بہت تیز تھے۔ بیرن جسقدر تیزی سے ان کا تعاقب کرتا تھا اس سے زیادہ تیز وہ خرگوش بھاگتے تھے اور کبھی غائب ہوجاتے۔ اور کبھی پھر نمودار ہوتے۔ اور کبھی تھک کر خاموش بیٹھ جاتے اور جب بیرن ان کے قریب پہنچتا تو پھر بھاگ جاتے۔ یہاں تک کہ نماز کا وقت گزر گیا۔ لیکن بیرن کو بھی ضد ہوگئی کہ میں ان کا شکار کر کے رہونگا۔ وہ اسی دُھن میں خرگوشوں کے پیچھے بھاگتا پھرتا تھا۔ کہ قلعہ کے گھنٹے نے بارہ بجائے۔ گھنٹے کی آواز سنکر بیرن کچھ پریشان ہو کر ٹھہر گیا۔ خرگوش بھی کھڑے ہوگئے اور اپنے کان سیدھے کر کے اگلے پیروں سے تالیاں بجانے لگے اور ایک پُراسرار آواز سنائی دی۔

بیرن صاحب سلام۔ اپنے شوق کی وجہ سے نماز بھی بھول گئے۔
شیطان آپ سے خوش ہے ——— اب جلدی جائیے ...
...... لیکن بیکار ہے۔

بیرن مارے غصے کے کانپنے لگا۔ اور گھوڑے کو گھر کی طرف تیز دوڑایا۔ شیطان پر لعنت کرتا جاتا تھا۔ لیکن اس کو یہ بھی خیال تھا کہ میں نے پادری سے تاکید کر دی ہے کہ بغیر میرے نماز شروع نہ کرے اور گو قانون کچھ بھی ہو۔ لیکن میرے حکم کی تعمیل ضرور کیجائے گی۔ جب وہ پل پر سے گزر کر قلعہ کے پھاٹک پر پہنچا تو وہاں سناٹا تھا۔ اور اسوقت کوئی شخص پھاٹک پر حاضر نہ تھا۔ یہ دیکھ کر اس کی طبیعت میں اشتعال پیدا ہوا کہ میرے استقبال کو کوئی کیوں نہیں آیا وہ گھوڑے سے اُتر کر ہتھیار لگائے ہوئے سیدھا گرجے میں پہنچا وہاں دیکھا کہ اس کے تمام ملازم اور خدمتگار دوزانو کھڑے ہیں اور پادری قربانگاہ پر دعا پڑھ رہا ہے۔

یہ دیکھکر بیرن کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ اس نے ہاتھ بڑھایا اور ...... پستول کی آواز نے سب کو چونکا دیا۔ پادری قربانگاہ پر گر پڑا۔ اور جان بحق ہوگیا۔

اس دن سے وسط اگست میں راتوں کو گھوڑے کھیتوں میں دوڑتے پھرتے ہیں۔ سیاہ کتے بھونکتے ہوئے گھوڑوں کے ساتھ بھاگتے ہیں۔ اور خونی گھنٹی چٹانوں پر لڑھکتی ہوئی جاتی ہے۔ یہ پورا غول قلعہ رہوڈ سے قلعہ کراتینبرگ کی جگہ تک جہاں بیرن کا رفیق رہتا تھا تین مرتبہ جاتا آتا ہے۔ لوگ وثوق کے ساتھ کہتے ہیں کہ یہ دوزخی غول اگر کوئی دیکھ بھی لے تو اس کی ہلاکت کے لئے کافی ہے اگر کوئی شخص اس غول کو راستہ میں ملجائے تو وہ قلعہ کے پھاٹک تک کھنچا ہوا چلا جاتا ہے۔

یہ قصہ کہکر وہ بوڑھا آدمی خاموش ہوا تو ڈاکٹر نے مجھ سے کہا۔

"اگر تم پسند کرو تو ہم دونوں کل قلعہ دیکھنے چلیں گے۔ اس کے وسیع کمرے آراستہ چھتیں۔ اس کا مربع برج اس کے تہ خانے اور قید خانے دیکھیں گے۔ اور وہ گرجا بھی دیکھیں گے۔ جہاں قربانگاہ پر پادری کی تصویر بنی ہوئی ہے۔ اور اس کی نماز کی کتاب ابتک وہیں رکھی ہوئی ہے جس پر خون کے دھبے ہیں۔ اس بے رحمانہ قتل کے بعد بہت جلد ظالم بیرن مرگیا۔ اور اس نے کوئی وارث نہیں چھوڑا۔ اور اس وقت سے بجز اُلوؤں اور چمگادڑوں کے کوئی انسان اس قلعہ میں نہیں رہا۔

یہ کہہ کر ڈاکٹر کھڑا ہوا اور لڑکی کے کمرہ میں جاکر دیکھا لڑکی اس وقت آرام سے سو رہی تھی۔ ڈاکٹر نے اس کمرہ سے واپس آکر کہا اب ہمیں گھر چلنا چاہیئے۔

ہم نے کافی کی پیالی ختم کی۔ اور دونوں میاں بیوی سے ہاتھ ملایا ڈاکٹر نے وعدہ کیا کہ میں کل پھر آؤنگا۔ اور وہاں سے روانہ ہوگیا۔

مطلع اس وقت بالکل صاف تھا اور چاند خوب روشن تھا۔ ہم کو لالٹین کی ضرورت نہیں ہوئی۔ اگرچہ رات کے دو بج چکے تھے۔ لیکن اس وقت ہم نے مختصر راستہ چھوڑ کر پتھریلے راستہ سے جانا پسند کیا رہوڈ گاؤں سے گزرتے ہوئے ایک دیہاتی کی گاڑی آتی ہوئی نظر آئی۔ جب گاڑی ہمارے قریب آئی تو گاڑیبان نے ڈاکٹر کو سلام کیا۔

شب بخیر ڈاکٹر صاحب۔

ڈاکٹر۔ شب بخیر پیٹر۔

پیٹر۔ کیا آپ گھر جانا چاہتے ہیں؟ آجائیے میری گاڑی میں دو آدمیوں کی جگہ ہے۔

ڈاکٹر۔ شکریہ۔ آج رات کو ہم بہت چلے ہیں۔

گاڑی آگئی اور ہم دونوں بیٹھ گئے۔ گاڑی میں پھلوں اور ترکاریوں کی ڈلیاں رکھی ہوئی تھیں۔ جب گاڑی روانہ ہوئی تو ڈاکٹر نے مجھ سے مذاقاً کہا۔ اب ہم اسی خونی گاڑی میں جا رہے ہیں کیونکہ پیٹر قلعہ رہوڈ

کا معمار ہے۔

ان الفاظ سے میں بے اختیار چونک پڑا۔ لیکن ڈاکٹر نے میری گھبراہٹ نہیں دیکھی اور اس نے گاڑیبان سے کہا۔

"قلعہ سے آگر تم اسقدر جلد کہاں جا رہے ہو؟"

پلیٹر۔ میں ہر ہفتہ لوویں کے میلہ جایا کرتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ سب سے پہلے وہاں پہنچ جاؤں اور چونکہ راستہ بہت طویل ہے۔ اس لئے میں رات ہی سے روانہ ہو جاتا ہوں۔ آج بھی میں بہت جلد جانا چاہتا تھا۔ لیکن جب میں گاڑی میں گھوڑے جوتنا چاہتا تھا۔ تو اتفاق سے ان کی لگام ٹوٹ گئی اور گھوڑے درختوں کی قطار کے جانب بھاگ گئے اور کتے ان کے پیچھے بھونکتے ہوئے دوڑے اور ایک خوفناک شور و غل پیدا ہو گیا۔ میں نے مشکل سے گھوڑوں کو روکا اور باگ درست کرنے میں بڑی محنت کرنی پڑی۔ دیر کی یہ وجہ ہے۔"

ان باتوں میں راستہ آسانی سے کٹ گیا اور ہم سرائے کے دروازہ پر پہنچ گئے۔ گاڑی کو رکوا کر ہم اتر پڑے اور پیٹر کا شکریہ ادا کیا۔

ڈاکٹر نے مجھ سے کہا شب بخیر۔ اور کہا ماسٹر پیٹر کی تقریر غالباً تمہارے دل سے رات کے بھوتوں کا ڈر نکالنے کو کافی ہو گی۔ جو ہم کو جاتے وقت قلعہ کے پاس ملے تھے یہ کہکر وہ چلا گیا۔

میں اپنے کمرہ میں جا کر لیٹا لیکن باوجود ڈاکٹر کی آخری بات کے مجھے نیند نہ آئی۔ کیونکہ تعجب خیز واقعات نے میرے دل پر بہت اثر کیا تھا۔ اور میرا دماغ پریشان تھا۔ میں نے لیمپ روشن کیا اور میز کے پاس بیٹھکر یہ کہانی لکھنے لگا۔

مکی۔ (بھوپالی)

غزل

مضطرب ہوں جلوۂ اُمیدِ باطل دیکھ کر
لرزہ بر اندام ہوں بیتابیٔ دل دیکھ کر

ناخدائے دل کو موجوں سے یہ کیسا ربط ہے
ماہیٔ بے آب ہو جاتا ہے ساحل دیکھ کر

وقتِ آخر ہم نہ ٹھہرے بارِ دوشِ دوستاں
رُوح خوش ہے مرگِ غربت کا یہ حاصل دیکھ کر

زعمِ عقل و فہم اِک نادانیٔ معصوم ہے
اے گرفتارِ فریبِ ہوش! اے دل! دیکھ کر

انتہائے لذتِ آوارگی دیکھے کوئی
بارہا لوٹ آئے ہیں آثارِ منزل دیکھ کر

چاندنی کا سیلِ عالمگیر اور پچھلا پہر
کھُل گئیں آنکھیں مری دنیا کو غافل دیکھ کر

(غیر مطبوعہ) عدم

ایثارِ حُسن

گذشتہ دنوں میں فرانس کے ایک مشہور معتقدر رکن حکومت قوت بینائی سے محروم ہو گئے۔ اُنہوں نے اپنی منگیتر سے کہا۔ کہ میں اب اندھا ہو گیا ہوں اور اس قابل نہیں رہا کہ محبت اور تاہل کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکوں۔ لیکن غیرت مند منگیتر نے جواب دیا۔ کہ یہ مجھ سے نہ ہو سکیگا۔ میں اپنی محبت میں ثابت قدم ہوں۔ چنانچہ دونوں کی شادی ہو گئی۔

مجبورِ مشیّت

بہت گہرا ہے گرچہ دل پر اُلفت کا اثر پیاری　　مگر قدرت نے مجھ سے چھین لی حسن بصر پیاری
مری دنیائے عشرت پر اندھیرا چھا گیا یکسر　　اب ان آنکھوں سے کچھ آتا نہیں مجھکو نظر پیاری
میں اب بھٹکونگا مستقبل کی اُن تاریک راہوں میں　　جہاں کام آ نہیں سکتا ہے کوئی راہ بر پیاری
محبت کا تری میں معترف ہوں، کیا کروں لیکن؟　　نبھانے کی کوئی صورت نہیں آتی نظر پیاری

بن آئے کیا مشیت ہی جو محروم نظر کر دے!
بھلا دے اپنے دل سے مجھکو قصہ مختصر کر دے

مختارِ محبت

یہ مانا! آدمی بے شک ہے مجبورِ مشیّت بھی　　مگر تم ساتھ بینائی کے کھو بیٹھے بصیرت بھی
تعجب ہی ہوئے جاتے ہو تم مایوس کیوں آخر؟　　بھُلا دی تم نے اپنے دل سے کیا میری محبّت بھی
محبّت امتیازِ کور و دیدہ ور سے بالا ہے　　سمجھتے ہو مجھے تم۔ آہ! کیا ننگِ محبّت بھی
رہونگی میں شریکِ حال پیارے رنج و راحت میں　　مصیبت آ پڑے تو میں اٹھاؤنگی مصیبت بھی

تمہاری شکل میرے واسطے جیسی ہی اچھی ہے!
تم اندھے ہو تو کیا غم ہے محبّت خود بھی اندھی ہے

وقار (انبالوی)

(غیر مطبوعہ)

عمر خیام اور اسکا عہد

(گذشتہ سے پیوستہ)

مندرجہ بالا رُباعیات سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ خیام مذہب کے بنیادی اصولوں کا منکر تھا۔ ان کا مفہوم صرف یہ ہے کہ وہ نظریۂ جبر کا قائل نہیں تھا۔ علامہ شبلی نعمانی اپنی تصنیف "شعر العجم" میں رقمطراز ہیں کہ خیام کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جبر کا قائل تھا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ علامہ موصوف سے غلطی ہوئی۔ جبر کے متعلق خیام نے جو رباعیات کہی ہیں ان میں ایک رنگ طنز پایا جاتا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ خیام ان حکما و علماء کو اپنی تضحیک کا نشانہ بنا رہا ہے۔ جو جبر کے قائل ہیں۔

علاوہ ازیں خیام کے حالات کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ خدا کے وجود سے منکر تھا۔ اس جگہ اس کی رباعیات کا حوالہ دینا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ ابھی ہم نے یہ سوال طے نہیں کیا کہ ان کی شناخت کا معیار کیا ہے۔ ضروری معلوم ہوتا ہے ابن القفطی کے الفاظ نقل کر دیئے جائیں۔

وہ رقمطراز ہیں کہ

خیام کے اشعار کے باطنی معانی اسلام کے لئے زہر قاتل حکم رکھتے ہیں۔

اگر ابن القفطی کو معلوم ہوتا کہ خیام خدا کے وجود سے منکر ہے تو وہ ہرگز اس واقع کو چھپانے کی کوشش نہ کرتا۔ پھر "چہار مقالہ"، "تاریخ گزیدہ"، "جامع التواریخ" جن میں عمر خیام کی زندگی کے جستہ جستہ حالات ملتے ہیں اس مسئلے کے متعلق خاموش ہیں۔ ان واقعات کی بنا پر یہ کہنا زیادہ قرین قیاس ہے کہ خیام کو قادر مطلق کے وجود سے انکار نہ تھا۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ ایک مشہور فلسفی خالق کائنات کے وجود پر اعتبار رکھتے ہوئے اس عقیدے کا قائل ہو کہ انسان اپنے افعال میں مطلقاً مجبور رہے کہ "نیک و بد افعال" کا ارتکاب اس کے اختیار میں نہیں۔

ابیقوریت کے عناصر

فلسفے کا منتہائے نظر اطمینان قلب کا حصول ہے۔ کائنات میں مخالف و متضاد قوتوں میں ہنگامہ برپا ہے۔ اور انسان کا جستجو آشنا دل اس تخالف و تضاد میں ایک عنصر سکون ڈھونڈنے کی کوشش میں مصروف رہا ہے۔ فلسفے کے مختلف مذاہب اور نظریئے اس ذوق تشنگی کی آئینہ داری کر رہے ہیں۔ اس بات پر تمام مذاہب متفق ہیں کہ روح انسانی میں جو خواہشات اور جذبات کا ایک طوفان بپا رہتا ہے اُس کا فرو ہو جانا اور کامل اطمینان ہو جانا کائنات کی سب کی بڑی نعمت ہے۔ لیکن اس نعمت عظمیٰ کے حصول کے ذرائع میں اختلاف ہے۔

دیدانت کے اصولوں کے مطابق فطری جذبات و خواہشات کو ترک کر دینا۔ دل کو تمام خیالات فاسدہ سے پاک کر لینا اور دنیوی تعلقات سے آزاد ہو جانے کا نام "اطمینان" ہے۔ کائنات ایک پردہ ہے جو نگار حقیقت کے روئے دل آویز پر چھایا ہوا ہے۔ اس پردے اس "مایا" کو دور کر دینے سے دل نور معرفت سے روشن ہو جاتا ہے اور انسان الوہیت کی حدود میں داخل ہو کر قادر مطلق کی ہستی میں فنا ہو جاتا ہے۔

نیو افلاطونی فلسفے کے مطابق اطمینان قلب "قادر مطلق" سے ہم آہنگ ہو جانے میں پنہاں ہے۔ دیوی دیوتا اس گہری خلیج کو پاٹتے ہیں جو خدا (ئے) مطلق اور انسان کے درمیان حائل ہے۔

شوپنہار کے خیال میں زندگی کے ارادے کو فنا کر دینے کا نام اطمینان ہے ایران کے متصوفین شعرا بھی اس اطمینان قلب کے جویا ہیں اور اس کے حصول کے لئے حسن کی پرستش اور "پیر مغاں" کے انتخاب کو ضروری تصور کرتے ہیں۔ یہ وہی نیو فلاطونی اثر ہے۔ تصوف میں "حسن" کو مظہر خداوندی تصور کیا جاتا ہے۔ اور اس مظہر کے ذریعے "حسن مطلق" تک پہنچنا باقی ذریعوں کی نسبت آسان سمجھا جاتا ہے۔

اس اطمینان قلب و مسرت کے حصول کے لئے جو نظام کار پیش کئے گئے ہیں ان میں سے اپیکورس کا فلسفہ بہت مشہور ہے۔

اپیکورس ایتھنز کا باشندہ تھا اور شروع ہی سے تفکر و تدبر کا عادی تھا۔ اس کی زندگی کے متعلق تفصیلی حالات نہیں ملے۔ البتہ نام نہاد معلمین اخلاق نے جن الفاظ میں اس کو یاد کیا ہے وہ جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔ تعجب کی بات ہے کہ کسی معقول وجہ کے بغیر اس کے نظام عمل کو تعیش اور بدکاری کا ایک منظرناک مجموعہ خیال کیا جاتا ہے۔ حالانکہ اس کا استدلال اس فطری حقیقت پر مبنی ہے کہ ہر وہ شے جو انسان کو کرب پہنچاتی ہے۔ حیات انسانی کے لئے

معز اور ہر وہ شے جو انسان کو لذت سے آشنا کرتی ہے۔ حیات انسانی میں ممدو معاون ثابت ہوتی ہے۔ گویا نظرت نے ہماری رہنمائی کے لئے مستقبل کی تاریک راہ میں ایک شمع فروزاں کردی ہے۔ احساس لذت والم ان تمام اشیاء کی مضرت یا فائدہ رسانی کا معیار ہے۔ جن سے انسان کو واسطہ پڑتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اطمینان حاصل کرنے کا سب سے اچھا ذریعہ نشاط ہے۔ اور ازبسکہ وہ روح کو فانی تصور کرتا ہے۔ اس لئے اس زندگی کے اعمال نشاط کو بہت اہمیت دیتا ہے۔ آہ غالب

ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

خیام میں ابیقوریت کے عناصر جابجا پائے جاتے ہیں۔ تعجب کی بات ہے کہ خیام نے "حصول نشاط" کو "اطمینان خاطر" کا ذریعہ سمجھا اور تصوف کے اس مکمل نظام سے قطعاً متاثر نہ ہوا۔ جو ایران پر چھایا ہوا تھا۔

خیام انبساط اور نشاط کو تقریباً تقریباً "شراب" کا مترادف تصور کرتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ جب اس کی زبان پر اس شے کا نام آتا ہے تو اس جوش۔ لذت اور کیف سے آتا ہے کہ روح بالیدہ ہو جاتی ہے۔ شراب اس کے لئے نشاط سرمستی اور زندگی کے تمام خوشگوار اثرات کا سرچشمہ ہے۔ شراب کو اس نے مظہر نشاط بنا کر اس آتش سیال میں اپنے لئے دنیا کی دلفریبیاں پنہاں کر لی ہیں۔ ابیقوریت موجود ہے۔ لیکن ایک عجیب رنگ میں۔ انبساط کی خواہش قایم ہے۔ لیکن صرف شراب کے ذریعے۔

حقیقت یہ ہے کہ شراب کا تصور خیام کے دل پر وہ شاعرانہ کیفیت طاری کر دیتا ہے۔ جسے اختلال خیالات کہتے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مقدمۂ دیوان غالب میں رقمطراز ہیں۔

کانٹ نے اپنی کتاب KRITIK DAR URTHEILSKRAPT میں خوب کہا ہے کہ بہت سے اشعار ایسے ہوتے ہیں جن میں آزاد حسن ہوتا ہے وہ پھولوں کی طرح اپنے معنی نہیں بیان کرتے۔ بلکہ اپنی خوشبو سے مشام جان کو مسرور کرتے ہیں۔ اگر ان کے نثر کرنے اور اُن کے مطالب کے دریافت کرنے کی کوشش کی جائے تو وہ کوشش ایسی ہوگی جس طرح کوئی شخص پھولوں کی خوشبو کو پانے کی غرض سے ان کے پتوں کو توڑ کر علیحدہ کرے۔ بعض اوقات انسان پر ایک کیفیت طاری ہوتی ہے۔ اس کیفیت میں خواب کی سی حالت ہوتی ہے۔ خواب میں متخیلہ ادراک پر غالب آ جاتی ہے اور عجیب پر لطف پریشان مطلب منظاہر پیش کرتی ہے۔

بادلیئر کی مشہور نظم "میرا خواب" مرزا کے مفصلہ ذیل قطعہ سے کس قدر مشابہ ہے۔

نشہ ہا شاداب رنگ و ساز ہا مست طرب
شیشۂ مے سرو سبز جوئبار نغمہ ہے

غالب نشہ کو گل کی طرح شاداب اور ساز کو مے گسار کی طرح مست بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ شیشۂ مے سرود کے جوئبار پر ایک سرو سبز ہے بودلیر لکھتا ہے کہ شاعرانہ کیفیت میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب تمام حواس نہایت درجہ تاثرات پذیر اور ذکی الحس ہو جاتے ہیں۔ آنکھیں پردۂ ابد تک دیکھنے لگتی ہیں۔ پرشور مقامات میں خفیف سے خفیف آواز کو کان سننے لگتے ہیں۔ اور شور سے بالکل نا آشنا رہتے ہیں۔ اختلال خیالات واقع ہوتا ہے۔ اور جملہ اشیائے عالم اپنی صورت سے بسا اوقات دوسری صورتوں میں منقلب ہو جاتی ہیں۔ اور خیالات میں ناقابل حل اطلاقی تغیر پیدا ہو جاتا ہے۔ آوازیں رنگین معلوم ہونے لگتی ہیں۔ اور رنگ میں نغمہ پیدا ہو جاتا ہے۔ غالب کو نشہ شاداب اور ساز مست اور نغمہ آب رواں اور جام سرو سبز نظر آتا ہے۔ لیکن غالب میں یہ کیفیت ایک نہایت معتدل انداز اور صحیح حد تک ہے۔ رمبو کی طرح اُس حد تک نہیں پہنچی کہ جس طرح حروفی حروف کے اعداد میں معنی نہاں پاتے ہیں۔ وہ ہر حرف میں ایک خاص رنگ پاتا ہے

شراب کے متعلق خیام پر یہی کیفیت طاری ہے ساغر شراب کی تہہ میں اُسے حسین وجمیل نازنین زرنگار لباس میں مصروف رقص نظر آتی ہیں۔ شراب پھول بنکر اُڑتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اور کیف رنگ بنکر دنیا کو شوخ رنگوں میں غرق کر دیتا ہے۔

کہتا ہے۔

ما و مے و معشوق دریں کنج خراب
جان و دل و جام و جامہ در رہن شراب
فارغ ز امید رحمت و بیم عذاب
آزاد ز خاک و باد و ز آتش و آب

ساقی نظرے کہ دل خوش از دیدن تست
جاں شاد ز خوشہ چینی خرمن تست
ناگفتہ دلت ضمیر ما سیدہ اند
جام جم عاشقاں دل روشن تست

مے نوش کہ عمر جاودانی ایں است
خود خاصیت دور جوانی ایں است
ہنگام گل و مل ست و یاراں سرمست
خوش باش دمے کہ زندگانی ایں است

ساقی قدحے کہ سوز داغم نزدد
تا روغن بادہ درچراغم نزدد
بوئے کہ چوں غنچہ در دماغم زدہ ست
مغزم بشگافی از دماغم نزدد
ما سیم خریدار مے کہنہ و نو
وانگاہ فروشندۂ عالم بدو جو
پرسی کہ پس از مرگ کجا خواہی رفت
مے پیش من آر و ہر کجا خواہی رو

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خیام اپیکورس کی طرح روح کے فانی اور مادے کے غیر فانی ہونے کا قائل تھا۔

ذہن انسانی کی تمام کارفرمائیوں کی بے ثباتی اور مادے کے تفوق کی طرف وہ کئی رباعیوں میں اشارہ کرتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ کے قباد و کاؤس کی شوکت وعظمت مٹ گئی۔ لیکن وہ مٹی جن سے ان کے جسم تخلیق کئے گئے تھے۔ ابھی تک دوسری شکلوں میں جلوہ گر ہے۔ حسن وجمال کے مجسمے فنا ہوگئے۔ لیکن ان کا رنگ حسین پھولوں کے لباس میں مصروف جلوہ کاری ہے۔ کمہار خود مٹ گیا لیکن اس کے برتن زبان حال سے یہ کہتے ہوئے باقی رہ گئے۔

کوکوزہ گر وکوزہ خر وکوزہ فروش۔ یعنی انسان خود خاک میں مل گیا، اور اس کی تخلیقات جن کو وہ حقارت سے دیکھتا تھا۔ جنکو وہ اپنے ذہن کی جدت آفرینیوں کے باعث صحیح تصور کرتا تھا۔ اس کا مذاق اڑانے کے لئے باقی رہ گئیں۔

کہتا ہے۔

اے خاک اگر سینۂ تو بشگافند
بس گو ہر قیمتی کہ در سینۂ تست
ایں کوزہ چو من عاشق زارے بود است
در بند سر زلف نگارے بود است
ایں دستہ کہ در گردن او مے بینی
دستے است کہ در گردن یارے بود است
خاکے کہ بزیر پائے ہر حیوانے ست
زلف صنمے و ابروئے جانانے ست
ہر خشت کہ بر کنگرۂ ایوانے ست
انگشت وزیرے و سر سلطانے ست

خاک کو انسان پاؤں کے تلے روندتا ہے۔ اور خاموش، پائمال خاک ہنستی ہے۔ ہنستی ہے اور اس دن کے خواب دیکھتی ہے۔ جب وہ انسان کو روند دے گی۔

•

ایں سبزہ کہ امروز تماشاگہ تست
فردا ہمہ از خاک تو بر خواہد رست

یہ مادے کی فتح خیام کو مغلوب غم کر دیتی ہے۔ اور اس غم کی تلخی کو کم کرنے کے لئے وہ شراب کی تلخی کا متمنی ہوتا ہے۔

ساقی بقدر غم نہیں تلخی شراب کی ✦ لے کاش کوئی زہر ملا دے شراب میں

خیام خود تو "اطمینان قلب" کا ذریعہ ڈھونڈھتا ہے۔ اُسے شراب تشکیک کا سیلاب بہا کرلے گیا ہے۔ لیکن انسان کی جدوجہد کو دیکھکر وہ حیران ہو رہا ہے۔ آخر یہ ناچیز ذرہ کس طرف جا رہا ہے۔ کیا کر رہا ہے۔ کیوں کر رہا ہے۔ یہ سوالات ہیں جو ہر وقت اس کے دل میں پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ ان کا جواب اس کے پاس کوئی نہیں۔ اس کے علم کی انتہا ہے کہ اپنے شکوک کا اظہار کر دے۔ اور جب کوئی پوچھے تو کہدے "میں نہیں جانتا"۔ اس اعتبار سے لاادریت (تشکیک) کے عناصر بھی اس کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔ لاادریت یا تشکیک تھکے ہوئے یاس آشنا دماغوں کی تخلیق نہیں۔ بلکہ ایک آزاد بے پرواہ اور رازجو ذہنیت کی ترجمان ہے۔ انسانی فطرت کے رموز کو سلجھانے کی کوشش میں ادراک کی حدود سے پرے ما فوق الفطرت مظاہر و مناظر تک پہونچ گیا ہے۔

انسان جوشے اُمید کو سراب میں تبدیل ہوتے ہوئے دیکھ کر گر نہیں پڑتا۔ بلکہ اس کے پائے شوق میں برق کی سی تیز رفتاری پیدا ہو جاتی ہے۔ اور وہ ایک دنیا کے رموز کو منکشف کرنے کے بعد ایک اور نئی دنیا کا راز دریافت کرنے کے لئے آگے بڑھتا ہے۔ اور پھر اُسے ایسی چیزوں سے سابقہ پڑتا ہے جن کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتا۔ وہ بے اختیار یہ کہکر اعتراف عجز کرتا ہے "میں نہیں جانتا"۔ "میں نہیں جانتا" کے معنی یہ ہیں کہ "میں نہیں جانتا لیکن جاننا چاہتا ہوں"۔

عالم انسانی محدود ہے۔ مختلف اشیاء مختلف آنکھوں سے دیکھی جاسکتی ہیں۔ غائب اشیاء کا دریافت کرنا محال ہے۔ ایک ہی شے ایک ہی قسم کے حالات میں ایک شخص کو بری اور دوسرے شخص کو بھلی معلوم ہوتی ہے۔ مظاہر و مناظر فطرت کی حقیقت دریافت کرنے کا معیار نیا ہے۔

غم میں آسمان پر شفق کا جلوہ زار خون آرزو کا سیلاب معلوم ہوتا ہے غنچے دلہائے افسردہ معلوم ہوتے ہیں۔ فنا ہو جانے والی پتیوں کا مجموعہ

نظر آتا ہے۔ خوشبو دماغ کو پریشان کرتی ہے۔ ہوا کے جھونکے اپنے دوش پر بار ہائے کرب لاتے ہیں۔ اس کے برخلاف مسرت کے عالم میں دنیا پر ایک نیا رنگ چڑھ جاتا ہے۔ ہر شے شاداب اور رنگین نظر آتی ہے۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔ ع

بے یار بہار خوش نباشد

پھر یہی نہیں کہ مختلف اشیا مختلف حالات میں مختلف رنگوں میں جلوہ گر نظر آتی ہیں۔ بلکہ ان کی ماہیت دریافت کرنے کا کوئی ایسا عالمگیر ذریعہ نہیں جو خود کسی اور ذریعے کا محتاج نہ ہو۔

لاادریت انھیں اصولوں پر مبنی ہے۔

مظاہر قدرت میں انسان تخلیق اکبر ہے۔ لیکن اس کی تخلیق کی علت غائی اور اس کی جد و جہد حیات کا انجام بھی غیر متیقن ہے۔ ایک یہی دنیا نہیں جس میں حقیر انسان بستا ہے۔ بلکہ کائنات میں اور کئی کرے ہیں۔ ان کی تخلیق کا باعث کیا ہے۔ انسان کا ان سے کیا تعلق ہے؟ ازل اور ابد کے کیا معنی ہیں؟ یہ ایسے سوال ہیں جو انسان کی قوت تفکر کے پیدا ہونے کے ساتھ پیدا ہوئے ہیں۔

خیام کہتا ہے۔

دورے کہ درد آمدن و رفتن ما ست
آں را نہ بدایت نہ نہایت پیدا ست
کس مے نزند دمے دریں معنی راست
کیں آمدن از کجا و رفتن زکجا ست

تیسرا مصرع تخلیق اکبر کی علت غائی کے متعلق جو مختلف نظریے قایم ہیں ان کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ خیام نے "راست" کے لفظ سے اپنے "شک" کو پختہ کار انہ شک کے رنگ میں ظاہر کیا ہے۔ اُسے اس بات کا اعتراف ہے کہ انسان کی ابتداء و انتہا کے متعلق مختلف مذاہب ہیں۔ لیکن یہ امر ہنوز "پردہ شک" میں ہے کہ صحیح نظریہ کونسا ہے۔

مشنو سخن بہشت و دوزخ از کس
کہ رفت بہ دوزخ و کہ آمد ز بہشت
در پردہ اسرار کسے را رہ نیست
زیں تصفیہ جاں ہیچ کس آگہ نیست
جز در دل خاک ہیچ منزل گہہ نیست
افسوس کہ ایں فسانہ ہم کوتہ نیست
آسودہ دریں جہاں لئے دائم کیست
ایں نفسے زیر گے نتواں زیست

پس فائدہ در جہاں بے فائدہ چیست
از گردش چرخ ہیچ معلوم نیست
جز رنج زمانہ ہیچ موسوم نیست
ہرچند بکار خویش درے نگرم
عمرے بگذشت و ہیچ مفہوم نیست

حقیقت یہ ہے کہ خیام کا شک ایمان کے درجے تک پہونچا ہوا ہے۔

ملک ناروے کا مشہور ادیب ہنرک ابسن اپنے ناٹک "وارثان تخت" میں بادشاہ اور مغنی کے درمیان مفصلہ ذیل گفتگو لکھتا ہے۔

بادشاہ۔ تم کس طرح مغنی ہو گئے۔ تم نے فن موسیقی کس سے حاصل کیا؟

مغنی۔ جہاں پناہ۔ فن موسیقی تحصیل نہیں ہو سکتا۔

بادشاہ۔ نہیں!

مغنی۔ نہیں۔ میں نے یہ خداداد اکرام غم کے ہاتھوں پایا ہے

بادشاہ۔ تو کیا مغنی ہونے کے لئے غم کی ضرورت ہے۔

مغنی۔ مجھکو غم سے یہ دولت ملی۔ بعض کو مسرت سے یہ نعمت حاصل ہوتی ہے اور۔

بادشاہ۔ اور . . . .

مغنی۔ یقین سے جو ایمان کے درجہ تک ہو اور شک سے . . . .

بادشاہ۔ شک سے بھی۔

مغنی۔ جو ایمان کے درجے تک ہو ناقص نہ ہو۔

بادشاہ۔ ناقص شک کس کو کہتے ہیں

مغنی۔ جہاں پناہ۔ جس میں شک کرنے والے کو خود اپنے شک میں شبہ ہو۔ یہ شفق ہے نور اور ظلمت دن اور رات دونوں سے محروم رکھتی ہے۔

خیام اس ہولناک اور مہیب شفق کی بھول بھلیاں میں نہیں جو نور اور ظلمت رات اور دن دونوں سے محروم رکھتی ہے۔ "شک" کا آفتاب اس کے پہلو میں جلوہ گر ہے۔ اور اسی آفتاب کی روشنی سے اس کی دنیا کا ہر ذرہ منور ہو گیا ہے۔ اس شک کی وجہ سے وہ مختلف مذاہب و ملت کے متخالف و متضاد دعوؤں سے آزاد ہو گیا ہے۔ عقل اور مذہب کی شعبدہ کاریاں اُسے نہیں ستاتیں۔ جنت اور دوزخ کے افسانے اُسے نہیں لبھاتے۔ حقیقت اور شریعت کے نازک امتیازات اس کے لئے بے معنی ہیں۔

لہ مقدمہ دیوان غالب

کہتا ہے

رندے دیدم نشستہ خنگ زمیں
نے کفر نے اسلام نہ دنیا و نہ دیں
نے حق نہ حقیقت نہ شریعت نہ یقیں
اندر دو جہاں کرا بود زہرہ ایں

قنوطیت یا رجائیت

خیام کے کلام کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد مجھے ابھی اس امر میں شک ہے کہ اس کی رباعیات کا مرکزی خیال اور مرکزی جذبہ قنوطیت کی گہری تاریکی ہے۔ یا رجائیت کی شمع فروزاں۔

مسٹر آلڈرد تھفالڈ کا خیال ہے کہ ایرانی فطرتاً ایک یاس آشنا ذہنیت رکھتے ہیں اور قنوطیت کے عناصر ان کی اجتماعی زندگی کے اجزائے اعظم ہیں۔ ان کے خیال میں عمر خیام کی رباعیات سے مجموعی طور پر یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اس کے ذہن پر قنوطیت کا رنگ غالب تھا۔

وہ رقمطراز ہیں

"تشکیک نے یا اس کے قومی کردار سے ایک اور خصوصیت پیدا ہوتی ہے۔ عمر کے رباب شاعری سے ایک دردناک مسلسل اور متواتر نغمہ قنوطیت نکلتا ہے۔ جو اس کی رباعیات کا مرکزی خیال ہے۔ یہ نغمہ قنوطیت مدھم اور بلند سروں میں سنائی دیتا ہے۔ بعض اوقات ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خیام اس پراسرار دنیا میں تنہا ناچیز انسان کی بے بسی پر ماتم کر رہا ہے۔ کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ تغیرات عالم اور جام فنا کی تلخیوں سے متاثر ہو رہا ہے ایمان و عرفان کے نور کے بغیر انسان ایک پیکر ناامیدی بنکر رہ جاتا ہے۔ اس کا غم عام ہے۔ تمام دنیا کے لئے ہے۔ وہ ایک قوی ہیکل دیو کی طرح کائنات کے رنج و الم کو اپنے شانوں پر اٹھائے ہوئے ہے۔

خیام کے بہترین اشعار وہی ہیں جن میں عظیم و خوبصورت اشیا کے فنا ہو جانے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ فٹزجیرلڈ کے انگریزی ترجمے نے ان رباعیات کے دردناک انداز کو اور بھی تیز کر دیا ہے۔ اس کے اشعار سسکیاں لیتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔

آ۔ کہتا ہے

پیش از من و تو میل و نہارے بود است
گردندہ فلک برائے کارے بود است"

ان رباعیات کے ساتھ ساتھ جب ان اشعار کا مطالعہ کیا جائے جن میں حصول انبساط کی تلقین کی گئی ہے۔ تو یہ اندازہ قائم کرنا ذرا مشکل ہو جاتا ہے۔ کہ خیام کے اشعار کا مرکزی خیال قنوطیت ہے یا رجائیت۔

اس میں شک نہیں کہ دنیا ایک طوفان بلا ہے۔ غم و رنج کے خوفناک تھپیڑے انسان کو ساحل مقصود تک پہونچنے سے دور رکھتے ہیں۔ لیکن اس طوفان خیز فضا میں ایک طرب زار حسن و جمال بھی نہاں ہے اور اس جنت نگاہ و فردوس گوش۔ لالہ زار کی رنگینی حیات کی تمام کاہشوں کی تلافی کر دیتی ہے۔ خیام اپنی فانی زندگی کو عیش و نشاط سے لبریز کرنے کے لئے ہر شئے میں حسن دیکھتا ہے۔

لعل لب کی سرخی۔ نرگس نیم باز کی مستی اور دست حنا مالیدہ کی رنگینی کیا کم ہے۔ شفق کے دلربا جلوے۔ سحر کی ضیا پاش سحر کاری موجود ہو تو انسان غم و اندوہ کے تاریک بادلوں کی طرف کیوں نظر کرے۔ خیام بادۂ ارغواں سے غم کا بوجھ ہلکا کر لیتا ہے۔ اور اس کے بعد ساقی کی محبت میں غرق ہو جاتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اگر زندگی کا لطف حاصل کرنا ہو تو پہلے "بیخودی" کا حصول ضروری ہے۔ اس کے بغیر عقل بزرگ کار اپنے مشوروں سے دل کو آشنائے غم کرتی رہے گی۔ نشاط کا حصول صرف اس حالت وجد میں ممکن ہے جو شراب ارغواں یا شراب محبت کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔

غالب نے بھی کئی جگہ ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔

کہتا ہے۔

نہ بہار کو فرصت بہار تو ہے
طراوت چمن و خوبی ہوا کہیئے
نہ نگار کو الفت نہ نگار تو ہے
روانی روش و مستی ادا کہیئے

(باقی آئندہ)

عابد

رہرو اور رہزن

رواں ہیں رہزنوں کے قافلے صحرائے وحشت سے
یہ کیسے لوگ ہیں لڑنے چلے ہیں دیوِ فطرت سے

وہ ظلمت ہے کہ ہیبت کا فرشتہ کانپ جاتا ہے
وہ تاریکی ہے شیطانوں کا دل بھی خوف کھاتا ہے

اسی سنسان تاریکی کے وسعت گیر دامن میں
اسی سنسان خاموشی کے بے تنویر مسکن میں

جرائم کے ہلاکت آفریں ہیجان پنہاں ہیں
لباسِ آدمی میں سنگ دل حیوان پنہاں ہیں

یہ وہ انساں ہیں جن سے آدمیت خوف کھاتی ہے
یہ وہ وحشی ہیں جن سے بربریت خوف کھاتی ہے

یہ غارتگر۔ لٹیرے۔ راہزن ہیں کاروانوں کے
یہ ہیرو ہیں سیہ کاری کے شیطانی فسانوں کے

یہ جنگل ایک گہوارہ ہے خونی وارداتوں کا
یہ صحرا ایک میداں ہے جنونی وارداتوں کا

یہاں کا ذرہ ذرہ ظلم و سفاکی کا مظہر ہے
یہاں کا آسماں اک نیلگوں خاموش پتھر ہے

نیاموں سے نکل آتی ہیں جب خونریز شمشیریں
برستی ہیں اندھیرے میں جب آتش ریز شمشیریں

تھکے ماندے مسافر جب یہاں فریاد کرتے ہیں
غریب انسان جب یوں بیکسی کی موت مرتے ہیں

زمیں پر رقص جب کرتی ہیں لاشیں بیگناہوں کی
سنی جاتی ہیں جب مظلوم آہیں بے گناہوں کی

سکونِ بیکراں میں کوئی ہنگامہ نہیں اٹھتا
زمین و آسماں میں کوئی ہنگامہ نہیں اٹھتا

غیر مطبوعہ

سید عبدالحمید۔ عدم

چار دن کا عذاب

(ایک روسی افسانہ)

مجھے جنگل میں بھاگنا۔ گولیوں کی آواز سننا۔ شکستہ ٹہنیوں کا زمین پر گرنا۔ جھاڑیوں میں پناہ لینا خوب یاد ہے۔ جنگل کے دوسرے کنارے پر ایک سرخ شے نمودار ہوئی۔ دفعتاً سیدر و جو نمبر ۱ کمپنی میں ملازم تھا چارزانو ہو کر بیٹھ گیا۔ اور میری طرف بڑی بڑی اور وحشت انگیز آنکھوں سے گھورنے لگا۔ اس کے منہ سے خون جاری تھا۔ اور مجھے بھی یاد ہے کہ میں نے اسکو جھاڑیوں میں پناہ گزیں ہوتے دیکھا۔ وہ قوی ہیکل اور فربہ اندام تھا۔ میں باوجود اپنی نقاہت کے اس کی طرف تیر کی مانند سیدھا دوڑتا ہوا گیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میرے پاس سے کوئی شے نہایت تیزی سے گزری ہے۔ میرے کان انگارہ بن گئے۔ میں نے خیال کیا کہ شاید وہ مجھ پر حملہ کر رہا ہے۔ لیکن ایک مہیب چیخ کے ساتھ وہ جھاڑیوں میں پوشیدہ ہو گیا۔ شاید وہ جھاڑیوں کے اردگرد چکر کاٹتا لیکن بدحواس ہو کر اس نے اپنے آپ کو خاردار جھاڑیوں میں چھپا لیا۔ میں نے ایک ہی ضرب میں اس کے ہاتھ سے بندوق چھڑا لی۔ اور اپنا خنجر اس کے سینے میں گھونپ دیا۔ ایک گسج نے مجھے بیدار کر دیا۔ ہمارے آدمیوں کے نعرہائے انبساط سے آسمان گونج اٹھا۔ جب میں جنگل سے باہر نکلا تو مجھے بیشمار گولیاں چلنے کی آواز سنائی دی۔ یکلخت نعروں کی آواز بند ہو گئی۔ اور ہمارے آدمیوں نے قدم آگے بڑھائے۔ میں وہیں پڑا رہا یہ عجیب معاملہ تھا۔ لیکن میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب تمام آوازیں یکلخت بند ہو گئیں مجھے کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ مجھے نیلے رنگ کی کوئی شے نظر آئی۔ شائد آسمان تھا۔ لیکن پھر وہ بھی مفقود ہو گیا۔

میری عجیب حالت تھی۔ میں پیٹ کے بل لیٹا ہوا تھا۔ اور سوائے ایک چھوٹے سے ٹکڑے زمین کے اور مجھے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ گھاس کے چند تنکے۔ ایک چیونٹی جو ایک تنکے پر اوپر نیچے اتر چڑھ رہی تھی اور خشک پتوں کا ایک ڈھیر۔ یہ تمام اشیاء میری کل کائنات تھیں۔ اور میں یہ تمام چیزیں صرف ایک آنکھ سے دیکھ سکتا تھا۔ کیونکہ دوسری آنکھ کسی بھاری چیز سے بند تھی شاید وہ ٹہنی جس پر میں دراز تھا۔ میں نہایت بیتاب تھا۔ اور وہاں سے جنبش کرنے کا متمنی لیکن یہ میرے فہم و ادراک سے باہر تھا کہ میں کیوں جنبش کرنے سے قاصر ہوں۔ وقت گزر رہا تھا اور مجھے سوائے پتنگے اور شہد کی مکھی کی بھنبھناہٹ کے اور کوئی آواز سنائی نہیں دی۔ آخر بڑی جدوجہد کے بعد میں نے اپنا دایاں بازو جسم کے نیچے سے باہر نکالا اور اپنے دونو ہاتھوں کے سہارے سے اٹھنے کی سعی کی۔

کوئی شے صاعقہ نواز سرشت سے میرے تمام جسم میں سر سے لیکر پاؤں تک سرایت کر گئی اور میں پھر زمین پر گر پڑا۔ پھر عمیق تاریکی چھا گئی۔

میں بیدار ہوا۔ میں بلگاریا کے سیاہ فام آسمان پر روشن ستاروں کو کیوں دیکھ رہا ہوں؟ کیا میں اپنے خیمہ میں موجود نہیں؟ میں نے اس کو کیوں چھوڑا؟ میں نے ذرا جنبش کی تو میری ٹانگوں میں ایک جانگداز درد پیدا ہوا۔

میں مجروح ہو گیا ہوں۔ میں نے زخموں کو چھوا۔ دونوں ٹانگوں پر خون منجمد تھا۔ جب میں ان کو چھوتا تو شدت درد میں اضافہ ہو جاتا۔ وہ درد دانتوں کے درد سے مشابہ تھا۔ مسلسل اور جانگسل میرے کان شعلہ انگیز تھے اور سر پتھر کی طرح بھاری۔ میں نے خیال کیا کہ میری دونو ٹانگیں زخمی ہیں لیکن کس طرح؟ میں یہاں سے اٹھایا کیوں نہیں گیا؟ کیا یہ ممکن ہے کہ دشمن نے ہم کو شکست دی؟ اول تو ایک دھندلا سا خاکہ میری نظروں کے سامنے آیا پھر صاف طور پر میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ ہم دشمن سے شکست نہیں کھا سکتے لیکن میں یہاں سے اٹھایا کیوں نہیں گیا؟ یہ کھلا میدان ہے۔ یہاں ہر شے صاف طور پر نظر آتی ہے۔ اور صرف میں ہی نہ تھا بلکہ اور بھی۔ لڑائی نہایت جنگجو تھی۔ میں نے اپنے سر کو موڑ کر چاروں طرف ایک نظر دوڑائی۔ یہ اب آسان تھا کیونکہ جب میں گھاس اور چیونٹی کو دیکھکر اٹھنے کی جدوجہد میں گر پڑا تھا لیکن

پہلے کی طرح منہ کے بل نہیں بلکہ اپنی پشت پر۔ اسوجہ سے میں ستاروں کو دیکھ سکتا ہوں۔

میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ گو دونوں ٹانگیں مجروح ہونے کی وجہ سے یہ نہایت دقت طلب امر تھا۔ مایوسی مجھ پر کئی بار حملہ آور ہوئی۔ لیکن آخر کار میں اس پر غالب آگیا۔ شدت درد سے میری آنکھیں اشک آلود تھیں۔ میرے اوپر نیلے آسمان کا ٹکڑا تھا جس پر ایک روشن اور بہت سے مدھم ستارے چمک رہے ہیں۔ میرے ارد گرد لمبی اور سیاہ جھاڑیوں نے احاطہ کیا ہوا ہے۔

مجھے محسوس ہوا کہ میرے بال خوف سے کھڑے ہوگئے ہیں جب دشمن نے مجھے نشانہ بنایا تو میں جھاڑیوں میں آگیا۔ یہ کسقدر تعجب انگیز ہے کہ میں زخمی ہوکر یہاں رینگتا ہوا آیا۔ اور اب درد سے بیتاب ہوں اور ہلنے سے معذور۔ شاید اس وقت مجھے ایک زخم لگا ہوگا اور دوسرا یہاں پہنچکر زردی مائل روشنی نمودار ہوئی۔ روشن ستارے مدھم ہونے لگے۔ اور چھوٹے چھوٹے ستارے غائب ہو گئے۔ نورانی چاند نکل رہا ہے۔ آہ یہ گھر میں کیسا خوشنما معلوم ہوتا ہوگا

حیرت انگیز آوازیں سنائی دینے لگیں۔ گویا کوئی گریہ وزاری میں مبتلا ہے۔ کیا کوئی میری طرح بھولا بھٹکا یا زخمی میرے نزدیک ہی کراہ رہا ہے۔ گریہ زاری کی آواز بالکل قریب تھی۔ لیکن کوئی انسان نظر نہ آتا تھا۔ او خدا یہ تو میری گریہ زاری کی صدائے بازگشت ہے۔ آہستہ آہستہ اور موثر آہ و بکا کسقدر الم انگیز ہے۔ لیکن اس کی ماہیت حقیقی طور پر سمجھنے سے قاصر ہوں۔ کیونکہ میرا دماغ پریشان ہے اور سر سکے کی طرح بھاری۔

بہتر ہے کہ میں لیٹ کر سو جاؤں۔ کیا میری تقدیر میں دوبارہ بیداری سے ہم آغوشی لکھی ہے؟ لیکن مجھے اس بات سے اب کیا سروکار ہے؟

اس وقت جب میں لیٹنے کی تیاری کر رہا ہوں۔ چاند کی ایک سفید کرن اس مقام کو روز روشن کی طرح منور کر رہی ہے اور مجھے چند گز کے فاصلے پر ایک سیاہ چیز دکھائی دی۔ اور بٹن یا اسباب جنگ چمک رہا تھا۔ یا تو ایک نعش ہے یا کوئی زخمی۔ مجھے کیا میں تو آرام کرتا ہوں۔

یہ نا ممکن ہے کہ ہمارے آدمی چلے جائیں۔ وہ دشمن کو شکست دیکر اپنی حکومت کا سکہ بٹھائیں گے۔ لیکن میں خیموں میں جلتی ہوئی آگ کی آواز کیوں نہیں سنتا۔ یقیناً نقاہت نے میری قوت سماعت سلب کر لی ہے۔ وہ ضرور یہاں ہی ہونگے "مدد کرو۔ مدد کرو" میرے سینے سے خود بخود دخفیانہ آواز نکلی مگر جواب ندارد۔ آوازرات کی مرطوب ہواؤں میں گونجی۔ ہر چہار سو سکوت طاری ہے۔ چاند رحم اور ہمدردی سے مجھ پر اپنا نور برسا رہا ہے۔ اگر وہ زخمی ہوتا تو میری آواز اس کو بیدار کر دیتی۔ وہ ایک لاش ہے۔ لیکن ہماری فوج کی یا دشمن کی؟ میں اس کی فکر کیوں کروں؟ نیند نے میری دھکتی ہوئی آنکھوں کو پھر بند کر دیا۔

گو میں کچھ عرصے سے بیدار ہو چکا تھا لیکن آنکھیں بند کئے ہوئے لیٹا رہا۔ میں اپنی آنکھوں کو کھولنا نہیں چاہتا کیونکہ بند پلکوں میں بھی تمازت آفتاب محسوس کرتا ہوں۔ اگر میں آنکھوں کو کھولوں تو تکلیف ہوگی۔ اس کے علاوہ ساکت و صامت پڑے رہنا بہتر ہے۔ میرا خیال ہے میں کل زخمی ہوا تھا۔ ایک دن گزر چکا ہے۔ اسی طرح اور بھی گزر جائینگے۔ اور میں لقمۂ اجل بن جاؤنگا۔ بہتر ہے کہ میں جنبش نہ کروں اور میرا جسم ایسا ہی پڑا رہے۔ میرے لئے سکون قلب کسقدر بہتر ہوگا۔ لیکن کوئی چیز خیالات کی گردش میں مانع نہیں ہو سکتی۔ میرا دماغ گونا گوں خیالات اور ماضی کی یاد سے لبریز ہے۔ خیر یہ بہت دیر تک قائم نہیں رہ سکتا۔ اور اس کا اختتام قریب ہے۔ ہر شے فانی ہے۔ سوائے اخبار کی چند سطور جن میں ہمارے قلیل زیاں۔ استنے زخمی اور فلاں مقتول درج ہوگا۔ نہیں وہ میرا نام شائع نہیں کریں گے۔ وہ صرف "ایک مقتول" تحریر کریں گے۔ جس طرح کوئی کہہ سکتا ہے 'ایک کتا' یہ تمام منظر میرے پیش نظر ہوا۔ یہ میری گذشتہ زندگی کا المناک منظر ہے۔ زخمی ہونے سے پیشتر میں بازاروں میں گھوم رہا تھا کہ ایک مجمع نے میری توجہ کو جذب کر لیا۔ یہ مجمع ایک سفید چیز کے اردگرد جو خون سے تر اور درد سے چلا رہا تھا احاطہ کئے ہوئے تھا۔ یہ ایک خوبصورت کتا تھا جو ٹریم کے نیچے آکر کچلا گیا۔ وہ دم توڑ رہا تھا۔ عین اس طرح جسطرح کہ میں اب حالتِ نزع میں ہوں۔ ایک قلی مجمع کو چیرتا ہوا کتے کو گردن سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا لے گیا اور مجمع منتشر ہو گیا۔

کیا مجھے بھی کوئی یہاں سے لے جائیگا؟ نہیں بلکہ میں یہیں پڑا سڑ جاؤنگا۔ آہ زندگی کسقدر خوبصورت ہے۔ اس روز میں نہایت خوش تھا۔ میں ایک مست شرابی کی طرح جھوم جھوم کر گلیوں کو طے کر رہا تھا۔ او واقعات ماضی کی یاد میرا دامن چھوڑ دے۔ مجھے اذیت نہ پہنچا۔ ماضی کی مسرت اور موجودہ آلام .... درد کو برداشت کرنا اور حافظہ کی اذیت جو مشابہت کی محرک ہے سے پرہیز کرنا بہتر ہے۔ یہ اذیت دردِ دنداں سے بھی بدتر ہے۔

تپش بڑھ رہی ہے۔ سورج آتشیں ہے۔ میں نے آنکھ کھولی

تو مجھے وہی جھاڑیاں - وہی آسمان اور ایک ہمسایہ نظر آیا - وہ دشمن کی لاش ہے - وہ قوی جثہ ہے - مَیں نے اس کو پہچان لیا -

میری نظروں کے سامنے مقتول تھا - مَیں نے اس کو کیوں قتل کیا؟ وہ یہاں خون میں نہایا ہوا مردہ پڑا ہے - وہ کون ہے؟ شاید میری طرح اس کی بھی ماں بوڑھی ہوگی - کافی دیر تک وہ اپنے جگر گوشے کے لئے اپنے جھونپڑے کے دروازہ پر راہ دیکھیگی - کیا اس کا پیارا، اس کا دستگیر اس کو فکر معاش سے نجات دینے والا واپس جائیگا؟ اور میں؟ میں اس کے بدلے جاؤنگا - وہ خوش ہے وہ سنتا نہیں - وہ زخم کے درد یا تشنگی یا اس مصیبت کو محسوس نہیں کرتا - میرے خنجر نے اس کا کام تمام کیا - اس کے سینے میں ایک بڑا سیاہ داغ ہے جس کے اردگرد خون منجمد ہے یہ میرے خنجر کا زخم ہے -

میں اس کا متمنی نہ تھا - جب میں فوج میں بھرتی ہوا تو میرے دل میں کسی کو قتل کرنے کی خواہش نہ تھی - میرے خیال میں مَیں نے اپنا سینہ اس کی بندوق کا نشانہ بننا کس لئے پیش کیا تھا -

یہ بدنصیب مصری (اس نے مصری فوج کی وردی پہنی ہوئی تھی) اسقدر موردِ الزام نہیں جسقدر کہ میں - اس نے بلگاریا یا روس کا نام بھی نہ سنا تھا - اس کو جانے کا حکم دیا گیا اور وہ چلا آیا - اور اگر وہ انکار کرتا تو یا تو چھڑیوں کی ضربوں کا شکار ہوتا یا پاشا کی بندوق کا نشانہ بنتا - اس نے استنبول سے لیکر رسٹچک تک کا دور دراز اور پُرخطر سفر طے کیا - ہمارے حملہ کی انہوں نے مدافعت کی - ان کو معلوم ہوگیا کہ ہم ان کے خار اشگاف اسلحہ یا شجاعت سے خائف نہیں بلکہ برابر قدم آگے بڑھا رہے ہیں - وہ خوفزدہ ہوکر اپنی جان بچانے کے لئے بھاگنے کا متمنی تھا کہ ایک کمزور آدمی نے جس کو وہ اپنے ایک ہی تھپڑ سے موت سے ہم آغوش کردیتا - اپنا خنجر اس کے سینہ میں گھونپ دیا - وہ کس طرح موردِ الزام ہوسکتا ہے اور میں بھی کس طرح؟ گو میں اس کا قاتل ہوں - لیکن میں تشنگی کے عذاب کا شکار کیوں ہوگیا؟ پیاس؟ اس لفظ کے معنی کو کون جانتا ہے؟ جب ہم رومانیا سے گزر رہے تھے تو آفتاب کی حرارت ۱۰۵ درجہ تھی لیکن مجھے اسقدر تکلیف محسوس نہیں ہوتی تھی - آہ اگر کوئی اسوقت آجائے - او خدا اس کی بڑی کپی میں ضرور پانی ہوگا - مجھے صرف وہی درکار ہے اور اس کا خمیازہ کیا بھگتنا پڑیگا؟ لیکن مجھے اس کے پاس جانا پڑیگا -

میں نے رینگنا شروع کیا - میری ٹانگیں جکڑی ہوئی تھیں - بازوؤں میں حرکت کرنے کی قدرت نہ تھی - جسم سکے کی طرح بھاری گویا میں زمین میں جکڑا ہوا تھا - اور وہ نعش کوئی ۱۲ گز کے فاصلہ پر پڑی ہوئی تھی - لیکن میرے لئے تو یہ فاصلہ ۱۲ میل سے کم نہ تھا - میرے حلق سے شعلے نکل رہے تھے - انسان پانی کے بغیر بہت جلد مرجاتا ہے - لیکن پھر بھی میں رینگنے لگا - ہر جنبش سے میرے جسم میں ایک جانگسل درد پیدا ہوتا تھا - میں گریہ زاری کرتا ہوا رینگتا رہا - آخرکار میں اس کے قریب پہنچگیا - کپی نصف سے زائد پانی سے پُر تھی -

مقتول تو نے میری زندگی بچالی - ایک کہنی کے سہارے پر میں نے اس کا منہ کھولا اور میں یکلخت اپنے جسم توازن قائم نہ کرسکنے کی وجہ منہ کے بل اپنے نجات دہندہ کی چھاتی پر گر پڑا -

---

میں نے پانی پیا - پانی صاف - گرم اور زیادہ تھا - میرا رشتہ زندگی دراز ہوگیا - مجھے یاد ہے کہ میں نے علم وظائف الاعضا کی کتاب میں پڑھا تھا کہ انسان پانی کے ذریعہ چند ہفتے زندہ رہ سکتا ہے - اور اسی میں ایک آدمی کے متعلق مندرج تھا جس نے فاقہ کشی سے خودکشی کا اقدام کیا اور وہ پانی کی وجہ سے بہت دنوں تک زندہ رہا -

لیکن اگر میں پانچ یا چھ دن اور زندہ رہا تو پھر کیا ہوگا - ہمارے سپاہی سب چلے گئے ہیں - بلغاریا والے فرار ہو چکے ہیں - گردونواح میں کوئی شاہراہ نہیں - میری موت اس جگہ یقینی ہے - میں تین دن کے عذاب کو ایک ہفتے میں تبدیل کر رہا ہوں - کیا میرے لئے موت بہتر نہ ہوگی؟ میرے ہمسایہ کی بندوق جو انگریزی کارخانہ کی بہترین صنعت ہے اسکی بغل میں ہے - میں صرف اپنا بازو دراز کرکے اس کو حاصل کرسکتا ہوں - پھر اس مصیبت سے نجات حاصل ہوجائیگی - بہت سے کارتوس زمین پر بکھرے ہوئے ہیں - جن کو وہ استعمال نہیں کرسکا -

کیا میں اپنے آپ کو ہلاک کرلوں یا کس کا منتظر رہوں؟ کس لئے؟ نجات؟ موت؟ لیکن مجھے ہمت نہیں ہارنی چاہیئے - میں اپنے آخری لمحوں تک موت کا مقابلہ کرونگا - اگر ایک دفعہ ہمارے سپاہی میری جستجو میں کامیاب ہوگئے تو میری جان بچ جائیگی -

شاید میرے اعضا صحیح وسالم ہیں - اور وہ میری صحت کو بحال کرسکیں - میں ضرور اپنے وطن کو مراجعت کرونگا - او خدا میری ماں اور میری محبوبہ کو اس کلفت کی خبر نہ ہونے دے - ان کو میری موت کا پتہ ملجائے لیکن ان کے لئے میرے دو تین یا چار دنوں کے مصائب و آلام کی حقیقت ناقابل برداشت ہوگی -

میرا سر چکرانے لگا - میرے ہمسایہ تک کے سفر نے مجھے چکنا چور

کردیا۔ اور اب یہاں اس کی جانگداز تعفن میرے لئے سوہان روح ہے۔ اس کا رنگ سیاہ ہے کل یا پرسوں اس کی شکل وصورت کیسی تھی۔ میں بے بال وپر یہاں اس لئے پڑا ہوں کچھ دیر آرام کرکے میں واپس لوٹ جاؤنگا۔ خوش قسمتی سے ہوا ابھی اسی طرف چل رہی ہے اور اس تعفن کو اپنے ساتھ لے جائیگی۔ میں وہاں بے حس وحرکت تھکا ماندہ پڑا رہا۔ تمازتِ آفتاب سے میرا چہرہ اور ہاتھ جھلس گئے۔ میرے پاس کوئی ایسی چیز نہ تھی جس سے میں اپنے جسم کو ڈھانپ سکوں۔ میں شام کا منتظر تھا۔ میرا خیال ہے کہ یہ دوسری رات ہوگی۔

میرے خیالات منتشر ہو گئے اور میں اونگھنے لگا۔

میں بہت دیر تک اسی حالت میں پڑا رہا۔ لیکن جب میں نے آنکھ کھولی تو رات اپنا سیاہ لبادہ دنیا پر ڈال چکی تھی۔ اور سب اشیاء پہلی رات کی طرح تھیں۔ میرے زخموں میں جانگسل درد تھا۔ میرا مقتول بے حس وحرکت پڑا ہوا تھا۔ وہ میرے خیالات وتصورات پر قبضہ کئے ہوا تھا۔

کیا یہ ممکن ہوسکتا ہے کہ میں اپنے عزیز واقارب کو داغِ مفارقت دیکر اور اتنا طول طویل سفر کرکے تمازت اور اس مصیبت کا شکار ہو جاؤں۔ میں نے اس قتل کے علاوہ اور کونسے کارہائے نمایاں کو سرانجام دیئے ہیں۔

قتل؟ قاتل؟......کون؟.........میں؟

جب میں نے فوج میں بھرتی ہونے کا ارادہ ظاہر کیا تو میری ماں اور بیوی کے لبوں میں جنبش ہوئی۔ گو ان کی آنکھوں میں آنسو رواں تھے۔ میں اپنے عزم میں اندھا تھا اور ان کے اشکہائے محبت کو دیکھ نہ سکا۔ میں یہ محسوس نہ کرسکا (لیکن اب اس کا احساس ہورہا ہے) کہ میں اپنے عزیز و اقارب کو داغِ جدائی دے رہا ہوں۔ لیکن اب ان کی یاد کو تازہ کرکے اپنے آلام ومصائب میں اضافہ کیوں کروں۔ ع

گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں۔

میرے بعض احباب وشناسا سے میری بھرتی کے وقت عجیب وغریب حرکات سرزد ہوئیں۔

"یہ کیسا سودائی ہے جو ایسی خدمات سرانجام دینا چاہتا جس کا وہ اہل ہی نہیں"

بادِ سحر کا جھونکا آیا۔ جھاڑیوں میں جنبش ہوئی۔ پرندے صبح کے راگ الاپنے لگے۔ ستارے مدھم ہو گئے۔ یہ میرے تیسرے دن کی ابتدا تھی۔ میں اس کو کس چیز سے تعبیر کروں۔ زندگی یا عذاب سے؟

یہ تیسرا دن ہے۔ ابھی میری زندگی کے کتنے دن باقی ہیں۔ بہرحال چند! میں بہت لاغر اور نحیف ہوگیا ہوں اور اس نعش سے دور ہٹنے سے قاصر۔ بہت جلد ہم دونوں کی حالت یکساں ہو جائے گی اور یہ ناگواری دور۔

مجھے پانی پینا چاہیئے میں نے ارادہ کیا کہ دن میں تین دفعہ یعنی صبح۔ دوپہر اور شام کو پانی پیونگا۔

آفتاب طلوع ہوگیا۔ اس کی خون کی مانند سرخ شعاعیں جھاڑیوں سے چھن چھن کر آرہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آج کا دن کل سے زیادہ آتشیں ہوگا۔ میرے کشتے تیرے ساتھ کیا گزریگی اب ناقابل برداشت ہے۔ اس کی شکل وحشت انگیز اور بال بکھرے ہوئے تھے۔ اس کا چہرہ قدرتی طور پر سیاہ اور پژمردہ تھا۔ اور اس کی جلد اسقدر سخت ہوگئی کہ کان کی پشت سے چھٹ گئی تھی۔ اس کی پنڈلیاں جو بھاری پٹیوں سے ملبوس تھیں ورم شدہ تھیں۔ اور پٹیوں کے درمیانی حصہ میں پھپھولے تھے۔ اس کا جسم پھول کر کپا ہوگیا۔ آج تمازتِ آفتاب سے اس کی کیا حالت ہوگی؟ اس کے قریب پڑا رہنا ناقابلِ برداشت ہے۔ مجھے نقلِ مقام کی ہر ممکن جدوجہد کرنی چاہیئے۔ لیکن کیا مجھ میں اتنی طاقت ہے؟ میں اپنے ہاتھ اور پاؤں کو ہلا سکتا ہوں۔ کپی سے پانی پی سکتا ہوں۔ لیکن اس بھاری اور غیر متحرک جسم کو ہلانے سے قاصر ہوں۔ پھر بھی کوشش کرونگا خواہ ایک گھنٹہ میں نصف گز کا فاصلہ طے کیا جائے۔

اسی جدوجہد میں صبح کا وقت صرف ہوگیا۔ شدتِ درد سے جان نکلی جارہی ہے۔ لیکن مجھے اس کی پرواہ نہیں۔ مجھے اس سے زیادہ کچھ یاد نہیں اور نہ میں کبھی تصور کرسکتا ہوں کہ تندرستی کیسی چیز ہے؟ میں درد کا خوگر ہوگیا ہوں۔ میں نے درحقیقت کوئی چھ گز کا فاصلہ طے کیا ہوگا۔ کہ میں اپنی پرانی جگہ پر آگیا۔ لیکن میں تازہ اور لطیف ہوا سے لطف اندوز نہیں ہوسکتا۔ اگر ایک سڑتی ہوئی لاش سے چھ گز کے فاصلہ پر ہوا تازہ کہلائی جاسکتی ہے۔ ہوا کا رخ بدلتا رہا۔ ایک دفعہ پھر اسی خوفناک تعفن نے میرے دماغ کو پریشان کیا۔ میرے خالی دماغ کو پریشان کیا میرے خالی معدہ میں ایک پر درد تشنج پیدا ہوا اور جسم میں ارتعاش۔

تکان اور کسل سے چور چور ہو کر میں بیہوش ہوگیا۔ یکلخت میں نے انسانی آواز اور گھوڑوں کی ٹاپ سنی۔ کیا یہ میرے تخیل اور تصور ہی کی کرشمہ سازی تو نہیں؟ میں چیخ مارنے والا تھا لیکن ضبط کیا۔ بغرض محال اگر وہ دشمن ہوں تو پھر کیا ہوگا۔ وہ میرے آلام میں ایک عذاب الیم کا اور

اضافہ کریں گے جس کے خیال سے میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ میری کھال ادھیڑیں گے اور زخمی ٹانگ کے کباب بنائیں گے اور اگر وہ اسی پر اکتفا کریں تو میں اس کو ان کی کشادہ دلی پر معمول کرونگا ۔ کیا ان کے ہاتھوں میں جان بحق ہونا اس عذاب سے بہتر نہ ہوگا؟

لیکن اگر وہ ہمارے آدمی ہوئے اور کمبخت جھاڑیوں تم نے میرے اردگرد کیوں اسقدر عمیق احاطہ کیا ہوا ہے ۔ مجھے کچھ بھی نظر نہیں آتا ۔ ایک شگاف سے بہت دور ایک خندق کا دھندلا سا خاکہ نظر آسکتا ہے ۔ مجھے یاد ہے کہ اس خندق کے پاس ایک ندی ہے جہاں ہم نے جنگ سے پیشتر پانی پیا تھا اور ندی کے پار پل بنانے کے لئے ہم نے بڑے بڑے پتھروں کا انبار لگا دیا ۔ مجھے یقین ہے کہ وہ سواران پتھروں کے قریب ہونگے ۔ آواز بند ہوگئی ۔ میری قوت سماعت جواب دے چکی ہے ۔

او خدا! اگر وہ ہمارے آدمی ہیں تو میں چلاؤنگا ۔ میری آواز ندی تک پہنچ جائیگی ۔ انہوں نے ادھر آنے میں کیوں تاخیر کی ہے؟ میرے صبر کا پیمانہ چھلکا جاتا ہے ۔ مجھے اب نعش کی بدبو نہیں آتی ۔

دفعتاً ہماری فوج نے ندی کو عبور کیا ۔ ان کی سرخ گوٹ والی نیلی وردیاں دکھائی دیتی ہیں ۔ وہ نصف دستہ فوج ہے ان کے آگے آگے ایک سیاہ ڈاڑھی والا حاکم ایک پُر رعب گھوڑے پر سوار ہے ۔ جونہی انہوں نے ندی کو عبور کیا حاکم نے اپنی زین پر مڑکر حکم دیا "کوچ کرو"۔

"خدا کے لئے ٹھہرو ۔ بھائیو میری مدد کرو" میرے منہ سے ایک لرزاں فریاد نکلی ۔ لیکن میری آواز گھوڑوں کی ٹاپ اور کاسک کی باہمی گفتگو میں گم ہوگئی ۔ انہوں نے میری آواز نہ سنی ۔ آہ غضب ہوگیا ۔ مایوس ہوکر میں نے اپنا منہ زمین میں چھپا لیا ۔ اور گریہ وزاری کرنے لگا ۔ کیٹی سے جو میری بدحواسی سے الٹ گئی پانی بہنے لگا جو میری زندگی ۔ میری نجات اور پنجۂ موت سے مخلصی کا واحد ذریعہ تھا ۔ اور تپتی ہوئی زمین میں جذب ہوگیا ۔

اس اضطراب کو جو اس المناک واقعہ کے بعد مجھ پر مسلط ہوگیا احاطۂ تحریر میں لانا میری مجال سے باہر ہے ۔ میں نیم وا آنکھوں سے بے حس و حرکت پڑا رہا ۔ ہوا کا رخ بدلتا رہا ۔ کبھی تازہ ہوا کا ایک جھونکا آجاتا اور کبھی اس تعفن آمیز ہوا سے میرے دماغ کے پردے پھٹ جاتے ۔ میرا ہمسایہ اس روز ناقابل بیان وحشت انگیز تھا ۔ ایک دفعہ میں نے اس کی طرف نگاہ کی تو میرے دل میں لرزہ تنفر پیدا ہوا ۔ اس کا چہرہ غائب تھا ۔ اس کی ہڈیاں بے پوست تھیں اس سیاہ فام منہ کو دیکھکر جس میں سے بھیانک انداز سے دانت باہر نکلے ہوئے تھے ۔ میں لرزہ براندام ہو گیا ۔ گو میں نے کئی مرتبہ اپنے ہاتھوں میں کاسۂ سر اٹھایا ہے اور سر کو علیحدہ بھی کیا ہے لیکن ان درخشاں بٹنوں والی وردی میں ایک پنجر نے میرے جسم میں ایک ارتعاش پیدا کر دیا ۔

"یہ جنگ ہے" میں نے اپنے دل میں سوچا "اور وہ اس کی نعش ہے"۔

آفتاب کی حدت ہمیشہ کی طرح جلاد دینے والی تھی ۔ میرے ہاتھ اور چہرہ جھلس گیا ۔ میں نے باقی ماندہ پانی پیا ۔ میں تشنگی سے اسقدر بے تاب تھا کہ گو میں نے ایک گھونٹ پانی پینے کا ارادہ کیا ۔ مگر تمام پانی ایک ہی گھونٹ میں پی گیا ۔ آہ میں نے ان کو کیوں آواز نہ دی جبکہ وہ میرے قریب تھے ۔ اگر وہ دشمن کے آدمی ہوتے تو بھی اس عذاب سے بہتر تھا ۔ زیادہ سے زیادہ وہ مجھے ایک ایک یا دو گھنٹے اذیت پہنچاتے ۔ مگر اب تو مجھے یہ معلوم نہیں کہ میں کتنا عرصہ یہاں پڑا ہوا اس عذاب کا شکار رہونگا ۔

اماں! تو اپنے سنہری بال نوچ ڈالیگی اور اپنا سر دیوار کے ساتھ ٹکرائے گی ۔ تو اس دن کو ملامت کریگی جب میں پیدا ہوا تو اس دنیا کو جس نے انسانی تباہی کیلئے جنگ ایجاد کی لعنت بھیجیگی ۔

لیکن تجھے اور میری محبوبہ کو اس عذاب کا پتہ نہ ملیگا ۔ الوداع اماں ۔ الوداع میری محبوبہ ...... میری محبت ۔ آہ یہ کسقدر دلخراش منظر ہے ۔ میرا دل بیٹھا جاتا ہے ۔

پھر اس چھوٹے سفید کتے کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے آ گئی ۔ چوکیدار بے رحم تھا ۔ اس نے کتے کا سر نہایت بے دردی سے دیوار کے ساتھ ٹکرایا اور نالی میں پھینک دیا ۔ جسمیں عموماً گندا پانی اور غلیظ پھینکا جاتا ہے ۔ لیکن وہ اس وقت زندہ تھا ۔ اور تمام دن سسکتا رہا ۔ میں کیسا بدنصیب ہوں کہ آج تین دن سے اس حالتِ نزع میں پڑا ہوا ہوں ۔ کل چوتھا روز ہوگا ۔ پرسوں پانچواں ..... پھر چھٹا .....

آہ موت تو کہاں جا کر سوگئی آ اور مجھے اپنی آغوش میں سلا لے ۔

لیکن موت نہ آئی ۔ اور میں اس دوزخ کی آگ میں پڑا رہا ۔ میرے پاس پانی کا ایک گھونٹ نہیں جس سے اپنے خشک حلق کو تر کر سکوں ۔ تعفن نے مجھے دیوانہ کر دیا ۔ یہ تعفن کا ایک ڈھیر ہے اور ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ ۔ جب گوشت بالکل خشک ہو جائیگا تو ہڈیاں اور وردی رہ جائیگی ۔ پھر میری باری ہوگی اور میں میری حالت

جھاڑیوں میں جنبش پیدا ہوئی۔ اور آپس میں سرگوشیاں ہونے لگیں۔ "تم مر جاؤ گے۔ تم مر جاؤ گے۔" اور اس کے بالمقابل جھاڑیوں نے جواب دیا:۔

"تم نہیں دیکھو گے۔ تم نہیں دیکھو گے۔"

"کیوں تم ان کو یہاں نہیں دیکھ سکو گے" میرے قریب ہی ایک بلند آواز آئی۔ میں فوراً چونک اٹھا۔

ڈوکوتیو ہماری پلٹن کا دفعدار ہے جو جھاڑیوں میں سے میری طرف نہایت رحم و محبت سے دیکھ رہا ہے۔

"بیلچہ لاؤ" اس نے کہا "دو اور لاشیں پڑی ہیں۔ ایک ہماری اور ایک ان کی۔"

میں بولنا چاہتا تھا "ابھی بیلچہ نہ لاؤ۔ مجھے ابھی دفن نہ کرو۔ میں زندہ ہوں۔" لیکن میرے خشک لبوں سے ایک ہلکی سی آواز نکلی۔

"او خدا یہ کسطرح ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ ابھی زندہ ہو۔ یہ تو ایوانو ہے۔ چلو جلدی چلو۔ ہمارا جوان ابھی سانس لے رہا ہے ڈاکٹر کو بلاؤ" اس نے کہا۔

کچھ عرصہ بعد پانی یا کوئی اور ایسی ہی چیز میرے حلق میں ڈالی گئی پھر ایک غشی کی سی حالت طاری ہو گئی۔

تختہ ہم آہنگی سے جا رہا تھا اور اس پر مجھے آرام تھا۔ کبھی تو میری آنکھ کھل جاتی اور پھر بیہوش ہو جاتا۔ میرے بندھے ہوئے زخموں میں اب درد و کرب کا نشان بھی نہ تھا۔ ایک بے پایاں مسرت کی لہر میرے رگ و پے میں سرایت کر گئی۔

"چلو۔ نیچے رکھو۔ تختہ کو اٹھاؤ۔ روانہ ہو جاؤ۔" پیٹر اونووچ نے جو ایڈ کمپ کا حاکم تھا حکم دیا۔ وہ طویل القامت۔ دبلا پتلا اور حلیم و سنجیدہ آدمی تھا۔ اس کا قد اسقدر لمبا تھا کہ اگر میں اپنی آنکھیں اس کی طرف موڑ کر دیکھوں تو اس کے کندھے اور سر آسانی سے نظر آ سکتے تھے حالانکہ تختہ چار قوی جثہ آدمیوں نے اٹھایا ہوا تھا۔

"پیٹر" میں نے آہستہ سے کہا۔

"کیوں پیارے۔ طبیعت کیسی ہے" اس نے مجھ پر جھک کر کہا۔

"پیٹر۔ ڈاکٹر نے کیا کہا ہے؟ کیا میں بہت جلد جان بحق ہو جاؤں گا؟"

"بیوقوف۔ تم زندہ رہو گے۔ تمہارے اعصاب بے ضرر ہیں۔ لیکن تم ساڑھے تین دن زندہ کیسے رہے؟ تم کیا کھاتے رہے ہو۔"

"کچھ بھی نہیں"

"اور پیتے کیا رہے ہو۔"

"مجھے ایک دشمن سپاہی کی کپی مل گئی تھی۔ اب مجھ میں بولنے کی طاقت نہیں پھر سہی"

اچھا۔ خدا تمہارا شامل حال رہے۔ سو جاؤ۔"

پھر وہی غشی طاری ہو گئی۔

جب میری آنکھ کھلی تو میں ہسپتال میں تھا۔ ڈاکٹر اور نرسیں میرے ارد گرد جمع تھیں۔ اور ان میں ایک پیٹرز برگ کا شہرہ آفاق ڈاکٹر میرے پاؤں پر جھکا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ خون سے لبریز تھے۔ وہ کچھ عرصہ میرے پاؤں کے زخم کی مرہم پٹی میں مصروف رہا۔ پھر میری طرف نظر اٹھا کر دیکھنے لگا۔

"تم اپنی خوش قسمتی پر خدا کا شکریہ ادا کرو جس نے تمہیں زندگی بخشی ہے۔ ہمیں تمہارا ایک پاؤں کاٹنا پڑا۔ لیکن اس کا کچھ مضائقہ نہیں۔ کیا تم بول سکتے ہو" ڈاکٹر نے کہا۔

"ہاں میں بول سکتا ہوں" اور میں نے جو کچھ اوپر تحریر کیا ہے سب بیان کیا۔

(ترجمہ)

علاؤالدین

چاندنی

وہ چاندنی ہے نور کی دنیا کہیں جسے　　فطرت کا اک صبیح تجلی کہیں جسے
ہر شے ہے کائنات کی سیمیں بنی ہوئی　　ہے ذرہ ذرہ حسن کی دنیا کہیں جسے
تنویر ہے کسی کے رخ بے نقاب کی　　عاشق کے دل کی شمع تمنا کہیں جسے
برپا ہے بحر نیل میں طوفان نور کا　　ہے ہر حباب حسن کا چشمہ کہیں جسے

(غیر مطبوعہ)

اجمل

عظمت

تمہارے سامنے ایک مصلح قوم ہے۔ رائے عامہ اس کے بارے میں بالکل مختلف ہے۔ ایک جماعت اس کے علم وفضل کا کلمہ پڑھتی ہے۔ اور اسے ملائک سے کم نہیں سمجھتی۔ دوسری طرف ایک گروہ ہے جس نے اسکی مذمت وبرائی اپنا شعار بنا لیا ہے۔ معمولی انسانوں کی صف میں بھی اسے کھڑا کرنے کے لئے تیار نہیں، —— یقین جانو، کہ وہ "بڑا" آدمی ہے۔

عظمت، علم وشعر، ثروت وجاہ، سے برتر ایک چیز ہے۔ شعرا بہت ہیں۔ عالموں کی تعداد بھی کم نہیں، عظمت ایک وہی قوت ہے جو صاحب عظمت کو عام شخصیتوں سے بلند اور ممتاز کر دیتی ہے۔ اصابت رائے۔ اسلوب فکر میں عام لوگوں کو اس سے کوئی نسبت نہیں۔

ہر مسئلہ میں اس کی رائے بے لاگ ہوتی ہے، اپنے مخترعہ اصول کے سوا کسی قاعدہ وقانون کا پابند نہیں ہوتا۔ کسی انسانی عقل سے مرعوب ہونا شان عظمت کے سراسر خلاف ہے۔ اس کے ذاتی اعتماد کا یہ جائز تقاضا ہوتا ہے۔ کہ عامۃ الناس اس کے بنائے ہوئے دستور العمل کی پیروی کریں، اور اس کے نقوش پا کو نشان راہ سمجھیں۔

عظیم ترین ہستی کے تمام کارنامے مافوق العادۃ اور ممتاز نظر آئینگے۔ شاعر کا اسلوب نرالا ہوگا، اسکی زمزمہ پیرائیاں بلبل نواسنج کو شرماتی ہونگی۔ ایک انشاپرداز اپنے بلیغ انداز بیان سے دل ودماغ پر اثر انداز ہوتا ہے۔ پبلک اس کے رشحات فکر کو آنکھوں سے لگاتی ہے۔ اگر فقیہ عظمت کا مالک ہے، تو پرانے مذاہب کی بیخ کنی کے ساتھ ساتھ جدید مذہب کی طرح ڈالتا ہے۔ بادشاہ ہے تو پھر نہ پوچھئے۔ قیصر وکسریٰ کی حکومتیں اس کے قدموں پر نثار ہونگی۔ تاریخ کے صفحات اس کے درخشاں کارنامے قیامت تک دہراتے رہیں گے۔ ایک صاحب عظمت وزیر حکومت کی ایسی جدید تشکیل کرتا ہے۔ کہ ماہرین سیاست انگشت بدنداں نظر آتے ہیں۔ اگر خوش قسمتی سے رہنمائے ملت ہے، تو زمین وآسمان اس کی تعریف میں رطب اللسان نظر آئیں گے۔ اس کی معجز نمائیاں قوم کی دردمندیوں کے لئے مسیحا کا کام کریں گی۔

یہ عظمت ہے اور صاحب عظمت میں ان خوبیوں کا ہونا ضروری ہے۔ جہاں ایک عظیم ترین انسان ملک وقوم کی آنکھوں کا تارا ہوتا ہے، اس کی ذات جمہور کے لئے فتنہ سے کم نہیں ہوتی۔ اس کے سبب سے پبلک میں اختلاف ونفاق کی گرم بازاری ہوتی ہے۔ جدت پسند جماعت اس کی ہر صدا پر لبیک کہتی ہے۔ اس کی تعریف وتوصیف میں آسمان وزمین کے قلابے ملائے جاتے ہیں۔ دوسری طرف اس کا ردعمل ہوتا ہے۔ ہجو میں نظمیں تصنیف ہوتی ہیں۔ اخبارات میں اس کے خلاف زبردست پروپگنڈا کیا جاتا ہے —— جب دو جماعتیں اس قدر مختلف خیالات کی تبلیغ کریں گی۔ ایک دوسرے کی تردید میں ایڑی چوٹی سے زور لگائیگا۔ تو تصادم ناگزیر ہے۔ اور یہ دن رات کا مشاہدہ ہے کہ جوتی وپیزار تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔

عظمت وجبروت کا مالک اس جنگ وپیکار کا ہنسی خوشی مطالعہ کریگا۔ اس لئے کہ جنگ وجدال سے اس کی عظمت پر اور مہر تصدیق ثبت ہو جاتی ہے۔

یہ مقصود نہیں کہ ممتاز ہستیوں کی تمام رائیں صائب ہوتی ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ قائد جو راہ عمل تجویز کرے۔ وہ ہر حال میں صحیح ہو۔ یہ بہت ممکن ہے کہ کسی مسئلہ میں ایک معمولی انسان کی رائے اس سے زیادہ صائب اور تیر بہدف ہو۔ لیکن، ہاں! یہ صرف عظیم ترین ہستیاں ہیں۔ جن کی تعریف ومذمت میں زبان وقلم مصروف عمل ہوں۔ اور معتقدین ومقلدین کی جماعتیں برسرپیکار ہوں۔

حضرت علیؓ کی محبت میں ایک فرقہ کفر کی حد تک پہنچ گیا۔ دوسرے بغض وعداوت میں اسقدر جادۂ اعتدال سے ہٹ گئے۔ کہ بمشکل ان کے کلمہ گو ہونے کا یقین کیا جاسکتا ہے کسی نے حضرت ابوبکرؓ عمرؓ کو "شیخین" کے معزز لقب سے سرفراز کیا۔ کوئی ان کے صدق و اخلاص کا بھی قائل نہیں۔ محی الدین عربی ایک طرف "سرتاج اولیا" اور "قطب الاولیا" کے القاب سے مخاطب کئے جاتے ہیں۔ دوسری جماعت انہیں "شیخ الملحدین" ہی کہہ کر پکارتی رہی۔

دنیا نے ابن رشد کے کمالات کا اعتراف کیا۔ اس نے کرسی قضا کو زینت بخشی، فلسفیانہ نکتہ سنجیوں نے اسے "مجدد فلسفہ" کے نام سے مشہور کرایا، لیکن تاریخ کے صفحات شاہد ہیں۔ کہ جامع مسجد میں ان کے ساتھ بدترین گستاخیاں کی گئیں۔ اور آفتاب پر خاک ڈالنے

کی ناکام کوشش کی گئی،

ایک طبقہ امام غزالی کو "حجۃ الاسلام" کہہ کر پکارتا ہے۔ اس کی محبت پرستش کی حد تک پہنچ گئی ہے۔ دوسری جانب ایک گروہ نے کتاب الاحیاء کی دھجیاں فضائے آسمانی میں بکھیر کر رکھ دیں۔ لوگ حیرت و استعجاب سے ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ گئے۔ ابوالعلاء معری کی زندگی بھی معتقدین و مخالفین میں بسر ہوئی۔ ایک طرف کچھ دل و دماغ ایسے تھے جن پر اس کی عظمت کا سکہ تھا۔ کچھ مخالفین تھے۔ جنہوں نے ملحد و بیدین کہنے سے بھی دریغ نہ کیا۔ زہر کا پیالہ پیکر حسرت و یاس کے ساتھ سقراط نے دنیائے فانی کو الوداع کہا۔ کتنا دردناک سانحہ تھا۔ ہزاروں آنکھیں تھیں۔ جو حزن و الم سے اشکبار تھیں۔ لیکن اس وقت ایسے "نفوس قدسیہ" بھی دیکھنے میں آئے۔ جن کے لبوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اور فرط مسرت سے پھولے نہ سماتے۔

متنبی کے معتقدین نے اسے "ملک الشعراء" بنا کر ثریا پر پہنچا دیا۔ اس کے دیوان پر سخن گسترانہ مقدمے لکھے گئے، خصوصیات شاعری کا احیاء کیا گیا۔ دوسری طرف "سخن فہم" معاندین ہیں۔ جو اسے "شاعر" تو کیا" ناظم بھی ماننے کے لئے تیار نہیں، —— ایک طرف انگلستان میں شکسپیر کے پرستاروں کا زور ہے۔ جو اس کی ادبیت کے نشہ میں سرشار ہو کر یہاں تک کہہ جاتے ہیں —— کہ "ہم سے شکسپیر کے سوا سب کچھ لے لو"۔ دوسری طرف "ادبی کافروں" کا انبوہ عظیم ہے۔ جو اسے ایک "دروغ گو" سے زیادہ وقعت نہیں دیتا —— نیپولین کے ثنا خواں ہیں۔ جو اسے نبوت کے بام رفیع پر پہنچاتے ہیں۔ دوسرا گروہ اسے اوباش اور بازاریوں کی صف میں لا کھڑا کرتا ہے۔

لوتھر۔ نیٹشے۔ ٹالسٹائی، یہ مغرب کے مشہور عظما ہیں۔ جنہیں زندگی بھر اور موت کے بعد بھی محبت و عداوت کے جام پینے پڑے۔ جمال الدین افغانی، محمد عبدہ۔ سعد زاغلول، مصطفٰے کامل، یہ مشرق کی قابل فخر، عظیم ترین ہستیاں ہیں۔ جن میں عمر بھر دوستوں اور دشمنوں سے واسطہ رہا۔ اور جن کے بارے میں اب بھی اسقدر رائیں مختلف ہیں۔ کہ حیرت ہوتی ہے۔

× × × × × × × × ×

× × × × × × × × ×

× × × × × × × × ×

یہ "عظما" کی ایک جماعت ہے۔ جن کے بارے میں رائے عامہ اس حد تک مختلف ہے۔ کہ مناظرہ و مباحثہ تو معمولی چیزیں ہیں — کشت و خون کی نوبت پہنچ جاتی ہے۔ یہ اختلاف رائے خود ان کی عظمت و بڑائی کی واضح دلیل بہم پہنچا رہا ہے۔

زندگی کے یہ معنی ہرگز نہیں۔ کہ انسان آخری لمحۂ حیات تک پیٹ بھرنے کی فکر میں لگا رہے۔ دنیا و مافیہا سے کوئی سروکار نہ ہو۔ یہ حیوانات کی زندگی ہے۔

انسانی زندگی کا معیار اس سے بلند ہونا چاہیئے۔ انسان کا کمال یہ ہے۔ نگاہیں اس کی جانب بیتابانہ اٹھنے لگیں۔ ایک مقناطیسی کشش ہو، جو دلوں کو اپنی طرف کھینچ لے۔ زبان و قلم مدح و ثنا میں مصروف ہوں، اچھوتوں کے سینے محبت سے معمور ہو جائیں، اور بروں کے کینے سے۔

عظما کی زندگی جاودانی ہوتی ہے، ان کی مسرتیں ابدی ہوتی ہیں۔ ان کی زندگی سب سے کامیاب ہوتی ہے۔ اگرچہ دنیا میں اس کے برعکس معلوم ہو۔

عظمت کی خدمت دوست و دشمن یکساں کرتے ہیں۔ "عظمت" کا مینار تعمیر و تخریب کی انتہائی کشمکش کے بعد آسمان سے باتیں کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ جب کسی منار کے گرد معتقدین و مخالفین ہمکنار نظر آئیں۔ جان لو، کہ اس پر عظمت کی بلند و بالا عمارت تیار ہونے والی ہے۔

عظمت کی دیوار، بغض و محبت کے سہارے قائم ہے۔ جب تک یہ دو ستون اپنی جگہ پر قائم ہیں۔ عمارت بھی انتہائی کر و فر کے ساتھ اپنی سطوت و جبروت کا مظاہرہ کرتی رہیگی، یہ ناممکن ہے، کہ دیوار عظمت کا سارا بار محبت کا ستون اپنے کمزور کاندھوں پر اٹھا لیے۔

یہ کوئی تعجب انگیز بات نہیں۔ کہ دنیا تیری تعریف کے نغمے گانے لگے۔ اس لئے کہ زبان خلق اسی کی ثنا خواں ہوتی ہے۔ جو اپنی رائے سے الگ ہو کر، عوام کے اشاروں پر حرکت کرے۔ اور "زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز" کا مصداق بن جائے۔

اس سے بھی فریب میں نہ آنا، کہ دنیا تیری بغض و عداوت پر کمر باندھ لے۔ اس لئے کہ یہ شیاطین و اشرار کا خاص حصہ ہے۔

ہاں! تمہیں خوش ہونا چاہیئے۔ کہ اگر خلق اللہ تمہارے بارے میں اختلاف رائے رکھتی ہے کہ یہ عظمت کی نشانی ہے۔

ایسے رہنما بننے کی کوشش کرو۔ جس کے ارد گرد معتقدین و معاندین کا ازدحام ہو۔ اس سپاہی کی زندگی نہ اختیار کرو۔ جو شجر عظمت کے پہنچنے کے لئے اپنا خون پسینہ کی طرح بہاتا ہے۔

(منفلوطی)

مسعود عالم (نوگانوی) (ندوی)

فلسفۂ جذبات حیوانات

فلسفہ کی اُس شاخ کو جسے ہم فلسفۂ جذبات کے نام سے موسوم کرتے ہیں دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

(۱) فلسفۂ جذبات طبعی۔

(۲) فلسفۂ جذبات غیر طبعی۔

فلسفۂ جذبات غیر طبعی کی مختلف اقسام یہ ہیں۔

(۱) فلسفۂ جذبات اطفال۔

(۲) فلسفۂ جذبات مُسن۔

(۳) فلسفۂ تخلیقات مافوق الفطرت۔

(۴) فلسفۂ جذبات حیوانات

زمانۂ ماسبق میں اس آخری حصۂ علم کی طرف بہت کم توجہ کی گئی ہے۔ اُس کی مختلف وجوہات تھیں۔ اوّلاً جانور بلحاظ اہمیت انسان سے دوسرے درجے پر آتا ہے اور شیخ سعدی کے اس مقولہ کے بموجب۔ کہ ؎

تو کارِ زمین را نکو ساختی ٭ کہ با آسمان نیز پرداختی

فلسفۂ جذبات طبعی اور فلسفۂ جذبات تعلق با انسان کی تکمیل کے بعد ہی اس علم کی طرف کافی توجہ دی جاسکتی تھی۔ علم تشریح الابدان سے عدم واقفیت سنگ راہ تھی۔ کیونکہ یہ دونوں علوم بالکل لازم و ملزوم ہیں لیکن ان دنوں جب یہ بات پایۂ تکمیل کو پہنچ چکی ہے کہ ہر علم اپنی انتہا پر پہنچکر دوسرے علوم میں غرق ہوجاتا ہے تو اب یہ نہایت ضروری خیال کیا گیا ہے کہ ہر طبقۂ علم کو دوسرے علوم کے فائدے کے لئے پورے پورے غور سے مطالعہ کیا جائے۔ اس لئے فلسفۂ جذبات حیوانات کو اب بہت اہمیت دی جاتی ہے۔

ڈارون کے اس نظریہ ارتقا نے کہ مطابق کہ انسان جانور ہی کی کامل ارتقا کی شکل کا نام ہے۔ اس علم کو اور بھی اہم بنا دیا ہے۔ اور یہ مان لیا گیا ہے کہ فلسفۂ جذبات انسانی کے سمجھنے کے لئے فلسفۂ جذبات حیوانی کا سمجھنا ایسے ہی ضروری ہے جیسے مکان کی دوسری منزل تک پہونچنے کے لئے سیڑھیوں پر چڑھنا۔

اس مضمون پر جو کچھ ہم کو قدما میں سے ورثہ کے طور پر ملا ہے وہ ان بیشمار قصوں سے عبارت ہے جو راہبوں اور پالتو جانوروں کے شائقین نے نہایت کاوش سے جمع کئے ہیں۔ لیکن چونکہ تحقیقات کا کوئی علمی طریقہ استعمال نہیں کیا گیا۔ اس لئے یہ تمام قصے یکساں طور پر ناقابل اعتبار ہیں۔ چنانچہ ان کو علمی لحاظ سے بالکل بے وقعت سمجھا جاتا ہے۔

یہ سوال کہ آیا حیوانات میں ذہن اور اُس کے لوازمات یعنی قوتہائے فہم وادراک احساسات وجذبات موجود ہیں یا نہیں۔ نہ صرف فلسفیوں کے دماغوں میں بلکہ عوام کے دماغوں میں بھی مختلف صورتوں میں پیدا ہوتا رہا ہے۔ جانوروں کے متعلق زمانۂ گذشتہ کی کہانیاں جن میں اُن کو انسانوں کا سا دل ودماغ عطا کیا جاتا تھا۔ سب اسی خیال کی شہادتیں ہیں۔ مختلف مذاہب کی روایات بھی اس خیال سے خالی نہیں ہیں۔ اس سوال کا جواب اس مضمون کا صحیح مقصد ہے۔

موجودہ زمانہ کے مطابق کام کرنے کے لئے ان امور کا خیال رکھنا اشد ضروری ہے۔

(۱) یہ کہ فلسفۂ جبلت جذبات حیوانات کامل تحقیقات کے نتائج پر مبنی ہونا چاہئے۔ نہ کہ صرف تمثل اور عقل حیوانی یا طبعی کی تحقیقات پر۔

(۲) تحقیقات حتی الوسع قدرتی ماحول میں کرلی چاہئے۔

(۳) ہر واقع کو جدا اور صحیح طور پر پرکھا جائے اور اس کے متعلق تجربہ یا مشاہدہ سے پیشتر کسی قسم کی رائے دل میں قایم نہ ہو۔

چوپائے کی پیدائش کے فوراً بعد اُس کو نہایت غور سے دیکھا گیا ہے۔ اس طور پر ہم اُن کے صحیح جذبات اور احساسات کا پتہ چلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمارے علم کے لئے یہ نہایت اچھا مواد ہے۔

تجربات کے مشاہدہ کے طریقہ کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ ان کی طرز تعریح و توضیح میں بھی کامل تبدیلی واقع ہوگئی ہے۔ جانوروں کے افعال انسانی افعال کے تطابق میں فلسفۂ جذباتِ انسانی کے ساتھ مقابلہ کرکے سمجھنے چاہئیں۔ اور اُن کے ہر فعل کو ممکن طور پر سیدھے اور سادہ طور پر حل کرنا چاہئے۔ اُن کا کوئی فعل جو استیلاف اذکار حافظہ سے حل کیا جاسکے۔ اُس کو جانوروں کی غور و فکر کا شاہد نہ سمجھا جائے۔ اور جو فعل ان کے تخیل کے ساتھ منسوب کیا جاسکے۔ اُسے تمثیل تحریکی نہ سمجھا جائے یہ ایک نہایت سودمند قاعدہ ہے۔ اور اس سے مفید ترین نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ اور فوائد کے علاوہ اس قاعدے نے جبلت حیوانی سمجھنے میں مدد

دی ہے۔ اور سطحی نظر سے دیکھنے پر یہ طریقہ صحیح معلوم ہوتا۔ خیال کیا سکتا ہے کہ شک کا فائدہ جانوروں کو ملنا چاہیئے۔ یعنی جن واقعات میں انسانی حالات کے ماتحت کسی فعل کا باعث ہیجان فکری ہو وہاں ان واقعات کو فہم وادراک کا نتیجہ سمجھا جائے۔ لیکن جب ہم بارلبط گفتگو کی مثال کو لیتے ہیں تو یہ وہمی غلطی رفع ہو جاتی ہے۔ آج تک یہ خیال کیا جاتا ہے کہ جانور ایک کامل زبان بنانے کے ناقابل رہے ہیں۔ اگر اعلیٰ قسم کے جانور باوجود ربط گفتگو کرنے کے قابل ہونے کے ایک کامل زبان نہیں بنا سکے تو یہ صرف اس لئے ہے کہ ان کے پاس موضوع گفتگو کی کمی ہے۔ اور اگر یہ تجربہ درست ہے تو اُن کے دماغ ارتقا کی دو مختلف کڑیاں ہیں۔ یہ فرض کر لینا قطعی درست ہوگا کہ جانوروں کا دماغ ممکن طور پر سیدھے سادے طریقہ پر کام کرتا ہے۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انسان جو سوچ سکنے کے قابل ہے۔ شاذ ہی کبھی سوچنے کی تکلیف گوارا کرتا ہے۔ جب کبھی ممکن ہوتا ہے وہ دماغی پگڈنڈیاں کام میں لاتا ہے۔ جب بھی ممکن ہوتا ہے وہ استیلاف افکار سے فائدہ اُٹھاتا ہے یعنی گذشتہ واقعات کی یاد کو دماغ میں رکھکر ایک نامحسوس طریقہ پر اُنھیں حالات کے ماتحت بغیر سوچنے کے کاربند ہوتا چلا جاتا ہے۔ تو اس خیال کو اور بھی تقویت ہوتی ہے کہ بائیسکل کا چلانا۔ جمناسٹک کے کھیل کرتب اس کی نہایت واضح مثالیں ہیں۔ ان ابتدائی اصولوں پر کاربند ہوتے ہوئے اس مختصر سی بحث کے بعد میں چند تجربات ومشاہدات بیان کروں گا۔ جو انھیں اصولوں کے مطابق مشاہدہ کئے گئے ہیں۔

دو ماہ کا عرصہ گزرا کہ ایک کوّا منڈیر پر آ بیٹھا۔ ایک بچے نے روٹی کے تین ٹکڑے اُس کے سامنے ڈال دیئے۔ قرب وجوار میں کوئی دوسرا کوّا موجود نہ تھا۔ کوّا ٹکڑوں کو دیکھنے کے بعد تھوڑی دیر کے لئے ٹھیرا۔ پھر اُن میں سے ایک ٹکڑا روٹی کا اُٹھا کر آنگن کے ایک کونہ میں لے گیا۔ اس کونہ میں لکڑی کا ایک بوسیدہ بکس پڑا تھا۔ اس میں ایک گلی سڑی بوری پڑی تھی۔ کوّے نے چونچ سے بوری کو پرے ہٹایا۔ اور ٹکڑا اندر چھپا دیا۔ پھر اُڑ کر دوسرے ٹکڑے کو انگنائی کے دوسرے کونہ میں چند لکڑیوں کے نیچے چھپا دیا۔ اور تیسرا ٹکڑا چونچ میں اُٹھا کر اُڑ گیا۔ واقعہ سات اور آٹھ بجے صبح کے درمیان کا تھا۔ شام کو وہی کوّا پھر لوٹا اور لکڑی کے بکس کے پاس جاکر بوری کو پرے ہٹانے کے بعد چھپایا ہوا ٹکڑا لیکر اُڑ گیا۔ دوسرے روز صبح کے وقت وہ پھر واپس آیا۔ اور لکڑیوں کے پاس جاکر دوسرے کونے میں سے ڈھونڈھ کر چھپا ہوا ٹکڑا نکال کر اُڑ گیا۔ کیا یہ سب واقعات اور کوّے کے افعال جبلت حیوانی کا نتیجہ معلوم ہوتے ہیں؟ یقیناً کوّے کے دماغ میں مفصلہ ذیل سلسلہ خیالات پیدا ہوئے ہوں گے۔ روٹی کے ٹکڑے تین ہیں ایک وقت میں میں صرف ایک لیجا سکتا ہوں کوئی اور کوّا یا کوئی دوسری چیز بھی انھیں لیجا سکتی ہے۔ کسی ایسی جگہ ان کا چھپانا لازمی ہے کہ کوئی دیکھ کر نہ لیجا سکے۔ اگر باقیماندہ دونوں ٹکڑے چھپائے گئے تو جو کوّا ایک کی جگہ دریافت کر لیگا وہ دوسرے کو بھی لیجائے گا۔ پھر یہ واقعہ اس کی قوت حافظہ کا شاہد ہے کہ صبح کا واقعہ اُسے نہ صرف شام تک بلکہ دوسرے دن تک یاد رہا۔ سب سے آخر میں کوّے کا تین دن تک گننے کے قابل ہونا اور جمع اور تفریق کے سوالات تین ہندسوں تک حل کر سکنا تجربہ (۲) چند دن ہوئے میں نے پھر ایک تجربہ کیا۔ دس بارہ ٹکڑے روٹی کے چھوٹے بڑے انگنائی میں ڈال دیئے۔ چند کوّے آئے اور مختلف ٹکڑے اُٹھا کر اُڑ گئے۔ سب سے آخر میں ایک کوّا آیا۔ پاس پاس پڑے ہوئے دو ٹکڑے باقی تھے اُس نے اُن میں سے ایک ایک ٹکڑا اُٹھایا اور پھر اُسے پھینک دیا۔ اور دوسرے کو اُٹھا کر منڈیر پر جا بیٹھا۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ اُس کا یہ فعل اتفاقیہ تھا یا جان بوجھ کر کیا گیا۔ میں نے اس کوّے کو مار کر بھگا دیا۔ مقابلہ کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ ٹکڑا جو بعد میں لیجایا گیا پہلے کی نسبت بڑا تھا۔ یہ کوّے کی قوت امتیاز ظاہر کرتا ہے۔

ایک صاحب ایک پالتو کتے کو ایک خالی کمرہ میں لے گئے۔ اور وہاں جاکر ایک سوکھی ہڈی اُس کے سامنے ڈال دی۔ چونکہ ہڈی میں کوئی کھانے کی چیز نہیں لگی ہوئی تھی اس لئے کتے نے اُسے بالکل نہ چھوا۔ اُن صاحب نے اس ہڈی کے ساتھ ایک باریک ڈور باندھ رکھی تھی جو چھت کے ساتھ پنکھے کے انکڑے میں سے نکلتی ہوئی پنکھے کے سوراخ کے رستہ کمرہ کے باہر نکل جاتی تھی۔ کمرے کے دروازے بند کرکے وہ صاحب خود باہر نکل آئے۔ اور ڈور کا سرا اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس عرصہ میں کتا ایک نامحسوس طریقہ پر ہڈی کی طرف نظر جمائے بیٹھا رہا۔ دو منٹ کے بعد ڈور کو دفعتاً کھینچا گیا۔ ہڈی گز بھر اونچی زمین سے اُٹھی اور پھر گری۔ یہ دیکھ کر کتا چیخ اُٹھا اور پرے کونے میں دوڑتا ہوا جاکر بھونکنے لگا۔ اس تجربہ سے کتے کے دماغ پر یہ عمل ظہور پذیر ہوا ہوگا۔ کہ ہڈی ایک ایسی چیز ہے جو اُس نے اس سے پیشتر خود بخود کبھی حرکت کرتے نہیں دیکھی۔ کمرہ میں کوئی اور موجود نہیں جو اُسے حرکت دے سکتا۔ ہڈی نے فوری حرکت کی چنانچہ اُس خشک ہڈی میں کوئی ایسی خلاف فطرت چیز موجود ہے جو اُس کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ اور وہ اُس سے خائف ہو گیا۔

نیا تجربہ۔ مرغیوں کے چور جانوروں کی جبلت حیوانی سے یوں فائدہ اُٹھاتے ہیں کہ سردی کی راتوں میں گاؤں میں ڈربہ کے قریب آتے ہیں۔ مرغیوں کا ڈربہ بالعموم صحن میں بنا ہوتا ہے۔ پھر حقے کی ملکی کا ایک سرا

ڈربے کے اندر کسی سوراخ کے راستہ اندر کر دیتے ہیں۔ دوسرے سرے کو منہ میں رکھ کر زور سے پھونکیں مارتے ہیں۔ مرغیاں دم بخود ہو جاتی ہیں پھر وہ دروازہ کھول کر ایک ایک کو پکڑ کر ان کی چونچیں بند کر کے لے جاتے ہیں۔ مرغیاں نلکی میں سے نکلے ہوئے سانس کو غالباً سانپ کی پھنکار سمجھتی ہیں جو اُن کا فطری دشمن ہے۔ اور اس لئے ڈر کر بالکل خاموش رہتی ہیں۔

ہمارے گھر کے سامنے ببول کے پیڑ پر کوؤں کا جوڑا رہتا تھا۔ میرے ایک قریبی رشتہ دار جو ہسپتال میں کام سیکھنے جایا کرتے تھے۔ کام پر جاتی دفعہ ہمارے ہاں ہو کر جایا کرتے تھے۔ ایک روز آ کر اُنھوں نے کوؤں کا گھونسلا اُتار ڈالا۔ اور بچے مار ڈالے۔ اُس روز سے کوؤں کا جوڑا اُن کا ایسا دشمن ہوا کہ جب وہ ہمارے ہاں آتے اُن کے سر پر کائیں کائیں کرتے ہوئے اُڑتے رہتے۔ یہاں تک کہ ہسپتال تک جو قریب ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلہ پر واقع ہے اُن کے ساتھ ساتھ جاتے اور وہاں پر بھی یہی تماشا جاری رہتا۔ یہ سلسلہ دس بارہ روز تک قایم رہا۔

اپنے بچوں سے کوؤں کی محبت بدلہ لینے کا مادہ اُن کے دماغ میں رہنا۔ اس واقعہ کی یاد اتنے دنوں تک قایم رہنا اس مشاہدہ کے ماحصل ہیں۔

رابر کتا جو اس وقت میرے پاس ہے میرے ایک قریبی عزیز کے ہاں تھا۔ اُن کو شکایت تھی کہ وہ جونہی کوئی کتاب دیکھتا ہے پھاڑ ڈالتا ہے اور کپڑوں کا تو ایک دشمن ہے۔ میں اُن کے ہاں سے کتا لے آیا۔ اور صحن میں لا کر باندھ دیا۔ آتے ہی میں نے ایک کتاب اُس کے سامنے ڈال دی۔ پرانی عادت کے مطابق اُس نے اُسے اُٹھا کر جھنجھوڑا۔ ایک ہنٹر جو پہلے ہی سے تیار رکھا رسید کیا گیا۔ پھر خاموش۔ یہی عمل کتے نے کے بعد دیگرے چار بار کیا۔ اور متواتر ہنٹر کھاتا رہا۔ اُس کے بعد آج تک کتے نے منہ نہیں لگایا۔ یہی عمل کپڑوں کے بچاؤ کے لئے بھی کیا گیا۔ غور کرنے پر معلوم ہوگا کہ تین بار تک تو کتا کتاب کے پھاڑنے اور ہنٹر کے لگنے میں کوئی علت معلول کا تعلق قایم نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن چوتھی بار اُسے معلوم ہوگیا کہ ان دونوں چیزوں میں کچھ نہ کچھ تعلق ضرور ہے۔ پھر کتے کی یاد نے اُس کی مدد کی۔ اور اُس نے ہمیشہ کے لئے کتابیں پھاڑنا بند کر دیں۔ سرکس کے تمام جانور اسی اصول پر سدھائے جاتے ہیں۔

ہمارے مکان میں ایک روز اچانک کئی ہزار کیڑے نکل آئے۔ وجہ یہ تھی کہ اُن کے قریب شکر کا کھلا ٹین پڑا ہوا تھا۔ تین دن تک یہ کام چھوٹے بچوں کے سپرد کیا گیا کہ جو کیڑا سوراخ سے نکلے واپس نہ جائے لیکن ان میں ذرہ بھر بھی کمی واقع نہیں ہوتی تھی۔ چوتھے روز کسی نے ایک ترکیب بتائی۔ آٹھ نو مرغی کے بچے لا کر چھوڑ دیئے گئے۔ اب وہاں پر ایک بھی کیڑا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اگرچہ مرغی کے بچوں کے چلے جانے کے چند گھنٹے بعد وہ پھر نکلنے شروع ہو گئے۔ اس مشاہدہ سے یہ معلوم ہوا کہ گو چھوٹے بچوں نے اُن کو کئی روز تک برابر ہلاک کیا۔ لیکن چونکہ انسان کیڑے کا فطرتی دشمن نہیں ہے۔ اس لئے کیڑوں کے دماغ میں اُن کی طرف سے قدرتی خوف نہیں پیدا ہوتا تھا۔ برخلاف اس کے چونکہ مرغی کے بچوں کی خوراک کیڑے مکوڑے ہیں۔ اس لئے اُنھیں دیکھتے ہی اُن پر فطرتاً خوف چھا گیا۔ اور وہ چھپ گئے۔ یہ قدرتی یا فطرتی خوف جبلت حیوانی میں تبدیل ہو گیا ہے۔ اور اس میں اُن کی سمجھ یا فہم کا کوئی حصہ نہیں۔

حیات اینڈ برادرس کی اُس شاخ میں جو گجرات میں واقع ہے ایک روز مجھے ایک دوست کے ساتھ جانے کا اتفاق ہوا۔ کارخانہ کے منیجر ہم کو شو روم میں لے گئے۔ دروازہ سے داخل ہوتے ہی ہم نے ایک ایسی چیز دیکھی کہ دفعتاً رک گئے۔ دیکھا کہ ایک سانپ کوئی ڈیڑھ گز لمبا تین انچ موٹا منہ کھولے زمین پر پڑا ہے۔ چھت کے قریب ایک چوہا چڑ چڑ کر رہا تھا۔ چوہا نہایت بیتابی سے دو فٹ دیوار پر سے نیچے اُترتا۔ اور ڈیڑھ فٹ اوپر چڑھ جاتا۔ یونہی چند منٹ اُترتا اور چڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ زمین پر اُتر آیا۔ سانپ ویسے ہی منہ کھولے بےحس و حرکت پڑا تھا۔ بھاگ کر خود بخود چوہا سانپ کے کھلے ہوئے منہ میں داخل ہو گیا۔ اور سانپ اُس کو نگل گیا۔ اس موقع پر چوہے کو کوئی فوری خوف نہیں تھا۔ بلکہ خوف جبلت حیوانی کی وجہ سے اُس کی فطرت میں داخل ہو چکا تھا۔ اور چوہے کو سانپ نے اس خوف کی وجہ سے زیر اثر لا کر ہپناٹائز کر دیا تھا۔ اس وقت خوف اور اُس کے لوازمات تمام و کمال چوہے کے بدن اور اُس کی حرکات سے ہویدا تھے۔ اور سانپ کی توجہ دیکھنے قابل تھی۔

جانوروں پر راگ کا اثر

انسان راگ کو پسند کرتا ہے۔ اور بہتیرے ادنیٰ درجہ کے جانوروں یعنی حیوانات میں بھی یہ احساس لطف پایا جاتا ہے۔

ہم چند تجربات کا نتیجہ جو لندن کے چڑیا گھر میں کئے گئے بیان کرتے ہیں۔ ایک بینڈ باجہ جس میں دو وائلن ایک بانسری اور ایک منہ سے بجانے کا باجا تھا۔ ہر ایک جانور کے پاس باری باری سے لیجائے گئے نتائج اگرچہ پریشان کن تھے۔ لیکن دلچسپ تھے۔

مثال کے طور پر گینڈے کے لئے راگ کوئی دلچسپی نہیں رکھتا تھا اور کوئی بھی راگنی گائی جائے وہ یوں حملہ کرتا ہوا دوڑتا تھا کہ گویا بینڈ کو

توڑ دا سے گا۔ دھیمے سلانے والے سر، اور اونچے سر اُس کی قوت غضب کو یکساں طور پر متحرک کر رہے تھے۔ برخلاف اُس کے دریائی گھوڑا سوائے جاز کے باقی ہر قسم کے سروں کو پسند کرتا تھا۔

بیشتر نغمے جو گینڈے کو غضب آلود کر دیتے تھے اُن کے لئے خوش آہنگ تھے۔ وہ اگلے پاؤں کھڑے کر کے جنگلے کے ساتھ ٹیک لگا کر نہایت غور سے سنتے تھے۔ حتیٰ کہ جھنجھناہٹ کی آخری سریں بتدریج فضا میں غائب ہو جاتیں۔ یہاں پر مقصد حقیقی کا کوئی سوال نہیں تھا۔ چڑیا گھر کے دریائی گھوڑے اپنے محافظ کو دیکھ کر مسرور ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ اُن کو تازہ مچھلی کی یاد دلاتا ہے۔ لیکن یہاں خوراک کا کوئی سوال نہیں تھا۔ طوفان باد و باران بجلی کی کڑک اور توپوں کی گرج دریائی گھوڑوں پر کوئی اثر نہیں ڈالتی۔ اس لئے یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ صرف آواز ہی اُن کو اپنی طرف راغب کر لیتی تھی۔

چڑیا گھر کے بھیڑیئے اور گیدڑ نہایت خوشی سے راگ کی طرف متوجہ ہوتے تھے۔ جونہی کہ ہلکے سروں میں کوئی راگ گایا جاتا وہ اپنی تھوتھنیاں آسمان کی طرف کر لیتے اور اس قدر شور مچاتے کہ بینڈ کی آواز اُس میں ڈوب جاتی۔ چیتا خوب محظوظ ہوتا تھا۔ گایوں کے سامنے جب میٹھے سروں میں کوئی راگ گایا جاتا تو وہ پہلے کی نسبت زیادہ دودھ دیتیں۔

ناظم تالاب ہائے چڑیا گھر لکھتے ہیں کہ بینڈ مگرمچھ کو بلاناغہ اپنی طرف راغب کرتا تھا۔ حقیقتاً بینڈ بجنے پر تمام تالاب خالی ہو جاتے اور ہر جانور کناروں پر آ کر سر پانی سے باہر نکال کر دلچسپی سے راگ سننے لگتا۔ حشرات الارض میں سے بچھو راگ میں دلچسپی لیتے تھے۔

یہ ایک عجیب واقعہ ہے کہ تمام اقسام کے پرند راگ سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔ بلکہ بعض تو سنکر برافروختہ ہو جاتے ہیں۔

نغمہ اور شور

اس قسم کے تجربات کا خلاصہ لکھنا ایک دشوار امر ہے۔ ظاہراً ایک قسم کے جانور کا نغمہ دوسرے کے لئے ناپسند شور ہو گا۔ اور وہی دلچسپ نغمہ جو پرجوش اور مجذوب دریائی گھوڑے کو حلقہ بگوش کر لیتا ہے۔ سرد مزاج بلغمی کاہل گینڈے کو برافروختہ کر دے گا۔

جانوروں کے گیت جو ہمارے لئے بے ربط و بے معنی شور سے زیادہ نہیں ہیں۔ جن کے لئے مقصود ہوتے ہیں۔ اُن کے دلوں میں وجد کی حالت پیدا کر سکتے ہیں۔

بلی کی پرآشوب صداؤں اور پرانے مقبرہ کے کھنڈرات میں سے اُلو کی چیخ سننے والوں کے لئے یکساں طور پر دلچسپ ہو سکتی ہے۔ یہ کہنا نہایت مشکل ہے کہ کہاں نغمہ شروع ہوتا ہے اور کہاں پر محض شور ختم ہو جاتا ہے۔ مثلاً موسم گرما میں ہمارے بجلی گھروں ہر سال ڈائنیموں سے چھو چھو کر کروڑوں مچھر فنا کا جام پیتے ہیں۔ ڈائنیموں کی بھن بھناہٹ نروں کو نہایت مرغوب ہوتی ہے۔ اور وہ غالباً اُسے کسی محبوب کا نغمۂ محبت سمجھتے ہیں۔ بعض جگہ مچھر کی اس فطری کمزوری سے فائدہ اُٹھایا گیا ہے۔ اور اُن کے فنا کرنے میں مدد لی گئی ہے۔ ایک امریکن انجینیئر نے اس مشاہدہ کو کام میں لا کر ایک ایسا آلہ ایجاد کیا ہے جو ایک خاص قسم کی آواز پیدا کرتا ہے۔ یہ آواز مچھروں کے لئے نہایت پسندیدہ ہوتی ہے۔ مچھر اس آواز کو سنکر بیتاب ہو ہو کر اُس پر گرتے ہیں اور بجلی سے جلکر خاک سیاہ ہو جاتے ہیں۔

اس [illegible] ہیں کہ بعض قسم کے چوپائے راگ سے مسحور ہو جاتے ہیں۔ اور ز[illegible] کے قصص جن میں اُن کا ذکر ہوتا ہے قدرے حقیقت پر مبنی [illegible] ایک قصہ جو دنیا بھر میں مشہور تھا نہایت بری طرح سے جھٹلایا گیا [illegible] سانپ کا راگ پر عاشق ہونا وغیرہ۔ تجربات سے یہ بات پایۂ ثبوت [illegible] چکی ہے کہ کسی قسم کے سانپ نے کسی قسم کے راگ کے ساتھ [illegible] دلچسپی ظاہر نہیں کی۔ سپیروں کا سانپ کو بین پرست کرنا محض اُن [illegible] فریب ہے۔ سانپ مست نہیں ہوتا بلکہ فطرت سے مجبور ہو کر سپیرے کی بین کو جو اُس کے ہاتھ میں ایک باقاعدگی کے ساتھ لہراتی ہے۔ [illegible] کو اُٹھتا ہے۔ اور چونکہ ہر بار بین کے ساتھ جاتا ہے اس لئے لوگ اُس کو ناچتا ہوا تصور کرتے ہیں۔

جانوروں پر انسانی راگ کا اثر ایک مشکوک امر ہے۔ لیکن عام قسم کے جانور اپنی نوع کے راگ [illegible] کرتے ہیں۔ خصوصاً نغمہ ہائے اُلفت کو تقریباً ہر قسم کے پرند [illegible] کے موسم میں راگی بن جاتے ہیں۔ بعض قسم کے بندروں اور [illegible] کے گلے ارغنوں کی قسم کے ہوتے ہیں۔ اور رات کو [illegible] کی آواز اور موسم برسات میں مینڈکوں کا مل کر ٹرانا۔ اس قسم کی راگ کی [illegible] ترین مثالیں ہیں۔ ایک قسم کا جانور یعنی جنگلی چوہا مادہ کو اپنے [illegible] کی خاص قسم کی رگڑ سے آواز

جنّت

وہ بالکل بیکار تھا، نکما تھا، اسے کوئی کام نہ تھا، صرف طرح طرح کے شوق تھے، وہ لاٹری کے مربع ٹکڑوں پر مٹی ڈال کر بجایا کرتا۔ بس اس کا یہی کام تھا۔ گھر میں ہر شخص اس کی شکایت کرتا، نفرت کی انتہا نہ تھی، وہ خود بھی کبھی کبھی عہد کر لیا کرتا تھا کہ اب میں اس پاگل پن کو چھوڑ دوں گا۔ لیکن پاگل پن اس کو نہ چھوڑتا۔

(۲)

بعض لڑکے سال بھر تک بالکل نہیں پڑھتے پھر بھی امتحان میں کامیاب ہو جاتے ہیں، ٹھیک یہی اس کا انجام ہوا، اس کی تمام عمر تو بے عملی میں بسر ہوئی لیکن مرنے کے بعد اسے معلوم ہوا کہ اسے آسمان میں جگہ مل گئی ہے، قسمت آسمان کی راہ میں بھی ساتھ نہیں چھوڑتی، فرشتوں نے اسے بے عملوں کے آسمان میں لیجانے کے بجائے باعملوں کے آسمان میں داخل کر دیا۔ اس آسمان میں اور سب کچھ تو تھا لیکن اطمینان نہ تھا، یہاں مرد کہا کرتے تھے کہ دم لینے کی فرصت نہیں، عورتیں کہتیں کہ۔ میں تو چلی کام پڑا ہوا ہے، غرض سب یہی کہتے کہ وقت قیمتی ہے۔ یہ کوئی نہیں کہتا کہ وقت بے قیمت ہے۔ جو تھا یہی کہتا کہ اب تو ہم سے کچھ اور نہیں ہو سکتا، باوجود اس پریشان حالی کے سب خوش تھے، اکثر شکایت کرتے کرتے صرف یہ کرتے کہ کام کرتے کرتے حیران ہو گئے۔

اس بیچارے کو کہیں بھی عافیت نہ تھی، نہ اس سے کسی کی موافقت ہوتی تھی، وہ راستے میں اپاہجوں کی طرح چلتا جس سے مصروف کار لوگوں کو بیحد دقت ہوتی، وہ اگر کہیں چادر بچھا کر چاہتا کہ بیٹھے اور آرام کرے تو کوئی نہ کوئی آکر اس سے ضرور کہتا کہ۔ ارے بھئی یہ کھیت ہے، اس میں دانے بوئے ہوئے ہیں، پھر اسے وہاں سے اٹھ جانا پڑتا۔

(۳)

ایک لڑکی روزانہ پابندی کے ساتھ گھڑا لیکر آسمان کے ایک چشمے سے پانی بھرنے آتی تھی، جو ستاروں کے تاروں کی طرح راستے پر تھرکتی ہوئی چلتی تھی، وہ جلدی جلدی بالوں کو سنوار کر جوڑا باندھ لیتی تھی پھر بھی دو چار بال اس کے چہرے پر بکھرے ہوئے رہ ہی جاتے تھے، گویا وہ اس کی آنکھوں کی سیاہی دیکھنے کے لئے جھانکتے رہتے تھے۔

وہ نکما چشمے کے کنارے ایک طرف درخت کی طرح چپ چاپ کھڑا رہتا تھا۔

جس طرح کھڑکی سے کسی مسکین کو دیکھ کر شہزادی کو ترس آجاتا ہے اسی طرح اس بے عمل نکمے کو دیکھ کر لڑکی کا دل ہمدردی سے لبریز ہو گیا۔

لڑکی نے کہا۔ معلوم ہوتا ہے تمھیں کوئی کام نہیں ہے۔

اس نے زور دیکر کہا۔ کام تو کروں، لیکن اس کے لئے وقت نہیں ہے۔

لڑکی کچھ سمجھ نہ سکی۔ اس نے کہا۔ مجھ سے کام لوگے؟

اس نے کہا۔ تم سے کام ہی لینے کے لئے تو میں یہاں کھڑا ہوں۔

لڑکی نے کہا۔ کیا کام دوں؟

اس نے کہا۔ تم پانی بھرنے کے لئے جو گھڑے لاتی ہو۔ ان میں سے ایک گھڑا مجھے دیدو۔

"گھڑا لیکر کیا کروگے پانی بھروگے؟"

"نہیں میں اس پر تصویر بناؤں گا۔"

لڑکی نے گھبرا کر کہا۔ میں جاتی ہوں، مجھے فرصت نہیں ہے۔

اسی چشمے پر روزانہ دونوں کی ملاقات ہوتی اور وہ روز یہی کہتا کہ مجھے اپنا گھڑا دو۔ میں اس پر تصویر بناؤں گا، آخر مجبور ہو کر لڑکی نے گھڑا دیدیا۔ وہ اس کو لیکر اس پر تصویر بنانے لگا، مختلف قسم کے رنگ تھے اور مختلف قسم کے خطوط،

تصویر بن جانے پر لڑکی نے اسے خوب غور سے دیکھا، پھر بھویں ٹیڑھی کرکے پوچھنے لگی۔ اس کا مطلب؟

اس نکمے نے کہا۔ اس کا مطلب کچھ بھی نہیں۔

لڑکی گھڑا لیکر گھر چلی گئی، وہ دن میں سب کی آنکھ بچا کر اسے دیکھا کرتی رات کو بستر سے اٹھ کر اور چراغ جلا کر اس تصویر کو دیکھتی، اس نے اپنی زندگی میں پہلی بار ایسی چیز دیکھی جس کا کوئی مطلب نہیں۔

اس روز بھی اس نکمے سے ملاقات ہوئی۔

لڑکی نے کہا۔ اب کیا چاہتے ہو؟

"تم سے کام چاہتا ہوں"

"کون سا کام دوں؟"

"اگر تم پسند کرو تو میں رنگین سوت سے چوٹی باندھنے کا ڈورا طیار کردوں۔

"اس سے کیا ہوگا؟"

"کچھ نہیں"

اب ڈورے طیار ہونے لگے اور آئینہ لیکر پٹی باندھنے میں لڑکی کو دیر ہونے لگی، کام پڑا رہ جاتا تھا اور وقت نکل جاتا تھا۔

(۴)

دیکھتے ہی دیکھتے باکار لوگوں کے آسمان میں بڑا خلل پڑ گیا۔ منتظمین آسمان بہت پریشان ہوئے۔ انھوں نے ایک کمیٹی کی اور کہنے لگے کہ اب سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا۔

آسمان کے کارندے نے اپنا قصور تسلیم کیا۔ اور کہنے لگا میں نے غلطی سے ایک نکمے کو اس آسمان میں داخل کر لیا۔

وہ نکما کمیٹی میں بلایا گیا۔ اس کی رنگین پگڑی اور کمربند دیکھ کر لوگوں نے کہا واقعی بڑی غلطی ہوئی۔

صدر نے کہا۔ تمھیں پھر زمین پر واپس جانا ہوگا۔

وہ اپنی رنگین پگڑی کو ہلاتے ہوئے بولا۔ تو پھر میں رخصت!

لڑکی بولی۔ میں بھی جاؤں گی۔

صدر حیران سا ہوگیا۔ اس نے بھی پہلی ہی بار ایسا واقعہ دیکھا جس کا کوئی مطلب نہیں ٭

(ٹیگور۔ بذریعہ سرسوتی ہندی)

ابو محمد امام الدین مدیر ترجمان

بنارس

خزینۂ دانش

پھول مرجھا کر انسان کو دنیا کے فانی ہونے کا پیغام دیتے ہیں۔ لیکن فانی انسان نہیں دیکھتا۔ نہیں سنتا۔ دنیا فنا ہو جائیگی اور صرف خدا باقی رہ جائے گا۔ ہر عشرت کے ساتھ غم ہے۔ پھول کے ساتھ کانٹے ہیں۔

(فارسی)

اروائے دیراف نامہ

تاج

یہ عمارت فن تعمیر کا ایک رنگین نقش ہی نہیں بلکہ ایک مغرور اور بے نیاز بادشاہ کا شعلۂ محبت ہے۔ جو زندگی سے لرزاں پتھر کی صورت میں آسمان کی طرف مائل پرواز ہے۔

جس طرح ایک خوبصورت نازنین کے شعلہ ہائے حسن و جمال کے سامنے انسان کی تمام سوتی ہوئی قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں خون رگوں میں جوش مارنے لگتا ہے اور سانس لیتے میں رکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ عین اسی طرح کے جذبات تاج کا نظارہ پیدا کرتے ہیں۔

مسٹر اے ای ارنلڈ

دعا

روح کی سچی خواہش کا نام ہے۔ یہ ایک پوشیدہ شرار کی گرمی ہے۔ جو سینے کی گہرائیوں میں درخشاں ہے۔

مانٹگمری

تبصرے

جدید مطبوعات

اسلامی تصوف

مترجم۔ مولانا عبدالرحیم صاحب ناظم مکتبۂ علوم

قیمت ۱۲؍ ۔ مقام اشاعت الہلال بک ایجنسی ۔ شیرانوالہ دروازہ لاہور

فاضل مترجم نے شیخ الاسلام حافظ ابن قیم الجوزی کی تصنیف طریق الہجرتین حصہ اول کا ترجمہ کرکے ایک اہم خدمت انجام دی ہے ۔ اس کتاب میں اسلامی تصوف کے بنیادی اصولوں کو واضح کیا گیا ہے ۔ مفید کتاب ہے اور ان داموں سستی ہے ۔

پیمانۂ محبت

تضمین بر غزلیات غالب
غزلیات وقطعات

مصنف۔ منشی مولابخش ہمدم ۔ پبلشر منشی محمد اسلم کلاکوٹ کراچی شہر ۔ قیمت درج نہیں ۔

ہمدم صاحب کی تضمینوں اور غزلوں کا مجموعہ ہے ۔ تضمینیں اکثر بے لطف ہیں ۔ اور قیامت یہ ہے کہ صرف بے لطف ہی نہیں بلکہ غالب کے پرواز تخیل کو نہایت ہی بھونڈے رنگ میں پیش کرتی ہیں ۔

غالب کا مشہور قطعہ ہے ۔

اے تازہ واردان بساطِ ہوائے دل

ہمدم صاحب تضمین فرماتے ہیں ۔

یہ ملک و مال اور یہ سب عظمت شہی
رفع غم و الم کے لئے لازمی سہی
سامان انبساط دکھاتے ہیں گرہی
ساقی بجلوہ دشمن ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ رہزن تمکین و ہوش ہے

قیاس کن ز گلستان من بہار مرا

باقی رہی انکی اپنی غزلیں تو ان کے متعلق صرف یہ کہنا کافی ہے کہ

خاموشی از ثنائے تو حد ثنائے تست

تجلیاتِ سخن

(مجموعہ کلام مولوی نظامی)

مصنف۔ نظام الدین حسن نظامی بدایونی

اس کتاب کے مصنف وہی مشہور نظامی ہیں جو کتابوں کو اس لطافت اور نزاکت سے چھاپتے ہیں کہ دل خوش ہو جاتا ہے ۔ اس کتاب میں ان کی نظمیں جمع کردی گئی ہیں ۔ قیمت درج نہیں ۔

شہیدانِ ننکانہ

مصنف گورکھ سنگھ ۔ گورکھ۔

مقام اشاعت ۔ چوک پائیاں امرتسر قیمت ۸؍

واقعہ ننکانہ کے تفصیلی حالات پر مشتمل ہے ۔

پیام نور ۔ اور اتمام حجت

مصنف۔ عبدالوہاب کی (بنگلور) قیمت ۲؍

کتابت ۔ طباعت ۔ مرغوب و گوارا ۔

۳۰ صفحہ کی ضخامت کی ایک مختصر سی کتاب ہے ۔ جسمیں مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔ مصنف کا دعویٰ ہے کہ انھیں خواب میں رسول خدا نے حکم دیا تھا کہ مسلمانوں کو آپ کا پیغام پہنچا دیا جائے ۔

"تاریخ"

تاریخ اور آثار قدیمہ کا ایک سہ ماہی رسالہ ہے ۔ جو کوٹلہ انبر جاہ حیدرآباد دکن سے شائع ہوتا ہے ۔

حکیم سید شمس اللہ قادری اس کے مدیر ہیں ۔ سالانہ قیمت پانچ روپیہ ہے ۔ رسالہ بڑی محنت سے ترتیب دیا گیا ہے ۔ اور اکثر مضامین کافی ریسرچ کے بعد لکھے گئے ہیں ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ عام اردو داں پبلک کے لئے اس رسالے میں کوئی سامان دلچسپی نہیں ۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کی اشاعت کا مقصد صرف "ارباب نظر" کے ذوق علمی کی تسکین ہے ۔ اور وہ بوجہ احسن انجام پائے گا ۔

دنیائے ادب

عقل کا سرمایہ دار

افضل ان لوگوں کی طرف ایک حقارت کی نظر ڈالکر گذر گیا جو انارکلی میں دو کانوں کے چبوتروں پر سو رہے تھے۔ زرد سکڑے ہوئے چہرے کسی درجہ سے دبی ہوئی آنکھیں بکھرے ہوئے بال۔ یہ لوگ اندھی تقدیر کے زخم خوردہ تھے۔ اور اپنی حالت کو سدھارنے کے لئے کچھ نہ کر سکتے تھے۔ آج صبح ان کے پاس کچھ نہ تھا۔ آج شام کو ان کے پاس کچھ نہیں ہے۔ کل صبح ان کے پاس کچھ نہ ہوگا۔ . . . . . .

افضل کی یہ حالت نہ تھی۔ اُسے یقین تھا کہ کل شام تک اس کی جیبیں روپے سے بھرپور رہیں گی۔

اس کا لباس سادہ لیکن قیمتی تھا۔ اور انداز سے ایک قسم کی نفاست نمایاں تھی۔ تعلیم کی نفاست جو غربت میں بھی باقی رہتی ہے۔ اچھی تربیت کی نفاست . . . . . .

اس کی جیب میں اس وقت پانچ روپے چھ آنے تھے۔ انارکلی سے گذر کر وہ جیگڑ محلے پہونچا۔ ایک غیر معروف قمار خانے میں داخل ہو گیا اور اپنی ساری پونجی ہار دی۔

باقی رات اس نے گلیوں میں پھر کر گذار دی۔ . .

صبح ایک دوا فروش کی دوکان کے سامنے اُسے ایک چھوٹا سا لڑکا نظر آیا۔ جس کے ہاتھ میں ایک بوتل تھی۔ بوتل کے گرد ایک نسخہ لپٹا ہوا تھا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں کوئی چمکدار سی شے تھی . . . . . ایک روپیہ

افضل نے مسکرا کر کہا "کہاں جا رہے ہو تم بچے؟"

لڑکے نے غرور سے جواب دیا "میں۔ میں امی کے لئے دوا لینے جا رہا ہوں۔ امی نے مجھے ایک روپیہ دیا ہے"۔

یہ کہتے ہوئے اُس نے مٹھی کھول کر ایک چمکتا ہوا روپیہ دکھایا۔ افضل نے کہا "خوب تمھاری امی نے یہ خیال نہیں کیا کہ کہیں تم کسی تانگے کے نیچے نہ آ جاؤ۔ چلو میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں اور راہ میں ہم ملائی کا برف کھائیں گے۔ ملائی کا برف کھاؤ گے یا میٹھی ٹکیاں لو گے؟"

افضل بچے کا ہاتھ پکڑے ہوئے دوا خانے میں داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر ایک تبسم سا تھا۔ مہذبانہ دانشمندانہ اس نے دواساز کو نسخہ دیتے ہوئے کہا۔

خالص پانی ایک پرنٹ۔ سوڈیم کلورائڈ چار گرین اور نسخہ تیار ہو گیا۔ مجھے دھوکا دینے کی کوشش فضول ہے۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ اس نسخے کی کیا قیمت ہے۔

دواساز مسکرایا۔ نسخہ بنا کر اُس نے افضل کے ہاتھ میں دے دیا اور کہا "چار آنے"۔

پھر بولا "آپ دوا سازی کے فن کو خوب سمجھتے ہیں۔ عام طور پر اس نسخے کی قیمت ایک روپیہ لی جاتی ہے"۔

افضل بھی مسکرایا۔ باقی بارہ آنے کے پیسے اپنی جیب میں ڈالے۔ بچے کو ایک آنے کی مٹھائی لے دی۔ نسخہ اور بوتل اُس کے ہاتھ میں دیدی۔ اور اُسے یہ کہتے ہوئے رخصت کر دیا "تانگوں اور موٹروں سے بچنا"۔

یکایک دونوں طرف سے دو موٹریں بچے کی طرف آئیں۔ افضل برق مثال تیزی سے دوڑا اور بچے کو تھام کر بیچ میں کھڑا ہو گیا۔

اس کے بعد افضل ایک ہوٹل میں داخل ہوا۔ آرڈر دیا اور انتظار کرنے لگا جب ملازم اس کا کھانا لیکر آیا تو افضل نے اُس سے نہایت متین اور سنجیدہ لہجے میں پوچھا "بھلا تم جانتے ہو کہ آدمیوں کی وہ تین قسمیں کونسی ہیں جنکو آسانی سے فریب دیا جا سکتا ہے؟"

ملازم نے انعام کی توقع میں جواب دیا۔

"کیوں نہیں ایک تو وہ مسافر ہیں . . . . . . ؟"

غلط ہے"۔ افضل نے ملازم کو ٹوک دیا "وہ تین قسمیں یہ ہیں۔ مرد بچے اور عورتیں"۔

اور وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگا۔

ہوٹل سے باہر نکل کر وہ ایک جعلی چٹھی لیکر ایک سیدھے سادھے مسلمان

کے گھر گیا۔ اور اپنی مصیبتوں کی داستان سناکر پانچ روپے اینٹھ لایا۔

اب دوپہر ہونے کو تھی۔ وہ سیکلوڈ روڈ پر سے گذر رہا تھا کہ چار خوش پوش نوجوان جوانی کی شراب میں سرشار افضل کو پہچان کر اس کی طرف بڑھے۔

ایک نے کہا "اہا افضل! بڑی دیر کے بعد تم کو دیکھا۔ آؤ دریا پر چلتے ہو۔ فرزند نے ہم سب کو دعوت دی ہے۔ آئس کریم اُڑے گی"۔

دوسرا بولا۔ کیوں نہیں۔ بھلا افضل اور انکار چلو بھئی۔

افضل نے کہا "حضرات مجھے بیحد افسوس ہے۔ پورے ایک بجے مجھے خان بہادر احمد حسین کے ہاں پہونچنا ہے۔ وعدہ ہو چکا ہے۔ میں ان کے ساتھ مسوری جا رہا ہوں"۔

خوش پوش نوجوان رخصت ہو گئے۔

افضل نے جیب میں ہاتھ ڈال کر پانچ روپوں کو ٹٹولا۔ اور پھر اپنے آپ سے کہنے لگا۔

ہمت حوصلہ۔ دکھاوا زندگی کے سب سے ضروری عناصر ہیں۔ دکھاوا۔ سب دکھاوا ہے۔ زندگی کے کھیل میں دکھاوا ترپ ہے۔ مرد بچے۔ عورتیں سب اسی "دکھاوے" سے متاثر ہوتے ہیں۔ دکھاوا . . . .

اس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔

ایک بوڑھا شخص جس کے کپڑے صریحاً و قطعاً اس کے گنوارپن پر دال تھا۔ اس سے خطاب کر کے کچھ کہہ رہا تھا۔

معاف کیجئے گا۔ آپ کو معلوم ہے وحید لاہور میں کہاں رہتا ہے۔ وہ میرا لڑکا ہے۔ اور میں اکبرآباد سے آرہا ہوں۔ لیکن مجھے اس کا پتہ یاد نہیں رہا۔

افضل نے تلخی سے کہا "مجھے نہیں معلوم۔ پولیس میں اطلاع دیجئے۔

"پولیس"۔ بوڑھے گنوار نے دردناک سے طریقے میں کہا۔

"پولیس کی کیا ضرورت ہے۔ اگر آپ مجھے بتا سکیں کہ وحید . . . . "

افضل نے اپنی مسرت کو چھپاتے ہوئے سرد مہری سے جواب دیا۔ "میں کسی سعید وعید کو نہیں جانتا۔ اور میں تمھیں مشورہ دیتا ہوں کہ . . . . . "

بوڑھے نے اُمید بھرے لہجے میں کہا۔ سعید نہیں جناب وحید۔ اس کا قد درمیانہ ہے۔ موٹی موٹی آنکھیں۔ گندمی رنگ کوئی تیس برس کے قریب عمر اور . . . .

افضل نے بات کاٹ کر کہا "وحید تو میرا ہمسایہ ہے۔ آپ نے پہلے کیوں نہیں کہا"۔

یہ کہکر اُس نے اپنی گھڑی نکالی۔ اس کا اصول تھا کہ بھوکا رہنا اچھا ہے۔ لیکن گھڑی کے بغیر گذارہ کرنا بہت برا ہے۔ پھر بولا "خانبہادر محمد حسین سے میں وعدہ کر چکا تھا کہ چائے ان کے یہاں پیوں گا۔ لیکن اب مجبوری ہے۔ میں اپنے عزیز دوست کے باپ کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا"۔

اس واقعے کے ایک گھنٹے بعد ایک بوڑھا سادہ لوح گنوار تھانے میں اپنے نوٹوں کی چوری کی رپورٹ درج کرا رہا تھا۔ اور افضل ۱۰۰-۱۰۰ کے دس نوٹ جیب میں ڈالے ہوئے گھوم رہا تھا۔ اور اپنے دل میں کہہ رہا تھا "وحید" یہ گنوار آتے کہاں سے ہیں۔ جنھیں یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ لاہور میں "وحید" کا نام لیکر اس کا پتہ نہیں مل سکتا۔ مطمئن دل۔ آسودہ فلسفیانہ خیالات میں غرق وہ لوہاری دروازہ کی طرف چل پڑا۔ دروازے کے پاس ایک شکستہ حال فقیر ہاتھ پھیلا کر مانگ رہا تھا۔ افضل کو دیکھ کر اس نے دردناک انداز سے کہنا شروع کیا "داتا تیرا بھلا ہو۔ غریب کے حال . . . . "

افضل نے اس کی طرف ایک روپیہ پھینک دیا۔

بوڑھے فقیر نے دعائیں دیتے ہوئے کہا "اللہ تیرا بھلا کرے۔ مجھے بھیک مانگنے کا شوق نہیں ہے۔ کام نہیں ملتا کیا کروں"۔

افضل نے جواب دیا۔ تم بے وقوف ہو۔ کام کرنا بیوقوفوں کا کام ہے دنیا ایک کان ہے۔ دوسرے لوگ محنت کرتے ہیں۔ لیکن سرمایہ دار فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ سونا انھیں کو ملتا ہے۔ میں عقل کا سرمایہ دار ہوں۔ عقل سے کام لیکر لوگوں کو فریب دیتا ہوں۔ اور کھاتا ہوں۔

فقیر نے پھر کہا "خدا تمھیں برکت دے"۔

افضل نے جواب دیا۔ برکت وفادار کتے کی طرح آج میرا پیچھا کر رہی ہے اچھا خدا حافظ۔

ایک ہوٹل کی طرف چل دیا۔

سول سٹیشن پر نکلسن روڈ کی طرف آتے ہوئے اُسے شام ہو گئی۔ ایک کوٹھی کے پاس افضل رک گیا۔ اس کوٹھی کے گرد دیوار تھی۔ لیکن افضل پنجوں کے بل کھڑا ہو کر اندر جھانک سکتا تھا۔ ایک حسین لڑکی باغ میں ٹہل رہی تھی۔ اس کا لباس سفید تھا۔ اس کے چہرے سے تقدس کا نور نمایاں تھا۔ اس کی آنکھوں میں دنیا بھر کی حیا اور شگفتگی سما گئی تھی۔ یہ لڑکی افضل کی پھوپھی زاد بہن تھی۔ اور افضل اس سے منسوب تھا۔ لیکن اس کی حرکتوں کے باعث اس کی پھوپھی نے افضل سے اپنی لڑکی کی شادی کر دینے سے انکار کر دیا تھا۔ افضل کے دل میں ایک طوفان اضطراب اُٹھا۔ بچپن کے معصوم دن اور . . . آہ . . . . . .

وہ تار کے ایک کھمبے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور کہا۔

"کاش میں مر جاؤں"۔ (حجن!)

انگریزی

جسم انسانی

سقراط نے آج سے بہت پہلے پوچھا تھا۔ آدمی کیا ہے؟ وہ کیا بن سکتا ہے؟ کیا انسان گلہائے رعنا کے لباس میں جلوہ افروز ہوگا؟ کیا وہ غنچوں کے ساتھ شگفتہ ہوگا۔ کیا وہ پرندوں کی شکل میں نغمہ پیرا ہوگا۔ کیا اس کا جسم پھر درختوں کی شاخوں میں چھپ کر ہوا کے جھونکوں کے ساتھ حرکت کرے گا؟ اور غالب کی بات پوری ہوگی؟

یہ شے جو ہمارے جسم میں موجزن ہے اور جسم کے فنا ہونے کے بعد بکھر جاتی ہے۔ یہ زندگی کیا ہوگی؟ موت کے بعد اس کا کیا بنے گا؟

ایک مشہور مصنف نے ایکبار لکھا تھا۔ "میں مادئین کے گروہ میں سے ہوں۔ اس طرح کہ اپنے جسم کو برقرار رکھنے کے لئے میں ہزاروں جانداروں کا خون بہانا روا رکھتا ہوں۔ بعض اوقات میں ڈر جاتا ہوں۔ سوچتا ہوں کہ اس ذرۂ بے مقدار کو زندہ رکھنے کے لئے جسے انسان کہتے ہیں کتنی زندگیوں کو برباد کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے"۔

یہ ہے جسم کا جبر!

ذرا تصور کیجئے۔ روحانی دنیا میں اگر مذکورہ بالا مصنف کے ارد گرد ان مذبوح جانداروں کی شکلیں جمع ہوگئیں۔ اور دردناک نظروں سے اس کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ تو کیا اس سے بدتر کوئی دوزخ ہو سکتا ہے؟

یہ تو ہوا جسم کے متعلق۔ آیئے اب ذرا جسم میں رہنے والوں کے حالات کا جائزہ لیں۔

حضرت ایوبؑ نے فرمایا تھا۔ "انسان کے جسم میں ایک روح بستی ہے اور خدائے تعالیٰ نے اس روح کو زیور عقل سے مزین کیا ہے"۔

دلی پال کے اقوال کے مطابق وجود کی تثلیث میں ہمارے جسم کو مقدس روح کے مندر ہونے کا فخر حاصل ہے۔

بدھ مت کے اشراقی مفسر کہتے ہیں کہ یہ جسم سات اور جسموں کا آشیانہ ہے۔

آخر معلوم تو ہو کہ جسم کیا ہے؟ یہ کیا شے ہے۔ جسمیں روح رہنا منظور کرتی ہے۔ یہ کمزور شے جسے وقت مردہ کر دیتا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ تمام جہاں مطلق کے ذرے بے انتہا کا ایک شرارہ ایسی حقیر شے کو اپنا مستقر بنا لیتا ہے؟ جسم کی تخلیق کا مقصد کیا ہے۔

والٹ وٹمن ایک نظم میں کہتا ہے

"اگر دنیا میں کوئی چیز مقدس اور پاک ہے تو جسم یقیناً وہ شے ہے۔ ایک مضبوط صحت مند جسم جمیل ترین چہروں سے زیادہ خوبصورت ہے۔

والٹ وٹمن کی نظر میں روح کی وقعت جسم سے زیادہ نہ تھی۔ اور اگر ہم جسم کو انسان کی روح اور خدا کے صفات جلال و جمال کا مظہر سمجھیں تو واقعتاً دنیا کی کوئی شے اس سے زیادہ عظیم نہیں۔

آیئے ذرا انسان کے جسم کو مظہر شان خدا تصور کرکے دیکھیں

"خدا نے انسان کو زمین کی مٹی سے بنایا۔ اور پھر اس کے نتھنوں میں زندگی کا سانس پھونک دیا۔ اور پھر انسان ایک جیتی جاگتی روح بن گیا یوں خدا نے انسان کو اپنی شکل پر بنایا۔ عورتیں اور مرد تمام خدا ہی کے بنائے ہوئے ہیں"۔

انسان جیتی جاگتی روح۔ تو جسم ہی وہ شے ہے۔ جہاں رہ کر روح پرواز پیدا کرتی ہے۔ جسم اپنے فرائض ادا کرنے کے بعد کچھ بھی نہیں وہ ایک کم قیمت صدف کی طرح ہے۔ جس سے درخشاں موتی نکال کئے گئے ہیں۔ روح ہی سے انسان کی شخصیت بنتی ہے۔ اور ہمیں اختیار ہے کہ جس طرح چاہیں روح کو متاثر کر لیں۔

ہم سرمدی عقل کے پیدا کردہ ہیں۔ اور خدائے قدوس نے ہم کو تین رہبر عطا کئے ہیں۔ جن سے ہم جسم پر قابو رکھ سکتے ہیں۔

نفس شاعرہ۔ نفس نیم شاعرہ اور نفوس اعلیٰ جبلی وسیع قوتوں کا احساس تھوڑے دنوں سے انسان کو ہونے لگا ہے۔

نفس باشعور آرزو پرور جسم پر قدرت رکھتا ہے۔

کرآئیر کہتا ہے۔

"اگر تم ان قابلیتوں پر انحصار نہ کرو۔ جو تمھارے نفس شاعرہ میں پوشیدہ ہیں۔ اور نفس نیم شاعرہ کے احکامات کے ماتحت کام کرو۔ تو تم اپنی راہ سے تمام مزاحمتیں کو دور کر سکتے ہو۔ یاد رکھو۔ مایوسی کی کوئی ایسی حالت نہیں۔ گمشدہ زندگی کی کوئی ایسی مصیبت نہیں جسے نفس رفع نہ کر سکتا ہو۔

کیونکہ تمہارے نیم شعوری نفس میں ایک اُستاد کاریگر کام کر رہا ہے۔ جس کی کیمیاگری نے عقل کل سے استفادہ کیا ہے۔ تم اپنے صلاحیتوں کو تھکاتے جاؤ۔ وہ اور نئی پیدا کرتا جائیگا۔"

نفس نیم شاعرہ دراصل ایک جادوگر ہے۔ جو ہماری آرزوں کو اس طرح پورا کرتا ہے۔ جس طرح الہ دین کا طلسی چراغ یہ نفس ہماری زندگی کے تمام تجارب کا خازن ہے۔ ہم نے جو کچھ پڑھا ہے۔ سنا ہے۔ محسوس کیا ہے وہ تمام ابھی محفوظ ہے۔ اور جو لوگ اپنی قوتوں کے ارتقا پانے کے بعد اس پر قابو پاتے ہیں۔ ان کے لئے وہ اپنے تمام خزائن بے نقاب کر دیتا ہے نفس اعلیٰ جسمیں قوت شاعرہ بہت بڑھی ہوئی ہے۔ دانشمندی کا چشمہ ہے جو بارگاہ کبریا سے جاری ہوا ہے۔ اور جب ہم اس پر اقتدار حاصل کریں گے تو گو یا خالق کائنات کے ہم آہنگ ہو جائیں گے۔

یہ زمانہ سائنس کی ایجادات و اختراعات کا زمانہ ہے۔ اور سائنسدان ہر روز نئی نئی باتیں دریافت کرتے رہتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان لن ابھی تک ارتقاء کے مراحل پر ہے۔ آجکل گرددی ( ) غدود کی اہمیت پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے اعمال و وظائف میں تغیر و تبدل کرکے ہم انسان کے کردار کو متاثر کر سکتے ہیں۔ انسانی جذبات و احساسات پر اقتدار پیدا کر سکتے ہیں۔ کھوئی ہوئی جوانی کو حاصل کر سکتے ہیں۔ زندگی کو ایک غیر معین وقت تک طویل کر سکتے ہیں۔ اور اپنی تمام ذہنی قوتوں کو قایم رکھ سکتے ہیں۔

دو ہزار سال ہوئے حضرت داؤدؑ نے فرمایا تھا۔

"میری ساخت عجیب و غریب ہے۔ اور خطروں سے لبریز ہے۔ خوفناک ہے"۔

اسی طرح انسان کا جسم بھی ایک خاص مقصد کے لئے ایک خاص طریقے پر بنایا گیا تھا۔ ہماری ہڈیوں پر گوشت اور اعصاب کے ڈھانچے محض اس لئے چڑھائے گئے تھے کہ ہمارا جسم روح کا مستقر بن سکے۔ تاکہ ہم تجارب سے فائدہ حاصل کریں۔ ارتقا پائیں۔ پھلیں۔ پھولیں اور اپنے کرموں کی سزا اور جزا پائیں۔

انسان کے جسم کے تمام اجزا سائنسدانوں کی تحقیق کے ماتحت اپنے اسرار ظاہر کر چکے ہیں۔ اس پیچدار کل کا کوئی ایسا پرزہ نہیں جس کے متعلق تفصیلی حالات معلوم نہ ہوں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے گو یا جسم انسانی ایک پیانو ہے۔ جسے ایک ماہر کاریگر جب چاہے توڑ پھوڑ کے رکھدے اور پھر اسی طرح جوڑ دے مگر ذرا انسان کی ہیچ مدانی دیکھیں کہ اس پیانو کے ساز اور پرزوں سے بخوبی واقف ہونے کے باوجود وہ دریافت نہیں کر سکا کہ توازن و تناسب کہاں ہے وہ شے جو نغمہ پیدا کرتی ہے کہاں مستور ہے۔ زندگی کس جگہ جلوہ گر ہے: یہ نغمہ نہیں دریافت ہو سکتا۔ یہ نغمہ فضائے قدس کا ہے۔

اسی طرح ڈاکٹر جسم انسانی کے ہر ایک حصے سے واقف ہیں۔ مگر وہ اس جسم میں بسنے والی روح کو دریافت نہیں کر سکتے۔

کبھی نہیں۔ کیونکہ روح فضائے قدس کی ہے۔

سائنس داں جو اس جسم سے کام لیں۔ یا ان لطیف اور نازک آلہ ہائے کار سے جن کی وساطت سے اُنھوں نے دور دراز ستاروں کے راز دریافت کرلئے ہیں وہ روح انسان کو دیکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

سائنسدانوں نے روح کا وزن دریافت کرنے کی کوشش کی ہے اور معلوم ہوا ہے کہ موت سے پہلے اور موت کے بعد آدمی کے وزن میں صرف ایک اونس کا فرق پڑتا ہے۔

سقراط کو یہ راز معلوم تھا۔ جب زہر کا پیالہ پینے کے بعد اس کے شاگردوں نے اس سے پوچھا" آپ کو کہاں دفن کیا جائے"؟ تو اس نے جواب دیا۔ جہاں تم چاہو بشرطیکہ تم مجھے پکڑ سکو"۔

وہ جانتا تھا کہ اس کی روح کسی چیز میں مقید نہیں ہوگی وہ تو بلندیوں کی طرف پرواز کر جائے گی۔

آجکل کے ایک مشہور منطقی کا خیال ہے کہ تھوڑے عرصے کے بعد انسان کے جسم میں سے سرخ خون جاتا رہے گا۔ کیونکہ یہ خون زندگی کے مادی خیالات کا آئینہ دار ہے۔ اس کا خیال ہے کہ انسان جانداروں کو کھا کر پلنے کے لئے پیدا نہیں ہوا تھا۔ اسکے خیال میں تمام لوگوں کو زمین کی پیداوار پر قناعت کرنی چاہیے وہ کہتا ہے کہ اس طرح خودبخود تھوڑے عرصے کے بعد ہماری رگوں میں خون کی بجائے بجلی دوڑنے لگیگی۔

عربی

صحافتِ مصر

جنگ عظیم صحافت کے لئے اتنی ہی مفید ثابت ہوئی ہے جتنی کہ خشک کھیتی کے لئے بارش مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ اس ہولناک لڑائی نے سیکڑوں

انسانوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ مگر اخبار نویسی کے مردہ قالب میں جان ڈال گئی۔ یہ جنگ عظیم ہی کا صدقہ ہے کہ متمدن ملکوں میں آج صحافت نہ صرف بہترین نفع بخش تجارت ثابت ہو رہی ہے۔ بلکہ حکومت کی باگ ڈور بھی اسی کے ہاتھ میں ہے۔

جنگ عظیم سے پہلے مصر میں ایک ادبی مقالہ، چند چٹکلے۔ اور کچھ پرانی خبروں خبروں کو ایک دو ورقی کی صورت میں شائع کر دینے کا نام اخبار نویسی تھا۔ مگر ان گذشتہ پندرہ سال میں جو زبردست انقلاب ہوا ہے وہ واقعی تعجب خیز ہے۔ مصر کی صحافت نے اب اپنا پرانا لباس اُتار پھینکا ہے اور زرق برق مغربی لباس پہنکر مغربی طور طریقوں سے بن سنور کر مغربی ناز و انداز دکھاکر اپنے مغربیت پسند ناظرین کا دل لبھا رہی ہے۔

ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ مصر کی صحافت اسی بلند درجہ پر پہنچ چکی ہے جس پر اس کی مغربی بہن فائز ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ اس کے نقش قدم پر چلنے کی پوری کوشش کر رہی ہے اور اس میں ایک حد تک کامیاب بھی ہو چکی ہے۔ آج بھی انگلستان کے مایۂ ناز پرچوں۔ ڈیلی میل۔ ٹائمس اور سنڈے پکٹوریل کے مقابلہ میں ہم المقطم۔ الاہرام اور اللطائف المصورہ کا نام لیکر شرمندہ نہیں ہو سکتے۔

مصر میں جنگ عظیم سے پہلے اخبار نویسی کو پیشہ کے طور پر محض وہی لوگ اختیار کرتے تھے۔ جن کے لئے رزق کے دوسرے دروازے بند ہو جاتے تھے۔ یا جو اس سے طبعی دلچسپی رکھتے تھے۔ صحافت اپنی کم مائیگی کے سبب قابل انشا پردازوں کی خدمات حاصل نہیں کر سکتی تھی۔ لیکن آج یہ بات نہیں ہے۔ مصر کے بعض اخبارات اپنے ماہر فن ایڈیٹروں کو دو سو گنی اسسٹنٹ ایڈیٹروں کو سو گنی اور مترجمین اور نامہ نگاروں کو پچاس گنی ماہوار تک دے رہے ہیں۔

ہر شخص جانتا ہے ہمارا زمانہ تصاویر ہے۔ اس وقت وہی اخبار مقبول ہو سکتے ہیں جو تصویروں سے مزین ہوں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اگر اخبارات کو حسین عورت سے تشبیہ دی جا سکتی ہے تو تصویر کو اس کا زیور کہنا بالکل مناسب ہوگا۔ کیا کوئی حسین عورت بغیر زیور کے اپنے حسن کی تکمیل کر سکتی ہے؟

مصر کے بعض اخبارات و رسائل اس وقت بہترین تصویروں سے مزین ہو کر شائع ہو رہے ہیں۔ یہاں کے مشہور اخبار الاہرام نے اس سلسلہ میں وسیع انتظامات کئے ہیں۔ ممتاز ترین تصویر ساز اور تصویر فروش کمپنیوں کے ساتھ اس کے تعلقات ہیں۔ اور اس نے تصویر کشی اور بلاک سازی کے لئے ایک مستقل محکمہ قایم کر رکھا ہے۔ مشرق و مغرب کے تمام بڑے بڑے آدمیوں اور مشہور چیزوں کے فوٹو بڑی تعداد میں اس کے دفتر میں جمع ہیں۔ الاہرام کا پڑھنے والا جب اس میں کوئی آرٹیکل یا خبر دیکھے گا تو اس کے متعلق متعدد فوٹو اس کی نظر سے ضرور گذریں گے۔ الاہرام کے علاوہ السیاستہ۔ المقطم۔ مصر الجدیدۃ۔ اللطائف المصورہ اور الہلال بھی اس سلسلہ میں قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنی طباعت کی دلفریبی اور اپنی تصویروں کی بوقلمونی کے سبب رنگ برنگے پھولوں کا ایک باغ معلوم ہوتا ہے۔ مصر کے اکثر اخبارات کے اپنے پریس ہیں یہ پریس طباعت کی موجودہ ترقی کے بہترین نمونے کہے جا سکتے ہیں۔ انہیں ٹائپ ڈھالنے کی مشینیں حروف کو کمپوز کرنے کی مشینیں فوٹو کے ذریعہ سے چھاپنے کی مشینیں ایک وقت میں چار چار رنگ چھاپنے کی مشینیں اور وہ تمام آلات موجود ہیں جو یورپ میں چھپائی کے کام میں خوبصورتی اور آسانی پیدا کرنے کے لئے اب تک ایجاد ہو چکے ہیں۔

ان اخباروں کے دفتر ان کی اپنی مملوکہ چار چار اور پانچ پانچ منزل کی عالی شان عمارتوں میں قایم ہیں۔ اس سلسلہ میں الاہرام۔ الہلال اور اللطائف المصورہ کی عمارتیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ خصوصاً الاہرام کی چار منزلہ عمارت تو بے انتہا شاندار اور خوبصورت ہے۔ اسکے کونہ کونہ پر انگریزی اور عربی خط میں اس خوبصورتی کے ساتھ الاہرام لکھا ہوا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا پھول کھل رہے ہیں۔

زین العابدین سجاد

اطالوی

اظہار صداقت

صداقت کیا ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب دینا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ کیا کیا جائے۔

غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ جب ہم صداقت کا تصور کرتے ہیں تو صداقت کا اظہار مکمل ہوتا رہا ہے۔ ہم اپنے سامنے اظہار صداقت کر دیتے ہیں۔ لیکن جہاں تک صداقت کے موتی اظہار کا تعلق ہے۔ دوسرے کو اپنے خیالات سے واقف کرنے کا تعلق ہے تو وہ ایک اور بات ہے۔ ایسی بات جو خطرناک بھی ہے اور نتیجہ خیز بھی۔

صداقت کوئی پارسل نہیں کہ کوئی شخص دوسرے کے حوالے کر دے

حقیقت یہ ہے کہ ہم کبھی "صداقت" دوسرے شخص تک نہیں پہنچاتے۔ جب ہم کسی شخص سے مخاطب ہوتے ہیں تو ہم اُسے اپنے الفاظ کے ذریعے ایک ایسی صورت حالات کی طرح متوجہ کرتے ہیں جو ہمارے ذہن میں پہلے سے صداقت کی صورت میں جلوہ گر تھی۔ تاکہ ان کی ذہنی حالت "صداقت" کے متعلق ایک سی ہو جائے۔ اور اس امر کا واقع ہونا بہت دشوار ہے خیالات کے اظہار کا ذریعہ الفاظ ہیں۔ اور الفاظ کا مفہوم صحیح طور پر کبھی متعین نہیں ہوا۔

ہسپانوی

شاعر

دنیا کی عظیم ترین شخصیت شاعر ہے۔ اس سے فطرت کا کوئی راز پوشیدہ نہیں۔ وہ اپنی اُمیدوں۔ آرزوؤں۔ کامیابیوں۔ ناکامیوں۔ محبت عشق کے گیت گاتا ہے۔ اور فطرت اس کے ساتھ گاتی ہے۔ وہ اپنے تصورات و احساسات کو "محبت" کی بھٹی میں ڈال کر پاکیزہ و منزہ کر دیتا ہے جھوٹ اس بھٹی میں جل جاتا ہے۔

اس کے گیت آپ کے گیت ہیں۔ میرے گیت ہیں۔

جاپانی

مشرق و مغرب

خدا جانے مغرب کو مشرق کے انداز حیات سے کب واقفیت ہوگی ہم ایشیائی واقعات اور غلط بیانی کے اس جال کو دیکھ کر حیران ہو جاتے ہیں۔ جو ہماری فطرت کے متعلق بنا جاتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ہم یا تو کنول کا پھول کھا کر جیتے ہیں یا چوہے اور مینڈک کھا کر۔

ہندوستانی روحانیت کو جہالت کا لقب دیا جاتا ہے۔ چینی وقار و متانت کو حماقت کہا جاتا ہے۔ جاپانی حب الوطنی "جبر" کے نام سے موسوم ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہم لوگ اپنے اعصاب کی بڑھتی ہوئی بے حسی کے باعث جسمانی تکلیفوں کو زیادہ محسوس نہیں کرتے۔ گویا یا تو ہم فرشتے ہیں۔ یا حیوان۔ اسی طرح اگر مغرب کو معلوم ہو جائے کہ وہاں کے رہنے والوں کے متعلق کس کس طرح کی باتیں مشہور ہیں تو وہاں کے لوگ غرق حیرت ہو جائیں۔

ہماری تحریروں میں تحیر۔ اجنبی اور غیر معنی اشیا۔ کیخلاف احساس بغاوت اور فدا جانے کیا کچھ پایا جاتا ہے۔ ہمیں کوئی شک نہیں کہ مغرب کیمتعلق جو غلط فہمیاں پھیلائی گئی تھیں وہ تمام رفع ہو رہی ہیں جیسی مشرق کی حماقتیں ہوتی تھیں۔ کوئی نہیں جو مغرب کو مشرق کے راز سے مطلع کرے۔ کوئی نہیں

جرمنی

سفر

وینس پہونچکر میں اُتر گیا۔ مجھے ابتک وہ شہر لطیف یاد ہے۔ سیاب اور لطیف کشتی کا سفر۔ اجنبی۔ جن کی زبان سمجھنے سے میں قاصر تھا۔ شام بہار نسیم کے جھونکے۔ خاموشی۔ عالمگیر وسیع۔ سکون بخش عمارتوں کے خوبصورت حصے نظر آتے تھے۔ اور غائب ہو جاتے تھے۔

کشتی میں بیٹھکر مجھے نیند آ گئی۔ گہری نیند اور میں نے خواب دیکھنا شروع کیا۔ لالہ زار۔ دوپہر بہار کا اثر تھا۔ پھول۔ تیتریوں کی طرح تو پرواز تھے۔

غنچوں میں حسین و جمیل پریاں مسکرا رہی تھیں۔ ذرے سونے کے ٹکڑوں کی طرح چمک رہے تھے آسمان سے نور کی بارش ہو رہی تھی۔ اور اس ہجوم رنگ و نور حسن میں ایک طرف کوئی شخص ستار بجا رہا تھا۔ نغمے ہوا کے دوش پر آسمان کی طرف پرواز کر رہے تھے۔ حسن فانی حسن مطلق کی طرف جا رہا تھا۔

میری آنکھ کھل گئی۔

پانی۔ خاموش پانی چپ چاپ بہ رہا تھا۔ وہ ہی کشتی رواں تھی۔ آہ وینس!

فرانسیسی

رات

مینہ برس رہا تھا۔ رات آگئی۔ میں منزل مقصود کی طرف جا رہا ہوں میری منزل مقصود کونسی ہے؟ تنہا تنہا گلیوں میں سے گذر کر۔ تنہا تنہا بازاروں میں سے ہوتے ہوئے میں ایک عظیم الشان عمارت کے سامنے آ پہنچا ہوں۔ جس کے کنگرے اہرمنی کی طرح اپنے چنگل بڑھا بڑھا کر پردۂ شب کو چاک کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس سیاہ لبادے میں کبھی سرخ دھیمی روشنی نظر آ رہی ہے۔ میں اندر داخل ہوتا ہوں۔ شاید کوئی مندر ہے۔ عبادت گاہ ہے۔ ایک غار سا نظر آیا۔ جو سرخ روشنی سے لبریز ہے۔ ایک مہیب و عظیم بت نظر آ رہا ہے۔ دیوار کے ساتھ ایک ڈھول رکھا ہے۔ سرخ بتیاں ستونوں کی طرح دھوئیں کے انبار میں مبہم طور پر نظر آتی ہیں۔

ایک طرف بتوں کی ایک قطار ہے۔ ان کے ہاتھوں میں زمرد۔ مرجان نیلم کی چھڑیاں ہیں۔ دوسری طرف دروازے کا رنگ خون کی طرح سرخ ہے۔ خون کا رنگ دبا ہوا اور سیاہی کا رنگ تمام فضا پر چھایا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ آہ۔ ٹوکیو۔ شہر چراغاں۔ جنت نظیر۔ گلذول

پشتو

اخلاص

دیکھ اخلاص کا مرتبہ کتنا بلند ہے۔ زمانہ اخلاص کا غلام ہے۔

آسمان پر اُڑنا مشکل ہے۔ لیکن اخلاص کے لئے زمین سے آسمان تک ایک قدم ہے۔

مخلص جو غیب کی خبر جانتا ہے۔ شاید یہ الہام اخلاص کی بدولت ہے

رسم و رواج ہمیشہ نہیں رہتے۔ اخلاص ہمیشہ باقی رہتا ہے۔

مذہب اخلاص کے بغیر بے مزہ ہے۔ مذہب اخلاص ہی کا نام ہے۔

رند اُس کو پیر بنا لیں گے جس ساقی کے ہاتھ میں بادۂ اخلاص کا جام ہوگا۔

عجب نہیں کہ وہ صیاد جس کا دام اخلاص ہے ہما کو گرفتار کرے۔ (دیوان رحمان) وقار

رجسٹرڈ　　　　　　ایل نمبر ۲۴۸۲

فہرست مضامین

جلد ۳　　بابت ماہ ستمبر ۱۹۳۰ء　　نمبر ۳

تصاویر:- سہ رنگی (۱) قلوپطرہ کی موت (یک رنگی) (۲) مطالعہ (۳) کارلائل (۴) رسکن (۵) گھر کا بے زبان رکن (۶) روز حشر (۷) رنگ دبو - (۸) شہسوار -

(مولوی احمد عبداللہ خاں صاحب ارشد نے مرکنٹائل پریس ریلوے روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر ادبی دنیا کشمیر بلڈنگ میکلوڈ روڈ لاہور سے شائع کیا)

حال و قال

ادبی دنیا کے لئے جدید کارکنوں کی ضرورت۔

"صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے"

ادبی دنیا کے اسٹاف کو ہر حیثیت سے مکمل اور جامع بنانے کے لئے حسب ذیل حضرات کی ضرورت ہے۔

(۱) چند ایسے مستقل مضمون نگاروں کی جو

ا۔ انگریزی۔ فرانسیسی۔ عربی۔ فارسی سنسکرت اور ہندی وغیرہ سے بلند اور دلچسپ مضامین کا بامحاورہ ترجمہ خلاصہ اقتباس اور اخذ کرنے کی مہارت رکھتے ہوں۔

ب۔ سبق آموز اور بہترین غیر ملکی افسانوں کو تلاش و تفحص کے بعد ہندوستانی معاشرۃ کے سانچے میں ڈھالنے پر قادر ہوں۔

ج۔ فلسفیانہ۔ سائنٹفک اور علمی موضوعات پر اصطلاحات کی الجھنوں سے الگ ہو کر ایسے عام فہم۔ مختصر، اور دلچسپ مضامین لکھنے پر قدرت رکھتے ہوں جن سے عام اردو خوان پوری طرح فائدہ اٹھا سکیں

د۔ دل آزاری اور فحش نگاری اور ابتذال آرائی سے بچ کر بلند پایہ ظریفانہ مضامین لکھ سکیں۔

ھ۔ اردو علم ادب کے مختلف شعبوں پر تنقیص و تقریظ سے اجتناب کرتے ہوئے محققانہ انداز میں تنقیدی مضامین لکھنے کی استعداد رکھتے ہوں

و۔ ادبی دنیا کے "آئینۂ عالم" کے لئے دنیا کی اہم تحریکات، معلومات اور سبق آموز واقعات پر رہبرانہ طرز میں دلچسپ شذرات لکھ سکتے ہوں۔

ز۔ ترقی یافتہ ملکوں کی تعلیمی ترقیات اور ہندوستان کے ہر صوبے کی تعلیمی رفتار کے متعلق تازہ ترین مکمل واقفیت کے مضامین لکھ سکیں۔

ح۔ مشاہیر عالم کی سرخی کے تحت میں دنیا کے قابل قدر مصنفوں۔ موجدوں۔ رہنماؤں۔ مدبروں۔ بادشاہوں۔ بہادروں۔ خود ساز (سیلف میڈ) حضرات پر مفید اور سبق آموز مضامین لکھ سکتے ہوں۔

ط۔ دنیا کی ترقی یافتہ قوموں کے نظامہائے حکومت اور ان کی پارلیمنٹوں کی ساخت پر بیانیہ مضامین لکھنے کی مہارت رکھتے ہوں۔

ع۔ ہندوستان کے آثار قدیمہ، ہندوستانی اقوام کے تہذیب و تمدن اور ایشیائی تاریخ سے زریں مشرقی روایات اور اہل مشرق کے کارناموں کو اخذ کر کے پر معلومات مضامین لکھ سکیں۔

ک۔ ادبی دنیا کی "دنیائے ادب" کے لئے مشرقی و مغربی زبانوں سے مفید اور خرد افروز مضامین سے دلچسپ حصوں کا ترجمہ کر کے ادبی دنیا کے اس حصے کو جامع اور مکمل بنا سکیں۔

مذکورہ بالا مضامین کے مستقل عنوان قائم کئے جائیں گے۔ اور ان عنوانوں پر مستقل طور پر مضامین لکھنے والے انشاء پرداز ادبی دنیا کے عملۂ ادارت کے رکن تصوّر کئے جائیں گے۔

ان مضامین کا معاوضہ ادبی دنیا کے دوسرے مضامین کی عام شرح معاوضہ سے جدا ہوگا۔ ملک کے اہل قلم میں سے جو حضرات اپنی اپنی مخصوص دلچسپی کے مطابق کسی مضمون پر مستقل طور سے خامہ فرسائی منظور کریں گے ادبی دنیا میں اُن کے ناموں کا اعلان کر دیا جائیگا۔ اُن کی تصاویر شایع کی جائینگی۔ اُن کے مختار عنوان پر بحیثیت رکن ادارۃ اُن کا نام دیا جائیگا۔ ہر ماہ کی پندرہ تاریخ کو اُن کے مطبوعہ مضامین کا معاوضہ اُنہیں روانہ کر دیا جایا کریگا۔

نوٹ:۔ اس سلسلے میں وہی حضرات خط و کتابت کریں جو اپنے راستے کے راہرو بھی ہوں اور راہنما بھی۔ پختہ کار، پختہ مشق، وسیع المطالعہ ہونے کے ساتھ سب سے ضروری امر یہ ہے کہ محنت و دماغ سوزی سے مضمون تیار کرنے کے عادی ہوں۔ نومشق۔ نوکار۔ یا اپنی تحریروں کو الہامی سمجھنے والے، محنت و مطالعہ سے بیزار حضرات زحمت نہ فرمائیں۔

درخواستوں کے ساتھ نمونے کے طور پر کوئی مضمون بھی آنا چاہئے۔ جو حضرات متعدد عنوانوں پر قلم فرسائی کر سکیں۔ اُنہیں ہر عنوان پر ایک مضمون بطور نمونہ بھیجنا پڑے گا۔

(۲)۔ ایک تعلیم یافتہ خاتون کی قلمی اعانت درکار ہے جو مشرقی و مغربی ادبیات سے "نسوانی دنیا" کے عنوان پر ماہ بماہ دنیا بھر کے تازہ ترین نسوانی حالات، نسوانی تحریکات، اور نسوانی خبروں پر مشتمل ایک مضمون پر معلومات دلچسپ پیرایۂ بیان میں لکھ سکتی ہوں۔ اس کے علاوہ مشرق و مغرب کی اُن قابل فخر خواتین پر قلم فرسائی کر سکیں۔ جن کے کارنامے صفحات تاریخ پر ثبت ہیں۔

یہ خاتون نسوانی حصے کی ایڈیٹر ہونگی۔ اُن کے ہر مطبوعہ مضمون کا معاوضہ پیش کیا جائے گا۔

اس سلسلے میں وہ حضرات جو اپنی بیویوں کے نام سے مضمون نویسی کرتے ہیں یا جو معاوضہ لینے کی خاطر جعلی طور پر عورت بننے کی زحمت گوارا فرما لیا کرتے

ہیں خط و کتابت نہ کریں ۔ کیونکہ مستقل طور پر فریب دینا انہیں دشوار ہو جائیگا ۔

(۳) ایک ایسے آرٹسٹ کی ضرورت ہے جو ہمارے پیش کردہ خیالات کو تصویری قالب میں ڈھالنے کی مہارت رکھتا ہو ۔ مشاق اور ماہر فن آرٹسٹ اپنے تصویری نمونے بھیج کر معاملہ طے کریں ۔

(۴) چند ایسے خوش نویس کاتبوں کی ضرورت ہے جن کا خط نہایت پاکیزہ نہایت خوشنما اور پختہ ہو ۔ درخواستوں کے ساتھ جلی و خفی نستعلیق خط (عنوانات ، بغلی سرخیاں ، عام خط ، نوٹ کا خط) کے مطبوعہ و غیر مطبوعہ نمونے ۔ اُجرت کتابت ، یا تنخواہ کی تعیین کے ساتھ کام کی مقدار کی تفصیل بھیجی جائے ۔ کام انشاء اللہ تعالیٰ مستقل ہوگا ۔ تاجور

شکریہ

(۱) اگست کے رسالے میں "شکنتلا" کی تصویر کپور آرٹ پرنٹنگ ورکس لاہور کے مشہور آرٹسٹ لالہ رام لعل کے موقلم کا نمونہ تھی ۔ اپنے مکرم دوست مسٹر گوبند سروپ (میسرز عطر چند کپور اینڈ سنز کی فرم کے شریک) کی کرم فرمائی کا ہم دلی شکریہ ادا کرتے ہیں ۔ کہ انہوں نے اپنے قیمتی البم میں سے یہ پاکیزہ تصویر ادبی دنیا کو عنایت فرمائی ۔ اس تصویر کی نظر فروز طباعت دیکھ کر پنجاب کے مشہور و معروف کپور آرٹ پرنٹنگ ورکس لاہور کے طباعتی کارناموں کی تصدیق کرنی پڑتی ہے ۔

(۲) پنجاب کا دوسرا قابلقدر پریس مرکنٹایل لاہور ہے ۔ اس کے مالک لالہ دیوان چند کو لالہ گوپالداس جیسے باخبر منیجر اور منشی اللہ بخش جیسے مشہور ماہر طباعت فورمین کی خدمات حاصل ہیں ۔ ان حضرات کی توجہ محنت اور تجربہ کاری کے سبب مرکنٹایل پریس پنجاب کے چند بہترین پریسوں میں شمار ہونے لگا ہے ۔ لالہ دیوان چند تیس سال سے یہی کام کر رہے ہیں ۔ اُن کی دیرینہ تجربہ کاری اس پریس کے بہترین ہونے کی ضامن ہے ۔ اُنہوں نے اپنے پریس میں چیدہ چیدہ کارکن جمع کر لئے ہیں ۔

ہماری رائے میں جو رسالے بہترین طباعت اور نفاست کو ضروری سمجھتے ہیں وہ مرکنٹایل پریس کی خدمات حاصل کریں ۔ منیجر

غزل

کھو گیا تیری چاہ میں منگیا تیری راہ میں ۔۔۔ پھر بھی ہوئی نہ قدر کچھ دل کی تری نگاہ میں

دل نے یہ کہکے بارہا ہوش ہمارے کھو دئے ۔۔۔ کہئے تو کیا نظر پڑا یار کی جلوہ گاہ میں

پرسش حال سے غرض؟ عذر ستم سے فائدہ؟ ۔۔۔ اب کوئی آرزو بھی ہو میری دل تباہ میں

دیکھ فریب التفات پرسش مدعا نہ کر ۔۔۔ اب دل ناامید کو ڈال نہ اشتباہ میں

صدمۂ شام بیکسی پوچھئے اس غریب سے ۔۔۔ میری طرح سے تھک کے جو بیٹھ گیا ہو راہ میں

ضبطِ ملال و غم سے بھی کام چلا نہ ای شباب
خاک ہی اُڑ کے رہ گئی آہ دل تباہ میں

شباب (بدایونی)

آئینۂ عالم

بیرونی مہیجات اور انسان

مسٹر آر ولسن انگریزی کے مشہور اخبار "انکشاف" میں رقمطراز ہیں:-

موت سے کچھ عرصہ پہلے سر جیمز میکنزی ایک ایسے نظریے کے متعلق تجربے کر رہے تھے جو تکمیل تک پہنچکر علم الانسانی کا ایک حیرت انگیز باب کھول دیتا۔ انسانی زندگی کی نوعیت اور ماہیت بدو عالم سے فلسفیوں اور حکیموں کے ذوق جستجو کو دعوت عمل دیتی آئی ہے۔ سر جیمز بھی اپنی زندگی کے آخری دنوں میں حیات انسانی کے مختلف پہلوؤں پر غور کر رہے تھے۔ مختصر الفاظ میں کہا جا سکتا کہ وہ یہ سوچ رہے تھے کہ کہیں بیرونی مہیجات خصوصاً روشنی اور آواز انسانی زندگی کے لئے مہلک تو نہیں!

اس میں کوئی شک نہیں کہ بظاہر اس مسئلے پر غور کرنا بے فائدہ معلوم ہوتا ہے۔ اگر روشنی اور آواز کے مہیجات انسانی زندگی کے لئے خطرناک ہوتے تو ابتک انسان اسقدر ترقی کس طرح کرتا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس اہم مسئلے کو اس طرح سرسری طور پر فیصلہ کر دینا مناسب نہیں ہے۔ اس بات کی شہادت موجود ہے کہ روشنی اور آواز کئی حالتوں میں خطرناک ثابت ہوتی ہے۔ یہ تو ہر شخص جانتا ہے کہ تیز و قوی ہیج اکثر موت کا باعث ہوتا ہے۔ خیرہ کن ہجوم نور۔ بلند آواز۔ سخت دھکے یا چوٹ کے اثرات کس کو معلوم نہیں۔ اس بات کو ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ بعض اوقات خفیف ہیج بھی مہلک ثابت ہوتا ہے۔ سرگوشیوں میں جو باتیں کیجاتی ہیں بعض اوقات موت کا باعث بن جاتی ہیں۔ بعض حالت میں روشنی کی ایک شعاع خنجر کی دھار کی طرح مہلک ہوتی ہے۔ اسی طرح کبھی کبھی آدمی چھونے سے مرجاتا ہے۔ ان حالتوں میں مہیجات ائتلاف افکار کے قوانین کے ماتحت ایسے حالات و واقعات کو یاد دلاتے ہیں۔ جو موت کا باعث ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ سب لوگ جانتے ہیں کہ جب کوئی پولیس کا آدمی قتل کے ملزم کو چھوتا ہے تو اس کے قلب کی کیا کیفیت ہو جاتی ہے۔ پھر بعض جسمانی کیفیتیں ایسی بھی ہیں جن کے دوران میں خفیف ہیج بجلی کی طرح کام کرتا ہے۔ بعض اوقات بیمار اپنے کپڑوں کے بوجھ کو نہیں برداشت کر سکتا۔ ہوا اسے بری معلوم ہوتی ہے۔ خفیف سے شور سے اس کا دل دھڑکنے لگتا ہے۔

ان تمام باتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ مہیجات خفیف ہوں یا شدید ان کی ہلاکت آفریں قوت میں فرق نہیں آتا۔ مسٹر میکنزی کا خیال ہے کہ بیمار کی قوت ردعمل بہت کمزور ہو جاتی ہے۔ اس لئے وہ مہیجات کے خلاف اپنی زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے جدوجہد نہیں کر سکتا۔ اس کے برخلاف اچھے بھلے انسان میں ردعمل کی قوت انتہائے عروج پر ہوتی ہے اور وہ بیرونی مہیجات کا مقابلہ کر سکتا ہے۔

افسوس ہے مسٹر میکنزی کو فطرت نے ہم سے چھین لیا۔ اگر وہ زندہ رہتے تو شاید ان کی تحقیقات سے بنی نوع کو بہت فائدہ پہنچتا اور اس مسئلے کا ہمیشہ کے لئے فیصلہ ہو جاتا کہ "ردعمل" کیا شے ہے۔

موجودہ تعلیم کے نقائص

ڈاکٹر ایل۔ پی جیکس پرنسپل مانچسٹر کالج نے ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:-

"میں سمجھتا ہوں کہ ہم تعلیم اور صنعت و حرفت کے مسایل میں ذہن اور جسم کو انسان کے دو مختلف حصے سمجھکر ایک بہت بڑی غلطی کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ یہ خیال بالکل غلط ہے کہ انسان دو اجزا سے مرکب ہے یعنی ذہن جو ایک اعلیٰ درجے کی چیز ہے اور جسم جو ایک ادنیٰ شے ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جن لوگوں کو صنعت و حرفت کی تعلیم دی جارہی ہے۔ وہی آگے چل کر ہمارے لئے مفید ثابت ہونگے۔ جن لوگوں کی دماغی تربیت کی جارہی ہے اور جسم سے بے پروائی برتی جارہی ہے وہ کارزار زندگی میں نسبتاً کم مفید ثابت ہونگے۔ اس امر کی ضرورت ہے۔ کہ انسان کو انسان سمجھا جائے۔ اس سے مشین کا سا سلوک نہ کیا جائے۔ جہاں اس کے دماغ کی تربیت کی جاتی ہے۔ وہاں اس کے جسم کی طرف بھی مناسب توجہ دیجائے۔"

قلوپطرہ کی موت

معصر کی حسین ملکہ قلوپطرہ سانپ سے ڈسوا کر مرگئی۔ شیکسپیرؔ اس کی زبان سے کہتا ہے :-

" آج میرے دل میں غیر فانی آرزوئیں ہیں "

" انطونی اور قلوپطرہ "

مُعطّر تھا وفا سے دامنِ گوہر نگار اُس کا — منوّر تھا فروغِ دلبری سے رہ گزار اُس کا
وہ خوابِ موت میں ہے اور دلکو انتظار اس کا — وہ حُسنِ سحر کار اس کا وہ عشقِ بیقرار اُس کا
وہ روئے شعلہ زار اسکا وہ جسمِ نوبہار اسکا

وہ مشرق کا ستارہ ماہ پارہ عالم آرا تھا — جبیں سے جس کی نورِ شادمانی آشکارا تھا
وفا کے دیوتا نے دلبری کا رُوپ دھارا تھا — مگر فطرت کو اس تصویر کا جلنا گوارا تھا
کہ سوزِ عشق کے شعلوں سے دل ہو داغدار اسکا

وہ روئے ارغواں جو بادۂ رنگیں کو شرمائے — وہ حُسنِ گلفشاں جو نرم ہنٹوں کے پھول برسائے
قیامت ہے کہ جسکی زلف ناگن بن کے لہرائے — وہ جوشِ بیخودی میں سانپ سے ڈسوا کے مرجائے
بنفشہ کی طرح سنولا گیا رنگین عذار اسکا

ابھی تک اسکی خوشبو سے ہوائیں عنبر افشاں ہیں — ابھی تک اس کے جلوؤں سے فضائیں گل بداماں ہیں
ابھی تک اسکی آنکھیں بادہ پیما شعلہ ساماں ہیں — ابھی تک ماہ و انجم دیکھ کر یہ رنگ حیراں ہیں
ابھی تک موت سے ہنگامہ پیرا ہے وقار اسکا

عابدہ

عمر خیام اور اسکا عہد

(گذشتہ سے پیوستہ)

خیام کی صناعی

چند ابتدائی مسایل

حسن مطلق کے علاوہ دنیا میں صرف تین چیزیں ایسی ہیں جن کے متعلق انسان کو کچھ علم ہے۔ فطرت۔ روح اور آرٹ (صنعت) پہلی دو چیزیں بلا واسطہ حسن مطلق کی آفرینش ہیں۔ اور آرٹ نام ہے فطرت پر روح انسانی کے عمل کا اس نقطہ نظر سے انسان کی تمام تخلیقات آرٹ کے دائرے میں شامل ہو جاتی ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب آرٹ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ تو عام طور پر ہماری مراد فاین آرٹ ہوتی ہے۔ اور اس پہلو سے صرف وہی تخلیقات آرٹ کے نام سے موسوم ہونے کا استحقاق رکھتی ہیں۔ جس میں "حسن" کا عنصر پایا جاتا ہے۔ "حسن" کی آفرینش صنعت کا مقصد ہے۔ اور حسن کے بغیر صنعت ایک جسم بے جان۔ یہ وہ شعلہ ہے جو ذہن انسانی کو روشن کرتا ہے۔ حس کو جلا دیتا ہے۔ جذبات کی مردہ اور ٹھنڈی راکھ میں آتش آرزو پیدا کر دیتا ہے۔

یہ تو مسلّم ہے کہ صنعت کا مقصد آفرینش حسن و تخلیق جمال ہے۔ لیکن یہ ایک متنازعہ فیہ مسئلہ ہے کہ "حسن" کے جلوے الفاظ میں محصور ہیں یا معانی میں۔ الفاظ اور معانی کا باہمی تعلق ہمیشہ ایک معرکتہ الآرا ادبی مسئلہ رہا ہے۔ یہ نظریہ کہ صنعتی خوبی یعنی، رنگ حسن و نقش جمال معانی کے عالم خیال سے بے نیاز ہے۔ لہٰذا اپنی تردید آپ کر رہا ہے۔ تازہ ترین لسانی طبعی اور نفسیاتی تحقیقات سے یہ بات پایہ ثبوت تک پہنچ چکی ہے کہ انداز یعنی الفاظ کی ترتیب اور ان کا باہمی تناسب و توافق۔ معانی کی نوعیت سے مشروط ہوتا ہے۔ جس قسم کے معانی ہوتے ہیں اسی قسم کے الفاظ کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہوا کہ رنگ حسن انداز میں اسوقت تک پیدا نہیں ہو سکتا۔ جب تک معانی میں بھی اس کے عناصر نہ ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک ہی عالمگیر حقیقت مختلف طریقوں سے ادا کی جا سکتی ہے۔ کبھی خالص فلسفیانہ تشکک و وقار کے ساتھ اور کبھی صنعتی حسن و جمال کے پہلو لئے ہوئے۔ لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انداز بیان و رنگ تحریر نے اختلاف مراتب پیدا کر دیا ہے۔ ایک تحریر ادبی شان لئے ہوئے ہے اور دوسری خشک۔ یہاں صرف انداز بیان ہی کا فرق نہیں۔ بلکہ تصور و تخیل میں بھی فرق پیدا ہو گیا ہے جس پہلو سے فلسفی نے ایک مسئلے کو دیکھا ہے۔ ادیب نے اس طرح دیکھا ہی نہیں۔

اس مشہور شعر میں

آدمی زادہ طرفہ معجون است
از فرشتہ سرشتہ وز حیوال

اور اقبال کے اس شعر میں

بلند تر ز سپہر است منزل من و تو
براہ قافلہ خورشید میل فرسنگ است

صرف انداز بیان ہی کا فرق نہیں ہے بلکہ انداز تصور و تخیل میں بھی ایک نمایاں اختلاف ہے۔

دوسری طرف محض معانی کی دل آویزی سے آفرینش جمال نہیں ہو سکتی۔ معانی کو لباس خوشنما پہنانا ضروری ہے۔ پہلے کہا جا چکا ہے کہ کہ الفاظ کا انتخاب معانی سے مشروط ہے۔ اس اعتبار سے جو لوگ معانی میں جمال کو اسی طرح پنہاں سمجھتے ہیں جس طرح پتھر میں شرار وہ بھی تسلیم کریں گے کہ صنعتی حسن الفاظ کے لئے بھی لازمی ہے۔ کیونکہ جس حالت میں الفاظ کا استعمال معانی کی نوعیت سے ہوگا۔ الفاظ میں دل آویزی کا رنگ بھی ضرور پیدا ہوگا۔

مختصر طور سے کہا جا سکتا ہے کہ مناسب خیال کو مناسب الفاظ کے ذریعے ادا کرنے کا نام صنعت ہے۔ معانی اور الفاظ میں روح اور جسم کا رشتہ قائم ہے

عروس جمیل ولباس حریر

الغرض الفاظ اور معانی کا باہمی تعلق ادب کے دلچسپ اور لطیف ترین مسائل میں سے ہے۔ صناع کی تخلیقی اور انکشافی قوت بعض اوقات نقاد کے فہم و ادراک سے بالاتر ہو جاتی ہے۔ کئی بار ایسا ہوتا ہے۔ کہ الفاظ اور معانی کے باہمی تعلق و تناسب کا بیان کرتے ہوئے نقاد عاجز آجاتا ہے۔ عجز فطری ہے۔ اختراع و ابداع کی الہامی قوتیں تنقید سے بلند ہیں۔ شاعر کو حقیقت اپنے پہلو میں جلوہ گر نظر آتی ہے۔ اور نقاد اس کو چراغ عقل لے کر ڈھونڈتا ہے۔ جہاں "حقیقت" یعنی حسن کا آفتاب جلوہ گستر ہو وہاں آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ شمع کی روشنی کیا کام دے سکتی ہے۔ کبھی کبھی اس تاریک راہ میں بجلی سی چمک جاتی ہے اور نقاد حقیقت کے روئے دل آویز کو ایک لمحے کے لئے دیکھ لیتا ہے۔ اس کے بعد پھر اسی طرح ظلمات کا سا اندھیرا چھا جاتا ہے۔

الفاظ و معانی کے باہمی تعلق کی تحلیل میں فروگذاشت کی ایک دلچسپ مثال۔

علامہ شبلی اپنی معرکتہ الآرا کتاب شعر العجم کی چوتھی جلد میں رقمطراز ہیں:-

معنی کے لحاظ سے الفاظ کا اثر یہاں تک الفاظ کی نسبت جو بحث تھی وہ زیادہ تر لفظ کی حیثیت یعنی آواز اور صورت اور لہجہ کے لحاظ سے تھی، لیکن شاعری کا اصلی مدار، الفاظ کی معنوی حالت پر ہے یعنی معنی کے لحاظ سے الفاظ کا کیا اثر ہوتا ہے اور اس لحاظ سے اُن میں کیونکر اختلاف مراتب ہوتا ہے۔

ہر زبان میں مترادف الفاظ ہوتے ہیں جو ایک ہی معنی پر دلالت کرتے ہیں لیکن جب غور سے دیکھا جائے تو ان الفاظ میں بھی باہم فرق ہوتا ہے یعنی ہر لفظ کے مفہوم اور معنی میں کوئی ایسی خصوصیت ہوتی ہے جو دوسرے میں نہیں پائی جاتی، مثلاً خدا کو فارسی میں خدا، پروردگار، داور، ایزد، فریدگار، سب کہتے ہیں۔ بظاہر ان سب الفاظ کے ایک ہی معنی ہیں لیکن درحقیقت ہر لفظ میں ایک خاص بات اور خاص اثر ہے جو اسی کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس لئے شاعر کی نکتہ دانی یہ ہے کہ جس مضمون کے ادا کرنے کے لئے خاص جو لفظ موزوں اور موثر ہے وہی استعمال کیا جائے ورنہ شعر میں وہ اثر پیدا نہ ہوگا۔ یہ ایک دقیق نکتہ ہے، اور بغیر اس کے کہ ایک خاص مثال میں ایک ایک لفظ پر بحث کر کے نہ سمجھایا جائے سمجھ میں نہیں آسکتا۔

فیضی کا شعر ہے۔

بانگِ قلم دریں شبِ تار ۔۔۔ بس معنیٔ خفتہ کرد بیدار

"شعر کا اصل مضمون یہ ہے کہ "شاعری میں مَیں نے بہت سے نئے مضمون پیدا کئے"۔ اس کو استعارہ کے پیرایہ میں یوں ادا کیا ہے کہ "میرے قلم کی آواز نے بہت سے سوتے ہوئے مضمونوں کو جگا دیا۔ اب اس کے ایک ایک لفظ پر خیال کرو۔

بانگ خاص اس آواز کو کہتے ہیں جس میں بلندی اور فخامت ہو جو جگانے کے لئے موزوں ہے، بانگ اور آواز اور صریر ہم معنی ہیں۔ اس لئے بانگِ قلم کے بجائے آوازِ قلم اور صریرِ قلم بھی کہہ سکتے ہیں لیکن اس موقع کے لئے صرف بانگ۔ موزوں ہے۔

قلم کو فارسی میں خامہ اور کلک بھی کہتے ہیں۔ لیکن قلم کے لفظ میں جو فخامت اور رعب ہے اور لفظوں میں نہیں، متکلم کے میم نے ملکر اس فخامت کو اور بڑھا دیا ہے۔ بانگ اور قلم کی ترکیب نے لفظ کو اور زیادہ پُر وزن کر دیا ہے۔

تار کو تیرہ اور تاریک بھی کہتے ہیں۔ لیکن اس مصرع میں حُسن صورت کے لحاظ سے تار ہی موزوں ہے۔

بس کے ہم معنی بہت سے الفاظ ہیں مثلاً بسیار، لختے، خیلے، وغیرہ لیکن بس کو لفظ میں کثرت کی جو توسیع ہے اور لفظوں میں نہیں ہے۔

ان تمام باتوں پر غور کرو تب یہ نکتہ حل ہوگا کہ اس شعر میں جو اثر ہے اس کا سبب یہ ہے کہ مضمون کی ایک ایک خصوصیت ظاہر کرنے کے لئے جو الفاظ درکار تھے اور جن کے بغیر وہ خصوصیت ادا نہیں ہو سکتی تھی سب شاعر نے جمع کر دئے اور ان باتوں کے ساتھ اصل مضمون میں اصلیت اور طرز ادا میں جدت اور ندرت پیدا کی۔

بڑے بڑے خیالات اور جذبات لفظ کے تابع ہوتے ہیں ایک لفظ ایک بہت بڑے خیال یا بہت بڑے جذبہ کو مجسم کر کے دکھا سکتا ہے۔ ایک بہت بڑا مصور ایک مرقع کے ذریعہ سے غیظ و غضب، جوش اور قہر، عظمت اور شان کا جو منظر دکھا سکتا ہے۔ شاعر صرف ایک لفظ سے وہی اثر پیدا کر سکتا ہے۔

علامہ موصوف نے "بس معنی خفتہ کردہ بیدار" کا مطلب یہ سمجھا کہ مَیں نے بہت سے نئے مضمون پیدا کئے۔ اور درست سمجھا۔ لیکن ان کی نظر

اس طرف نہیں گئی کہ فیضی نے نئے مضامین پیدا کرنے کو "معنی خفتہ" کو بیدار کرنا کیوں کہا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس شعر میں یہی پہلو دلچسپ تھا جو نظر انداز کر دیا گیا۔ ایک سنگتراش کا قول ہے کہ بت بنایا نہیں جاتا بلکہ وہ اپنی پوری شان جمال کے ساتھ پتھر میں پہلے ہی سے موجود ہوتا ہے۔ اس کی فطرت تقاضائے اظہار کرتی ہے وہ اپنے حسن سے نگاہوں کو تسخیر کرنے کے لئے بیتاب ہوتا ہے۔ سنگتراش صرف یہ کرتا ہے کہ پتھر کے نقاب عارضی کو دور کر دیتا ہے۔ نگار حسن کا روئے دل افروز اپنی پوری شان میں جلوہ گر ہو جاتا ہے۔ اور اہل نظر پکار اٹھتے ہیں۔

چہرہ یار سے نقاب اٹھا
دل سے اک شور اضطراب اٹھا

اسی طرح آرٹ کی مملکت میں ہزاروں دل افروز و جاں پرور معانی منتظر نقاب کشائی رہتے ہیں۔ "حسن" کائنات کے ذرے ذرے میں پنہاں ہے۔ شاعر صرف یہ کرتا ہے کہ اس احساس حسن کو جو اس کے دل کو ایک طلسم رنگ و لو بنائے ہوئے ہے۔ الفاظ کا جامہ پہنا دے۔ اس اعتبار سے فیضی نے نئے معانی کو "معنی خفتہ" کہا۔ اس سے بہتر تشبیہ نہ ہو سکتی تھی۔ جس طرح سویا ہوا شخص بظاہر مردہ معلوم ہوتا ہے اور اس کا وجود عدم وجود برابر ہوتا ہے۔ لیکن ایک خفیف سی جنبش ایک ہلکا سا شور اس کی رگ حیات میں لرزش پیدا کر دینے کے لئے کافی ثابت ہوتا ہے۔ اسی طرح معانی بکر دلنواز فکر ہر وقت بیتاب اظہار رہتے ہیں۔ اور صناع کی انکشافی قوت ایک جنبش قلم سے انہیں منظر عام پر لے آتی ہے۔

اب پھر پڑھئے۔

بانگ قلمم درین شب تار
بس معنی خفتہ کردہ بیدار

ایک اور مثال

اقبال کا شعر ہے۔

غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغ حرم اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا

مرکزی خیال یہ ہے کہ عصر حاضر میں مسلمان امتیازات رنگ و خون و نسب میں مبتلا ہو کر اس اخوت کو بھلا بیٹھے ہیں۔ جو مذہب اسلام کا سنگ بنیاد ہے۔ حالانکہ ان امتیازات کی زنجیر سے آزاد ہو جانا ذرا بھی دشوار نہیں۔

اب اس خیال کے مختلف پہلو دیکھئے۔

"مرغ حرم" سے مسلمان مراد لیکر اقبال اسلام کی اس عالمگیر وسعت کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ جو شروع سے اس مذہب کی خصوصیت رہی ہے۔ جس طرح "مرغ" اپنے پر پرواز سے فضاؤں کو طے کرتا ہوا دور دور تک جا پہنچتا ہے۔ اسی طرح مسلم اپنی زندگی کے لئے کسی خاص زمین کسی خاص فضا کسی خاص حالت کا پابند نہیں ہے۔ یہ روح آزاد "زنجیری صبح و شام وطن" نہیں ہے۔ اس کا وطن روئے زمین ہے۔ "مرغ حرم" کے بال و پر غبار آلود ہونے سے مراد یہی ہے کہ اس کی طاقت پرواز حقیقی طور پر غبار رنگ و نسب سے ضائع نہیں ہوتی۔ ایک ذرا سی جنبش سے یہ عارضی عیب "غبار آلودگی" بھی ضائع ہو جائیگا۔ یعنی ان امتیازات کو فنا کرنے کے لئے ایک حرکت استقلال کافی ہے۔ اور بس۔ اس کے بعد مسلم اپنی ابتدائی سادگی میں نمودار ہوگا۔ اور یوں فطرت کے اس پیغام کی تکمیل ہوگی جو ان الفاظ کے ذریعے ادا کیا گیا تھا۔

"الیوم اکملت لکم دینکم"
(آج کے دن میں نے تمہارے دین کی تکمیل کر دی۔)

ایک اور مثال

غالب کا شعر ہے۔

آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیش نظر ہے آئینہ دایم نقاب میں

مرکزی خیال یہ ہے کہ کائنات حسن مطلق کے جمال بے مثال کا ایک پرتو ہے۔ جس طرح صناع کی ذہنیت اور اس کے عقلی کمالات اس کی صنعتی تخلیقات سے نمایاں ہوتے ہیں۔ اسی طرح کائنات کے مظاہر و مناظر بھی خدا کے وجود کی دلیل ہیں۔ اور اس کے حسن و جمال کے شاہد۔ دنیا ہر لحظہ ترقی کر رہی ہے۔ بڑھ رہی ہے۔ اور اس آئینہ میں نگار حقیقت اپنا جلوہ دیکھ رہا ہے۔ آخر ایک دن ایسا آئیگا جب انسان اپنی تکمیل کر لیگا۔ اور الوہیت کے رازوں سے واقف ہو جائیگا۔ اقبال نے کیا خوب کہا ہے

فروغ خاکیاں از نوریاں افزوں شود روزے
زمیں از کوکب تقدیر ما گردوں شود روزے

اب دیکھئے یہ خیال کس طرح ادا کیا گیا ہے۔

دنیا کے ارتقائی ترقی اور انسان کے ذہنی جلا کو خدا کی "آرائش جمال" کہا ہے۔ یعنی حسن مطلق انسان کی تکمیل کر کے اپنے ذوق حسن کی تکمیل کر رہا ہے۔ مناظر کائنات کو آئینہ کہہ کر غالب نے وہ تمام تعلقات آئینہ کر دئے ہیں جو خدا اور انسان کے درمیان پائے جاتے

ہیں - انسان صفات خداوندی کا مظہر ہے - اور اس اعتبار سے "آئینہ جمال دوست کہلانے" کا مستحق ہے "ہنوز" کا لفظ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ابھی انسانیت کی تکمیل نہیں ہوئی - "نقاب" یہی دیتا ہے یعنی مایا - جو پردے کی طرح "جان عالم" کے چہرے کو چھپائے رکھتی ہے - ورنہ اس آفتاب حسن کی ضیا باری سے آنکھیں خیرہ ہو جائیں - پھر اس "نقاب" میں یہی بات نہیں کہ وہ "رخسار جان عالم" کا پردہ ہے - بلکہ یہ بھی اشارہ ہے کہ جس طرح نقاب کو حسن کی آرائش کی اطلاع نہیں ہوتی اسی طرح دنیا کو بھی اپنی تکمیل کا پورا علم نہیں ہوتا - جو لوگ طوفان میں گھرے ہوئے ہیں وہ موجوں کی بلاخیزی اور قہر انگیزی کا صحیح اندازہ نہیں قائم کر سکتے - "سبکساران ساحل" ہی طوفان کی شدت کا اندازہ لگا سکتے ہیں - انسان عام طور پر اپنے ذہنی ارتقا سے بے علم رہتا ہے - لیکن شاعر کی انکشافی قوت نے اس نکتے کو پا لیا ہے -

موسیقی اور الفاظ معانی

اس سے پہلے کہا جا چکا ہے کہ صنعت کا مقصد اعلیٰ تخلیق حسن ہے - اب ظاہر ہے کہ الفاظ کا حسن صرف حسن صوت ہو سکتا ہے - ادبی انداز "حسن صوت" کا دوسرا نام ہے - حقیقت یہ ہے کہ الفاظ "فردوس گوش" ہو سکتے ہیں - جنت نگاہ نہیں - اس اعتبار سے ترنم اور "تناسب مترنم" انداز کی صفات جمالی کہلاتی ہیں -

ترنم سے مراد شیریں خوشگوار لطیف اور سبک الفاظ کا استعمال ہے - قاآنی ترنم کے اعتبار سے لاجواب ہے - اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ اس راز کو سمجھ گیا ہے - کہ شاعری نے موسیقی سے جو کچھ لیا ہے وہ حسن کی آفرینش کے لئے ضروری ہے - میں نے کئی بار تجربہ کیا ہے جو لوگ فارسی زبان سے قطعاً ناواقف ہیں - ان کو قاآنی کے اشعار سنائے ہیں - اور انہوں نے بے اختیار کہا ہے -

"کسقدر مترنم اشعار ہیں" -

مندرجہ ذیل اشعار کا ترنم دیکھئے -

نگار مشکبوئے من زمن خطا چہ دیدۂ ٭ کہ ہم چو آہوان چیں از ما خطا رمیدۂ
بساز نقل آشتی بس است گیر و دار ہا
نہ ہمدمے کہ یکدمش ز حال خود خبر کنم ٭ نہ محرمے کہ پیش او حدیث عشق سر کنم
نہ دلبرے کہ بر رخش بیاد او نظر کنم ٭ نہ بادۂ کہ مجلسے کنو و دماغ تر کنم
نہ طبع را فراغتے کہ تن دہم بکار ہا

تناسب مترنم ترنم سے زیادہ لطیف شے ہے - یہ شے پیدا کرنے کے لئے پہلے صناع الفاظ و معانی میں خوشنما اور مناسب تعلق پیدا کرتا ہے - اس کے بعد لفظ کو لفظ سے فقرے کو فقرے سے اس طرح ترکیب دیتا ہے - کہ الفاظ کا اتار چڑھاؤ - اجزا کا زیر و بم اور تراکیب کی برجستگی سے ایک جادو کا سا اثر پیدا ہو جاتا ہے -

مندرجہ بالا سطور سے یہ بات عیاں ہو جائیگی کہ "الفاظ اور معانی" کا تعلق ادب کے ایسے مسایل میں سے ہے کہ قدم قدم پر اس کا ذکر آئیگا - یہاں کہا جا چکا ہے کہ "موسیقی" کے بغیر "ادب" "آفرینش حسن" کا مقصد پورا نہیں کر سکتا کیونکہ ادب صرف حسن صوت کے ذریعے تخیل کو متاثر کر سکتا ہے - یہ بھی کہا جا چکا ہے کہ موسیقی کے عناصر پیدا کرنے کے لئے پہلے الفاظ اور معانی کا مناسب ربط پیدا کرنا ضروری ہے تو ثابت ہوا کہ جبتک صناع الفاظ اور معانی کے تعلق باہمی کے دشوار گذار راستے کو طے نہ کریگا - وہ "آفرینش حسن" کی منزل کی طرف قدم نہ بڑھائیگا -

موسیقی اور وزن

مندرجہ بالا سطور میں اشارہ کیا جا چکا ہے - کہ الفاظ کی انتہائی صنعت گری "حسن صوت" ہے اور بس - شعر میں حسن صوت کی بہترین مثالیں نظر آتی ہیں - اور اس کی وجہ یہی ہے کہ شعر کے لئے وزن ضروری ہے - اور وزن تناسب و توافق کا پیمانہ ہے - موسیقی کے اصولوں کی طرح وزن اشعار میں الفاظ کے اتار چڑھاؤ سے ایک اثر حسن پیدا کرتا ہے -

وزن اور موسیقی کا تعلق ایک نہایت دلچسپ بحث ہے میں نے اس فن پر کوئی کتاب نہیں پڑھی - لیکن موسیقی سے واقفیت رکھنے کے باعث وزن کے ارکان اور موسیقی کے اصولوں میں جو مشابہت مجھے نظر آتی ہے اُسے پیش کرتا ہوں -

سریلی آواز ستار بانسری ہارمونیم یا کسی اور ساز کے تعدد لرزش سے پیدا ہوتی ہے - ایک سیکنڈ کے وقفے میں جس تعداد میں لرزش پیدا ہوتی ہے - اسے تعدد لرزش کہا جاتا ہے - اب اگر یہ لرزش ایک ہی تعداد پر قائم رہی تو سریلا پن کہلاتی ہے ورنہ شور ہو کر رہ جاتی ہے -

ہر لرزش سُر کہلاتی ہے - اگر تعداد لرزش زیادہ ہے تو سُر اونچی ہوگی کم ہے تو نیچی - خاص وقتوں کے اندازہ پر گانے کو لے کہتے ہیں لے کو ناپنے کے لئے ۱/۴ سیکنڈ کا پیمانہ مان لیا گیا ہے - اس وقفے کو ماترا کہتے ہیں - بعض اوقات ایسا ہوا کہ جہاں آٹھ ماترے ہوتے ہیں وہاں گانے والا صرف چار ماتروں جتنا وقف لیتا ہے - ایسی صورت میں لے کو دگن یا درت کہتے ہیں - تمام ماتروں میں لے کے بھر جانے کو

Melody Harmony

چکر کہتے ہیں ۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ لے معمولی ماتروں میں پھرتی ہے اور گانے والا مقررہ الفاظ کو دوبارہ یا تین بار کہکر بالکل صحیح سم لیتا ہے ۔ اسے دگن اور تگن کہتے ہیں ۔

چکر میں کہیں کہیں ایسا وقفہ آتا ہے جہاں لے ذرا ٹھمتی ہے ۔ اس ٹھماؤ کو سم کہا جاتا ہے ۔ ماتروں کی تعداد کو کئی ٹکروں میں بانٹ دیا جاتا ہے ۔ یہ ٹکرے چکر کے رنگ کہلاتے ہیں ۔

انگ کا وقفہ قائم رکھنے کو تال کہتے ہیں ۔ جتنے انگ ہونگے اتنی تالیں بھی ہونگی ۔ اس اعتبار سے چکر کے شروع اور ختم ہونے کے امتیاز کے لئے کسی تال کی آواز باقی تالوں کی آواز سے مختلف ہوتی ہے ۔ اس تال کو خالی کہتے ہیں ۔

وزن میں بحر کے ارکان سُر ہونگیں ۔ مثلاً

مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن

ایک رکن اور دوسرے رکن کے درمیان جو وقفہ ہے اسے ماترا کہا جائیگا ۔

مفاعیلن کے آٹھ بار کہنے سے لے اپنے کل ماتروں میں دوڑ جائیگی ۔ ایک شعر پورا ہو جائیگا ۔

اس اعتبار سے کئی وزن اپنی موسیقیت کے اعتبار سے دوسرے وزنوں پر فوقیت رکھیں گے ۔ مندرجہ بالا وزن میں صرف ایک سُر اپنے آپ کو دہرا رہی ہے ۔ لیکن مندرجہ بالا وزنوں میں سروں کا اختلاف دیکھو ۔

فاعلن مفاعیلن ۔ فاعلن مفاعیلن

کہتے ہو نہ دینگے دل ہم نے گر پڑا پایا

کارگاہ ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے

مستفعلن ۔ مفعولن ۔ مستفعلن ۔ مفعولن

کیں کیمیائے ہستی قاروں کند گدارا

اس کی وجہ یہ ہے کہ جس راگوں میں سر میں اپنے آپ کو کم دہراتی ہیں وہاں مختلف سروں کے امتزاج سے تناسب و توافق موسیقی کا ایک گہرا اثر مترتب ہوتا ہے ۔ اسی طرح جن اوزان میں ارکان کے حروف ایک دوسرے سے مختلف ہیں وہاں کثرت کو وحدت اور تفاوت کو تناسب کا انگ دیکر موسیقی کا اثر پیدا کیا گیا ہے ۔

اس کی ایک اور وجہ سمجھ میں آتی ہے ۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے ۔ کہ راگ میں خوش نمائی اور ترصیع پیدا کرنے کیلئے معمولی سروں میں ادا کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی ایک دوسری سُر کو چھو بھی لیتے ہیں ۔ جو سر محض چھویا جاتا ہے ۔ اسے (grace) "لطافت" کہتے ہیں ۔ وہی بات کو کثرت سے وحدت تناسب کو پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے ۔

اسی طرح اوزان میں ارکان کے حروف کے اختلاف سے وزن کو مرصع اور خوش آواز کیا جاتا ہے ۔ مثلاً موسیقی کے اعتبار سے

مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن

فاعلن مفاعیلن فاعلن مفاعیلن

بس یہ فرق ہے کہ دوسرے وزن میں ایک رکن فاعلن سے بدلا گیا ہے اور اس کی لرزش کی خاطر اس میں م ۔ ی ۔ (grace) لطافت کے ہلکے سروں کی طرح چھولی گئی ہیں ۔ اب فاعلن اور مفاعیلن میں جو اختلاف ہوگیا ہے ۔ اسکو دوسری بار دہرا کر تناسب پیدا کردیا گیا ہے ۔

یہ تو ہوا اوزان کے اعتبار سے موسیقی کا اثر ۔ الفاظ میں بھی اسی طرح موسیقی کا اصول کارفرما ہے ۔ یعنی صناع شاعر الفاظ کو اسطرح باہمدگر ترتیب دیتا ہے وہ ایک دوسرے کے ساتھ ایسی برجستگی اور شستگی سے ملتے ہیں کہ دگن کا اثر پیدا ہو جاتا ہے ۔

اقبال کے مندرجہ ذیل اشعار پر غور کیجئے

گلہ جفائے وفا نما کہ حرم کو اہل حرم سے ہے

کبھی بتکدے میں کروں بیاں تو کہے صنم بھی ہری ہری

دم زندگی ۔ رم زندگی ۔ غم زندگی ۔ سم زندگی

غم رم نہ کر سم غم نہ کھا کہ یہی ہے شان قلندری

دوسرے شعر کے الفاظ میں زندگی کی تکرار ۔ غم رم اور سم غم کی ترکیب اور الفاظ کا باہمی امتزاج حد درجہ ترنم آفریں ہے ۔ پہلا شعر دھیمی سروں میں شروع ہوتا ہے ۔ لیکن دوسرا بڑھ جاتا ہے مندرجہ ذیل اشعار میں پہلے شعر میں تال کے اعتبار سے "اہل حرم سے ہے" خالی اور "ہری ہری" سم گنا جائیگا ۔

عابد

"تنقید نگار"

یاد آیا میکہ میں مرزا سجنا ور بیگ چغتائی تھا" ـــــ قارئین کرام پر بھی واضح ہو جائیگا کہ میں اب یہ نہیں "ہوں"۔ نام تو باقی ہے اور وائے بدنصیبی میں ابھی تک روزنامہ نقاد کا تنقید نگار بھی ہوں۔ یہ خبر نہیں کہ کچھ عرصہ بعد میری ہستی میں اور کیا تغیر واقع ہوگا۔ پریشان ہوں۔ سراسیمہ ہوں۔ پراگندہ خاطر ہوں اور اپنا افسانہ زیر تحریر ہے۔ صورت حال حد درجہ نازک ہے لیکن کوشاں ہوں کہ باوجود مشکلات "آپ بیتی" ذرا وضاحت کے ساتھ بیان کروں۔ ذرا صبر سے کام لیجئے۔ جب انسان خود اپنی ہی حقیقت فراموش کر دے تو اظہار مدعا جوئے شیر کے لانے سے کم نہیں۔ ذرا غور کر لوں تو شاید اپنی داستان بیان کرسکوں۔ اور خیالات واضح کرنے میں کامیاب ہوجاؤں۔ اچھا چند سے اجتماع حواس کی مہلت دیجئے ...... میں آخر ہوں کیا؟ کاش کے مجھے اس کا علم ہوتا۔ حیف! مردہ ہستی! مرزا..... آ۔ ور..... بیگ... چغتا... ئی!!!

حاشا، گزشتہ ایام میں یہ حرکت مجھے قطعی پسند نہ ہوتی۔ لیکن میرا مذاق سلیم تو جب سے میں تنقید نگار ہوا، بالکل بدل گیا، زمانے کی طرح پلٹ گیا۔ ہر شے اس وقت متغیر نظر آتی ہے یہ میری "آپ بیتی" ہے لیکن حقیقت میں خودستائی پر مبنی نہیں ہے۔ کیونکہ اب میں 'وہ' نہیں ہوں جو تھا۔ میری اصلیت بدل گئی ہے، میں اپنی حقیقت کو فراموش کر چکا ہوں۔

ایک زمانہ تھا کہ میں خوبصورت آدمی تھا کسیقدر شرمیلا، خوشنما مونچھیں۔ دلکش چہرہ۔ خاکی لباس مجھے بہت مرغوب تھا۔ قدرے لکنت کرتا تھا جو کہ زمانۂ تحصیل علم میں ایک ہم مکتب کی صحبت کا اثر تھا۔ حسین زاہدہ مجھے میری فطری سادگی اور تصنع و نمائش سے احتراز کی وجہ سے پسند کرتی تھی۔ ہماری محبت یکسانی فطرت و خیالات پر قائم تھی۔ ہم مستقبل کے لئے نہایت روح افزا اور سرورخیز امیدیں قائم کیا کرتے تھے۔ (واحسرتا! کہ حباب کی طرح وہ ٹوٹ گئیں۔) اس کی ماں رحلت کر چکی تھی۔ اس کا باپ مجھ سے اس وجہ سے خوش تھا۔ کہ میں اس کی گفتگو میں دلچسپی کا اظہار کیا کرتا تھا۔ میرے والد سرآوردہ تھے۔ لاریب کہ میری فضائے مستقبل نہایت روشن اور خوشگوار تھی ...... ان ایام میں، میں تھیئٹر نہیں جاتا تھا۔ میری چچی راشدہ مرحومہ نے وفات سے قبل مجھے وہاں جانے سے منع کیا تھا .... اس کے بعد میری منشار کے خلاف، مسٹر ناظم ایڈیٹر نقاد نے مجھے "ڈرامہ" کا نقاد بننے پر مجبور کیا۔ ناظم ایک بذلہ سنج، خوش مزاج آدمی تھے، بڑا سر اور سیاہ گھونگر والے بال۔ ایک مرتبہ جب میں کلیم سے ملنے جا رہا تھا تو راہ میں انہوں نے مجھے روک لیا اور غیر معمولی خندہ پیشانی سے ملے۔

"آخاہ، چغتائی صاحب" انہوں نے فرمایا "بس آپ بہت موزوں ہیں۔"

انہوں نے میرا کالر پکڑ لیا اور بہت سرعت سے دفتر لیگئے۔ ردی کی ٹوکری کے اوپر کی آرام کرسی پر مجھے بٹھاتے ہوئے کہنے لگے۔

"براہ کرم تشریف رکھیئے" ؛ ازاں بعد وہ نہایت پھرتی سے کمرہ کے دوسری طرف گئے۔ اور چند سرخ اور زرد رنگ ٹکٹ مجھے لاکر دیدیئے۔

وہ کہنے لگے "الیگزینڈرا کمپنی" پنجشنبہ اور جمعہ کو "وطن"، شنبہ کو "آنکھ کی خطا" میرے خیال میں" "لیکن" ـــ میں نے کہا۔

ڈیسک پر سے چند پروف اٹھا کر دیکھتے ہوئے انہوں نے کہا۔

"میں بہت خوش ہوں کہ آپ کو فرصت ہے"۔

میں نے کہا۔ "میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا"۔

"ہوں؟" وہ میرے جواب سے بہت متحیر ہوئے۔

میں نے دریافت کیا "کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں ان 'کھیلوں' پر تنقید کروں؟"

"جی ہاں۔ تو کیا آپ دعوت سمجھے تھے؟"

"لیکن میں تنقید نہیں کرسکتا"۔

"جی؟"

"بات یہ ہے کہ میں آجتک تھیئٹر نہیں گیا ہوں"۔

"معصوم ہستی!"

"لیکن آپ جانتے ہیں کہ میں اس فن سے نابلد ہوں"۔

"درست فرمایا۔ یہ نئی شاہراہ ہے۔ آپ اس کے عادی نہیں ہیں۔

لیکن ہمارا روزنامچہ ایک زندہ پرچہ ہے۔ یہاں آپ کو اپنی ذاتی رائے سے آگاہ کرنے کی اجازت ہے۔ بیجا طرفداری کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اس معاملہ میں آپ کی ذہانت اور نقابلیت پر کافی بھروسہ کرتا ہوں:

لیکن میرے ذاتی خیالات ——"

انہوں نے مجھے دفعتاً کھڑا کر دیا۔ دروازہ پر لائے اور کہنے لگے "آپ جاکر ذرا کلیم سے تو رائے لیجئے، وہ تمام معاملات کی تشریح کر دینگے"

میں شش و پنج میں ابھی استادہ ہی تھا کہ مسٹر ناظم نے پھر دروازہ کھولا۔ اور "میں بھول گیا" کہتے ہوئے ایک چوتھا ٹکٹ اور میرے سپرد کیا۔ اور دروازہ زور سے بند کر لیا۔

مجھے بیکار طوالت سے نفرت ہے۔ میں نے طے کر لیا کہ میں ناظم کے مشورہ پر عمل پیرا ہونگا۔ اور (وائے خون تمنا) تنقید نگار بنجاؤنگا کلیم کے مکان تک میں نے راستہ آہستہ آہستہ طے کیا۔ اور آخر کار اسی فیصلہ پر پہنچا۔ فی الواقع مسٹر ناظم کا طرز ملاقات نہایت کامیاب ہے میری ملاقات کے چار سال میں انہوں نے شاید ہی کسی خیال کا اظہار کیا ہو جس سے اتفاق کرنے کے لئے وہ مجھے مجبور کرنے میں کامیاب نہ رہے ہوں۔ ممکن ہے کہ اس کا باعث میری کمزوری ہو۔ یہ تو واقعہ ہے کہ میں اپنے ماحول کے اثرات کو بہت جلد قبول کر لیتا ہوں۔ میری بربادی حقیقتاً اسی اثر پذیری کا نتیجہ ہے۔ یہی کمزوری میری لکنت کا باعث ہوئی۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ ہے۔ اُس دن میں سواری پر مکان کو واپس ہوا۔

روز اول کے واقعات کے تذکرہ سے، گو وہ بہت دلچسپ ہیں۔ میں آپ کے عزیز وقت کو ضائع نہ کرونگا۔ اُن کی تفصیل میں اپنے روزنامچہ کے لئے محفوظ رکھتا ہوں۔ نہ میں اس واقعہ کی طرف اشارہ کرونگا۔ کہ میں کس طرح "وقفہ راحت" کے بعد اپنی نشست کو بھول گیا۔ اور تیسرا ایکٹ گیلری میں سے دیکھا۔ مجھے آپ کے سامنے جس امر کا اظہار منظور ہے وہ اُن تاثرات کی بابت ہے جو مجھ پر اس شب کو مرتب ہوئے۔ ایکٹنگ نے مجھ پر کیا انوکھا اثر پیدا کیا۔ واضح رہے کہ میں نے اسوقت تک ایک خاموش، تنہا پسند زندگی بسر کی تھی۔ میں اس سے قبل تھیئٹر نہیں گیا تھا۔ میری طبیعت قدرتی طور پر شوخ مناظر سے بہت سرعت کے ساتھ متاثر ہو جاتی ہے۔ گو آپ کو یہ تکرار فضول معلوم ہو۔ لیکن میرا بیان سمجھنے کے لئے اس بات کو ہمہ وقت پیش نظر رکھنا چاہئے۔

حیرت و استعجاب نے، جس میں خوف کا عنصر بھی شامل تھا۔ اول اول مجھ پر اثر کیا۔ فطرت سے تضاد، حقیقت سے بُعد ایسی چیزیں ہیں کہ ممکن ہے ایک تھیئٹر کے عادی کو اپنی طرف متوجہ نہ کر سکیں محسوس نہ ہو لیکن ایک "نو وارد" کی آنکھوں میں یہ سماں مزید کھٹکنے لگتا ہے۔ ایکٹروں کی وہ لااُبالی۔ وحشیانہ حرکات، تصنع بھرے خیالات نمائشی جذبات، اُن کا منہ بنانا۔ مترنم خراٹے لینا۔ اُن کی مصنوعی چیخ اور بیکار۔ ہونٹ چبانا۔ حقیقت سے کوسوں دور، دہشتناک مناظر، اور اسٹیج کے تمام امتیازات تصنع ایک فطرت کے شیدائی کو عجیب کیفیت سے آشنا کرتے ہیں۔ ان سب حرکات کو، جو نو وارد کو عجیب اور کسیقدر بے معنی معلوم ہوتی ہیں۔ عادی حضرات بس اسی طرح سمجھ جاتے ہیں جسطرح کوئی گفتگو کے مفہوم کو سمجھ لے۔ گویا یہ حرکات بھی خاموش زبان بن جاتی ہیں۔

یہ منظر میرے لئے ایک عجیب منظر تھا۔ اجتماع کافی تھا۔ ناظرین ایکٹنگ میں محو نظر آتے تھے۔ میری تازہ نظروں کو یہ کیفیت، انسانی فطرت کی تضحیک معلوم ہوئی۔ میں نے اسے تنقیدی اور استفسارانہ نگاہوں سے دیکھا اور خیال کیا۔ جیسا کہ ہر تنقید نگار خیال کرتا ہے۔ کہ ڈرامہ کی اصلاح میرا فرض ہے۔ شب کو کھانا کھانے کے بعد جو کثرت جذبات اور جوش تنقید کی وجہ سے کھایا نہ جاتا تھا۔ میں دفتر اپنی رائے سپرد قلم کرنے گیا۔ میری رائے حقارت اور استہزا کا پہلو لئے ہوئے تھی۔ مسٹر ناظم نے بہت مسرت کا اظہار کیا۔

رات بھر خواب میں میں نے ایکٹروں کو دیکھا۔ گھورتے ہوئے، سینہ کوبی کرتے ہوئے، دراز کردہ بازوؤں اور انگلیوں کو جھٹکا دیتے ہوئے، بُری طرح مُسکراتے ہوئے، مایوسانہ ہنستے ہوئے، نا امیدانہ گرتے ہوئے، ابلہانہ مرتے ہوئے۔

گیارہ بجے میں اٹھا۔ سر میں قدرے درد تھا۔ "نقاد" میں اپنی رائے کو پڑھا۔ ناشتہ کیا۔ اور کمرہ میں مو تراشی کے لئے گیا۔ اس وقت ایک عجیب حرکت سرزد ہوئی۔ مجھے استرا نہیں ملا۔ معاً خیال ہوا کہ وہ بیگ میں بند تھا۔

میں نے کہا۔ "آہ" میں آئینہ کے سامنے کھڑا تھا۔ بیگ کا خیال آتے ہی خود بخود میرے منہ سے نکل گیا" اخاہ" میں نے غیر اختیاری طور پر بائیں ہاتھ کی انگلیوں کو پھیلا کر جھٹکا دیا۔ میرا دایاں ہاتھ نادانستہ طور پر میرے شکم پر آگیا۔ میں ہر وقت ضابط رہتا ہوں۔ مجھے یہ حرکت عجیب معلوم ہوئی۔ میں نے اپنے اطمینان کے لئے اس کی تکرار کی۔ "خوب!" پھر میں کسیقدر نادم اور سراسیمہ ہو کر بیگ کی طرف گیا۔

مو تراشی کے بعد میرا ذہن یک بیک اس حرکت کی طرف، جو ابھی مجھ سے بے اختیارانہ صادر ہوئی تھی۔ منتقل ہو گیا۔ اور میں نے

بار دیگر آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر اس حرکت کی تکرار سے اپنے آپ کو محظوظ کیا۔ "یہ بھی ایک قسم کا مرض ہے" میں نے کہا...... اس کے بعد جہاں تک میری یاد کام دیتی ہے میں کلب سے چلا گیا۔ ازاں بعد ہوٹل میں زاہدہ کے ہمراہ شریک طعام ہوا۔ میری موجودہ مصروفیت کی روشنی میں ہم نے اپنے مستقبل پر گفتگو کی۔ مصروفیت! حیف! یہ میری بدقسمتی کا پہلا باب، میری بربادی کی پہلی منزل تھی۔ یہ مصروفیت مجھے روزانہ تھیٹر لیجاتی اور میں بتدریج غیر محسوسانہ تغیر پذیر ہونا شروع ہوا۔ اولین حرکت کے بعد مجھ سے نادانستہ نئے نئے افعال سرزد ہونے لگے۔ میں نے خود کو زاہدہ کے سامنے سرخم کرتے پایا۔ میں اس کے دراز کردہ ہاتھ کو لینے کے لئے جھکا۔ لیکن جونہی کہ میں اس غیر معمولی حرکت کو محسوس کرتا۔ فوراً سر بلند ہو جاتا۔ اور میرے چہرے سے اضطراب ظاہر ہونے لگتا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ میرے اس رویے کو حیرت سے دیکھتی۔ پھر میں خود اظہار ندامت کی "کوشش" میں مصروف ہو جاتا...... جب ناظم مجھ سے کوئی ایسا سوال کرتا جس کا جواب میں بخوبی نہ دے سکتا تو میری انگلیاں خود بخود دانتوں تک پہنچ جاتیں۔ زاہدہ سے کسی لطیف اختلاف پر میرا ہاتھ میری ابروؤں تک اٹھنے لگتا۔ دید و بازدید احباب کے موقعہ پر بھی مجھ سے ایکٹر کی ذہنیت کا اظہار ہو جاتا۔ میں سخت کوشاں تھا کہ اس سے احتراز کروں۔ مجھ سے زیادہ شاید ہی کوئی اس فن کے تصنع کو حقارت کی نظروں سے دیکھتا ہو۔ لیکن میں خود کو مجبور پاتا تھا اور گاہے گاہے باہمہ احتیاط میں غیر اختیاری طریقہ سے اپنی بدلتی ہوئی حالت کا اظہار کر دیتا۔

اب مجھ پر یہ روشن ہونے لگا۔ کہ اس کے کیا معنی ہیں۔ متواتر اور مسلسل فن نقالی کا دیکھنا بغیر رنگ لائے نہ رہا۔ میں ہمیشہ سے اپنے ماحول کے اثرات کو قبول کرتا رہا ہوں۔ اور اس مرتبہ بھی اسٹیج کی قربت میری اثر پذیر طبیعت پر نقش کندہ کرتی رہی۔ میری عادات و خصائل پر کافی اثر پیدا ہو چلا، رفتار و گفتار میں تصنع کا عنصر آمیز ہونا شروع ہوا۔ نقل کرنے کے "مرض" نے مجھ پر فتح حاصل کر لی۔ ہر روز میری اثر پذیر نرم زمین طبع پر کسی نہ کسی حرکت یا جذبہ کا عکس نقش ہو جاتا اور قائم رہتا۔ میرے شخصی امتیازات رفتہ رفتہ فنا ہونے لگے۔ اور تھیٹر کے تاثرات نے میری حقیقت اور فطرت کو پردہ سے پوشیدہ کرنا شروع کیا۔ میں نے اپنے تخیل میں خود اپنی نئی، تبدیل شدہ ہستی کا ملاحظہ کیا۔ ایک شب تنہا بیٹھ کر جب کہ مجھ پر خواب کی سی کیفیت طاری ہونے لگی تھی میں نے اسے دیکھا۔ خود کو دوسرے رنگ میں پایا۔ وہ میرا دوسرا وجود کمرہ میں ادھر اُدھر متحرک تھا۔ وہ ایکٹ کر رہا تھا۔ وہ اپنے گلے کو ہاتھوں کی گرفت میں لاتا تھا، آنکھوں سے مصنوعی حیرت کا اظہار کرتا تھا۔ چلنے میں ٹانگوں کو جھٹکتا تھا۔ رنگ برنگ بدلتا تھا وہ ایک انسان نما مشین معلوم ہوتا تھا۔ تصنع اس کا امتیاز، نمائش اس کی پہچان تھی۔

میں نے اس سلسلہ سے علیحدگی کی ایک ناکامیاب کوشش کی مسٹر ناظم، جتنے عرصہ میں اُن کے پاس رہا، "ترکی حور" کی بابت گفتگو کرتے رہے۔ اور مجھے اپنے خیالات کے اظہار کا موقعہ نہیں ملا۔

زاہدہ کا برتاؤ بھی بدلنے لگا۔ ہماری محبت میں جو سادگی اور آسانی تھی وہ غائب ہو گئی۔ مجھے احساس ہوا کہ وہ مجھ سے نفرت کرنے لگی ہے۔ میں نے بھی بظاہر کسی قدر رنجش کا اظہار کیا لیکن دل میں بے حد درجہ نادم، ملول اور غمگین تھا۔ میں نے ملازمت سے مستعفی ہونے کی کوشش کی۔ ناظم نے ادھر اُدھر کی باتیں کیں۔ ایک سگار پیش کیا، اور مجھے پھر شکست ہوئی۔ ازاں بعد میں زاہدہ سے ملنے کے لئے عجائب گھر گیا۔ اور اس طرح صورت حال نہایت نازک اور دل شکن ہو گئی۔

"آہ، پیاری زاہدہ" میں نے اس سے قبل اتنے پرجوش الفاظ استعمال نہ کئے تھے۔ آواز میں غیر معمولی جذبہ کا اظہار ہوتا تھا۔

اس نے اپنا ہاتھ کسی قدر سرد مہری سے دراز کیا اور ساتھ ہی ساتھ میرے چہرہ کا جائزہ لیتی رہی۔ میں نے اس کی قربت کو غنیمت سمجھا اور خود کو اس کی ہمراہی کے لئے پیش کیا۔

"بختاور" اس نے نہایت سنجیدگی سے کہا اور غور کرنے لگی۔ پھر اس نے مجھے دیکھا۔

میں نے کچھ نہ کہا۔ انجام میرے پیش نظر تھا۔ میں نے سخت کوشش کی کہ میں وہی سادگی پسند، تصنع سے پرہیز کرنے والا۔ بے ریا بختاور بن جاؤں جس سے زاہدہ محبت کرتی تھی لیکن ناکام رہا۔ مجھے اچھی طرح احساس تھا کہ اب میں وہ بختاور نہیں جو زاہدہ کا محبوب تھا۔ میں اپنی ہستی کو ایک نئی ہستی، اپنے وجود کو ایک تبدیل شدہ وجود سمجھتا تھا۔ میری اپنی اصلی عادات و خصائل پھر حاصل کرنے کی کوشش بھی تصنع سے خالی نہ معلوم ہوتی تھی۔ مجھے خود اپنے افعال سے ندامت تھی۔ میری حرکات خود میرے لئے بعید الفہم تھیں میرے جذبات صادق تھے لیکن ان کے اظہار میں تصنع تھا۔ میری رفتار، گفتار سوائے اسٹیج کے کارکنوں کے کسی اور سے مناسبت نہ رکھتی تھی۔

اس نے کہا "بختاور! تم بدل گئے ہو۔"

میں نے کہا "آہ" اور بے اختیار اپنے شکم کو پکڑ لیا اور اپنے سر کو ایکٹروں کی طرح جنبش دی۔

اُس نے کہا "یہ دیکھو"۔

میں نے کسی قدر تیزی سے کہا "آخر تمہارا مطلب کیا ہے؟" اور سراسیمگی سے اس کا چہرہ دیکھا۔ میں خوب جانتا تھا کہ اس کا کیا مطلب ہے۔ مجھے اپنے اطوار کی بناوٹ اور تصنع آمیزی کا خوب احساس تھا لیکن میں اس بدبختی سے نجات حاصل نہ کر سکتا تھا۔

میں نے کہا "تمہارا مطلب کیا ہے؟"

اُس نے فی الواقع میری طرف اس طرح دیکھا گویا وہ مجھ سے دور رہنا چاہتی ہے۔

زاہدہ نے دریافت کیا۔ "آخر اتنا تصنع کسلئے ہے؟ مجھے یہ پسند نہیں، پہلے تو تم اس سے آشنا نہ تھے۔"

"آشنا نہ تھا" میں نے اس کی ایک بیخبری کی حالت میں تکرار کی۔ میں نے اپنے ماحول پر ایک تیز نظر ڈالی۔

میں نے جلدی سے کہا "ہم تنہا ہیں"۔ "سنو!" میں نے زاہدہ کی طرف اپنی انگشت شہادت دراز کر دی اور غور سے زاہدہ کو دیکھکر کہا۔ "میں ایک بددعا کے زیر اثر ہوں"۔ میں نے دیکھا کہ "سایہ دار" پر اُس کی انگلیوں کی گرفت سخت ہوگئی۔

زاہدہ نے کہا "تم کسی بدصحبت میں ہو! تمہیں اس سے احتراز کرنا چاہئے۔ میں نے تمہاری طرح کسی کو اس قدر تغیر پسند نہیں دیکھا۔

میں نے غمگین آواز سے کہا "میں قابلِ رحم ہوں۔ رحم کرو۔"

اُس نے مجھے استفسارانہ نظروں سے دیکھا۔

اُس نے کہا "خدا معلوم کہ تم میں یہ تصنع کہاں سے آگیا ہے۔ یہ نمائش کیسی؟ کم از کم میں ایسے شخص کی ہمراہی میں رہنا قبول نہیں کر سکتی جس کی حرکات ایسی ہوں۔ چہارشنبہ کو تم نے اپنی حرکتوں سے مجھے بھی ذلیل کیا اور خود بھی نادم ہوئے۔ صاف صاف الفاظ میں، میں تمہاری ان حرکات کی بنا پر تم سے نفرت کرنے لگی ہوں۔ میں یہاں تم سے یہی کہنے کو ملی تھی کیونکہ یہاں تنہائی ممکن تھی۔"

میں نے جوشیلی آواز میں کہا۔ "زاہدہ!" میرے مشت بند ہاتھوں کی انگلیوں کے سرے سفید پڑ گئے تھے۔

"کیا تم مجھ سے ملنا نہیں ——"

زاہدہ نے جواب دیا۔ "ہاں" عورت کی قسمت یوں تو ویسے ہی دنیا میں حد درجہ پست اور نازک ہے، تمہاری ہمراہی میں تو ——"

میں نے اپنے دونوں ہاتھوں کو پیشانی پر مارا۔

"اچھا الوداع!"

"میں نے کہا۔ آہ زاہدہ! "خدا کے لئے"

زاہدہ نے کہا۔ "مسٹر سخناور، خدا حافظ!"

انتہائی جدوجہد سے میں اپنے حواس کو قائم رکھ سکا اور میں نے زاہدہ کے ہاتھ کو مس کیا اور چاہا کہ میں اپنی حالت کو اس پر واضح کر دوں اور اپنی مجبوری کا اظہار کر دوں۔ اس نے میرے چہرہ کو نہایت گہری اور ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھا اور ایک طرح کی ناگواری اس کے چہرہ پر ہویدا ہوئی۔

"نہیں، نہیں، مجھے علیٰحدگی اختیار کرنی چاہیئے" اس نے یاس آمیز لہجہ میں کہا۔ اور فی الفور وہ روانہ ہونے لگی۔ ذرا سی دیر میں وہ مجھ سے بہت دور تھی۔

خدایا، میرے دل کی گہرائیوں میں کیسا تلاطم برپا ہوا۔ مجھے کیسا اضطرار تھا۔ مجھے زاہدہ سے محبت تھی لیکن صاف طور پر کبھی اس کا اظہار طرفین سے نہیں ہوا تھا۔ افسوس کہ میری جدید ہستی اس وقت بھی مجھ پر کافی سے زیادہ حاوی تھی اور میں اپنی عادتوں کے ہاتھ مجبور تھا۔

"خدا حافظ" میں نے نیم ہشیاری میں کئی بار کہا۔ مجھے اس وقت خود اپنی ذات سے نفرت ہوگئی تھی۔ زاہدہ نظروں سے روپوش ہوگئی۔ میں نے اضطرابانہ انداز سے کہا "الوداع" اور اپنے چاروں طرف یاس انگیز نظروں سے دیکھا۔ مجھ دل شکستہ کے منہ سے بے اختیارانہ ایک چیخ نکلی۔ مشت بند ہاتھوں کو میں نے ہوا میں زور سے حرکت دی۔ عجائب گھر کی گیلری میں ایک تصویر کے پاس نہایت مشکل سے پہنچا۔ اپنے چہرہ کو ہاتھوں سے چھپا لیا۔ اور سرد آہیں بھرنے لگا۔ (عجائب گھر کے پولیسمین کو یہ یقین دلانا بہت مشکل ثابت ہوا کہ میں مدہوش شراب نہ تھا۔ بلکہ بار غم کی وجہ سے دل سے ایک لوٹتی ہوئی صدا نکلی تھی۔ میرے نعرے کی آواز نے اُسے متوجہ کیا تھا۔)

لیکن اتنا زبردست صدمہ بھی مجھے میری بدقسمتی سے بچانے میں کامیاب نہیں ہوا۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں نے کہا۔ ہر شخص کو احساس ہے، کہ تھیٹر کی ذہنیت مجھ میں دن بدن جذب ہوتی چلی جاتی ہے۔ میں اس بات پر مصر ہوں کہ مجھ سے زیادہ کوئی اور آدمی تھیٹر کے غیر فطری کارناموں کو حقارت کی نظروں سے نہیں دیکھتا۔ مجھے اس کا سخت تکلیف دہ احساس ہے۔ میری اصل ہستی —— خاموشی

پسند اور خوش مزاج بختاور ـــــ فنا ہو چکی ہے۔ میں اپنی خودی کو اس سیل رواں سے جدا نہیں کر سکتا۔ بس باد صرصر کے جھونکوں میں مثل برگ خشک ہوں۔ کہ اُڑا چلا جاتا ہوں۔ ہر شخص میری اس تبدیلی سے آشنا ہو گیا ہے۔ میرا درزی بھی اس سے آگاہ ہے۔ اس بہار میں میں نے خاکی رنگ کے سوٹ کے لئے فرمائش کی لیکن اس نے تیز آسمانی رنگ کا سوٹ میرے لئے تیار کیا۔ واقعی اُسے ہر چیز کی موزونیت کی شناخت میں کمال حاصل ہے۔ میرا دائرہ دوستی وسیع ہو گیا ہے۔

اب میری ملاقات ایکٹروں سے بھی ہے۔ مجھے ان سے دلی نفرت ہے۔ لیکن صرف انہیں کی صحبت میں مجھے یہ اطمینان نصیب ہوتا ہے کہ مجھ پر انگشت نمائی نہیں کیجا رہی ہے۔ ناظم نے بھی میری اس غیر معمولی تبدیلی کو محسوس کیا ہے۔ کلیم بھی مجھ سے کل اس بات پر رنجیدہ ہو گئے۔ کہ میں نے انہیں "عزیز لڑکے" کے نام سے مخاطب کیا تھا۔ اسٹیج کی ذہنیت مجھ میں اسقدر جہ سرایت کر چکی ہے!

حقیقت یہ ہے کہ میری اصلی شخصیت فنا ہو رہی ہے۔ خاموش اور پُر سکون زندگی بسر کرنے کے بعد مجھے تھیٹر کے تنقید نگار کی حیثیت سے نہایت ہیجان انگیز دائرہ میں داخل ہونا پڑا۔ وہاں کی رنگ پرستی نے مجھ پر کافی اثر کیا۔ بعض لوگ اس امر کو فراموش کر دیتے ہیں کہ آدمی کے افعال پر صحبت اور قربت کتنا اثر پیدا کرتی ہے۔ میں نے اس سے قبل "اسٹیج کے شکار" کے کلمے کو سنا تھا لیکن میں اسے علم بیان کی ایک صنعت خیال کرتا تھا۔ میں مزاحاً اسے ایک "مرض" کہا کرتا تھا۔ لیکن یہ مذاق نہیں۔ واقعی یہ مرض ہے۔ میں خود اپنی موجودہ حالت سے نالاں ہوں۔ لیکن یہ اضطراب لاحاصل ہے۔ یہ مرض لاعلاج ہے۔ ہر ہفتہ مجھے تین گھنٹے یا اس سے زیادہ نئے نئے کھیلوں کو نظر تنقید اور نگاہ غور سے دیکھنا پڑتا ہے اور اس سے جو اثرات مترتب ہوتے ہیں وہ میری اس تبدیلی کو اور زیادہ پائیدار بنا دیتے ہیں۔ روز بروز میرے اطوار اسقدر پست ہوتے جاتے ہیں۔ اور میرے ہر کام میں نمائش اور تصنع اس شدت سے بڑھتا جاتا ہے کہ میں مجھے شک ہوتا ہے۔ کہ آیا یہ میری ہی ہستی ہے جو اس قسم کی غیر فطری حرکات کی مرتکب ہوتی ہے۔ یہ نئی تہذیب جو مجھ پر اسقدر حاوی ہو گئی ہے ایک پوستین کے مانند ہے جو روز بروز دبیز تر ہوتی جاتی ہے۔ اور میری اصلیت کو پوشیدہ کرتی جاتی ہے۔

مجھے کبھی کبھی یہ خیال ہوتا ہے کہ کیا میں اس پریشان کن جدوجہد اور کشمکش سے دست بردار ہو جاؤں۔ دنیا کی ساکن، غیر دلچسپ یاس آمیز زندگی کو، جس کے لئے میں اب اسقدر موزوں ہوں، الوداع کہوں، بختاور بیگ کے نام کو کسی پیشہ ور نام سے تبدیل کر لوں۔ اور اس طرح میری تبدیلی مکمل ہو جائے۔ اور تصنع سے پُر۔ حقیقت سے دور۔ فطرت سے خلاف۔ اسٹیج کی زندگی اختیار کر لوں۔ مجھے آسائش اور آرام کی صورت صرف یہی نظر آتی ہے۔ کیونکہ عام لوگ مجھے خردمند اور غیر تمند تسلیم کرنے کے لئے طیار نہیں ہیں۔ اسٹیج پر اور صرف اسٹیج پر میں کامیاب زندگی بسر کر سکتا ہوں۔ جہاں پر میرے کارناموں کو شاید نظر تحسین سے دیکھا جائے۔ پس یہی انجام نظر آتا ہے۔ لیکن میں پھر اس کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔ کہ جو خاص باتیں ایک ایکٹر کو عام لوگوں سے متمیز کرتی ہیں اُن سے مجھے سخت نفرت ہے۔ مجھے اپنی چچی راشدہ مرحومہ کی رائے سے ابھی تک اتفاق ہے۔ کہ اسٹیج میں دلچسپی ظاہر کرنا خردمندوں کا فعل نہیں ہے۔ اور اسٹیج پر کام کرنا نہایت نا اہلی ہے۔ اس وقت بھی میری دلی خواہش ہے کہ میں اس تنقید نگاری کو خیرباد کہوں اور حقیقت اور قدرت کی سچی مسرتوں سے حظ اٹھاؤں لیکن ناظم پر میرا بس نہیں چلتا۔ جب میں اس کے پاس اس خیال سے جاتا ہوں۔ تو وہ مجھے ایک زوردار سگار اور ایک جام شراب ارغوانی اور سوڈا پیش کرتا ہے اور میں اپنے اظہار خیالات میں ناکامیاب رہتا ہوں۔

(ویلز)

سیّد رضی الحسن چشتی

قیس کی آبلہ پائی پئے لیلیٰ دیکھو ذوقِ آوارگیٔ دشتِ تمنّا دیکھو
عشق کی منزلِ اوّل ہی میں بیتاب ہے دل آگے آتی ہے مصیبت ابھی کیا کیا دیکھو

(غیر مطبوعہ)

حفیظ
(ہوشیارپوری)

سمندر سے

(از حضرت فاخر ہریانوی)

پرستش گاہِ مغرب اس صدی کا دیوتا تُو ہے
فنا کا آئینہ ہے۔ مظہرِ شانِ خدا تُو ہے

ترے ہر قہقہے میں شورشِ طوفاں نہاں ہے
مہیب انگڑائیوں میں موت کا ساماں نہاں ہے

ازل سے کر رہا ہے پرورش تُو اُن چٹانوں کو
ہمیشہ گھورتی ہیں جن کی نظریں بادبانوں کو

غریب انساں ترے ساحل پہ جب قبضہ جماتا ہے
تو اسکی بے حقیقت کوششوں پر مسکراتا ہے

مٹا دیتی ہیں اُس کو قہرمانی طاقتیں تیری
کہ لامحدود ہیں یہ غیر فانی طاقتیں تیری

حیاتِ عارضی کی بے ثباتی ہے عیاں تجھ سے
سُنے کوئی غمِ انسانیت کی داستاں مجھ سے

تری گہرائیوں میں دفن ہیں جنچیں حسینوں کی
نہاں ہیں سینکڑوں سیال قبریں نازنینوں کی

اثر ہوتا نہیں تجھ پر کبھی دلسوز آہوں کا
تماشا دیکھتا رہتا ہے پُر حسرت نگاہوں کا

نہ پگھلا دل ترا معصوم رُوحوں کی دُعاؤں سے
چھڑایا دُودھ پیتی بچیوں کو تُو نے ماؤں سے

ہوئے ہیں جذب تیری وسعتوں میں بے کفن لاکھوں
شہیدِ جذبۂ آزادیٔ قوم و وطن لاکھوں

نگل جاتا ہے تُو بے خوف اُن جنگی سفینوں کو
جلا کر راکھ کر دیں جو پہاڑوں کو زمینوں کو

(غیر مطبوعہ)

فاخر

لاادریت اور ابیقوریت

سقراطی تحریک کا خلاصہ تاریخی وضاحت کی خاطر ذیل میں یہ دکھا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ فلسفہ میں سقراطی تحریک کا کیا درجہ ہے:-

واضح ہو کہ اہل سفسطہ سے لیکر ارسطو تک کا زمانہ تحریک سقراطی کہلاتا ہے۔ یعنی سقراط کا ظہور شدید لاادریت کے زمانہ میں ہوا۔ کیونکہ سوفسطائیوں کی تعلیم کا نتیجہ، جیسا کہ اہل علم کو معلوم ہے۔ اس کے سوائے اور کچھ نہ نکلا کہ لوگوں میں تشکوک اور شبہات پیدا ہو گئے۔ ان لوگوں نے تحقیق اور طلب علم کو بالائے طاق رکھدیا۔ اور فلسفہ و حکمت کا مقصد صرف یہ قرار دیا کہ لکھے پڑھے آدمی، عوام الناس کو مغالطے دیسکیں، یا اُن پر اپنی علمیتِ ناقصہ کا سکہ جما سکیں۔ اسی وجہ سے آج سفسطہ اور سوفسطائی، فریب اور فریبی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ان بزرگوں نے فلاسفۂ متقدمین کے خیالات سے خلق خدا کو فائدہ نہ پہونچایا بلکہ جس طرح کسی چور کے ہاتھ اگر کمند آجائے تو وہ اس کی مدد سے چوری ڈکیتی کریگا۔ اسی طرح ان لوگوں نے متقدمین کا فلسفہ پڑھ پڑھ کے لوگوں کو گمراہ کرنا شروع کیا۔ اور اس کام میں کامیابی اس لئے ہوئی کہ

× × × × × × × × × ×

× × × متقدمین کے خیالات نہایت ناقص اور مبہم تھے اور ان کا منطقی نتیجہ سوائے لاادریت کے کچھ نکل ہی نہ سکتا تھا۔ سقراط کی زندگی اور اس کے فلسفے، دونوں کا مقصد اس کے سوائے اور کچھ نہ تھا کہ لوگوں کو "حکمت" کی حقیقت اور اہمیت سے قرار واقعی آگاہی حاصل ہو جائے۔ اور فلسفہ کے مطالعہ اور اس سے فائدہ حاصل کرنے کے لئے اُس نے چند اصول مرتب کئے جن کو "اسالیب سقراطی" کہا جاتا ہے۔ گویا فلسفہ کی بنیاد استوار کرنا اور اس کے اصول مدون کرنا اس کے فلسفہ کا خلاصہ اور لب ولباب قرار دیا جا سکتا ہے۔ اسی لئے اُسے ابوالفلاسفہ کا لقب دیا گیا ہے۔

سقراط نے جب لاادریت کے اسباب پر غور کیا تو اُسے معلوم ہوا کہ مختلف فلاسفہ اُن امور کے حل کرنے میں اپنی زندگی صرف کرتے رہے ہیں، جو ان کی لیاقت سے باہر ہیں۔ مثلاً "خدا" کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ انسان ضعیف البنیان، جب اپنی ہی ذات کو پورے طور پر نہیں سمجھ سکتا۔ تو خدا کی ذات و صفات کو کیا سمجھ سکتا ہے۔ لا محالہ لاادریت اور تشکیک کے قعر میں جا پڑیگا۔ علاوہ بریں کائنات اور ماوراء الکائنات[1] کے متعلق فلسفیانہ غور و فکر یا قیاس آرائی کرنا ہی، حیات انسانی کا مقصد وحید نہیں ہے بلکہ اہم بات جس کی طرف ہر شخص کو اپنی توجہ مبذول کرنی چاہئے۔ یہ ہے کہ پاکیزہ زندگی بسر کرنے کا طریق کار کیا ہے؟ پس سقراط نے لوگوں سے کہا کہ بجائے آسمان و زمین کی ساخت پر غور کرنے کے، خود اپنے نفس میں غور کرو۔ اور دیکھو کہ تمہارا کیرکٹر انسانوں کا سا ہے یا حیوانوں کا سا؟ گویا اس نے فلسفۂ اخلاق کی بنیاد ڈالی۔

افلاطون نے، جو سقراط کے سب شاگردوں میں ممتاز ہے۔ سقراطی طریق کو بہت زیادہ عمومیت کے ساتھ استعمال کیا۔ لیکن اخلاقیات کو اس کے فلسفہ میں بھی بہت نمایاں مرتبہ حاصل ہے۔ حتیٰ کہ افلاطونی طبیعات۔ سراسر اخلاقیات ہی کی توضیح و تشریح کے لئے وقف ہے۔ اُس صداقت کی تلاش جس کے حصول کے بعد انسان، خدائی صفات سے متصف ہو جاتا ہے۔ اور جس کا حاصل کرنا، افلاطون کی رائے میں ہر انسان کا فرض اولین ہے۔ در اصل ایک زبردست اخلاقی مقصد اپنے اندر پنہاں رکھتی ہے۔ یعنی تکمیل صفات انسانی۔ افلاطون نے اپنی ساری عمر صرف اسی مسئلہ کے حل کرنے میں صرف کردی کہ انسان کس طرح دیوتاؤں کی سی زندگی بسر کرتا ہے؟ اس کے علاوہ اُس نے سائینس کی بنیاد بھی ڈالی تھی۔ جس پر اس کے شاگرد ارسطو نے اچھی خاص عمارت قائم کردی۔

ارسطو اور افلاطون کے نظریات میں ایک امتیازی نشان یہ ہے۔ کہ افلاطون نے اپنی توجہ تمامتر، فلسفہ اخلاق پر مبذول کی۔ اور مابعد الطبیعاتی فلسفہ کو بھی اخلاقیات سے وابستہ کر دیا۔ لیکن ارسطو کے فلسفہ میں طبیعات اور مابعد الطبیعات کو اہمیت حاصل ہے۔ اخلاقیات پر جزوی توجہ کی گئی ہے۔ اور اس کو فلسفہ کی محض ایک شاخ تصور کیا گیا ہے۔

ارسطو کے فلسفہ کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ لوگوں کی ذہنیت، فلسفیانہ

---

[1] جو کائنات یعنی دنیا سے بالاتر ہو۔

غور و فکر کے لئے آمادہ ہوگئی۔ چونکہ اُس نے سقراطی اسلوب کو بطرز نو مدوّن کردیا۔ اور . . . . . طبیعات اور مابعد الطبیعات دونوں کو از سر نو محلِ تحقیق قرار دیا۔ اس لئے فلسفہ کی تاریخ میں آگے چلکر ایک نئے باب کا اضافہ ہوگیا یعنی لوگوں میں تحقیق و تلاش کا مادہ پیدا ہوگیا۔

ارسطو کے بعد، فلسفی رجحان پر ایک طائرانہ نگاہ

ارسطو کی وفات پر، سقراطی تحریک کے دور کا خاتمہ ہوگیا۔ اس کی وفات کے بعد، اُس کے چند ممتاز شاگردوں نے اس کے فلسفہ کا درس دینا شروع کیا۔ اور قدرے اختلاف کے ساتھ اس مشغلے کو جاری رکھا۔ ان لوگوں کا رجحان، زیادہ تر احساسیت کی طرف تھا۔ یہ لوگ زیادہ تر مطالعہ و مشاہدۂ فطرت میں مشغول رہتے تھے۔ ارسطو کے جانشیں، ہیتوفریسٹس نے تو اپنے استاد کے فلسفے کو قدرے ملحوظ رکھا بھی، لیکن اُس کے شاگرد، اسٹراٹو نے مادیت میں اس درجہ غلو[1] کیا کہ روح یا نفس ناطقہ کے غیر مادی اور غیر فانی ہونے سے قطعاً انکار کردیا۔ آگے چلکر خدا کے وجود سے بھی انکار کردیا گیا اور ارسطو جیسے خدا پرست فلاسفر کے شاگرد پکے دہریے ہوکر رہ گئے۔ جوں جوں۔ یہ لوگ ارسطو کے فلسفہ اور عقاید سے انحراف کرتے گئے۔ توں توں اِن کی تعلیمات اور شخصیت کا اثر کم ہوتا گیا۔ اور ارسطو کے فلسفہ کی جگہ دوسرے مذاہب پیدا ہوکر، اس کے قائم مقام یا مدِّ مقابل بنتے چلے گئے۔

ارسطو کے بعد سوسائٹی کی حالت

ارسطو کی وفات کے بعد جو فلسفیانہ مذاہب ایتھنز میں پیدا ہوئے۔ ان کا تفصیلی تذکرہ کرنے سے پہلے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یونانی اور خصوصاً ایتھنز کی سوسائٹی پر ایک نظر ڈالی جائے کیونکہ فلسفہ مابعد ارسطو یونانی سوسائٹی کے رجحانات سے بھی ایک حد تک متاثر ہوا تھا اور ایسا ہونا بالکل قدرتی بات ہے جیسا کہ مقدمہ میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا جاچکا ہے۔

ارسطو یونان کی آزادی سلب ہوجانے کے بعد بھی کچھ عرصہ تک زندہ رہا۔ لیکن اس زمانہ بھی غلامی کے آثار ہر طرف پیدا ہوچکے تھے۔ سکندر کی وفات کے بعد رہا سہا وقار بھی معدوم ہوگیا سیاسی اہمیت اور آزادی قطعاً جاتی رہی یعنی توہین و تذلیل کے تمام مدارج سانلہ طے ہوگئے۔ اس غم کو بھلانے کے لئے ایتھنز کے باشندے عیش و عشرت میں مشغول ہوگئے اور چند ہی سالوں کے بعد جس طرح ایتھنز زمانہ گزشتہ میں علمی تحریکات اور فلسفیانہ سرگرمیوں کے لئے مشہور تھا۔ اسی طرح، رقص و سرود۔ عیش و عشرت اور اخلاقی بدکاریوں کے لئے زبان زد خلائق ہوگیا۔ ایسا ہونا تعجب خیز نہیں۔ اس لئے کہ یہ بات خلافِ قانون فطرت نہیں۔ خلاف مشاہدہ و تجربہ نہیں ہے۔

اٹھارھویں صدی عیسوی میں، ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی اقبال کا آفتاب لبِ بام تھا۔ سلطنت مغلیہ جسے اکبر و اورنگ زیب نے زمین سے اٹھاکر، اوجِ ثریا تک پہونچایا تھا۔ بستر مرگ پر لیٹی ہوئی، اپنی آخری سانسیں پوری کر رہی تھی۔ ہمسایے درکنار، خود اس کے خویش و اقارب، اس کے مال و متاع اور اسباب خانگی کو، اُس کی ٹمٹماتی ہوئی آنکھوں کے سامنے دھڑی دھڑی کرکے لوٹ رہے تھے۔ اُن کی دیکھا دیکھی، اغیار بھی دور و نزدیک سے، بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کے لئے چلے آرہے تھے۔ مسلمانان ہند کی شامت اعمال، صورتِ نادری میں جلوہ گر ہورہی تھی۔ تختِ طاؤس سے لیکر دیوانِ خاص کی چھت اور ساکنانِ دیوان کی عظمت دونوں، غلامانِ سلطنت اور برادرانِ ملت کے غارتگر ہاتھوں میں بازیچہ بنی ہوئی تھیں۔ محمد شاہ یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا کہ نہ صرف سلطنت اور قوم بلکہ وہ خود اور اس کے افرادِ خاندان، لوگوں کی نگاہوں میں دن بدن ذلیل و خوار ہورہے ہیں۔ اور ۱۷۳۹ء کے بعد سے تو رہا سہا وقار بھی جاتا رہا۔ لیکن باوجود ان باصرہ افروز حقایق کے جو آٹھ پہر اس کے پیش نظر تھے، وہ خود، اُس کا عملہ، اس کے ارکانِ سلطنت، اس کے مشیرانِ دولت، اُس کے احباب و اقارب حد ہے کہ دلّی والے سب کے سب گانے بجانے رنگ رلیاں منانے، خُم کے خُم لنڈھانے اور بدکاریوں میں ایک دوسرے سے سبقت لیجانے میں مصروف تھے۔ اگر محمد شاہ میں کچھ بھی غیرت کا مادہ ہوتا، اگر واقعی اُس کی رگوں میں تیموری خون جوش زن ہوتا اگر واقعی اس میں اخلاقی یا روحانی عنصر کا کوئی شائبہ بھی موجود ہوتا، تو وہ حملۂ نادری کو تادیبِ سماوی سمجھتا اور اپنی اور اپنے افراد مملکت کی اصلاح میں منہمک ہوجاتا، یا کم از کم، مرتے دم تک چُپ چاپ گوشۂ عزلت میں پڑا رہتا لیکن اس میں اور اُس کی رعایا میں، حاسۂ اخلاقی، قطعاً مردہ ہوچکا تھا۔ اِدھر نادر شاہ نے پیٹھ موڑی اُدھر ارباب نشاط سارنگی کے تار ملانے بیٹھ گئے اور پکھاوجی مردے کو آٹا کھلانے لگے۔ (پکھاوج اور طبلہ دونوں کی کھال پر آٹا لگایا جاتا ہے تاکہ "تھاپ" میں "گمگ" پیدا ہو) میں نے اس جگہ محض

[1] بہت زیادہ توجہ کرنا۔

حقائق پیش ناظرین کئے ہیں۔ ان میں عبارت آرائی یا خیال آفرینی کو مطلق دخل نہیں ہے۔ ایک ایک لفظ تاریخی کسوٹی پر پرکھا جا سکتا ہے۔ اسلام کو تو جانے دیجئے۔ اُس کی طرف تو محمد شاہ جیسوں کی توجہ کیا مبذول ہوتی۔ سیاسی طور سے مسلمان دن بدن ضعیف ہوتے جا رہے ہیں۔ لیکن ایک طرف اطبائے زماں، حبوب و ادویات طیار کرنے میں مصروف تھے۔ دوسری طرف تان سین[53] اور بیجو باورے[53الف] کے نام لیوا، نت نئی چیزیں مثلاً دُہر پد، خیال، ہوری اور ٹھمریاں[54] تصنیف کرنے میں مشغول تھے۔ تمام ملک ہاتھ سے نکل گیا مگر آنکھ نہ کھلی۔

انیسویں صدی میں سلطنت مغلیہ یعنی مسلمانوں کے سیاسی اقبال کا خاتمہ ہوگیا مگر مسلمانوں کے طرز عمل میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہوئی۔ اگر شاہزادے اور سلاطین زادے، قلعہ معلّی کے اندر بٹیریں لڑانے اور مشاعرے منعقد کرنے میں اپنے اوقات عزیز بسر کرتے تھے تو رؤسا و امراء کے علاوہ عام باشندے، دلّی کی گلیوں میں خاک چھانتے پھرتے تھے۔ ۱۷۶۲ء سے لیکر ۱۸۰۳ء تک کونسی آفت ایسی تھی۔ جو دلّی والوں پر نازل نہیں ہوئی لیکن راجا اور پرجا جس راستہ پر پڑ چکی تھی اُس سے بال بھر اِدھر اُدھر نہ ہوئی۔ طرفہ تماشا تو یہ ہے کہ مسلمانوں کے مذہبی رہنما بھی اسی خواب غفلت میں گرفتار تھے۔ وہ مسلمانوں کی پستی اور زوال کا تماشا اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ لیکن اگر مابین علماء مباحثہ ہوتا تھا تو اس مسئلہ پر نہیں کہ مسلمانوں کی پستی کے اسباب کیا ہیں؟ اُنکی اصلاح کیونکر ہو سکتی ہے؟ بلکہ اس مسئلہ پر کہ مسلمانوں کے پیغمبر صاحب (صلعم) کو "علم غیب" حاصل تھا یا نہیں؟ یا اُن کا "نظیر" پیدا ہونا عند العقل ممکن ہے یا نہیں؟ قرآن مجید کا ترجمہ پڑھنا حرام ہے یا مکروہ؟ فاتحہ خلف الامام جائز ہے یا ناجائز؟ انگریزی پڑھنے یا کوٹ پتلون پہننے سے، مسلمان، مسلمان رہ سکتا ہے۔ یا نہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ آج بیسویں صدی میں بھی مسلمانِ ہند اور اُن کے قائدین و زعمائے ملت۔ اُسی شاہراہ پر چل رہے ہیں جو کعبہ کی بجائے، ترکستان کو جاتی ہے۔۱۲

الغرض ایتھنز بھی، زوال آزادی کے بعد، اخلاقی مصائب میں سر تا پا غرق ہو چکا تھا۔ ایک زمانہ میں، یہاں کے باشندے، سادگیٔ مزاج و لباس و خوراک و عادات ان چاروں باتوں کے لئے مشہور تھے۔ لیکن اب ہر شخص تن آسانی، راحت طلبی، عیش پسندی اور عیاشی کی طرف مائل تھا۔ جس طرح کسی زمانہ میں فلاسفہ اور حکماء کی مانگ رہا کرتی تھی اُسی طرح اب آبداروں، باورچیوں اور گویوں کی تلاش رہتی تھی۔

مختصر یہ کہ کسی زمانہ میں کسی قوم نے عیش و عشرت کا ساماں اس فراوانی اور خوبصورتی کے ساتھ جمع نہیں کیا ہوگا۔ جیسا کہ باشندگان ایتھنز نے یعنی پہلے وہ لوگ اپنا دماغ۔ عقل اور حکمت کی اشاعت میں صرف کرتے تھے اب ساری دماغی قابلیت، سامان عیش کے فراہم کرنے میں صرف کرنے لگے۔ اسی وجہ سے شہر ایتھنز تمام یونان کے بیفکروں عیش پسندوں اور دولت مندوں کا مرکز بنگیا۔ مختلف ریاستوں کے خود مختار بادشاہ، سال میں چار چھ مہینے کے لئے ایتھنز میں آکر داد عشرت دینا اپنا فرض یقین کرتے تھے، اور یہاں کے باشندے اسدرجہ ذلیل ہوگئے تھے۔ کہ ڈیمیٹرئیس کو خدا سمجھکر پوجنے لگے کیونکہ وہ نہ صرف خود عیاش تھا بلکہ عیاشوں کا سرپرست اور محافظ بھی تھا۔

مورخین فلسفۂ یونان نے اس بات پر حیرت کا اظہار کیا ہے کہ ایک طرف ایتھنز میں عشرت و عیاشی کا بازار گرم تھا۔ دوسری طرف رواقی فلسفہ لوگوں کو اخلاق حسنہ کی طرف دعوت دے رہا تھا اور عملی طور پر اپنے اخلاقی فلسفہ پر عمل کر کے سعید ارواح کو اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ لیکن مجھے اس امر پر کوئی تعجب نہیں ہوتا۔ اس لئے ہر داعی الی الشر کے مقابلہ میں ایک داعی الی الخیر، زمانہ میں موجود رہتا ہے۔ اور دنیا کسی وقت اہل اللہ سے خالی نہیں رہتی۔ چنانچہ جس زمانہ میں محمد شاہ، لال قلعہ میں بیٹھا ہوا۔ شراب ناب کے خم لنڈھا رہا تھا۔ اسی زمانہ میں، ایک بندۂ خدا[55]، جس کے تبحر علمی کے سامنے، بقول علامہ شبلی نعمانی مرحوم "رازی اور غزالی کے کارنامے ماند پڑ گئے"۔ اسی دلّی میں بیٹھا ہوا۔ خلق خدا کو "دینِ فطرت" کی طرف بلا رہا تھا۔ تاکہ ارباب معصیت پر اتمام حجت ہو جائے۔ ✻

---

[55] بندۂ خدا سے مراد حضرت مجدد شاہ ولی اللہ صاحب طاب ثراہٗ کی ذات بابرکات ہے جن کی وفات ۱۱۷۶ھ یعنی ۱۷۶۳ء کے قریب ہوئی تھی۔ ان کے مرتبہ کا اندازہ اسبات سے ہو سکتا ہے کہ آج مسلمان ان کو بارہویں صدی ہجری کا مجدد یعنی ریفامر تسلیم کرتے ہیں۔ ان کے چاروں فرزند آسمان علم پر آفتاب و ماہتاب ہو کر چمکے بھلا کون ہے جس نے شاہ رفیع الدین یا شاہ عبد القادر کا ترجمہ قرآن نہیں پڑھا ان کی وفات کے بعد شاہ عبد العزیز صاحب محدث رح دہلی میں علم کے دریا بہاتے رہے۔ ان کی وفات ۱۲۳۹ھ ۱۸۲۴ء میں ہوئی۔ چوتھے شاہ عبد الغنی تھے جن کے فرزند حضرت سیدنا شاہ اسمٰعیل شہید رح نے تقویت الایمان لکھکر مسلمانوں کے خیالات کی اصلاح کی اور مانوس

[53الف] مشہور رنگی۔ [54] راگنیوں کے نام۔

اندریں حالات ناممکن تھا کہ فلسفہ ان خیالات سے متاثر نہ ہوتا سقراط۔ افلاطون اور ارسطاطو کی سنجیدہ روح، مدارس سے مفقود ہو چکی تھی بلکہ ایک طرف لا ادریت کا زور تھا دوسری طرف ابیقوریت کا شور تھا اور ان دونوں کے مقابلہ میں رواقیت، عیاش طبع باشندگانِ ایتھنز

. . . .

. . . کو قدیمی پاکیزگی کی طرف دعوت دے رہی تھی۔ بہرکیف اب ہم ان مذاہب کو قدرے وضاحت سے بیان کریں گے۔

(۱) لاادریت

پائیرو کے سوانح حیات

فلسفہ تشکیک یا لاادریت کا بانی پائیرو باشندہ ایلس تھا جس کی تاریخ ولادت متحقق نہیں ہو سکی۔ ابتدائی حالات بھی پردۂ خفا میں ہیں۔ اسقدر معلوم ہے کہ ۳۲۷ ق م میں جب سکندر ہندوستان پر حملہ آور ہوا تھا تو پائیرو بھی اس کی فوج کے ہمراہ آیا تھا اور اس کے آنے کی غرض محض یہ تھی یہاں کے جوگیوں۔ سادھوؤں اور فلاسفروں سے تبادلہ خیالات کر سکے۔ اگرچہ ہمیں یہ معلوم نہیں کہ کن لوگوں سے کیا کیا گفتگو رہی۔ اور کن کن مسائل پر تبادلۂ خیالات ہوا لیکن پائیرو کی آئندہ علمی زندگی کو مدِنظر رکھتے ہوئے یہ قیاس غلط نہیں کہ ہندو فلسفہ بھی اُسے تسلی نہ دے سکا۔ یا انہی لوگوں سے اس کو ملاقات کا موقعہ ملا۔ جو اسی طرح "لاادریے" یا دہریے ہونگے۔ کیونکہ ہندوستان میں آستکتا (خدا پرستی) کے ساتھ ساتھ ناستکتا (الحاد) بھی موجود تھی۔ سانکھیہ درشن، جس کا چرچا اس زمانہ میں عام تھا۔ نتائج کے لحاظ سے دیمقراطیسی فلسفہ کا مماثل ہے۔ اور پائیرو ہندوستان آنے سے پہلے دیمقراطیس کی تصانیف پڑھکر پکا مادہ پرست (دہریہ) بن چکا تھا۔ لیکن اس فلسفہ سے اُس کی تشفی نہ ہو سکی لہذا وہ انجام کار لاادری بنگیا۔

بہرحال جب وہ اپنے وطنِ مالوف کو واپس گیا تو وہاں جاکر اس نے اپنی بقیہ زندگی، غور و فکر، درس و تدریس اور پاکیزہ اصولوں کے ماتحت بسر کی۔

---

۴ شریعت کی خاطر سقراط اور حسین رض کی سنت کی دوبارہ زندہ کیا۔

شاہ صاحب موصوف کی بہترین تالیف جس نے انہیں مجدد الوقت بنا دیا۔ اور اُن کے نام کو زندۂ جاوید بنا دیا۔ حجۃ اللہ البالغہ ہے جس میں انہوں نے اسلام کا فلسفہ نہایت خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے، آیات اللہ الکاملہ کے نام سے اس کتاب کا ترجمہ اردو میں بھی ہو چکا ہے۔ کاش کوئی مخلص مسلمان اس کتاب کا ترجمہ انگریزی میں بھی شایع کرادے۔ مؤلف ۱۲

۵۲ مولنا شبلی (ولادت ۱۸۵۷ء وفات ۱۹۱۴ء) اُن اکابرین سے ہیں جنہوں نے تشکیل ملت اسلامیہ میں معتدبہ حصہ لیا، اور مسلمانوں میں علمی بیداری پیدا کی، سیرت نبوی اُن کے تبحر علمی پر دال ہے۔ دار المصنفین اعظم گڈھ، دراصل انہی کے خواب کی تعبیر ہے جو علامہ سید سلیمان ندوی کی نگرانی میں ملک و قوم کی لائق تحسین خدمت کر رہا ہے ۱۹۱۳ء میں فقیر مولف کو مرحوم کی ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا۔

۵۳ - امام فخرالدین رازی جن کی تفسیر قرآن کسی زمانہ میں، نہایت وقعت کی نگاہوں سے دیکھی جاتی تھی۔ اور آج بھی بیشمار افراد اس سے استفادہ کرتے ہیں۔ اور اس لحاظ سے اس کا جواب نہیں ہے کہ اُس میں ہر مسئلہ پر بہت کچھ فلسفیانہ بحثیں موجود ہیں۔ حتیٰ کہ بعض علماء نے یہانتک لکھدیا کہ اس تفسیر میں سوائے قرآن کے اور سب کچھ موجود ہے۔ انہی بزرگ کے حق میں، سیدنا و مرشدنا و مولنا رومی رح نے فرمایا ہے:-

گر باستدلال کار دیں بُدے ؛ فخر رازی راز دارِ دین بُدے

۵۴ غزالی حجۃ الاسلام محمدؐ غزالی رح ان خوش قسمت لوگوں میں سے ہیں جن کی عزت ایشیا، یورپ اور امریکہ تینوں براعظموں میں یکساں ہو رہی ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ مرحوم غیر معمولی شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی احیاء العلوم، رازی کی تفسیر کی طرح ضخیم اور مشہور ہے۔ اور فلسفۂ اخلاق پر شاید اس سے زیادہ مبسوط کتاب دنیا میں موجود نہیں۔ مولنا روم رح کی مثنوی کے بعد، مشرق میں اگر کسی غیر الہامی کتاب کو مقبولیت نصیب ہوئی تو غزالی کی احیاء العلوم کو۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ برخلاف دیگر علماء کے، یہ بزرگ صوفی بھی تھے اور تصوف کے جملہ مدارج دس سال کی ریاضت کے بعد طے کر چکے تھے۔ فلاسفر بھی تھے۔ عالم شریعت بھی اور صوفی صافی بھی۔

۵۵. دین فطرت سے مراد اسلام ہے۔ چنانچہ آیت ذیل اس پر گواہ ہے:-

"فاقم وجہک للدین حنیفا، فطرت اللہ التی فطر الناس علیہا؛ لاتبدیل لخلق اللہ، ذالک دین القیم"

پس اپنا منہ یعنی توجہ دین حنیف کی طرف کرو۔ یعنی اللہ کی پیدا کردہ "فطرت" پر کاربند ہو جاؤ۔ جس پر اس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ اس کی تخلیق میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ یہی سچا دین ہے۔ ۱۲

پائیرو اور سقراط کا موازنہ

دونوں نے تشکیک ہی سے اپنی فلسفیانہ زندگی کا آغاز کیا لیکن فرق یہ ہے ۔ کہ سقراط نے تمام مروجہ مقبولہ حقایق کے متعلق اس لئے شک کیا کہ ان کی صحت کا امتحان کرے ، لہذا اُس کا شک تحقیق کے لئے محرک تھا لیکن پائیرو کا شک اسے نا امیدی کی طرف لے گیا، اس نے تمام فلسفی مذاہب کا مطالعہ کیا لیکن " صداقت " کہیں نہ ملی کیونکہ محض فلسفہ کی مدد سے معمائے کائنات کا حل دستیاب نہیں ہوسکتا۔ اس لئے اس نے فیصلہ کیا کہ فلسفہ محض بیکار ہے اور انسان حقایقِ کائنات سے واقفیت حاصل کر ہی نہیں سکتا ۔ اسی لئے پائیرو نے اپنی زندگی آرام اور اطمینان کے ساتھ بسر کی لیکن بیچارہ سقراط ہمیشہ موردِ آفات بنا رہا ۔

پائیرو کا فلسفہ

بدقسمتی سے پائیرو کی تصانیف آج بالکل ناپید ہیں ۔ جس طرح معتزلہ کی تفسیرِ قرآن ۔ لیکن سیکسٹس ایمپریکس نے اس کے خیالات تعلیمات اور عقاید جسقدر ممکن ہوسکا ، یکجائی طور پر مرتب کئے ہیں ۔ اُن سے مندرجہ ذیل اقتباسات خالی از دلچسپی نہ ہونگے ۔

(۱) " لا ادری " یعنی " میں نہیں جانتا " جب پائیرو سے لوگوں نے فلسفہ کے متعلق سوالات کئے تو اُس نے جواب میں کہا " (یقینی طور پر) میں کچھ نہیں جانتا[1] " اس دن سے اس کے مذہب کا نام ہی " لا ادریت " یا تشکیک پڑ گیا ۔ اس فلسفہ کا لبُ ولباب صرف یہ ہے کہ دنیا میں " صداقت " یا حقیقت " کا کوئی معیار موجود نہیں ہے ۔ اس دعویٰ پر مندرجہ ذیل دلائل مرتب کی جاسکتی ہیں :-

(۱) بقول ارسطو انسان صرف مظاہر کا علم حاصل کرسکتا ہے ۔ یہ " مظاہر " کیا ہیں ؟ صرف ، اشیاء کی ظاہری صورت ۔ لیکن اِن اشکال کی صداقت کا معیار کہاں ہے ؟ ہم ان اشکال ، کی اُن اشیاء سے مطابقت کا یقین کس طرح حاصل کریں ۔ جن کی یہ اشکال ، ظاہری صورتیں ہیں ؟ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ مختلف اشیاء مختلف اوقات میں مختلف انسانوں کو مختلف دکھائی دیتی ہیں ۔ تو ان مظاہر مختلفہ میں کونسا " مظہر " حقائق اشیاء پر منطبق ہوسکتا ہے ۔ اور ہم کس طرح جان سکتے ہیں ۔ کہ فلاں شکل ، فلاں شے کی سچی تصویر ہے ؟

علاوہ بریں اس بات کا یقین کس طرح ہو کہ ہم کسی شے کو پورے طور سے جان سکتے ہیں ؟ مثلاً ایک " امرود " لے لیجئے ہم اُسے دیکھتے ہیں ۔ سونگھتے ہیں ، چھوتے ہیں ۔ چکھتے ہیں ۔ اس کے گرنے کی آواز سنتے ہیں تو نظارہ خوشبو ۔ ذائقہ ۔ احساس اور آواز یہ پانچ مختلف اشکال یا امرود کے پانچ مختلف پہلو ہیں جو ہمارے سامنے آتے ہیں ۔ اگر انسانوں میں پانچ کی جگہ آٹھ حواس ہوتے تو امرود میں بھی پانچ کی جگہ آٹھ خواص پائے جاتے ۔ اگر انسان میں پانچ کی جگہ تین حواس ہوتے تو امرود میں بھی بجائے پانچ کے تین ہی خواص پائے جاتے ۔ اب سوال یہ ہے کہ آیا امرود کے خواصِ مذکورہ ہمارے حواس خمسہ پر منحصر ہیں یا اس کے ذاتی خواص ہیں ؟ نیز یہ کہ پانچوں خواص ذاتی ہیں یا بعض ؟ دوسری صورت میں کون سے ذاتی ہیں کون سے اعتباری ؟

علاوہ بریں مختلف لوگوں کے حواس ۔ مختلف اشیاء کو ، مختلف اشکال میں پیش کرتے ہیں ۔ مثلاً ایک ہی شے زید کو بڑی معلوم ہوتی ہے بکر کو چھوٹی ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خواصِ اشیاء حواس انسانی پر منحصر ہیں ۔ فی الجملہ جو بات یقینی طور کہی جاسکتی ہے وہ یہ کہ اشیاء ہم کو فلاں فلاں طریق یا اسلوب پر دکھائی دیتی ہیں ۔ یہ سچ ہے ۔ کہ ہمیں " احساسات " حاصل ہوتے رہتے ہیں ۔ لیکن یہ تو یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ جو احساسات ہمیں حاصل ہوتے ہیں وہ اشیائے متعلقہ کی سچی تصویریں ہیں ۔ یعنی فی الواقع وہ احساسات اُن اشیاء کے ذاتی خواص پر دلالت کرتے ہیں ۔ " امرود چمکیلا اور سفید ، خوشرنگ ۔ خوشبودار ۔ خوش ذائقہ ۔ گول سڈول اور شیریں ہوتا ہے " یہ تمام باتیں بالکل صحیح ہیں ۔ بشرطیکہ ان تصریحات سے ہمارا مطلب صرف اتنا ہو کہ امرود ہمیں ، ایسا ایسا معلوم ہوتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ دوسرا بھی ان صفات کو مدارِ یقین بنالے ممکن ہے کہ اُسے یہی امرود بدنما ۔ بد ذائقہ اور بدبودار اور ناہموار معلوم ہو ۔

---

[1] اس موقعہ پر یہ لطیفہ یاد آگیا :-

جان اسٹوارٹ مل (۱۸۰۶ء – ۷۳) مشہور لاادری گذرا ہے ۔ ایک مرتبہ وہ کسی ضیافت میں شریک ہوا ۔ جہاں ایک معمر خاتون بھی تھی جو کلیسائی مذہب پر صدق دل سے یقین رکھتی تھی ۔ اور اس نے مِل کا نام اور اسکے خلافِ مسیحیت عقاید کا ذکر ، بارہا سُنا تھا اس لئے اسے دیکھنے کی بیحد مشتاق تھی ۔ اس نے مِل سے پوچھا لاادری کسے کہتے ہیں ؟ مِل نے جواب دیا " مہربان خاتون ! لاادری وہ ہے جو کسی بات کو مدارِ یقین نہیں بناتا ۔ یعنی یقینی طور پر کسی امر کے متعلق کوئی رائے نہیں رکھتا کہ فلاں امر صحیح ہے یا غلط ۔ ممکن ہے صحیح ہو ممکن ہے غلط ہو " تو اس خاتون نے کہا " پھر تمہیں اس بات کا یقین کیونکر ہے کہ تمہیں کسی بات کا یقین نہیں ہے ؟ " مؤلف

اندریں حالات، فلاسفہ یہ ادّعا کرتے ہیں کہ "عقل" معیارِ صداقت ہے اور وہ سچ اور جھوٹ۔ صحیح اور غلط میں امتیاز کرسکتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس بات کا کیا ثبوت کہ عقلِ انسانی کبھی غلطی نہیں کرتی؟ عقل کی صحت کے لئے ایک معیار کی ضرورت ہے، پھر اس معیار کی صحت کے لئے دوسرے معیار کی، پھر اس کے لئے تیسرے معیار کی، وہلمّ جرّا ۵

پس، چونکہ ہم کو صرف مظاہر کا علم حاصل ہوسکتا ہے نہ کہ ذاتِ شے کا اس لئے تحقیق وتلاش ایک امرِ لاحاصل ہے، کائنات کے معمے کو حل کرنے کی کوشش بالکل بے سود ہے۔ انسان کو صرف علمِ مظاہرِ کائنات ہی پر اکتفا کرنا چاہئیے۔ کیونکہ اس سے آگے بڑھنا، اُس کی لیاقت سے باہر ہے۔

لیکن لاادریوں سے بڑی غلطی یہ ہوئی کہ انہوں نے اپنی دانست میں وجودیات کا ابطال کرکے یہ سمجھ لیا کہ "مطلق علم" کا یا کسی سائنس کے مدوّن ومرتب ہونے کا بھی امکان نہیں ہوسکتا۔ یعنی انسان کائنات میں کسی شے کا کسی قدر علم بھی حاصل نہیں کرسکتا۔ بیشک انسان "خدا" "کائنات" یا "نفسِ ناطقہ" کو بکلی احاطہ نہیں کرسکتا۔ لیکن اس میں کیا شک ہے کہ جو کچھ وہ جانتا ہے اس کی صحت کا عقلی طور پر امکان ضرور ہے۔ بیشک انسان بعض دفعہ غلطی بھی کرتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ تمام دنیا جہلِ مرکب میں مبتلا ہوجائے اور قیامت تک غلطی ہی میں گرفتار رہے۔ اس پر مفصل بحث آئندہ کیجائیگی۔

واضح ہو کہ متشککینِ جدید نے، جن کو ہم (agnostics) یا لاادریے کہتے ہیں۔ اپنے مذہب میں کسی نئی بات یا دلیل کا اضافہ نہیں کیا صرف پرانی شراب کو نئی بوتلوں میں بھر کے نئے لیبل لگا دیئے ہیں۔ ہیومؔ صاحب نے اپنے فلسفہ میں جن دلائل کی بنا پر یہ سمجھا ہے کہ میں نے یقینیات کے قلعہ کی ساری دیواریں منہدم کر دی ہیں۔ وہ اُن سے دو ہزار سال پہلے ہی پائیرو (المتوفی ۲۸۸ سنہ ق م) نے شرح وبسط کے ساتھ بیان کر دی تھیں۔

"تعریف" کے متعلق پائیرو کہتا ہے کہ یہ شے بھی قطعاً بیکار ہے۔ اگر جس چیز کی ہم تعریف کرتے ہیں، وہ ہمارے حیطۂ علم میں ہے۔ تو ہم اس کو اس تعریف کی بنا پر نہیں جانتے بلکہ ذاتی علم کی بنا پر جو پہلے سے ہمیں حاصل ہے اور اگر ہم اُس شے سے واقف نہیں تو تعریف نہیں کرسکتے۔ اور اگر کریں گے تو صریحاً غلط ہوگی۔

مختصر یہ کہ لاادریوں نے اپنا فلسفہ پیش نہیں کیا بلکہ سابقین کے تحکمانہ عقاید یعنی کسی تردید ہی کو اپنا مشغلۂ زندگی بنالیا۔

ابیقوریت

ابیقور کی لائف

ابیقور ۳۴۰ سنہ ق م میں بمقام ایتھنز پیدا ہوا تھا۔ بچپن ہی سے اُس میں غور وفکر کے آثار ہویدا تھے۔ تیرہ سال کی عمر میں جبکہ وہ استاد سے ایک نظم پڑھ رہا تھا تو اس میں ایک شعر آیا جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شے جو کائنات میں نظر آتی ہے، غیر منظم مادہ یا ہیولانی اصل سے پیدا ہوئی ہے۔ ابیقور نے اُستاد سے سوال کیا جناب! غیر منظم مادہ کس شے سے پیدا ہوا؟ استاد نے کہا یہ سوال ادبیات سے تعلق نہیں رکھتا اس کا جواب مدِنظر ہو تو کسی فیلسوف سے مابعد الطبیعات پڑھو" ابیقور نے اسی دن سے فلسفہ کا مطالعہ شروع کردیا۔ لیکن "گئے تھے روزے بخشوانے وہاں اُلٹی نماز گلے پڑگئی"۔ فلسفہ کا مطالعہ تو اس لئے شروع کیا تھا کہ ایک دشواری کا حل دستیاب ہوجائے۔ مگر چند سال فلسفہ پڑھنے کے بعد ایک چھوڑ سینکڑوں شبہات اور سوالات پیدا ہوگئے۔ زیادہ تر دیمقراطیسی فلسفہ اُس کے زیرِ نظر رہا۔ علم کی تلاش اُسے مختلف شہروں میں لےگئی لیکن گوہرِ مقصود ہاتھ نہ آیا۔ بہرحال چھتیس سال کی عمر میں اُس نے ایتھنز میں درس دینا شروع کیا اور ۲۷۰ سنہ ق م میں وفات پائی۔

خصایص وعادات

ابیقور نہایت خاموشی پسند۔ صلح کل۔ نیک مزاج اور مرنجان مرنج شخص گزرا ہے۔ شہر سے باہر ایک خوشنما باغ میں مکان اور مدرسہ دونوں تعمیر کئے تھے اور چند مخلص دوستوں کا مجمع ہمیشہ اس کے گرد لگا رہتا تھا۔ دوستوں سے گفتگو بھی کرتا رہتا تھا اور سلسلۂ تالیف بھی جاری رہتا تھا۔ ۵

ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اِک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

خیال کیا گیا ہے کہ کریسی پس کے بعد، ابیقور تمام یونانی فلاسفہ میں سب سے زیادہ صاحبِ تصانیف گزرا ہے، لیکن آج اس کی ایک تصنیف بھی موجود نہیں ہے۔

ابیقور کے مخالفین نے اس پر اور اس کے فلسفہ پر اسقدر شدید الزامات عائد کئے کہ آج ابیقوریت عموماً رندی وبدمستی کی ہم معنیٰ خیال کی جاتی ہے اور خود، اس فلسفے کے بانی کو ایک عیاش اور رند مشرب انسان تصور کیا جاتا ہے۔ حالانکہ حقیقتِ حال، بالکل اس

کے برعکس ہے۔ اب سوال ہوگا کہ آخر کیا وجہ ہے کہ ابیقوریت کو رندی اور بدمستی کا کا مترادف قرار دیدیا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کے مخالفین نے اس کے خلاف پروپیگنڈا اسقدر زبردست کیا تھا کہ حقیقت پوشیدہ ہو کر رہ گئی۔ اس کی مثال اگر درکار ہو تو دنیا کے سب سے بڑے انسان کی نظیر پیش کی جا سکتی ہے اُس انسان کی نظیر جسے آج غیر متعصب غیر مسلم دنیا کی مذہبی ہستیوں میں کامیاب ترین شخصیت قرار دیتے ہیں۔ جس سے بڑھکر بنی نوع آدم کا خیر خواہ اور محسن آجتک پیدا نہیں ہوا۔ جس کا تلقین کردہ مذہب شکوک اور شبہات[11] سے پاک ہے۔ جس کی لائی ہوئی کتاب[12] آج تیرہ سو سال کے بعد بھی بلحاظ اصلیت و صحت، اپنی نوعیت میں لاجواب اور عدیم المثل ہے۔ جس کی شخصیت تمام افرادِ عالم کے لئے "اسوۂ حسنہ[13]" کا کام دے سکتی ہے۔ اس موقعہ پر پیش کی جا سکتی ہے۔

جو لوگ تاریخ مذاہب سے واقفیت رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ مذہبی دنیا میں آنحضرت ختمیت مآب صلعم سے بڑھکر کسی پاک نفس پر الزاماتِ ناروا اور اعتراضات بیجا وارد نہیں کئے گئے۔ اور اسلام جیسے صاف اور معقول مذہب کو جو دراصل دینِ فطرت اور دینِ قیم ہے۔ سب مذاہب سے زیادہ ہدفِ ملامت بنایا گیا ہے یہ فعل، حروبِ صلیبیہ کے بعد، اسلام کی روز افزوں ترقی اور ہر دلعزیزی کو دیکھکر، مخالفینِ حق کی طرف سے وقوع میں آیا تھا لیکن تھوڑے عرصہ کے بعد یورپ کے مدبرین بھی سیاسی مصالح کی بنا پر ان مخالفین کے ہمنوا ہو گئے انگلینڈ فرانس۔ جرمنی۔ اٹلی اور تمام یورپ میں اسلام اور بانیٔ اسلام کے خلاف اسقدر زہر اُگلا گیا کہ در و دیوار صدائے مخالفت سے گونج اٹھے اور ایک تو کسی نے ان الزامات کی تردید نہ کی دوسرے قرآن مجید اور اسلامیات عربی زبان میں ہیں جن سے یورپین اقوام محض ناواقف لہذا جو جی میں آیا لکھا اور جو الزام ذہن میں آسکا اسلام اور بانیٔ اسلام کے سر تھوپ دیا۔ وہ کیوں جائیے گلیڈسٹن[14] کہا کرتا تھا کہ جبتک قرآن موجود ہے دنیا میں امن و امان قائم نہیں ہو سکتا۔ حالانکہ بیسویں صدی کے واقعات نے اُس کے نظریہ کی دھجیاں فضائے آسمانی میں بکھیر کر رکھدیں[15]۔ الغرض یورپین پادریوں اور مدبرین نے محض پروپاگنڈا کے زور سے یورپین اقوام کی نظروں میں اسلام اور بربریت کو ایک دوسرے کا مماثل قرار دیدیا۔

پس اسی طرح ذاتی اغراض کی بنا پر، ابیقور کے مخالفین نے اُس کے فلسفہ کو اسقدر بدنام کیا کہ الحفیظ والامان۔ آج انگریزی ادبیات (لٹریچر) میں ابیقوریت، ہر اُس بات کی مترادف ہے جو اخلاق حسنہ سے بعید ہو۔ حالانکہ اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ گئی ہے۔ کہ ابیقور نہایت پاکیزہ زندگی بسر کرتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ وہ خدا۔ معاد، حشرِ اجساد اور بقائے روح کا قایل نہ تھا لیکن اس سے یہ نتیجہ تو نہیں نکل سکتا کہ وہ زانی، شرابخور، قمار باز اور دغاباز تھا یا حسن صباح[16] کا بڑا بھائی۔ فی الجملہ ہم اس کا فلسفہ ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں:۔

ابیقور کا فلسفہ

ابیقور کے نزدیک فلسفے کی علت غائی تحقیقِ حق نہیں بلکہ آسودگی اور طمانیت قلبی کا حصول ہے۔ وہ کہتا ہے کہ فلسفہ وہ طاقت ہے جس کی بدولت "عقل" انسان کو راحت کے دروازہ تک پہونچا سکتی ہے۔ یعنی اُس کی زندگی کو مسرور بنا سکتی ہے۔ پس فلسفۂ اخلاق ہی سب سے اعلیٰ فلسفہ ہے اور اسی کے مطالعہ کی ضرورت ہے۔ مابعد الطبیعات اور منطق، یہ دونوں علوم تو قطعاً بیکار ہیں۔ ان کے پڑھنے پڑھانے سے کوئی فائدہ نہیں اگر وہ پاکیزہ زندگی بسر کرنے کے اصولوں سے یعنی فلسفہ اخلاق سے نابلد ہے تو "انسانیت" ہی سے خارج قرار دیا جائیگا۔

تمام عقلائے دہر کا اس مسئلہ پر اتفاق ہے کہ زیست انسانی کا مقصد اور سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انسان کو "طمانیتِ قلب" نصیب ہو جائے۔ یعنی تمام فطری خواہشات اور طبعی جذبات کی تسکین کا ساماں بہم پہنچ جائے۔ اختلاف ہے تو ذرائع حصول طمانیت میں ہے۔ اور مختلف ذرائع، جو مختلف لوگوں نے اس گوہر مقصود کے حاصل کرنے کے لئے تلقین کئے ہیں۔ آج دنیا میں مختلف مذاہب کے نام سے مشہور ہیں۔ ابیقور کہتا ہے کہ "راحت" یا انبساط کے ذریعہ سے طمانیت یا سرورِ خاطر حاصل ہو سکتا ہے۔ پس وہی افعال مستحسن اور لایق تعریف ہیں جن سے "انبساط" حاصل ہو اور مشاہدہ بھی اسی بات کو درست ٹھیراتا ہے جملہ حیوانات (انسان اور بہائم وغیرہ) بالطبع راحت کے جویا اور کلفت سے نفور ہیں۔ ہر متنفس، تکلیف سے بچنا چاہتا ہے اور وہی بات یا کام کرنا چاہتا ہے جس سے اُسے لذت، حظ یا انبساط حاصل ہو تاکہ اس کی بدولت اُسے راحت، خوشی یا سرورِ دائمی نصیب ہو سکے۔ پس جب حیوانات بھی نادانستہ یا

---

[11] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا۔ [12] ڈیون پورٹ اور باسورتھ اسمتھ۔ [13] ایڈورڈ گبن [14] سر ولیم میور۔ [15] کارلائل ۱۲

جبلی طور پر راحت کے طالب ہیں تو انسان کو بھی اسی طرف مائل ہونا چاہیئے۔ واضح ہو کہ لذت، کو محض لذت کی خاطر حاصل نہ کرنا چاہیئے۔ بلکہ "طمانیت قلبی" کے اصول کو ہر لذت میں مد نظر رکھنا چاہیئے۔ اور اگر کسی لذت کی بناء پر آئندہ راحت دائمی یا سرور و طمانیت باطنی میں نقصان واقع ہو تو محض فوری انبساط کی خاطر، دائمی راحت کو قربان نہ کرنا چاہیئے۔ بلکہ اس لذت ہی سے کنارہ کش ہوجانا ہی بہتر ہے۔ مثلاً فضول خرچی سے تھوڑے دنوں کے لئے تو لطف نصیب ہوسکتا ہے۔ لیکن پھر تمام عمر قرض اور مفلسی کا عذاب لاحق حال رہیگا۔ اس لئے فضول خرچی سے محترز رہنا ہی بہتر ہے۔ یعنی "چار دن کی چاندنی پھر اندھیری رات" والا مضمون نہ ہونا چاہیئے۔
اسی لئے بسا اوقات انبساط کے مقابلہ میں انقباض اور لذت کے عوض کرب گوارا کرنا بھی انسان کے حق میں مفید ہوسکتا ہے مثلاً تھیٹر یا سینما سے انبساط، اور کمرے میں بیٹھکر اقلیدس یاد کرنے سے انقباض ضرور ہوتا ہے لیکن اگر ایک انٹرنس کلاس کا طالب علم امتحان سے پہلے اپنا وقت سیر و تفریح میں بسر کرتا رہے تو تھوڑے دنوں کے انبساط کے بعد مدتوں کا انقباض لاحق حال ہوجائیگا۔
گویا برخلاف سائرینیٹ کے اپیقوریت مستقل اور دائمی راحت حاصل کرنے کی تعلیم دیتی ہے۔ اول الذکر فلسفہ کا بانی ارسطا فیس صرف "فوری انبساط" کی طلب کو مقصد حیات قرار دیتا ہے۔ لیکن اپیقورس نے اس کے فلسفہ کی اصلاح کی اور "دائمی سرور" کو مطمح نظر بنایا اور ارسطو کی طرح "سرور" اور "خوبی" (نیکی) کو لاینفک قرار دیا۔ یعنی "قلب مطمئنہ" اور "حیات طیبہ" میں کوئی فرق نہیں۔ بہترین انبساط (سرور) جسمانی یا مادی نہیں بلکہ عقلی اور ذہنی ہی ہوتا ہے۔ جسقدر سرور یا انبساط بذریعہ حواس خمسۂ ظاہری حاصل ہوتا ہے وہ بہت جلد فنا ہوجاتا ہے۔ لذیذ غذائیں۔ گلاب کی خوشبو، موسیقی اور نغمات حسین وجمیل صورتیں، چکنی اور ملایم اشیاء یہ سب آنی اور فانی باتیں ہیں۔ آپ لذیذ سے لذیذ غذا کھا لیجئے اس کی لذت صرف اسی وقت تک ہے جبتک نوالہ حلق سے نیچے نہیں اترتا۔ مثل مشہور ہے "ہر چیز خواہ کتنی ہی لذیذ کیوں نہ ہو، حلق کے نیچے اتری اور مٹی ہوئی"
پھول کی خوشبو کیسی ہی دلپذیر کیوں نہ ہو چند گھنٹوں سے زیادہ نہیں رہتی۔ وعلی ہذا القیاس یہی وجہ ہے کہ اپیقورس نے اپنے شاگردوں کو نہایت پاک اور سادہ زندگی بسر کرنے کا حکم دیا تھا اور وہ خود بھی اعتدال کی زندگی بسر کرتا تھا۔ خوراک کے معاملہ میں بھی وہ نہایت محتاط تھا "جَو کی روٹی اور چشمہ کا پانی" اس کی روزانہ زندگی کا آئینہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ "نان جوین" کی تعریف ہمارے سعدی نے بھی کی ہے۔
اپیقورس کہتا ہے کہ "قناعت سب سے بڑی دولت ہے۔ خوش و خرم رہو۔ جو میسر آئے اسکو خوشی اور رضا مندی کے ساتھ قبول کرو۔ یعنی صبر و شکر کے ساتھ کھالو۔ مثل مشہور ہے ؎

چکنی چپڑی دیکھ کے مت للچائے جی
روکھی سوکھی کھائے کے ٹھنڈا پانی پی

دولتمند وہ نہیں جس کے پاس اشرفیاں بہت ہوں۔ بلکہ وہ جس کی ضروریات کم ہوں۔
دکھ اور تکلیف کرب اور الم، اس دنیا سے مفقود یا معدوم نہیں ہوسکتے۔ لہذا ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ جہاں تک ہوسکے ان سے دامن بچاؤ۔ اور کنارہ کرو۔ نیکی (خوبی) کی بنیاد اختیار اور عقل پر ہے اور یہ دونوں جوہر ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوسکتے، کیونکہ بغیر اختیار کے ہماری عقل۔ ایک امر مہمل بن جائیگی اور بغیر عقل کے ہماری قوت اختیار، محض اندھی ہوجائیگی (یعنی گمراہ، جس طرح اندھا آدمی راستہ بھٹک جاتا ہے) پس جملہ انسانی افعال کی خوبی یا زشتی انسان کے علم اور ارادہ پر منحصر ہے، اور فلسفیانہ تعلیم وتربیت کا واحد مقصد یہی ہونا چاہیئے کہ اس کی Intellect اور Will یعنی ذہن اور ارادہ دونوں مرتبۂ تکمیل کو پہنچ جائیں یعنی اس کا دماغ صحیح فیصلہ اور اس کا ارادہ صحیح راہ کو اختیار کرسکے۔
فی الجملہ اس میں شک نہیں کہ، اپیقوریت کو، اصلاح نفس انسانی کے سلسلہ میں بہت سی مشکلات کا سامنا درپیش ہوتا ہے، وہ مشکلات یہ ہیں۔ تعصب۔ حماقت۔ جہالت اور رسوم باطلہ بہت کم لوگ ایسے ہیں جو فی الحقیقت عقل وہوش اور عقل و ارادۂ ذاتی سے کام لیتے ہیں۔ ورنہ عموماً جیسے دیکھو لکیر کا فقیر، رسوم اور رواج کا غلام۔ اور لوگوں کے اعتراضات باطلہ سے ڈرنے والا لیکن اخلاقی اصولوں سے "نڈر" اور بے نیاز نظر آئیگا۔ لوگ یہ نہیں دیکھتے کہ مذہب یا اخلاق کیا کہتا ہے بلکہ یہ کہ برادری والے کیا کہتے ہیں۔
جہالت سب سے بڑی رکاوٹ ہے اور اس کی دو قسمیں ہیں:۔ ایک تو وہ جہالت جو "قوانین کائنات" کے عدم واقفیت کا نتیجہ ہوتی ہے اور اسی کی وجہ سے لغو توہمات اور مہمل خیالات اور باطل عقائد پیدا ہوتے ہیں (مثلاً عوارض جسمانی چیچک وغیرہ

دراصل ایک بیماری یا مرض ہے۔ لیکن جو مومتیں لاعلمی کا شکار تھیں یا ہیں۔ وہ اس قسم کے امراض کا علاج جھاڑ پھونک سے کراتی تھیں۔ اور کراتی ہیں۔ بعض امراض کو، جن کی نوعیت و ماہیت سمجھ میں نہیں آتی جھٹ بھٹ دیو بھوت آسیب چڑیل وغیرہ سے منسوب کر دیتے تھے۔ اور کر دیتے ہیں۔ اور بجائے معالجہ کرانے کے جادو منتر ٹوٹکے وغیرہ سے کام لیتے تھے اور لیتے ہیں۔ یہ اقوام آج بھی دنیا کے پردے پر موجود ہیں۔

نیز اسی جہالت کی وجہ سے بے بنیاد خوف اور امیدیں پیدا ہوتی ہیں، جو انسان کی ذہنی اور ارادی قوتوں کو کمزور کر دیتی ہیں۔ پس علم طبیعات کا مطالعہ از بس ضروری ہے۔ دوسری جہالت وہ ہے جو "فطرتِ انسانی" یعنی (human nature) سے عدم واقفیت کے باعث پیدا ہوتی ہے جس کے سبب سے انسان بعض اوقات اپنے ہمجنسوں کی پرستش کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور صدہا مصائب اور بے شمار مصائب کا شکار رہتا ہے۔ پس علم النفس اور قوائے ذہنیہ کے مطالعہ کی از حد ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ تیسری قسم جہالت کی عام ہے یعنی وہ جہالت جو نوشت و خواند سے ناواقفیت کی بنا پر پیدا ہوتی ہے اور ہندوستان میں ہر جگہ (خصوصاً مسلمان عورتوں میں) پائی جاتی ہے اور اس میں شک نہیں کہ یہ جہالت ہی ہندوستانیوں کی بہت سی اخلاقی کمزوریوں کا اصلی سبب ہے۔ اور جب تک یہ وبا ہندوستان پر مسلط ہے۔ ہمارا ملک آزاد نہیں ہو سکتا۔

ابی قور کہتا ہے کہ اگرچہ کرب و الم سے حتی الوسع گریز کرنا چاہئے۔ لیکن تھوڑے دنوں کی تکلیف آگے چلکر دائمی سرور کا موجب بن جائے تو اس تکلیف کو بخوشی برداشت کر لینا چاہئے اور یاد رکھنا چاہئے کہ دنیا میں تکلیف کم ہے، راحت زیادہ ہے، اور سب سے اعلیٰ لذت یہ ہے کہ انسان کو اطمینان قلبی یعنی سکون دماغی حاصل ہو جائے، اور انسان ہر قسم کے تفکرات اور ذہنی انتشار سے آزاد ہو جائے۔

موت سے ہرگز نہ ڈرنا چاہئے۔ کیونکہ "جب تک ہم جیتے ہیں، موت ہمارے پاس نہیں آ سکتی۔ اور جب ہم موت کے منہ میں چلے جائینگے تو ہمارا وجود ہی باقی نہ ہوگا۔ پس مرجانے کا احساس بھی نہیں ہو سکتا کیونکہ موت، احساسات کا خاتمہ کر دیتی ہے"۔

روح یا نفس ناطقہ، بقولِ ابیقور، ایک مادی شے ہے یعنی جسم کی طرح روح بھی مادی ہے اور مرنے کے بعد فنا ہو جاتی ہے۔ پس دیوتاؤں یا خدا کے تسلیم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر ذوق اس فلسفہ کی لذت سے خبردار ہوتے تو یہ شعر زبان پر نہ لاتے:۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے؟

ابی قور کہتا ہے کہ مرنے کے بعد کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ "موت" ہر شے کا خاتمہ بالخیر کر دیتی ہے نہ بانس رہیگا نہ بانسری بجیگی۔

روح کے خواص یا افعال چہارگانہ ہیں۔ (۱) حرکت (۲) سکون (۳) حرارت۔ (۴) احساس۔ جسم اور روح ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔ روح کا وجود جسم کے بغیر ممکن نہیں اسی طرح جسم کا وجود روح کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

ابی قور، مادہ کو ازلی ابدی اور غیر قابلِ فنا مانتا ہے۔ یعنی دمقراطیسی فلسفے کا پیرو ہے۔ اسی لئے رواقی اُسے دہریہ کہتے ہیں اور میری رائے میں بالکل بجا کہتے ہیں۔ اگر کوئی شخص دیمقراطیسی فلسفے سے ناواقف ہو لیکن وہ بقائے روح کا قائل نہ ہو تو اُسے خدا، معاد حشر اجساد، جزا و سزا، قیامت دوزخ اور بہشت وغیرہ پر ایمان لانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

بہرکیف ابی قور نے لوگوں کو لاادریت کی تاریکی سے نکالنے کی کوشش ضرور کی اور ان کو اخلاقی راہ دکھائی۔ بلکہ اخلاقیات کی بنیاد فلسفہ پر قائم کرنے کی کوشش کی۔ اس کو اس کوشش میں کامیابی اس لئے نہ ہو سکی کہ اُس نے فطرتِ انسانی کا مطالعہ کامل طور سے نہیں کیا۔ اور اس لئے جزوی صداقت ہی اُس پر آشکار ہو سکی۔ ۱۲

یوسف سلیم

شہسوار

وہ آئے جب سوارِ توسنِ ناز　　　قیامت ہم رکاب آئے نہ آئے؟ (داغ)

گلستانِ وفا کا رنگ پرداز　　　پرستانِ ادا کا ناوک انداز
شبستانِ حیا کی شمعِ روشن　　　نیستانِ طرب کا زمزمہ ساز
نگارستانِ دل کا نقشِ رنگیں　　　بہارِ آرزو کا رنگِ اعجاز
فروغِ بزمِ عشرت جس کے جلوے　　　بہارِ باغِ الفت جس کے انداز
لب اُس کے ترجمانِ رازِ الفت　　　نگاہیں آرزوئے دل کی غمّاز
جبیں رنگینیٔ قدرت کا نقشہ　　　تو قد رعنائیٔ فطرت کی پرواز
کہانی جس کے آگے حورِ جنّت　　　فسانہ جس کے آگے ترکِ شیراز
شباب و نور و نکہت کا سراپا　　　جنون پرور۔ ستم انگیز ۔ طنّاز
یگانہ شہسوارِ عرصۂ حسن　　　"وہ آئے جب سوارِ توسنِ ناز
قیامت ہم رکاب آئے نہ آئے؟"

وقار (انبالوی)

مرمریں مجسمّہ

وہ چوری کے جرم میں گرفتار تھا۔ اور عدالت نے اسے ایک سال قید کا حکم سنایا تھا۔ اُس بڈھے مجرم کے اخلاق کو اور واردات کے مفصل واقعات کو سُنکر میں ششدر رہ گیا۔ میں نے اُس سے ملاقات کی اجازت حاصل کی۔ پہلے تو وہ میرے ساتھ بڑی بے اعتنائی سے پیش آیا۔ اور بات تک نہ کی۔ مگر کچھ پس وپیش کے بعد وہ اپنی سرگذشت سُنانے پر آمادہ ہوگیا۔

" آپ سچ کہتے ہیں" اُس نے کہا "میں نے بھی خوشگوار دن دیکھے ہیں۔ میں نے اچھی تعلیم حاصل کی تھی۔ اور میں ایک انجنیر تھا۔ عالم شباب میں میرے پاس کافی دولت تھی۔ اور میں فرخندہ زندگی بسر کرتا تھا۔ شام کے وقت یا تو میں ناچ گھر چلا جاتا۔ اور یا کسی محفل میں بیٹھکر شراب نوشی کیا کرتا۔ وہ دن مجھے خوب یاد ہیں۔ چھوٹے چھوٹے واقعات بھی میرے دماغ میں ابھی تک محفوظ ہیں۔ لیکن با ایں ہمہ میں اپنے واقعات کے سلسلہ کی یادداشت کو مکمل نہیں کہہ سکتا۔ اس میں ایک خلا ہے۔ جس کو پُر کرنے کے لئے اپنی باقیماندہ زندگی کو میں صرف اُن باتوں کے لئے وقف کرونگا۔ جن کا لینا سے کچھ بھی تعلق ہو۔

" ہاں۔ تو جناب! اُسے لینا کہتے تھے۔ یہ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں۔ وہ غریب تھی۔ لیکن وہ اپنی غریبانہ زندگی کو خوشگوار بنانے میں ہوشیار تھی۔ گویا اس کی خاص طور پر تربیت کی گئی تھی۔ وہ کھانا خود پکاتی تھی۔ لیکن اُس کے ہاتھ ایسے تھے۔ جیسے کسی سانچے میں ڈھلے ہوئے ہوں۔ جناب! اُس کے سادہ لباس میں ایسی کشش تھی۔ کہ ذرا سے میل جول پر دنیا اُس کی طرف خود بخود کھنچی آتی تھی۔ میں خود بھی اس سے ملنے کے بعد وہ نہ رہا —— اور میں نے اپنی گذشتہ زندگی کی نحوست گرد کی طرح جھاڑ دی"۔

ہماری شادی ہوگئی۔ واقعات ہی ایسے ہی تھے۔ کہ وہ مجھ سے محبت کئے بغیر نہ رہ سکی۔ میں خوبصورت تھا۔ جوان تھا۔ اس کے علاوہ مختلف شعراء کا کلام بھی مجھے حفظ تھا۔ اپنی پہلی ملاقات کے واقعات کے متعلق مجھے اب کچھ یاد نہیں۔ لیکن کبھی کبھی مختلف تصویریں تاریکی کی عمیق گہرائیوں میں سے خود بخود اُبھر کر آنکھوں کے آگے کھنچ جاتی ہیں۔

جب کبھی ہم اکٹھے تھیٹر میں ہوتے۔ وہ خوش اور بشاش (جو اُس کی خاصیت تھی) ڈرامہ کے ایک ایک لفظ سے حظ اُٹھاتی۔ اور میری طرف دیکھ کر اُس کی شیریں لبوں پر ایک ہلکا سا تبسم کھیل جاتا —— آہ! وہ مسکراہٹ مجھے اب تک یاد ہے۔ اس کے بعد لبسا اوقات ہم آپس میں مختلف جگہوں پر ملتے۔ تو وہ اپنا سر میری طرف جھکاتے ہوئے اطمینان سے کہتی "میں جانتی ہوں۔ زیادہ دیر تک یہ عیش نہ ملیگا۔ خیر کچھ حرج نہیں" مجھے وہ الفاظ اب تک یاد ہیں۔

ایک سال کے بعد میری محبت نفرت سے بدل گئی۔ میں نے اس معصوم کو تنگ کرنا شروع کیا۔ وہ کڑھ کڑھ کر مرگئی۔

"سالہا سال گذر گئے۔ میں نہیں بتاؤنگا۔ میں نے کن ذرائع سے اپنی زندگی بسر کی۔ لینا کے بعد درحقیقت میں نے صرف دنیاوی خواب دیکھے —— دولت کے خواب۔ ایک دفعہ تو تقریباً میں پوری کامیابی جس پر میری نگاہ تھی حاصل کر چکا تھا۔ میں ہزاروں خرچ کر سکتا تھا۔ دور دراز ملکوں میں سفر کر سکتا تھا۔ میں نے پھر شادی کی۔ اور میری اولاد بھی ہوئی۔ اس کے بعد تباہی کا آغاز ہوا۔ میری تمام تجویزیں ناکام رہیں۔ میری بیوی مرگئی۔ بچوں کو اکیلا دیکھکر میں نے ان سب کو رشتہ داروں کے پاس بھیجدیا۔ اور اب خدا مجھے معاف کرے اب مجھے یہ بھی علم نہیں کہ وہ زندہ بھی ہیں یا نہیں جیسا کہ آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ میں ہر وقت شراب نوشی اور جوئے میں مشغول رہنے لگا......

میں نے ایک ایجنسی جاری کی۔ مگر وہ بھی کامیاب نہ ہوئی۔ اس میں میری تمام باقیماندہ دولت اور طاقت بھی ضائع ہوگئی۔ میں نے جوئے کے ذریعے ترقی چاہی۔ مگر قید ہوتے ہوتے بال بال بچا —— یہ سب کچھ بلا سبب نہ تھا۔ دوست میرے مخالف ہو گئے۔ اور یوں میری تباہی شروع ہوئی"

"رفتہ رفتہ میں اس خستہ حالت پر پہنچا۔ جس میں آپ مجھے دیکھ رہے ہیں۔ دراصل میں ادبی مجلسوں سے نکل کر پستی کی تاریک گہرائیوں میں گر گیا۔ غلیظ لباس اور کثرت شراب نوشی کی وجہ سے میں کس جگہ جانے کی جرأت کر سکتا تھا؟ پچھلے چند سال میں مہینوں تک

بغیر شراب کے مختلف کارخانوں میں مزدور کے طور پر کام کرتا رہا ہوں۔ اور جب کبھی میں شراب کے لئے نکلتا۔ تو سیدھا شہر کے مشہور قمارخانوں کا رُخ کرتا۔ ان تمام لوگوں کو جو راستے میں مجھ سے دوچار ہوتے ہیں نفرت حقارت کی نگاہ سے دیکھتا۔ اور ہمیشہ اسی وہم میں رہتا کہ خوبیٔ قسمت سے میں جلد ہی ایک بار پھر امیدوار ہو جاؤں گا۔ میں کسی طرح کی غیر منقولہ جائیداد یا ایسی ہی کسی اور بات کا امیدوار رہتا۔ اور اسی لئے مجھے اپنے ساتھیوں سے نفرت تھی۔ کہ وہ اس قسم کی امید کو محض ہیچ خیال کرتے تھے۔

"خیر ایک دن بھوک اور شدتِ سردی سے کانپتا ہوا میں ایک مکان میں بلا وجہ اور بے دھڑک جا داخل ہوا۔ میرے ساتھ عجیب واقعہ پیش آیا: "باورچی نے چلّا کر پوچھا "کیا تم لوہار ہو؟"

میں نے جواب دیا ہاں میں لوہار ہوں۔ انہیں ایک میز کے تالے کی مرمت کے لئے کسی کی تلاش تھی۔ میں اردگرد لٹکی ہوئی تصویروں کے دیکھنے میں محو ہو گیا۔ میں نے کام شروع کیا۔ اور اُن کی حسبِ منشاء مکمل کر دیا۔ گھر کی مالکہ نے مجھے کچھ نقدی عطا کی۔ جسے میں نے بلا پس و پیش قبول کیا۔ میری نگاہ اچانک ایک ستون پر پڑی۔ جس پر سنگِ مرمر کا ایک بُت پڑا ہوا تھا۔ پہلے پہل مجھ پر غشی طاری ہونے لگی ——— خدا جانے کیوں؟ میں غور سے اس کی طرف تکتا رہا .... کیا یہ لینا نہیں؟ ——— اور میں باور نہ کر سکا۔

"جناب! میں کہتا ہوں۔ میں لینا کو بالکل بھول چکا تھا اور اُس دن پہلی مرتبہ میں سمجھا۔ کہ میں نے اسے واقعی بھلا دیا ہے۔ یکایک اس کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ مردہ جذبات اور خواب و خیال جو مدت سے میرے پہلو میں دفن ہو چکے تھے جیسے کسی سمندر کی گہرائیوں میں غرق ہو چکے ہوں۔ ایک دفعہ پھر سلگ کر بھڑک اُٹھے۔ میں نے لرزتے ہوئے اس بُت کو دیکھا۔ اور پوچھا "معزز خاتون! کیا میں جان سکتا ہوں۔ کہ یہ مجسمہ کس کا ہے؟"

"اوہ" ۔ اس نے جواب دیا۔ "یہ بڑی قیمتی چیز ہے۔ اور پانچ سو سال پہلے پندرھویں صدی میں تیار کیا گیا تھا۔"

اُس نے سنگ تراش کا نام بھی لیا۔ لیکن میں اچھی طرح سے سمجھ نہ سکا۔ اُس نے بتایا۔ کہ اُس کا خاوند کافی عرصہ تک اٹلی اور روس کے سفیرانِ خاص سے خط و کتابت کے بعد اسے اٹلی سے ہمراہ لایا تھا۔

لیکن "اُس نے کہا "تم شاید اسے پسند نہیں کرتے۔ تمہارا مذاق بھی موجودہ زمانہ کے مطابق ہے۔ کیا تم دیکھتے نہیں۔ نہ تو کان اپنی اصلی جگہ پر ہیں۔ اور نہ ہی ناک موزوں طریقہ سے بنایا گیا ہے......... ؟" افسوس! بس اتنا کہہ کر وہ چلی گئی۔

"میں وہاں سے بھاگ نکلا۔ میرا دم گھٹا جا رہا تھا۔ یہ صرف شباہت ہی نہ تھی۔ بلکہ ہو بہو اُس کی اصلی تصویر تھی ——— بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ——— یہ پتھر کی صورت میں زندگی کے لئے تفریح کا سامان تھا۔ بتائیے! کس کرامات کی بنا پر ایک صنّاع نے پندرھویں صدی میں ہو بہو وہی نازک کان۔ دلکش آنکھیں۔ وہی غیر موزوں ناک اور پھر وہی اونچی ڈھلوان پیشانی تخلیق کی جس سے میں خوب واقف ہوں۔ دنیا میں دو مختلف وقتوں میں بالکل ایک جیسی عورتیں کس طرح پیدا ہونگی ——— ایک پندرھویں صدی میں۔ دوسری موجودہ وقت میں؟

"وہ دن میری تمام باقیماندہ زندگی کے تغیر کا باعث ہو گیا۔ میں اپنے گذشتہ کمینہ پن اور اپنی تباہی کے اسباب کو بخوبی جان گیا۔ میں اب سمجھا کہ لینا ایک فرشتہ تھی۔ جو خوبیٔ قسمت سے مجھے عطا ہوئی اور جس کی میں نے قدر نہ کی۔ گذرے ہوئے زمانہ کا واپس لانا ناممکن تھا۔ لیکن ——— جس طرح کوئی قیمتی برتن کے ٹوٹے ہوئے بکھرے پڑے ٹکڑوں کو بڑی احتیاط سے جمع کرے ——— میں نے بھی اپنے اور لینا کے مابین گذرے ہوئے تمام واقعات کو جمع کرنا شروع کیا۔ وہ چند ایک تھے۔ میں نے کوشش کی۔ مگر مفصل نہ سمجھ سکا۔ تمام کے تمام مختلف جزو تھے۔ لیکن جب کبھی مجھے کوئی نئی گزشتہ بات یاد آ جاتی۔ تو میرے دل کو بڑی فرحت حاصل ہوتی۔ ان باتوں کی سوچ اور غور و فکر میں مجھے گھڑیاں گذر جاتیں۔ لوگ مجھ پر ہنستے۔ لیکن میں خوش تھا۔ میں بوڑھا تھا۔ میرے لئے از سرِ نو زندگی حاصل کرنا ناممکن تھا۔ پھر بھی میں اپنے نفس کو پراگندہ خیالات سے پاک کر سکتا تھا۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو حسد کی نظر سے دیکھنا ترک کر دیا۔ اپنے خالق کی بابت ہر قسم کی شکایتوں سے اپنی زبان روک لی۔ اور اس تبدیلی کی وجوہات کا لُبِّ لباب صرف لینا ہی کی یاد تھی:

"میرے دل میں اُس بُت کو ایک بار اور دیکھنے کی تڑپ تھی۔ میں ساری ساری شام اُس مکان کے گرد سرگرداں پھرتا رہتا۔ میری تمام کی تمام کوشش صرف اُس بُت کو دیکھنے میں ہی صرف ہوتی۔ مگر افسوس! وہ کھڑکیوں سے بہت دور کافی فاصلے پر رکھا ہوا تھا۔ میں نے گھر کے سامنے کئی راتیں گذار دیں۔ گھر کے ایک نوکر سے میرے

دوستانہ تعلقات بھی پیدا ہو گئے۔ موسم گرما میں گھر کی مالکہ چند دن کے لئے کہیں چلی گئی۔ اب اپنی خواہش کا مقابلہ کرنا میری برداشت سے باہر تھا۔ میرا خیال تھا۔ کہ اگر میں صرف ایک دفعہ پھر لینا کا بُت دیکھ لوں۔ تو تمام واقعات شروع سے لیکر آخر تک روشن ہو جائینگے۔ اور یہ میرے لئے انتہائی مسرت اور تسکین کا باعث ہوگا۔ آخر میں نے وہ کام کرنے کا جسکی وجہ سے میں قید ہوا ہوں۔ فیصلہ کر لیا۔ آپ کو علم ہے۔ میں اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اُنہوں نے مجھے ہال کمرے ہی میں گرفتار کر لیا۔ اور عدالت میں یہ بیان دیا گیا کہ میں لوہار کے بھیس میں کئی مرتبہ گھر کے اردگرد دیکھا گیا ہوں..... ...... گو دراصل میں بے قصور تھا۔ تاہم جناب میری کہانی اب ختم ہو چکی ہے"۔

"مگر ہم تمہارے لئے اپیل دائر کریں گے۔ یہ تم بری کر دئے جاؤ گے"۔

اُس نے پوچھا۔ "لیکن کیوں؟۔ نہ تو میری سزا پر کسی کو رنج ہے۔ اور نہ ہی میری ضمانت کے لئے کوئی تیار ہوگا۔ لینا کی یاد میرا مدعا ہے۔ سو خواہ کسی رہائشی مکان میں رہوں۔ یا قید خانے میں ——— میرے لئے یکساں ہے۔"

میں نہ سمجھ سکا کہ کیا جواب دوں۔ لیکن اُس نے اُسی طرح بلوریں نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے سلسلۂ کلام کو جاری رکھا۔

"صرف ایک بات مجھے پریشان کرتی ہے۔ وہ یہ کہ ممکن ہے لینا اس دنیا میں آئی ہی نہ ہو۔ اور یہ محض کثرتِ شراب نوشی سے میرے کمزور دماغ ہی کی اختراع ہو۔ جس نے کہ کھڑے کھڑے اُس مُبت کی طرف دیکھتے ہوئے یہ افسانہ تیار کیا ——— تو پھر ———؟

(ترجمہ)

شریف احمد بی۔اے

غزل

جنون و عقل کو گرمِ ستیز کرتا جا۔ | رگِ حیات کی لرزش کو تیز کرتا جا
جلالِ حسن سے دامن میں بجلیاں بھر لے | کمالِ عشق کو ہنگامہ خیز کرتا جا
شرارِ عشق سے شمعِ حیات روشن کر | گلِ یقین کو یُوں شعلہ ریز کرتا جا
سکونِ دہر میں ہیجان و جوش برپا کر | نشاطِ امن و سکون سے گریز کرتا جا

ربابِ شوق کو پھر نغمہ بار کر شاطر
چراغِ عشق کو پھر جلوہ ریز کرتا جا

(غیر مطبوعہ)

شاطر (غزنوی)

نغمۂ خاموش

(یعنی محاکات، حسنِ صوت، یا اظہارِ واقعہ سے متعلق الفاظ اور اُنکی ترتیب)

فنِ تحریر کا وجود شکلوں کی نقل سے ہوا جس کا ثبوت قدیم مصر کے متشکل نقوش[1] ہیں۔ اس صوری رسم الخط کے بعد حروف[2] کا وجود ہوا جو کسی نہ کسی آواز کو ظاہر کرتے ہیں، حروف کی ترکیب سے الفاظ بنے جو مظاہرِ جذبات و اسالیب خیالات ہوئے۔ لیکن بعض الفاظ گنجینۂ معانی ہونے کے علاوہ کسی نہ کسی آواز کی بازگشت بھی ہوتے ہیں۔ اس طرح "الفاظ" آواز کے بھی قائم مقام ہیں۔ ایسے لفظوں میں ایک خاص بات یہ ہوتی ہے کہ وہ اصطلاح و اشتقاق سے بالکل مبرا ہوتے ہیں۔ نہ اُن کا مادہ کسی مصدر سے نکالا جا سکتا ہے، نہ اُن کو حقیقی و مجازی معنوں کے اعتبار سے منقسم کیا جا سکتا ہے البتہ قواعدِ زبان میں وہ صنائع بدائع کی ایک قسم ہو سکتے ہیں جس کو ہم "تجنیسِ صوت" کہیں گے لیکن چونکہ صنائع بدائع کا تعلق عموماً علم عروض سے ہے۔ اس لئے اگر آواز ظاہر کرنے والے الفاظ کی ترتیب سے شعر میں کوئی دلفریبی پیدا ہو تو اُس شعر میں اُن الفاظ کو تجنیس صوت سے متعلق کہا جائیگا۔ بالفاظ دیگر حروف کی وہ ترکیب جو لفظوں کو کسی آواز کا قائم مقام ثابت کرے اور اس ترکیب سے نظم و نثر میں دلفریبی پیدا ہو تو ایسے الفاظ "حُسنِ محاکات" کی بنا پر تجنیس صوت سے متعلق کہے جائینگے۔ کیونکہ وہ الفاظ جو کسی قسم کی آواز کو گراموفون کے "ریکارڈ" کی طرح ادا کریں وہ آواز ہی کی ایک جنس ہیں۔

× × × × × × × × × × × × × × ×

الفاظ جو محض عکسِ صوت یا آواز کی بازگشت ہیں عموماً بے معنی ہوا کرتے ہیں یا یوں کہئے کہ جس آواز کو وہ ظاہر کریں وہی ان کا مفہوم ہے۔ مثلاً: "گھماکا" - "دھماکا" - "کڑاک" - "گرج" - "چیخ" - "چرچراہٹ" "ٹن ٹن" اور "سن سن" وغیرہ۔ البتہ ان میں سے بعض ایسے الفاظ بھی ہوتے ہیں جو گو معنی نہیں رکھتے مگر اُن کا کوئی نہ کوئی نمایاں مفہوم ضرور ہوتا ہے۔ مثلاً: "دت" (کتے سے)۔ "ہُش" (چڑیا سے) "ہلا" (بکری سے)۔ اسی طرح "چون چون" - "چین چین" - "قاقا" - "قین قین" وغیرہ حتیٰ کہ خود بولنے والے کی آواز کبھی کبھی اُس کا نام ہو جاتی ہے مثلاً: "ٹٹہری" - "میمنا" - "پپاخہ" - "گھنٹی" اور "ڈھول" وغیرہ۔ لیکن بعض الفاظ بامعنی بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً "ہو کا عالم" - "سنسان" "سمسان" "گپ چپ" "گم سُم" "غپ شپ" اور "چہل پہل" وغیرہ۔ اور ان بامعنی الفاظ کی تحت میں وہ الفاظ بھی آسکتے ہیں جو عکس صوت یا آواز بازگشت نہیں ہیں مگر اپنے مفہوم کی بولتی ہوئی تصویر کہے جا سکتے ہیں۔ مثلاً "چٹکی" "بکوٹا" "پنپنا" "منہ چڑانا" "پھاڑنا" "چیرنا" وغیرہ۔ لیکن ان تعجب و مسرت اور خوشی و غمی کے اشاروں کا ذکر بھی یہاں غیر مناسب نہ ہوگا جو تقریر میں تو آتے ہیں مگر تحریر میں بہت کم مستعمل ہیں یا بالکل نہیں مثلاً "اُونہہ[3]" (یعنی اظہارِ بے توجہی) "آہاہا" (اظہارِ مسرت) "چہ چہ چہ" (اظہارِ تاسف) "ہاہا" "ہو ہو" "ہی ہی" "کھی کھی" "قہہ قہہ" اور "اف اف" وغیرہ۔ دورِ جدید میں "ڈراما" اور "ناول" لکھنے والے اس قسم کے الفاظ بھی حدودِ قوسین (بریکیٹ) میں بطور اظہارِ جذبات لکھتے ہیں۔

ان کے علاوہ چند ایسے الفاظ بھی جو قدیم اردو شاعری میں مستعمل تھے مگر اب متروک ہیں۔ اظہارِ نزاکت کا ذریعہ ہو سکتے ہیں۔ مثلاً: "ٹک" اور "ٹک" میر صاحب کا مشہور شعر ہے۔

سرہانے میرؔ کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

---

[1] یعنی "نقوش مقدس" Hieroglyphic Inscriptions

[2] حروف کا وجود قدیم ایرانی رسم الخط کے ارتقاء سے ہوا۔ یہ رسم الخط "خطوط نقشی" یعنی مخروطی شکل کے نقشوں سے ترتیب دیا گیا تھا۔ یہ "خطوط مخروطی" انگریزی میں Cuneiform Inscriptions کہلاتے ہیں

[3] "اُونہہ" پر مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب نے ایک علیحدہ مضمون بھی لکھا ہے۔

دیگر ؎

اے عشق بے محابا تو نے تو جان ماری
ٹک حسن کی طرف ہو کیا کیا جوان مارے

حالیؔ مرحوم کو ایسے الفاظ سے موافقت نہ تھی اور وہ خواہاں تھے کہ اس قسم کے نازک الفاظ ترک نہ کئے جائیں۔ وہ خود بھی اشعار میں ایسے الفاظ استعمال کرتے تھے مثلاً ؎

اے جہان اے روشِ تازہ بدلنے والے
نِت نئی چال نئی ڈھال سے چلنے والے
آج کچھ اور ہے کل اور تھی کچھ شان تری
ایک سے ایک نہیں ملتی کوئی آن تری

نزاکتِ بیان سے متعلق یہ الفاظ با معنی ہیں۔ "ٹک" معنی "ذرا"۔ "نِت" معنی "ہمیشہ"

غرض آواز کو ظاہر کرنے الفاظ کی دو بڑی قسمیں ہو سکتی ہیں۔

(۱) بہ اعتبارِ ساخت، آواز ظاہر کرنے والے الفاظ یا تو مفرد ہوتے ہیں یا مرکب یعنی وہ یا تو بذاتِ خود ایک لفظ ہوتے ہیں۔ یا کسی دوسرے لفظ سے ملکر ایک لفظ کی شکل اختیار کرتے ہیں۔ مثلاً "قند" مفرد ہے "قلاقند" مرکب۔ "موتی" مفرد ہے۔ "موتی چور" مرکب۔ لیکن آواز ظاہر کرنے والے الفاظ زیادہ تر مفرد ہی ہوتے ہیں۔ اور جو مرکب ہوتے ہیں اُن کی ساخت دلچسپی سے خالی نہیں کیونکہ ان کی ترکیب کسی دوسرے لفظ کے ملنے پر مبنی نہیں ہے۔ بلکہ صرف دو ہمنوا لفظوں کی تکرار پر اور یہ تکرار[۱] بھی کئی ترکیبوں پر مشتمل ہے۔ مثلاً "قُل قُل" جو صراحی کی آواز ہے۔ "صرصر" یعنی ہوا کیونکہ یہ لفظ ہوا کی روانی کو ظاہر کرتا ہے۔ اور "دلدل" جو ایک قسم کی عمیق کیچڑ[۲] کا نام ہے۔ یا ایسے ٹکڑوں کی ترکیب جو ہمنوا تو ہوں مگر ہمشکل نہ ہوں جیسے "گڑبڑ" (یعنی شورش) "دُھم دُھم" (باجے کی آواز) اور "گھما گھم" "چھما چھم" وغیرہ یا ایسے الفاظ جو لظاہر فقرہ ہیں اور ان کی ساخت دو دو ٹکڑوں کی دو ہم شکل و ہم نوا ترکیبوں پر مبنی ہے۔ مثلاً آہ، واہ، حیف اور ہائے وائے وغیرہ۔ یا الفاظ جو بالکل مختلف ٹکڑوں کی ساخت سے فقروں کی شکل میں مستعمل ہوئے ہیں جیسے "دھما چوکڑی" اور "اُچک پاند" وغیرہ۔

(۲) بہ اعتبارِ مفہوم آواز کو ظاہر کرنے والے الفاظ یا تو کسی جذبہ کو ظاہر کرتے ہیں مثلاً آہ، واہ، حیف اور ہائے وائے وغیرہ۔ یا کسی جانور کی آواز ہوتے ہیں مثلاً دہاڑنا۔ بھونکنا۔ کائوں کائوں اور کوکو وغیرہ۔ پنجروں میں طوطا "ٹین ٹین" کرتا ہے۔ تیتر "پٹیلو پٹیلو" کہتا ہے۔ اور بٹیر "فِٹ فِٹ، فِٹ فِٹ" کیا کرتی ہے۔ مولانائے روم نے تو پرندوں کی آواز ظاہر کرنے والے الفاظ سے آیۂ "تُسَبِّحُ لَہُ السَّمٰوٰاتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِیْہِنَّ" کی تفسیر بھی بیان کر دی ہے ؎

اے مطربِ خوش قاقا تو قی قی و من قوقو
تو دق دق و من حق حق تو ہی ہی و من ہو ہو
اے شاخِ درختِ گل لے ناطقِ امرِ گل
تو کبک صفت بو بو من فاختہ سان کو کو

مفہوم کی تحت میں ایسے الفاظ کا بھی ذکر کیا جا سکتا ہے جو کسی آواز کا گراموفون نہیں بلکہ اصل کی نقل ہیں۔ یعنی اصل کی پوری پوری تصویر کا اندازہ اُن الفاظ کے بولنے سے ہو جاتا ہے۔ مثلاً:-

شقاف - دھندلا - گھٹا اور اندھیرا گھُپ۔

تصویرِ واقعہ اور عکسِ صوت ظاہر کرنے والے الفاظ خواہ اُن کا تعلق سامعہ سے ہو خواہ باصرہ سے حضرت امیر خسروؒ سے بڑھکر شاید ہی کسی نے استعمال کئے ہوں۔ اہل ادب اب بھی کسی نقارخانہ سے "خانہ بر و خانہ برو" کی آواز سُن سکتے ہیں۔ اور دُھنیوں کی دکان سے ہر وقت "اینہم رفت و آنہم رفت" کی آوازیں سنی جا سکتی ہیں۔ ہر لفظ کی آواز اپنے لئے مخصوص حیثیت رکھتی ہے مثلاً پانی سے متعلق آواز لفظ "موسلادھار" سے ظاہر ہے۔ اسی طرح آگ سے شعلے بلند ہوتے ہیں۔ ہوا کے جھونکے چلتے ہیں۔ خاک اڑ کر آسمان کو "دھندلا" کر دیتی ہے اور ٹھنڈی ہوا سے سبزہ "لہلہانے" لگتا ہے۔

آواز اور صورتِ واقعہ ظاہر کرنے والے الفاظ غیر زبانوں سے بھی حاصل کر لئے جاتے ہیں۔ مثلاً عربی سے "زق رق و بق بق"، ہندی سے تو نہیں معلوم کتنے ایسے الفاظ اردو میں مستعمل ہیں مثلاً "کڑک" "چمک" "دھماکا" "ڈھول" اور "اودھم وغیرہ۔ اب انگریزی زبان سے بھی کئی الفاظ اردو میں آ گئے ہیں مثلاً "پف" (یعنی پھونک) "کلیپ انگ" (یعنی تالیاں بجانا۔ خوشی کے وقت "چیرز" دئے جاتے ہیں۔ غیرت دلانے کو "شیم" کہا جاتا ہے۔

---

[۱] یہ خیال رہے کہ یہ ترکیب محض لفظی ہے۔ معنوی نہیں۔
[۲] یا "کیچ"

لیکن بجائے اس کے کہ اصل انگریزی الفاظ مستعمل ہوں اُن کی نقل بہت کی گئی ہے۔ یعنی ایسے الفاظ زبان زدِ عام ہو گئے ہیں جن سے انگریزیت تو ظاہر ہے مگر ان کو انگریزی زبان سے کوئی واسطہ نہیں نہ وہ کسی مستند ترکیب پر مبنی ہیں مثلاً:-
"سٹرّیل"[1] (یعنی خراب) "ڈیلو کاٹ" (یعنی بہت بڑا) اسی طرح "ڈبل" سے ڈبل روٹی وغیرہ۔

حسنِ صوت ظاہر کرنے والے الفاظ جب نظم و نثر میں کسی سامعہ نواز ترتیب سے ظاہر ہوں تو ان کو اظہارِ واقعہ کی تصویر ہی نہیں بلکہ لوئتی تصویر سمجھنا چاہئے۔ کیونکہ انکی امداد سے شاعر اشعار میں نغمہ یا ترنم ظاہر کر سکتا ہے۔ ایسے ترنم کی مثال جو آواز پر مبنی ہو قاآنی کے مندرجہ ذیل اشعار ہیں۔ ؎

بہ چنگ بستہ چنگہا بہ نائے بستہ زنگہا
چکاوہا، کلنگہا، تدروہا، ہزارہا
زنائے خویش فاختہ دوصد اصول ساختہ
ترانہا نواختہ چو زیر و بم تارہا

ان اشعار میں نون غنہ کا ترنم اور "فاختہ" و "نواختہ" قابلِ غور ہیں۔ آخری مصرعہ میں "بم" "مشدد" نے تو کمال ہی کر دیا ہے۔ اسی طرح موسم بہار میں جنگل کی چہل پہل کا اظہار اس مصرعہ سے کیا ہے۔

ع صدائے ہائے ہوئے ہے ز ہر سوئے ہزار آید

علاوہ ان اشعار کے عندلیب کی مندرجہ ذیل غزل بھی نغمۂ خاموش کی نمایاں مثال ہے۔ ؎

زلفِ تو سنبل آمدہ گونۂ تو سمن سمن
گشت ز سنبل و سمن عارضِ تو چمن چمن
جعدِ تو دامِ راہِ دل گر نبود چرا بود
طرّہ بہ طرّہ خم بہ خم چنبر و چین شکن شکن
از لب و از دہانِ تو مصر و یمن شکستہ شد
شہدِ قیمت شکر شکر لعلِ لبت یمن یمن
مشکِ ختن شکستہ بہ وصفِ بہ چین نگفتہ بہ
موئے تو شد چو چین بہ چین روئے تو شد ختن ختن

اردو زبان میں ابھی لٹریچر کا دائرۂ اقتدار اتنا وسیع نہیں کہ ایسی مثالیں کثرت سے مل سکیں۔ پھر بھی بہت کچھ ہے خصوصاً انیس و دبیر کے کلام میں تو کثرت سے ایسی مثالیں ملیں گی۔ مثلاً (انیس) ؎

نقارۂ وغا پہ لگی چوب یک بیک
اٹھا غریو کوس کہ ہلنے لگا فلک
شہپور کی صدا سے ہراساں ہوئی ملک
قرنا پھنکی کہ گونج اٹھا دشت دور تک
شور دہل سے حشر تھا افلاک کے تلے
مردے بھی ڈر کے چونک پڑے خاک کے تلے

مندرجہ بالا بند میں الفاظ "نقارہ" "وغا" "غریو" "شہپور" اور "دُہل" قابلِ توجہ ہیں۔ کیونکہ انہیں سے آواز کا اظہار ہوتا ہے۔ اسی طرح مرزا دبیر کا ایک شعر ہے ؎

تیزی تپ تیغ نے بخشی نئی خفت
چین بہ جبیں چین بہ جبیں پشت بہ جنت

موجودہ اردو نظم میں بھی اس قسم کی جدتیں پیدا کی جا رہی ہیں۔ مثالِ ذیل سے انکا اندازہ ہو گا ؎

جھن من جھن جھن جھنکار
تن من دھن سے منہ موڑیں رشتۂ دنیا سے توڑیں
ہو کر دنیا سے بیزار پیار کریں آ مل کر پیار
جھن من جھن من جھن جھنکار
جھن من جھن من جھن جھنکار[2]

آواز ظاہر کرنے کے علاوہ واقعہ کی تصویر کھینچنے والے اشعار جن کو حسن محاکات کی بنا پر تجنیس صوت کی تحت میں شمار کرنا چاہئے اردو میں کلامِ انیس سے زیادہ کہیں نہ ملیں گے مثلاً:-

فوج کی آمد
اُمڈی ہوئی تھی فوج پہ فوج اور دل پہ دل
تھے برچھیوں کے صورتِ مقراض پھل پہ پھل
خنجر وہ جنکی آب میں تھی تلخیِ اجل
وہ گرز جن کے ڈر سے گری دیو منہ کے بل
ڈھالیں تھیں یوں سروں پہ سوارانِ شام کے
صحرا میں جیسے آئے گھٹا جھوم جھام کے

گھوڑا
سمٹا۔ جما۔ اُٹھا۔ ادھر آیا ادھر گیا
چمکا۔ پھرا۔ جبال دکھایا ٹھہر گیا
تیروں سے اڑ کے برچھیوں میں بے خطر گیا
برہم کیا صفوں کو پرے سے گذر گیا
جو آگیا قدم کے تلے گرد برد تھا
چھل بل غضب کے تھے کہ چھلاوہ بھی گرد تھا

[1] ہندی لفظ ہے ــــ د
[2] از ہمایوں لاہور

تلوار ؎

چمکی - گری - اُٹھی - اِدھر آئی اُدھر گئی

خالی گئے پرے تو صفیں خون میں بھر گئی

کاٹے کبھی قدم کبھی بالائے سر گئی

ندی غضب کی تھی کہ چڑھی اور اتر گئی

غلُ رَن میں تھا یہ کیا ہے جو قہرِ صمَد نہیں

ایسا تو رودِ نیل میں بھی جزر و مد نہیں

ہندی نظم میں اظہارِ واقعہ سے متعلق اشعار غالباً دنیا کی تمام زبانوں سے زیادہ ملیں گے - مثلاً برسات کی اندھیری رات اور ننھی ننھی بوندیں گرنے کا فوٹو اس سے بڑھکر کیا ہوسکتا ہے ؎

رین اندھیری تال کنارے مُرلا جھنکارے، بادل کارے

بوندیاں پڑیں پھُنیاں پھُنیاں جھولا کن ڈاروے امریاں[1]

دوسرا ساون ملاحظہ ہو ؎

رِم جھم رس کی دھارا برسے آنند منگن اکھل جگ برسے

موہ من ترسے نینان برسے

سندر شام گھنشام کنہائی و

گھاری گھاری گھن گھٹا گھر آئی

ان ترانوں میں الفاظ "رِم جھم رس کی دھارا" اور "پھُنیاں پھُنیاں" قابلِ توجہ ہیں - اور آخری کڑی تو گھٹا کی گھور گرج بھی ظاہر کرتی ہے -

الغرض فارسی، ہندی اور انگریزی وغیرہ کے اثر سے تجنیسِ صوت کا اردو زبان میں بھی کافی دخل ہوگیا ہے - مگر سخت تعجب ہے کہ کسی قواعد داں نے اس کی طرف غور نہ کیا - گو" اردو زبان کے قواعد جو فارسی پر مبنی ہیں اب انگلش گریمر کی تقلید پر بھی لکھے گئے ہیں - اور چونکہ انگریزی میں صنعتِ (Onomatopoeia) کی تحت میں تجنیسِ صوت پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے - اس لئے اردو میں بھی کم از کم تقلیداً اس کا ہونا ضروری تھا -

نظم کی خوبی ترتیبِ الفاظ میں ہے اور الفاظ کی خوبی حروف کی دلفریب ترکیب پر - اگر الفاظ اظہارِ آواز اور اظہارِ واقعہ سے متعلق ہیں تو ان کی مناسب ترتیب سے نظم بھی نمونۂ کمال ثابت ہوتی ہے - اور الفاظ کی دلفریب مناسبت اسی وقت ممکن ہے جبکہ وہ یکساں حیثیت رکھتے ہوں - ان کی آواز میں بہ لحاظ مفہوم موافقت ہو اور ساتھ ہی ساتھ عام فہم بھی ہوں - یہ نہیں کہ بلا ضرورت ایک لفظ تو ایران کا ہے دوسرا توران کا - ایک رعد کی گرج ظاہر کرتا ہے - دوسری بانسری کی آواز یا اُن میں سے کوئی ایسا ہے کہ اس کے معنی بغیر غیاث اللغات دیکھے سمجھ میں نہیں آسکتے -

مشہور فلسفی و مورخ[1] علامۂ ابنِ خلدون نے لکھا ہے کہ "نظم و نثر لکھنے کا فن، الفاظ کی ترتیب پر مبنی ہے نہ کہ خیالات پر - خیالات تو خود بخود پیدا ہوتے ہیں - مگر اُن کو ظاہر کرنے کے لئے ایسے اسالیب کی ضرورت ہے جو خیالات سے مناسبت و موافقت رکھ سکیں - مئے ناب کے لئے ساغرِ زرّیں ہونا چاہئے - اور گدلے پانی کے لئے ایک ٹھیکرا ہی کافی ہے "

آخر میں یہ ظاہر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ "نغمۂ خاموش" جو دو متضاد مفہوم ظاہر کرتا ہے - صرف بہ لحاظ مطالعہ "خاموش" کہا جاسکتا ہے کیونکہ "باصرہ" کے ذریعہ سے الفاظ سامعہ کو بھی پُر لطف معلوم ہوتے ہیں - یعنی زور سے پڑھے بغیر صرف مطالعہ ہی کرنے پر وہ الفاظ سامعہ نواز ہوتے ہیں - یہی وجہ ہے کہ رزمیہ شاعری کا مطالعہ ہمارے دل میں جوش و خروش پیدا کرتا ہے - اور بہاریہ اشعار کے مطالعہ سے خود اپنے آپ گانے کو جی چاہتا ہے - بس مطالعہ کی خصوصیت کو مدِ نظر رکھکر اظہارِ آواز اور اظہارِ واقعہ سے متعلق الفاظ و اشعار کو "نغمۂ خاموش" کہا گیا کیونکہ زور سے پڑھنے پر ہر "نغمہ" نغمہ ہے - مگر "خاموش" نہیں -

سید مقبول حسین احمد پوری

---

[1] ماخوذ از پھول والوں کی سیر

[1] "Tunis" میں پیدا ہوئے (۱۳۲۲ء) اور قاہرہ میں وفات پائی - (۱۴۰۶ء)"

Browns History of Persian Literature

تیمور لنگ

ہریچند میرا بچپن کا دوست تھا جس زمانے میں ہم دونوں ہندی مڈل کلاس میں پڑھتے تھے۔ ہمیں دلی دربار دیکھنے کا موقع ملا، وہاں ہم نے مغربی تہذیب کی روشنی میں ہندوستان کے اسٹیج پر ہندوستانیوں کا پارٹ دیکھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ہم دونوں زندگی کے متعدد نشیب و فراز جھیلتے ہوئے ایک مرہٹی تھیئٹریکل کمپنی میں ملازم ہوگئے۔

میں اس کمپنی کا ڈرامہ نگار تھا۔ اور ہریچند اس کا چیف ایکٹر۔ انسان کے تمام جذبات پر اس کو کامل عبور حاصل تھا۔ یہی اس کی کامیابی تھی، اسٹیج پر وہ اپنے آپ کو بالکل فراموش کر سکتا تھا۔ یہی اسکی کامیابی کا راز تھا۔

ہریچند کی اس کامیابی کو کچھ اس کے ساتھی دیکھ نہ سکے۔ اُن کی متفقہ کوششیں اس کی ممتاز شخصیت کو نقصان پہنچانے کے لئے بار بار بروئے کار آئیں اور ہر بار ناکام ہو کر رہ گئیں۔ بالآخر وہ ایک رات نہایت کمینہ حرکت پر اُتر آئے۔ سنیچر کی سنہری رات تھی۔ اور اس رات میرا ایک مذاقیہ ڈرامہ شروع ہونے والا تھا۔ کسی ڈرامے کی پہلی رات جتنی جوش انگیز ہوتی ہے اتنی ہی تردد انگیز بھی ہوتی ہے۔ ڈرامے کا فیل ہونا کمپنی کے مالک کے نقصان اور میری بدنامی کا باعث تھا۔ میں نے ڈراما کے لکھنے میں کوشش کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا تھا۔ تصویر کار نے پوری توجہ اور دلچسپی سے پردے تیار کئے تھے۔ گانے کے استاد نے کامل شوق اور حوصلے سے دلکش راگوں میں گانوں کو ترتیب دیا تھا۔ اس پر چیف ایکٹر تھا میرا دوست ہریچند،

جس حقیقت کو مدنظر رکھکر میں نے ڈراما لکھا تھا ہریچند اس کی تصویر کھینچ کے دکھا دیتا تھا۔ چنانچہ گرانڈ ریہرسل میں ہمارے حریفوں نے بھی دبی زبان سے اعتراف کر لیا تھا کہ یہ ڈراما میرے اور ہریچند کے کمال کو اسٹیج کی تاریخ کے اوراق پر ثبت کر دیگا۔

ساڑھے نو بجے تماشے کی تیسری گھنٹی بجی۔ پہلے حصّے کا پہلا سین شروع ہوا۔ ہریچند تقریباً سو فیٹ بلند پہاڑی چٹان پر کھڑا ہے۔ نیچے سے ایک عورت کی فریاد کانوں میں پہنچتی ہے۔ دیکھا ہر تو ڈاکو ایک تنہا عورت کے زیور چھین رہا ہے، وہ دفعتہً اوپر سے کودتا ہے مگر؟

...... اس عورت کی مدد کرنے کے بجائے خود بیساختہ چیخ اٹھتا ہے۔ ڈاکو عورت کو چھوڑ کر ہریچند کی مدد کو دوڑتا ہے۔

تماشائیوں کی سمجھ میں کچھ نہ آیا اس لئے وہ بالکل خاموش رہے لیکن میں سمجھ گیا۔ ایک طرف سے میں اور دوسری طرف سے مینجر دونوں اسٹیج میں کودے اور ہریچند کو اندر لیجا کر دیکھا۔ اس کے ایک پاؤں میں لوہے کی ایک لمبی تیز کیل چبھ جانے سے نالی کی طرح خون جاری تھا۔ ہری چند نے مجھے پُر درد لہجہ میں کہا ——— کسی نے قصداً یہ کارروائی کی ہے۔" اس کے بعد وہ بیہوش ہوگیا۔

دو غیر متعلق آدمیوں کے اسٹیج میں داخل ہو جانے کی وجہ سے تماشائیوں میں انتشار پیدا ہوگیا تھا۔ پردہ گرا دیا گیا اور اس حادثہ کی اطلاع دیکر تماشائیوں کو ٹکٹ کی قیمت واپس کر دی گئی۔ اس طرح کامڈی کا ڈراما ٹریجڈی میں تبدیل ہوگیا۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

بدقسمتی سے کیل کا زخم زہریلا ہو کر روز بروز بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ ڈاکٹروں نے رفتہ رفتہ پورا پاؤں کاٹ ڈالا جب کہیں زخم اچھا ہوا۔ پاؤں کے ساتھ ہریچند کو کمپنی کی ملازمت سے بھی دست بردار ہونا پڑا۔ اس کے گھر جانے کا دن قریب آیا وہ ایک ایک شخص سے رخصت ہوا۔ میرے پاس بھی آیا اور کہنے لگا۔ دوست! اب تم بھی رخصت دو۔ اب اسٹیج میں تو میرے لئے کوئی ٹھکانا رہا نہیں۔ شاید وطن میں ٹھکانا مل جائے۔ ہم تم بہت دنوں ساتھ رہے۔

میں ۔ تو ایک ساتھ ہی یہاں سے چلیں گے بھی۔ میں بھی کمپنی سے استعفا دئے دیتا ہوں۔

ہریچند ۔ نہیں۔ اس کی کیا ضرورت ہے؟ ایسا نہیں ہوسکتا۔

میں ۔ تو تم بھی یہیں رہو۔ کمپنی کے ملازم کی حیثیت سے نہ سہی. میرے دوست کی حیثیت سے۔

ہریچند ۔ یہ بھی نہیں ہوسکتا۔ کمپنی کے مالک نے بھی مجھے یہاں سے جانے کو نہیں کہا۔ مگر میں ان کے لئے بوجھ بنکر نہیں رہ سکتا۔ باہر ٹانگہ میرے انتظار میں کھڑا ہے۔ گاڑی کا وقت قریب ہے۔ اجازت

دو تسلیم۔

جونہی ہرسچند جانے لگا۔ میں نے اُسے روک کر کرسی پر بٹھا لیا۔ اور کہا:۔

تم اتنے بے مروت کیوں ہو گئے؟ تم نہیں رہو گے۔ تمہیں یہیں رہنا ہوگا۔

ہرسچند۔ تم تو بچوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ اسٹیج پر لنگڑا آدمی کسی ڈرامے کا ہیرو نہیں ہو سکتا۔

میں۔ ہو کیوں نہیں سکتا۔ اسٹیج دنیا ہی کا مختصر سا خاکہ ہے۔

اب ہرسچند کو میری باتوں کا کسی قدر یقین ہوا۔ اس نے کہا۔ کس ڈرامے کا؟

"اس ڈرامے کا" یہ کہکر میں نے صندوق سے ایک قلمی ڈرما نکالکر ہرسچند کو دیا۔ جس کے ٹائیٹل پیج پر اس نے جلی حروف میں لکھا ہوا دیکھا۔

"تیمور لنگ"

(ڈراما)

ہرسچند نے متعجب ہو کر پوچھا۔ یہ نیا ڈراما تم نے کب لکھا؟

میں نے کہا کل رات۔

ہرسچند۔ صرف ایک رات میں؟

میں۔ ہاں۔

ہرسچند۔ کس چیز نے تمہیں اسقدر قوتِ عمل سے لبریز کر دیا۔

میں۔ تم نے۔ تمہاری محبت نے۔

ابو محمد امام الدین (مدیر ترجمان)

غزل

صرف اتنی ہی شرحِ ہستی ہے ایک عنوانِ خود پرستی ہے

بادۂ غم سے مست رہتا ہوں غم پرستی سی غم پرستی ہے

موت کی آرزو میں جیتا ہوں میری ہستی بھی کوئی ہستی ہے

کچھ نہ پوچھو فراق کا عالم ہر طرف بیکسی برستی ہے

میں بھی اُس جذبِ دل کا مالک ہوں جس میں اک شانِ خود پرستی ہے

اے خدا کیا تری خدائی میں مجھ سے بدتر بھی کوئی ہستی ہے

جس کو کہتے ہو تم دلِ جوہرؔ
حسرتوں کی وہ ایک بستی ہے

جوہر عظیم آبادی

رسکن اور کارلایل

رسکن جان رسکن ۱۸۱۹ میں لنڈن میں پیدا ہوا اور ۱۹۰۰ میں مرگیا۔ وہ سکاٹلینڈ کے ایک دولتمند شراب فروش کا لڑکا تھا۔ اس نے کرائسٹ چرچ اکسفورڈ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ وہیں سے نیوڈی گیٹ انعام حاصل کیا۔ رسکن شروع سے ادب۔ شاعری اور صنعت کا دلدادہ تھا۔ سیر و سیاحت سے اس کا ذوقِ سلیم پختہ تر ہوتا چلا گیا۔ اٹلی۔ سوئٹزرلینڈ اور فرانس سے اس کے لئے بہت اثر آفریں ثابت ہوئے ۱۸۶۷ء میں وہ اکسفورڈ میں آرٹ کا پروفیسر مقرر ہوا۔ اپنی عمر کے آخری حصوں میں کانسٹن چلا گیا۔

اس کی مشہور تصنیفات مندرجہ ذیل ہیں:۔

عصر حاضر کے مصور۔ فن تعمیر کے سات چراغ۔ فن تعمیر اور مصوری پر لیکچر۔ ہوا کی ملکہ۔ ہیولی کے قانون۔

رسکن کا انداز تحریر ایک خاص رنگ حسن رکھتا ہے جس کا اب تک جواب نہیں ہوسکا۔ طویل موسیقیت سے لبریز فقرے۔ تصویر کشی۔ جوش بیان اور کلام یہ تمام باتیں اس کے انداز کو اپنے معاصرین کے انداز سے ممتاز کرتی ہیں۔

آرٹ کے نقاد کی حیثیت سے وہ اپنے زمانے میں ایک سربرآوردہ شخصیت تھا۔ وہ "صداقت" پر بہت زور دیتا تھا۔

فن مصوری (ماقبل رافیل) کے شاہکار اسے بہت پسند تھے۔ اگرچہ اسے "تاثراتی" انداز مصوری سے نفرت تھی۔ لیکن وہ پہلا شخص ہے جس نے آرٹ کی صحیح معنوں میں توضیح کی۔

کارلایل کارلایل ومفری شائر میں ۴ دسمبر ۱۷۹۵ء کو پیدا ہوا تھا۔ اس کا باپ ایک معمار تھا۔ جین بیلی ویلش سے شادی کرنے کے بعد کچھ عرصہ وہ اڈنبرا میں رہا۔ اس کے بعد لنڈن چلا گیا۔ جہاں اس نے اپنی باقیماندہ عمر گزار دی۔

قیام لنڈن کے پہلے حصے میں اس کی تمام توجہ ایک ہی کام پر مرکوز رہی۔ یعنی "تاریخ انقلاب فرانس" اس کی زندگی حوصلہ افزا توقعات سے خالی تھی۔ اور ماحول مخالف۔ اس کے پاس تھوڑا سا روپیہ تھا۔ لیکن کتاب کے ختم ہونے تک وہ بھی ختم ہو جاتا۔

کارلائل نے کتاب شروع کر دی اور پہلی جلد کے تکمیل کے بعد اسے جان مل کے حوالے کر دیا۔ بدقسمتی سے وہ مسودہ ضائع ہو گیا۔ اور اگرچہ جان مل نے کارلائل کی مالی مشکلات کا احساس کرتے ہوئے اسے ۱۰۰ پونڈ کی رقم لینے پر مجبور کیا۔ لیکن پانچ ماہ کی محنت کے ضائع جانے کا کارلایل کو سخت صدمہ پہنچا۔ تاہم حیرت انگیز استقلال سے کام لے کر اس واقع کے دو سال بعد اس نے "تاریخ انقلاب فرانس" کو مکمل کر لیا۔ اس کی اشاعت سے کارلائل کا شمار مشاہیر میں ہونے لگا۔ دور دور تک اس کی دھاک بیٹھ گئی۔ ارباب نظر نے احساس کیا کہ کارلایل ان اکابر میں سے تھا جو ملک کی تاریخ کو بدل دیتے ہیں۔

۱۸۸۱ء میں کارلایل کا انتقال ہو گیا۔

گھر کا مالک

افراد

انیس احمد .... ایک بوڑھا تاجر
جلیس .... اس کا لڑکا
کشور .... انیس احمد کی نوجوان بیوی (جلیس کی سوتیلی ماں)
خادمہ ....
محمد حسین .... انیس کا دوست - ایک وکیل
محمد رفیع .... ایک ڈاکٹر

پردہ اٹھتا ہے

ایک بڑا کمرہ - ایک طرف پلنگ پر انیس احمد بیمار پڑا ہے بیہوش ہے - کشور پاس ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی ہے - بوڑھی خادمہ ایک طرف دوسری چارپائی پر بیٹھی ہے -

شام کا وقت ہے - پت جھڑ کا موسم ہے - اُداسی سی چھائی ہوئی معلوم ہوتی ہے - ابھی انیس احمد کے کمرے میں لیمپ نہیں جلے - کشور ایک ضدی زبان دراز عورت ہے جس کے والدین نے روپے کیلئے اُسے انیس احمد کے ہاتھ بیچ دیا تھا - اس سودے کی تلخی ابھی تک اس کے دل سے نہیں گئی -

خادمہ - ڈاکٹر نے کیا کہا ہے ؟

کشور - یہی کہ ان کی دل کی حالت بہت نازک ہے - ذرا سا صدمہ....

خادمہ - (سرگوشی میں) آپ کا پیچھا تو چھوٹے گا !

کشور - کیا بکواس کرتی ہو -

کشور کے الفاظ سخت ہیں لیکن اس کے لہجے سے غصے کا اظہار نہیں ہوتا -

خادمہ - بیوی ! اب اسی برس کی عمر ہونے کو آئی دکھائی نہیں دیتا - سنائی نہیں دیتا - ایسے جینے سے مرنا بھلا ہے -

دروازہ کھٹکھٹایا جاتا ہے

کشور - دیکھنا - کون ہے - آج صبح کہہ رہے تھے کہ وکیل کو بلا کے جائیداد میرے نام منتقل کر دینگے - شاید وکیل آیا ہے - ان کو تو ہوش نہیں - اسے کل پھر آنا پڑیگا -

خادمہ - (نسوانی اشتیاق سے) تو کیا میاں جلیس کو کچھ نہیں ملیگا -

کشور - عورت ! تیری زبان تھمیگی یا نہیں - جا دروازہ کھول -

خادمہ دروازہ کھولتی ہے

خادمہ - میاں جلیس ہیں -

کشور - جلیس -

خادمہ - ہاں -

جلیس داخل ہوتا ہے - وہ ایک بلند قامت دبلا پتلا نوجوان ہے - اس کے چہرے پر ایک ہیبت سی برستی ہے - اسکی مونچھیں بڑی بڑی ہیں - آنکھیں اندر دھنسی ہوئی - ابرو گنجان - ناک لمبی - ہاتھ پاؤں چوڑے چکلے ہیں -

جلیس - شاید گھر کے مالک کو اسطرح "خوش آمدید" کہا کرتے ہیں -

کشور - یہ تمہارا گھر نہیں ہے - میرا ہے -

جلیس - سنو میں تم سے کچھ کہنے آیا ہوں -

کشور - میں کچھ نہیں سننا چاہتی - یہاں سے فوراً چلے جاؤ -

جلیس - (باپ کے پلنگ کی طرف دیکھکر) بیہوش ہے -

کشور۔ ہاں۔ اور تمہاری صورت سے بیزار۔ شرم تو نہیں آتی سیدھے جیل سے آرہے ہو گے۔ تم نے اپنے بوڑھے باپ کا دل توڑ دیا۔ اس نے تمہیں لکھایا پڑھایا۔ کمانے کے قابل کیا۔ اور تم نے اس کا صلہ یہ دیا کہ بدمعاشوں کے ساتھ مل کر چوری کی۔ جیل میں گئے۔ اور خاندان کی آبرو خاک میں ملادی۔

جلیس۔ یہ بات ہے!

کشور۔ ہاں۔ (غصے سے) اگر تم دو منٹ کے اندر اس مکان سے نہ جاؤ گے تو میں پولیس کو بلوا کر تمہیں نکلوا دونگی۔

جلیس (دھیما ہو کر) اچھا میں چلا جاتا ہوں لیکن کم از کم کچھ کھانے کے لئے تو دو۔ بھوک کے مارے میرا بُرا حال ہو رہا ہے۔

کشور۔ کچھ نہیں ملیگا۔

جلیس۔ میں کل سے بھوکا ہوں۔

کشور۔ مجھے اس سے کچھ تعلق نہیں۔

خادمہ۔ بیوی۔ کچھ دے دیجئے میاں کو۔

کشور۔ ہرگز نہیں۔

خادمہ۔ صبح کی بچی ہوئی روٹی ہی سے دیدیجئے۔

کشور۔ (نرم ہو کر) اچھا۔ (خادمہ سے) جاؤ کچھ روٹی اور مکھن لا دو۔

جلیس ایک کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔

خادمہ روٹی اور مکھن لاتی ہے۔ جلیس کھانے میں مصروف ہو جاتا ہے۔

جلیس۔ (کھاتے ہوئے) میرے نصیب میں یہ باسی روٹی اور مکھن تھا۔

کشور۔ خاموش! دیکھتے نہیں تمہارا بوڑھا باپ بیہوش ہے۔ جسدن سے انہیں معلوم ہوا ہے کہ تم نے چوری کی۔ اسدن سے انکی بیماری بڑھتی گئی۔ اور آج تو حالت زیادہ خراب ہے۔ پرسوں تم کو گھر سے نکل جانے کا حکم دینے کے بعد ان کی طبیعت بہت گر گئی۔

جلیس۔ (کھانا ختم کر کے) اچھا میں جاتا ہوں۔ کچھ روپیہ تو دیدو!

کشور۔ ایک پائی نہیں۔

جلیس۔ ادھار۔

کشور۔ ادھار۔ اور تمہیں۔ واپس کس طرح کرو گے۔

جلیس۔ (بستر کی طرف اشارہ کر کے) اس کی موت کے بعد۔

کشور۔ غلط!

جلیس اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اور کشور کی طرف غور سے دیکھتا ہے۔

جلیس۔ کیا اس نے مجھے عاق کر دیا ہے۔

کشور۔ تمہیں اس سے زیادہ کی توقع تھی؟

جلیس۔ آخر کچھ کہو تو۔ کیا ہوا۔

خادمہ داخل ہوتی ہے۔

خادمہ۔ وکیل صاحب آگئے۔

کشور اور جلیس دونوں اُٹھکر دوسرے کمرے میں چلے جاتے ہیں۔ ایک طرف دروازے کے پیچھے کشور بیٹھ جاتی ہے۔ جلیس کھڑا ہو جاتا ہے۔

خادمہ محمد حسین کو ساتھ لئے ہوئے داخل ہوتی ہے۔

محمد حسین! کیا حال ہے مسٹر انیس احمد کا۔

کشور۔ (نیچی آواز میں) بیہوش ہیں۔ شاید آج تو ہبہ نامہ پر ان کے دستخط نہ ہو سکیں۔

جلیس۔ ہبہ نامہ۔ کیسا ہبہ نامہ۔ اپنے باپ کی جائیداد کا وارث میں ہوں۔

محمد حسین۔ (جلیس سے مخاطب ہو کر) سنو جلیس۔ کل تمہارے والد نے مجھے کہا تھا کہ وہ اپنی ساری جائیداد منقولہ و غیر منقولہ اپنی بیوی کے نام منتقل کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں اس انتقال کا پورا اختیار حاصل ہے۔ چپ چاپ کھڑے رہو۔ اگر تم دخل دو گے تو میں تمہیں اس گھر سے نکلوا دونگا۔ کل مسٹر انیس احمد نے خاص طور پر کہا تھا کہ وہ تم کو محروم کرنا چاہتے ہیں۔

کشور۔ آپ خود اندر جا کر دیکھئے۔ شاید اب ہوش میں ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے بھی اس وقت آنے کا وعدہ کیا تھا۔

ڈاکٹر محمد رفیع داخل ہوتا ہے۔

ڈاکٹر محمد رفیع۔ (خادمہ سے) کیسی طبیعت ہے تمہارے میاں کی۔

خادمہ۔ جیسے آپ صبح دیکھکر گئے تھے۔ ویسے ہی ہیں۔ ہوش تو نہیں آیا۔

محمد رفیع۔ اچھا میں انہیں دیکھ آتا ہوں۔

تھوڑے عرصے کے بعد پھر داخل ہوتا ہے۔ اسکے چہرے پر تعجب اور خوف کے آثار ہیں۔

محمد رفیع۔ بیگم مسٹر انیس احمد نے عالم فانی کو خیر باد کہا

جلیس - کیا!

کشور چیخ مارتی ہے - پھر آہستہ آہستہ ہلکی آوازیں رونے لگتی ہے -

جلیس حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھتا ہے -

محمدؐ حسین ! تعجب ہے - میں ابھی مرحوم کو قانونی مشورہ دینے کے لئے سجانے والا تھا - اور یہ لوگ بھی اس طرح اطمینان سے باتیں کر رہے تھے گویا اس کی حالت اچھی ہے -

محمدؐ رفیع - مسٹر انیس احمد کو مرے ہوئے دو گھنٹے سے زیادہ گذر چکے ہیں -

جلیس - دو گھنٹے سے زیادہ !

محمدؐ رفیع - جی ہاں -

ڈاکٹر محمدؐ رفیع اور محمدؐ حسین چلے جاتے ہیں -

کشور ان کے چلے جانے کے بعد کمرے میں آجاتی ہے

کشور - (سسکیاں لیتے ہوئے) اب تم جاؤ گے یا نہیں - جاؤ - اور مجھے تنہا چھوڑ دو -

جلیس - اب میں کہاں جاؤنگا -

کشور - مرحوم کا حکم تھا تم اس مکان میں قدم نہ رکھو -

جلیس - لیکن اب اس گھر کا مالک میں ہوں -

کشور - کیا!

جلیس - میں اپنے باپ کی تمام جائیداد کا وارث ہوں - تم صرف گذارہ لے سکتی ہو - مجھے جانے کی ضرورت نہیں - تم اپنا کوئی بندوبست کرو -

کشور - میں -

جلیس - ہاں تم -

کشور - جلیس - تم آج تو مجھے اس گھر سے نہ نکالو - تمہارا باپ میرا شوہر مردہ پڑا ہے -

جلیس - تمہیں اسی وقت جانا ہوگا -

کشور - میں نہیں جاؤنگی -

جلیس - میں پولیس کو بلوا کر تمہیں نکلوا دونگا -

کشور رونے لگتی ہے

جلیس - آنسو نہ بہاؤ - خادمہ کو کہو تمہیں اپنے بھائی کے گھر لے جائے -

کشور - اچھا - میں جاتی ہوں - تمہیں اپنے گھر میں اپنے مردہ باپ کے ساتھ رات گذارنا مبارک ہو -

چلی جاتی ہے

جلیس - (اپنے آپ سے) مبارک کیوں نہیں -

اس کمرے میں جاتا ہے جہاں اس کا باپ مردہ پڑا ہے -

جلیس - خوف کی کیا بات ہے

(لمپ جلاتا ہے)

میں اس گھر کا آقا ہوں -

اس کی نظر مردے کے چہرے پر جا پڑتی ہے اور وہ کانپ جاتا ہے -

یہ خوف کیسا ہے ! ایک مردے سے کیسا خوف ! میں اس گھر کا مالک ہوں

اس کے بدن میں پھریری پیدا ہو جاتی ہے

ذرا باہر جاتا ہوں - لیکن نہیں - (مردے کی طرف دیکھکر) تم مجھے نہیں ڈرا سکتے - تم مجھے میرے گھر سے نہیں نکال سکتے -

ہوا کا ایک جھونکا آتا ہے لمپ بجھ جاتا ہے

جلیس گھبرا کے باہر نکل آتا ہے - مردے کے چہرے پر چاند کی روشنی پڑتی ہے - وہی اس گھر کا مالک ہے -

عابد

ابومُسلم خراسانی کا قتل

خلفائے بنو عباس کا جدِ اعلیٰ خلیفہ ابو جعفر منصور سلاطین اسلام میں ایک نہایت مدبّر، دور اندیش اور بلند پایہ حکمران گزرا ہے۔ اس نے عباسیوں کی نکبت و ادبار سے لے کر ان کے اوج و عروج تک کے سارے منظر اپنی آنکھوں دیکھے تھے۔ وہ ابومسلم خراسانی کی جان نثاریوں اور اس کے شجاعانہ کارناموں سے جو دولت عباسیہ کے قیام میں اس سے ظاہر ہوئے بے خبر نہ تھا۔ اسے اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ ابومسلم کی خدمات جلیلہ نے آل عباس کو کس درجہ ممنون احسان بنا رکھا ہے۔ باوجود ان سب باتوں کے اس نے اپنی سلطنت کے پہلے ہی سال یعنی ۱۳۷ھ میں ابومسلم جیسے جری و جنگ آزمودہ سپہ سالار کو جو بظاہر اس کا دستِ راست اور قوۃ بازو تھا قتل کرا دیا۔ بادی النظر میں خلیفہ منصور کے دامنِ شرف و عدالت پر یہ ایک نہایت بدنما دھبہ ہے۔ اس لئے یہ بتا دینا ضرور ہے کہ اس اقدام قتل کی تہ میں کیا کیا اسباب پوشیدہ تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ خلیفہ منصور کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہ اپنی حکومت کو ابومسلم کے خار وجود سے پاک کر دیتا۔ کیونکہ اگر ایسا نہ کرتا تو اس کی سلطنت کو کبھی استحکام نصیب نہ ہوتا بلکہ اگر ابومسلم اپنے منصوبوں میں کامیاب ہوجاتا تو نہ صرف یہ کہ اسلامی دنیا از سرِ نو مفسدات و بدامنی کا گہوارہ بن جاتی۔ بلکہ دولت عباسیہ کی بیخ کنی بھی کچھ غیر اغلب نہ تھی۔

اسباب قتل اصل میں ابو جعفر منصور اور ابومسلم میں اس زمانہ سے کشیدگی چلی آتی تھی جبکہ خلیفہ سفاح نے منصور کو اپنی اور اپنے بعد ابو جعفر منصور کی بیعت لینے کے لئے خراسان بھیجا تھا اور ابومسلم کو خراسان کی گورنری پر سرفراز فرمایا تھا۔ ان ایام میں ابومسلم نے نہایت تمرد و سرکشی کے ساتھ منصور کی تحقیر و تذلیل کی تھی۔ چنانچہ اسی زمانہ سے ابومسلم کے خلاف منصور کے جذباتِ خشم متلاطم چلے آتے تھے۔ [۳]

منصور کے ایام ولیعہدی میں ابومسلم نے اس کی جو توہین کی وہ تو غالباً منصور کے صفحۂ دل سے کلیتہً محو ہو چکی تھی اور اگر اس کا کوئی اثر باقی تھا تو وہ بھی ابومسلم کے شیوۂ وفاداری سے زائل ہو سکتا تھا۔ لیکن اس نے غضب یہ کیا کہ سفاح کی رحلت کے بعد بھی سرکشی اور شورہ پشتی سے باز نہ آیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ منصور کی آتش غضب اس کے خلاف دن بدن زیادہ بھڑکتی اور تیز ہوتی رہی۔

اسحاق بن مسلم کہتے ہیں کہ خلیفہ سفاح کے انتقال کی خبر سننے کے بعد میں نے مکہ معظمہ سے مراجعت کرتے وقت منصور سے کہا کہ ابومسلم کی موجودگی میں آپ کو حقیقی معنی میں سلطنت و رفعت نصیب نہیں ہو سکتی۔ منصور نے کہا۔ مجھے ابومسلم کے متعلق تمہاری دلی کیفیت معلوم ہوگئی۔ میں نے کہا یہ درست ہے لیکن میرے نزدیک تو آپ اس کی طرف سے سخت خطرے میں مبتلا ہیں۔ منصور نے کہا تم جھوٹ بکتے ہو۔ مجھے اس کی طرف سے کوئی خدشہ نہیں ہے۔ میں یہ سنکر خاموش ہوگیا۔ [۱]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ منصور کے دل پر اب واقعۂ خراسان کا کوئی اثر باقی نہ تھا۔ اور اگر ابومسلم جادۂ اطاعت سے باہر نہ نکلتا تو منصور کے دربار میں اس کے برابر کوئی شخص مقرب و سرفراز نہ ہو سکتا لیکن اس کی تیرہ بختی نے اس کے نظام حواس کو درہم برہم رکھ کر اسے برابر کج روی پر مائل رکھا۔

ہم یہاں چند واقعات پیش کرتے ہیں جن سے ثابت ہوگا کہ ابومسلم ان دنوں جذبات نخوت و پندار کا شکار ہو کر کس حد تک اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا تھا۔

جب منصور نے حج سے فارغ ہو کر مراجعت کی اور اس کے پاس خلیفہ سفاح کے انتقال کی خبر پہنچی تو اس وقت اس کے اور ابومسلم کے مابین ایک منزل کا بُعد تھا۔ منصور نے ابومسلم کو لکھا کہ مجھے خلیفہ سفاح کے حادثۂ وفات کی خبر ملی ہے۔ تم بہت جلد یہاں آکر مجھ سے ملاقات کرو لیکن ابومسلم نے کوئی التفات نہ کیا۔ [۲]

---

۱ الامۃ والسیاسۃ لابن قتیبہ جلد ۲ صفحہ ۱۳۲

۲ الامۃ والسیاسۃ لابن قتیبہ جلد ۲ صفحہ ۱۳۲

۳ ابن خلدون جلد ۳ صفحہ ۱۸۰ مطبوعہ مصر

چونکہ ابومسلم اقتضائے حج کے لئے منصور سے آگے بڑھ آیا تھا۔ پہلے اسی کو سفاح کے انتقال کی خبر ملی تھی۔ لیکن اس نے حماقت یہ کی کہ نہ تو خلیفہ سفاح کی رحلت پر منصور کو جو سفاح کا برادر حقیقی تھا تعزیت نامہ لکھا، نہ ابوجعفر کی طرف مراجعت کی، نہ اس کی آمد کا انتظار کر کے اس سے ملجانے کی کوشش کی اور نہ منصور کی خدمت میں فوراً خلافت پر ہدیہ تہنیت پیش کیا۔ منصور ابومسلم کی اس "شان بے نیازی" پر سخت کبیدہ خاطر ہوا۔ آخر منصور نے ایک عتاب آلود خط ابومسلم کو لکھا۔ تب اس نے تہنیت خلافت کی عرضداشت روانہ کی [1]

ابومسلم نے صرف اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ دارالسلطنت انبار پہنچ کر یہ رنگ لایا کہ منصور کے عم زاد بھائی عیسیٰ بن موسیٰ کو بلا کر اسے ابوجعفر منصور کے مقابلہ میں بیعت خلافت لینے کی ترغیب دی۔ لیکن عیسیٰ بن موسیٰ نے اس غدارانہ پیشکش کو سخت نفرت کے ساتھ ٹھکرا دیا۔ اور ابوجعفر منصور مسند خلافت پر بیٹھ گیا [2]

اس کے بعد جب منصور کے چچا عبداللہ بن علی نے منصور کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تو گو ابومسلم خلیفہ منصور کی خواہش کے بموجب عبداللہ سے لڑنے کے لئے روانہ ہو گیا۔ لیکن اس کا دل خلیفہ کی طرف سے صاف نہ تھا۔ جنگ عبداللہ بن علی کے بعد ایک ایسا قضیہ پیش آیا جس نے اسے منصور کی طرف سے اور زیادہ منحرف کر دیا۔ واقعہ یہ تھا کہ جب ابومسلم نے عبداللہ بن علی پر فتح پائی اور مال غنیمت جمع ہوا تو خلیفہ نے اپنے خادم ابوخصیب کو غنیمت کی فہرست مرتب کرنے کے لئے روانہ کیا۔ جب ابوخصیب نے ابومسلم کے لشکرگاہ میں پہنچ کر غنیمت کا جائزہ لینا چاہا تو ابومسلم غصہ سے بے قابو ہو گیا اور عالم برآشفتگی میں کہنے لگا۔ "منصور نے میرا اعتبار نہیں کیا۔ خیر اچھا کیا" اس وقت ابومسلم کی برہمی مزاج کا درجۂ حرارت اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ ابوخصیب کی جان کے درپے ہو گیا مگر بعد میں کچھ سوچ کے اسے چھوڑ دیا۔ [3]

جب یہ واقعات منصور کے گوش گزار ہوئے اسکی کبیدگی بڑھتے بڑھتے اس حد تک پہنچی کہ اس نے منصوبہ کو ابومسلم کے قتل و قمع پر مائل کر دیا۔ منصور کو اب اس بات کا یقین ہو چلا تھا کہ جب تک ابومسلم موجود ہے وہ حقیقت میں خلیفہ نہیں کہلا سکتا۔ اب وہ سوچنے لگا کہ ابومسلم کے متعلق کسی سے مشورہ کرنے کی ضرورت ہے یا استبداد بالرائے سے کام لینا چاہئے۔ آخر طبیعت نے فیصلہ کیا کہ مشورہ کر لینا ہی بہتر ہے۔ چنانچہ مسلم بن قتیبہ کو بلا کر اس سے صلاح پوچھی۔ ابن قتیبہ نے اس سوال کے جواب میں بے ساختہ یہ آیہ پڑھی:۔

لو کان فیھما آلھۃ الا اللہ لفسدتا } اگر زمین و آسمان میں اللہ کے سوا کوئی اور معبود بھی ہوتا تو یہ تباہ و برباد ہو جاتے۔

منصور یہ جواب سنکر کہنے لگا اے ابن قتیبہ تمہارا خیال بالکل درست ہے [1]

اب منصور سوچنے لگا کہ ابومسلم پر کیونکر دسترس پائے۔ اور یہ کانٹا کیونکر نکلے۔ منصور بساط سیاست کا بڑا زبردست شاطر تھا۔ ایسے ایسے سیاسی جوڑ توڑ جانتا تھا کہ آج کے بڑے بڑے سیاسیین کی تدبیر و سیاست بھی ان کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ منصور نے اس خیال سے کہ مبادا ابومسلم خراسان چلا جائے جھٹ مصر اور شام کی سند گورنری لکھ کر ابومسلم کے پاس بھیجدی لیکن ابومسلم جو منصور کے سیاسی ہتھکنڈوں سے خوب واقف تھا حقیقت حال کو فوراً بھانپ گیا اور جزیرہ سے بعزم خراسان اس کوشش میں چل کھڑا ہوا کہ وہاں کسی علوی جوان کو خلیفہ بنا کر منصور کا رقیب بنا دے۔ [2]

ابومسلم کے نام منصور کا فرمان اور اسکا جواب

منصور نے یہ خبر پاکر دارالخلافہ انبار سے مدائن کی طرف کوچ کر دیا اور ابومسلم کو تاکید لکھا کہ مجھ سے آکر ملاقات کرو۔ کیونکہ بعض ایسے اہم امور کے متعلق تم سے مشورہ کرنا ہے۔ جن کا ضبط تحریر میں لانا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ منصور نے اس طلب کے جواب میں لکھا:۔

"اب امیرالمومنین کا کوئی ایسا دشمن باقی نہیں رہا کہ ممالک محروسہ جس کے خار وجود سے پاک نہ ہو چکی ہو۔ ملوک آل ساسان کی ایک روایت ہم تک پہنچی ہے کہ وزراء کے لئے وہ حالت سخت خطرناک ہوتی ہے۔ جبکہ ملک سے فتنہ و فساد کی آگ فرد ہو جائے۔ پس ہم امیرالمومنین کے قرب اور باریابی سے کنارہ کش ہوتے ہیں۔ ہم اُس وقت تک دور بیٹھے برابر آپ کے وفادار رہیں گے جب تک

---

[1] ابن خلدون جلد ۳ صفحہ ۱۸۲
[2] ابن خلدون جلد ۳ صفحہ ۱۸۲
[3] ابن خلدون جلد ۳ صفحہ ۱۸۳

[1] وفیات الاعیان لابن خلکان جلد اول صفحہ ۲۸۲
[2] ابن خلدون جلد ۳ ۱۸۳ و تاریخ الخمیس جلد ۲ صفحہ ۳۶۳

آپ ہماری جان کے خواہاں نہ ہونگے لیکن اگر آپ کو ہماری حفاظت وصیانت منظور نہ ہوگی تو ہم بھی اس عہد کو توڑ دینگے"۔

منصور نے اس کے جواب میں یہ فرمان روانہ کیا:۔

"میں تمہاری عرضداشت کا مفہوم سمجھ گیا۔ تم اُن غداروں میں نہیں ہو جو کثرت جرائم کی وجہ سے سلطنت میں اضطراب و فساد کی خواہش کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ اپنی عافیت اسی میں دیکھتے ہیں کہ نظام جماعت اور شیرازۂ حکومت منتشر رہے مگر حیرت ہے کہ تم نے اپنے آپ کو ایسے لوگوں میں کیوں شمار کر لیا؟ تم تو تادم تحریر ہماری اطاعت میں بڑے راسخ القدم ہو۔ ہمارے ساتھ خلوص وعقیدت رکھتے ہو۔ اور اسی ثبات واستقلال سے اس بارِ فرائض کو اٹھائے ہوئے ہو جس کو پہلے اٹھائے ہوئے تھے۔ امیرالمومنین محض تمہاری تسکین خاطر کے لئے یہ مکتوب عیسٰی بن موسٰی کے ہاتھ روانہ کرتے ہیں۔ مگر شرط یہ ہے کہ گوش ہوش سے سنو۔ اور میں حق تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ ہر قسم کے وساوس شیطانی تمہارے دل سے نکل جائیں۔ اس بدبخت نے تمہاری نیت میں فساد ڈالنے کا اس سے بہتر موقع کوئی نہیں پایا ۱؎

ابومسلم نے اس فرمان کے جواب میں خلع خلافت کی دھمکی دی اور لکھا کہ آج تک جو میں نے خلافت عباسیہ کی دعوت وشیوع کا گناہ کیا۔ اب اس سے تائب ہوتا ہوں۔ ۲؎

شاہی قاصد کی روانگی اور اسکی کامیاب جد وجہد۔

ابومسلم نے یہ مکتوب روانہ کر کے حلوان کا راستہ لیا۔ جب یہ مکتوب منصور کے پاس پہنچا تو اس نے اپنے عم زاد بھائی عیسٰی بن موسٰی اور سرداران بنو ہاشم کو طلب کر کے ابومسلم کا خط دکھایا اور ان سے درخواست کی کہ آپ لوگ متفق ہو کر ابومسلم کو متنبہ کر دیں کہ بغاوت کا انجام اچھا نہیں ہے۔ اور لکھیں کہ تم جن خدمات کو انجام دے رہے ہو، انہی کی تکمیل کرو۔ لیکن امیرالمومنین کے دائرۂ اطاعت سے باہر نہ نکلو"

۱؎ ابن اثیر جلد ۵ صفحہ ۲۳۲

۲؎ ابن خلدون جلد ۳ صفحہ ۱۸۳

اس خط کو منصور کا آزاد غلام ابوحمید مروزی لے کر روانہ ہوا۱؎۔ خلیفہ نے بوقت روانگی ابوحمید کو یہ سمجھا دیا تھا کہ شروع میں تو ابومسلم سے نہایت نرمی اور ملاطفت سے گفتگو کرنا اور افہام وتفہیم کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھنا۔ لیکن اگر وہ کسی تدبیر سے راہ راست پر نہ آئے تو اس کے بعد کہہ دینا کہ امیرالمومنین نے قسم کھا کے فرمایا ہے کہ میں بنفس نفیس تم پر فوج کشی کرونگا۔ اگر تم دریا میں غوطہ لگاؤ گے تو میں بھی تمہاری جستجو میں غوطہ لگاؤنگا۔ اور اگر تم آگ کے شعلوں میں کود پڑو گے تو میں بھی کود پڑونگا۔ یہاں تک کہ تمہیں قتل کر ڈالوں یا خود جان بحق تسلیم کر دوں"۔

ابوحمید نے منصور کی ہدایت کے مطابق ابومسلم کو وہ خط دیا۔ جب وہ خط پڑھ چکا تو نہایت لجاجت سے گفتگو شروع کی اور ابومسلم کو خلیفہ کی اطاعت وفرمان برداری پر مائل کرنے میں اپنی ساری قوت گویائی صرف کر دی۔ ابومسلم نے مالک بن ہیثم سے مخاطب ہو کر کہا کہ تم سنتے ہو ابوحمید کیا کہتا ہے؟ مالک کہنے لگا آپ ایسی چکنی چپڑی باتوں میں نہ آئیے مجھے یقین ہے کہ اگر آپ خلیفہ کے پاس جائیں گے تو وہ آپ کو فوراً نہنگ شمشیر کے حوالے کر دیگا۔ ابومسلم یہ سن کے سہم گیا۔ اس کے بعد عامل رَے سے جو وہاں موجود تھا مشورہ طلب کیا۔ اس نے بھی خلیفہ کے پاس جانے سے منع کیا۔ ابومسلم نے ابوحمید سے کہہ دیا کہ میں دربار خلافت میں نہیں جا سکتا۔ جب ابومسلم نے قطعی انکار کر دیا تو ابوحمید نے خلیفہ کا زبانی پیغام پہنچانا شروع کیا۔ یہ پیام سن کر ابومسلم کا چہرہ خوف اور غصہ سے متغیر ہونے لگا۔ ۲؎

اس سے پیشتر خلیفہ منصور نے ابوداؤد کو جو ابومسلم کی طرف سے خراسان کا گورنر مامور تھا۔ ابومسلم سے قطع تعلق کر کے براہ راست دربار خلافت سے تعلقات استوار کرنے کو لکھا تھا۔ اور اس کے صلہ میں اپنی طرف سے خراسان کی سند امارت دینے کا وعدہ کیا تھا۔ ابوداؤد نے اسکو درپردہ منظور کر لیا تھا۔ اور انہی ایام میں ابوداؤد نے بھی ابومسلم کو خلیفہ کی مخالفت وبغاوت سے احتراز کرنے کے متعلق ایک مکتوب روانہ کیا تھا۔ اتفاق سے یہ مکتوب ابومسلم کے پاس اُس وقت پہنچا جب کہ ابوحمید خلیفہ کا زبانی پیام دے رہا تھا۔ ابومسلم کے دل میں اس خط کے

۱؎ ابن قتیبہ (جلد ۲ صفحہ ۱۳۳) اور مسعودی تذکرہ ابوجعفر منصور نے قاصد کا نام جریر بن یزید بجلی لکھا ہے۔

۲؎ ابن خلدون جلد ۳ صفحہ ۱۸۳

مطالعہ سے اور بھی زیادہ ہول سما گیا۔ ابوحمید سے کہنے لگا "گو میں نے خراسان جانے کا عزم صمیم کر لیا تھا لیکن اب یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اپنے معتمد ابواسحاق کو امیرالمومنین کی خدمت میں استصواب اور طلب رائے کی غرض سے بھیج دوں۔"

جب ابواسحاق مدائن پہنچا تو سرداران بنوہاشم اور دوسرے اعیانِ دولت اس کے استقبال کو آئے اور خلیفہ نے اسے کمال عزت و احترام کے ساتھ باریاب فرمایا۔ منصور نے دوران گفتگو میں ابواسحاق سے کہا کہ اگر تم ابومسلم کو خراسان جانے سے باز رکھ کر کسی طرح میرے پاس لے آؤ۔ تو میں ولایت خراسان کا ایک حصہ تمہارے زیر حکومت کر دونگا۔ ابواسحاق کے دل میں خراسان کی متوقع حکمرانی نے طرح طرح کی امنگیں پیدا کر دیں۔ چنانچہ وعدہ کر لیا کہ جس طرح بن پڑیگا ابومسلم کو بارگاہ خلافت میں پہنچاؤنگا۔ ابواسحاق یہاں سے رخصت ہو کر ابومسلم کے پاس آیا اور طرح طرح کے سبز باغ دکھا کر اسے منصور کے پاس چلنے پر راضی کر لیا۔ چنانچہ ابومسلم نے اپنے لشکر کو مالک بن ہیثم کے ماتحت چھوڑ کر تین ہزار فوج کے ساتھ مدائن کا رُخ کیا۔

ابومسلم آستانۂ خلافت میں

جب ابوایوب وزیرالسلطنۃ نے ابومسلم کو اس آن بان کے ساتھ آتے دیکھا تو اسے یہ خوف دامنگیر ہوا کہ مبادا ابومسلم کی فوج سے کوئی ایسا فعل سرزد ہو جس سے خلیفۃ المسلمین کی زندگی معرضِ خطر میں پڑ جائے اس خطرہ سے نجات حاصل کرنے کی یہ تدبیر نکالی کہ ابومسلم کے ایک ہمقوم کو بلا کر یہ حکم دیا کہ تم ابومسلم سے جا ملو اور اس کی وساطت سے امیرالمومنین کے حضور میں باریاب ہو۔ اور ابومسلم سے اپنے لئے ولائیت کسکر کی سفارش کراؤ۔ وہاں سے تمہیں اتنی دولت ملے گی کہ مالا مال ہو جاؤگے۔ مگر شرط یہ ہے کہ اس نفع میں میرے بھائی کو بھی شریک کرنا۔ اور خبردار اس کام میں تاخیر نہ کرو۔ کیونکہ امیرالمؤمنین ابومسلم کے آتے ہی اس کا انتظام کرنے والے ہیں۔

وہ شخص فریب میں آگیا۔ ابوایوب نے فوراً خلیفہ سے مل کر اس شخص کے لئے ابومسلم سے ملاقات کرنے کی اجازت حاصل کر لی۔ یہ شخص سرِراہ ابومسلم سے ملاقی ہوا۔ اور اس کو اس امر سے مطلع کر کے خلیفہ سے سفارش کرنے کی درخواست کی۔ اس خبر کو سن کر ابومسلم کا ساغر دل خوشی سے چھلک گیا۔ اور رنج و کلفت اور اضطراب کا کوئی شائبہ باقی نہ رہا۔

جب ابومسلم کے شہر کے قریب پہنچنے کی خبر مشہور ہوئی تو حسب احکامِ خلافت سردارانِ بنوہاشم اور عمائدِ سلطنت ابومسلم کے خیر مقدم کو آئے ابومسلم نے بارگاہ خلافت میں حاضر ہو کر خلیفہ کی دست بوسی کی اور استراحت کی اجازت حاصل کر کے واپس چلا آیا۔

قتل و استہلاک کی حیلہ جوئیاں۔

جب ۲۵ شعبان ۱۳۷ھ کی صبح نمودار ہوئی تو منصور نے اپنے حاجب عثمان بن نہیک کو اور چار دوسرے دربانوں کو بلوایا اور ان کو پس پردہ بٹھلا کر یہ ہدایت کر دی کہ جس وقت میں تالی بجاؤں تو ابومسلم کو فوراً قتل کر دینا۔ اس انتظام کے بعد ابومسلم بلایا گیا۔ باتوں ہی باتوں میں منصور نے اُن دو تلواروں کا تذکرہ چھیڑ دیا جو ابومسلم کو خلیفہ کے باغی چچا عبداللہ بن علی سے ملی تھیں۔ اتفاق سے ابومسلم نے اس وقت ان میں سے ایک تلوار اپنی کمر سے باندھ رکھی تھی۔ ابومسلم نے تلوار پر ہاتھ رکھکر کہا کہ یہ تلوار انہی دو میں سے ایک ہے۔ منصور نے کہا لاؤ ذرا میں بھی دیکھوں۔ ابومسلم نے تلوار کھول کر منصور کے حوالے کی۔ منصور اسے تھوڑی دیر تک دیکھتا رہا۔ اس کے بعد اسے اپنے پیچھے فرش پر رکھ دیا اور باتوں ہی باتوں میں عتاب آمیز اور درشت لہجہ اختیار کر لیا اور کہنے لگا کیوں ابومسلم تم نے خلیفہ سفاح کو نزولی زمینوں کے نہ لینے کو لکھا تھا؟

ابومسلم۔ ہاں مجھے یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ یہ امر اُن کے لئے جائز نہ ہوگا۔ لیکن اس کے بعد میں نے اس خیال کو پیش نظر رکھتے ہوئے انہی کے فرمان کے بموجب عمل کیا کہ آپ حضرات کا دودمانِ نبوت، معدنِ علم و عمل ہے۔

منصور۔ اچھا تم اس کی وجہ بتاؤ۔ کہ تم سفر حج میں میرے آگے آگے کیوں رہتے تھے؟

ابومسلم۔ مجھے یہ بات کچھ پسندیدہ نہ معلوم ہوئی کہ ہم اور آپ ایک چشمہ پر جمع ہوں۔

منصور۔ کیا تم یہ بتلا سکتے ہو کہ جب تم کو سفاح کے انتقال کی خبر ملی تھی تو تمہیں کونسی چیز میری طرف مراجعت کرنے یا قیام کر دینے سے مانع تھی؟ اگر کم از کم تم ٹھہر جاتے تو میں ہی تمہارے پاس پہنچ جاتا؟

ابومسلم۔ میں نے لوگوں کو نفع پہنچانے اور آپ سے پیشتر کوفہ پہنچ جانے کے خیال سے مراجعت یا قیام نہ کیا۔

منصور۔ اچھا تم نے میرے حکم کی تعمیل کیوں نہ کی اور تم خراسان کیوں جا رہے تھے؟

ابومسلم۔ میں اس ارادہ سے عازم خراسان ہوا تھا کہ وہاں سے عذر خواہی

کرکے آپ سے صفائی کر لونگا۔

منصور۔ اچھا وہ زر و مال کہاں ہے جو تم نے حرّان میں جمع کیا تھا؟

ابومسلم۔ مَیں نے وہ مال فوج میں تقسیم کر دیا۔

منصور۔ کیا تو مراسلات میں اپنا نام میرے نام سے پہلے نہیں لکھا کرتا؟ کیا تو نے میری پھوپھی آسیہ بنت علی سے نسبت نہیں ٹھہرائی؟ کیا تو اس بات کا مدعی نہیں ہے کہ تو سلیط بن عبداللہ بن عباسؓ کا پوتا ہے؟ اللہ اللہ تو نے اپنی بساط سے بڑھکر قدم مارا۔ رُوسیاہ تو نے نہایت سنگلاخ راستہ اختیار کیا۔

ابومسلم ھنوز کچھ جواب نہ دینے پایا تھا کہ منصور نے پھر غیظ و غضب کے لہجہ میں کہنا شروع کیا "کیوں بے خود سر تو نے سلیمان بن کثیر کو ناحق کیوں قتل کیا؟ کیا وہ ہمارا ہوا خواہ نہ تھا؟ کیا وہ اُس زمانہ سے ہمارا نقیب نہ تھا۔ جب کہ تو ابھی ہمارا شریک کار بھی نہ ہوا تھا؟

ابومسلم۔ چونکہ اس نے میری مخالفت کی۔ مَیں نے اسے ہلاک کر دیا۔ یہ سن کر منصور کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا لیکن کچھ کہنے نہ پایا تھا کہ ابومسلم جرأت کرکے بول اٹھا۔

ابومسلم۔ جناب والا! یہ میری ان خدمات کا صلہ ہے جو میں نے اس وقت تک انجام دیں۔

منصور۔ (ڈانٹ کر) اے شیطان کے بچے اگر تیری جگہ پر کوئی اور ہوتا تو میں اس کو کارگزاریوں کا صلہ دیتا۔ لیکن یہ تو بتا تو نے کیا کیا؟ کیا ہماری بدولت تو نے گلچھرے نہیں اڑائے؟ کیا تو ہمارے صدقہ سے ترقی پاکر آسمان عزت پر نہیں چمکا؟

ابومسلم نے اس کا کچھ جواب نہ دیا اور سر نیچا کرکے منصور کے ہاتھ کو بوسہ دینے اور معذرت کرنے لگا۔ مگر منصور کی آتش غضب بھڑکتی چلی گئی۔ یہ دیکھ کر ابومسلم بھی آپے سے باہر ہو گیا اور عالم برافروختگی میں کہنے لگا "جایئے مجھے آپ کی پروا نہیں۔ مَیں اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا۔

ابومسلم پر قاتلانہ حملہ

اس پر منصور نے اس کو گالی دی اور ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ پر مارا۔ تالی کا بجنا تھا کہ محافظ پردہ سے نکل آئے۔ عثمان بن نہیک نے لپک کر ابومسلم پر ایک وار کیا۔ ابومسلم نے گھبرا کر کہا امیر المومنین مجھے میرے دشمن کے لئے زندہ رہنے دیجئے۔ منصور نے کہا اگر میں تم ایسے خوفناک دشمن کو باقی رہنے دوں تو خدا مجھے ہلاک کرے۔" اس فقرہ کے تمام ہوتے ہی دربانوں نے تلواریں بے نیام کر لیں اور ابومسلم پر جھپٹ پڑے۔ یہ دیکھ کر ابومسلم کے کلیجہ سے ایک آہ نکلی۔ حملہ آوروں نے اسے آناً فاناً خواب مرگ میں سلا دیا۔ ؎[5]

ارباب نظر کے لئے یہ واقعات عبرت و بصیرت کی درسگاہیں ہیں۔ جو کوئی اپنی بساط سے بڑھ کر قدم مارتا ہے اور اپنی قدر و حیثیت کو نہیں پہچانتا اس کا یہی انجام ہوتا ہے۔ انقلاب زمانہ کا تماشہ دیکھو اور نیرنگیٔ فلک کی کرشمہ سازیوں پر غور کرو۔ کہ وہی ابومسلم جس کے نام کی ہیبت سے بڑے بڑے گردن فراز سپاہ سالار لرز جاتے تھے کس بیکسی کے عالم میں بیجان پڑا ہوا ہے۔

ابومسلم کے مارے جانے کے بعد وزیر السلطنۃ باہر آیا اور یہ کہہ کر ابومسلم کے آدمیوں کو واپس کر دیا کہ امیر صاحب (ابومسلم) ابھی خلیفۃ المسلمین کی خدمت میں رہیں گے۔ تم لوگ واپس جاؤ۔ ابومسلم کے ساتھی اور لشکری یہ سن کر قصر شاہی سے واپس آئے۔ اس کے بعد ان کو خلیفہ کے حکم سے انعام و اکرام دیئے گئے جن میں سے ابواسحاق کو ایک لاکھ درھم انعام ملا۔

اس کے بعد منصور نے جعفر بن حنظلہ کو طلب فرما کر اس سے قتل ابومسلم کے متعلق مشورہ طلب کیا۔ جعفر نے اس کے قتل کی رائے دی۔ منصور نے کہا۔ جزاک اللہ۔ دیکھو یہ اس کافر نعمت کا لاشہ پڑا ہے۔ جعفر کی نظر جونہی منصور کی داہنی جانب پڑی ابومسلم کی لاش دیکھ کر جوش مسرت سے کہنے لگا امیر المومنین! آج سے آپ کی خلافت کو استحکام نصیب ہوا۔"

تھوڑی دیر میں ابومسلم کے ماتحتوں میں سے ابواسحاق کو طلب کیا گیا۔ ابواسحاق کے دل پر ابومسلم کا اتنا رعب چھایا ہوا تھا کہ ابومسلم کے متعلق اس کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ منصور نے تشفی دیکر کہا جو تمہارے جی میں ہو بے خوف و ہراس بیان کرو۔ اس کے بعد ابومسلم کی لاش کی طرف اشارہ کرکے کہا دیکھو خدائے عزیز و برتر نے اسے ہلاک کر دیا۔"

ابواسحاق یہ دیکھ کر سجدۂ شکر بجا لایا اور سر اٹھا کے عرض پرداز ہوا اس منعم حقیقی کا لاکھ لاکھ شکر ہے جس نے آج امیر المومنین کی بدولت مجھے امن و اطمینان بخشا۔ اس کے بعد کہنے لگا امیر المومنین بخدا میری یہ حالت تھی کہ جب کبھی ابومسلم کے پاس جاتا تھا تو کفن پہن کے اور

؎[5] ابن خلدون جلد ۳ صفحات ۱۸۲ تا ۱۸۴

خوشبو لگاکے جاتا تھا" یہ کہہ کر اس نے جھٹ اپنا جبّہ اتارا اور منصور نے دیکھا کہ اس کے نیچے وہ درحقیقت کفن پہنے اور خوشبو لگائے تھا۔ ابواسحاق کی اس مظلومی و بے بسی کو دیکھ کر خلیفہ کا دل بھر آیا اور کہنے لگا شکر کرو کہ تم کو عافیت ملی۔

حادثۂ قتل کے بعد منصور نے ابومسلم کی طرف سے ابونصر مالک بن ہیثم کے نام اس مضمون کا خط لکھوایا کہ جسقدر مال واملاک تمہارے پاس چھوڑ آیا ہوں وہ میرے پاس روانہ کردو۔ اور اس کے بعد خود بھی چلے آؤ"۔ ابومسلم نے ابونصر کو بوقت روانگی یہ تلقین کردی تھی کہ اگر میری طرف سے تمہارے پاس کوئی ایسا خط آئے جس پر پوری مہر لگی ہو تو سمجھ لینا کہ میں اس خط کا فرستندہ نہیں ہوں۔ چونکہ منصور کے فرستادہ خط پر پوری مہر ثبت تھی ابونصر بھانپ گیا کہ یہ خط منصور کا لکھوایا ہوا ہے اور بقصد خراسان ہمدان کی طرف روانہ ہوگیا۔

منصور نے یہ خبر پاکر شہرزور کی سند حکومت لکھ کر اس کے پاس بھجوادی اور اسی کے ساتھ زہیر بن ترکی عامل ہمدان کے پاس اسکی گرفتاری کا فرمان بھی بھیجدیا۔ جوں ہی ابونصر ہمدان پہنچا زہیر نے اسکو ضیافت کا حیلہ کرکے بلا بھیجا اور گرفتار کرلیا۔ لیکن جب اس کے بعد خلیفہ کی جانب سے شہرزور کی سند حکومت ابونصر کے نام پہنچی تو زہیر نے اسے رہا کردیا۔ اس کے دوسرے روز منصور کا فرمان پہنچا کہ ابونصر قتل کیا جائے۔ زہیر نے اس فرمان کے جواب میں لکھا کہ میں نے پہلے اسے گرفتار کیا تھا لیکن جب اس کے نام شہرزور کی حکومت کا فرمان آیا تو اسے رہا کردیا" سچ ہے جس کی خدا حفاظت کرے اس کا کوئی بال تک بیکا نہیں کرسکتا۔

ابونصر اپنی مخلصی کے بعد بارگاہ خلافت میں پہنچا خلیفہ نے اسکو اس بات پر ملامت کی کہ تم نے ابومسلم کو خراسان جانے کا کیوں مشورہ دیا تھا۔ ابونصر عرض پیرا ہوا امیرالمومنین واقعی ابومسلم نے مجھ سے صلاح لی اور میں نے اسکو نیک مشورہ دیا۔ اگر امیرالمومنین بھی مجھ سے کبھی امر میں مشورہ کریں گے تو میں اپنی صوابدید کے موافق نیک مشورہ سے کبھی دریغ نہ کرونگا۔ میری اس میں بھلا کیا خطا ہے؟ یہ سنکر منصور نے اسے عواطف خسروی سے مخصوص فرمایا اور اس کے خلوص نیت پر اتنا خوش ہوا کہ اس کو موصل کا گورنر بنا کے بھیج دیا[1]۔

جب ابومسلم مارا گیا تو ابوجعفر منصور کا دیدۂ دل حصول اطمینان سے روشن ہوا۔ ابومسلم کی طرف سے جو جو خطرات ہر وقت دل کو بے چین کررہے تھے رفع ہوگئے۔ حادثۂ قتل کے بعد منصور نے جامع مسجد کے ممبر پر چڑھ کر ایک فصیح وبلیغ خطبہ دیا جس میں کہا:-

اے لوگو تم اُنس اطاعت کی جگہ وحشتِ عصیان کی راہ اختیار نہ کرو۔ صراط مستقیم پر گامزن ہونے کے بعد باطل کی تاریکیوں میں نہ بھٹکو۔ اس میں شبہ نہیں کہ ابومسلم کا آغاز خیر وخوبی کے ساتھ ہوا تھا۔ لیکن انجام بدکوشی پر ہوا۔ اس کی بدباطنی اس کے حسن ظاہر پر غالب آگئی اور آخرکار ہم کو اس کے خبث باطن اور فرد نیت کا اس درجہ یقین ہو کہ اگر اس کے صحیح حالات کسی ناصح مخلص کو معلوم ہوجاتے تو وہ ہمیں اُس کے اتنے دنوں آزاد چھوڑ رکھنے پر ملامت کرتا۔ ابومسلم برابر بیعت کو توڑتا اور ہمارے ذمّہ کی تحقیر کرتا رہا۔ حتیٰ کہ ہمارے لئے اس کا خون مباح ہوگیا۔ اور اس کی سابقہ خدمات اجرائے حق کی راہ میں کسی طرح حایل نہ ہوسکیں"[2]

خاکسار

ابوالقاسم رفیق دلاوری

---

[1] ابن خلدون جلد ۳ صفحہ ۱۸۴ [2] ابن اثیر جلد ۵ صفحہ ۲۲۴

مرزا جمّن

مرزا جی پرانی وضع قطع کے آدمی تھے۔ آپ کی جو بات تھی لاجواب تھی۔ نماز اور روزہ کے تو سرے سے پابند نہ تھے۔ ہاں پیر پرستی ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ جمعہ کے روز علی الصبح خط بنواتے۔ پھر داڑھی۔ مونچھوں اور سر کے بالوں میں مہندی وغیرہ لگا کر گل حکمت ہو کر بیٹھ جاتے۔ غسل کے بعد پوشاک بدلتے اور بڑے شوق سے عطر لگاتے۔ لوگ تو مسجد کو جاتے اور آپ گھر کے صحن میں بیٹھکر چوسر کھیلتے۔ لیکن زبان سے یا صمد کا ورد کرتے رہتے۔

گھر سے جو کہیں جانا ہوتا تو بار بار "لو بھئی ہم تو جاتے ہیں۔ اب اللہ کے حوالے۔"

"ابے او جمّو بیٹا! شوخی مت کیجیو۔ اچھا اللہ کو سونپا تمہیں" اور پھر گھر والی سے "بچوں کا خیال رکھئیو تم"۔ کہتے ہوئے اور بار بار پلٹ کر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے تشریف لیجاتے۔

جمّن کوئی دس بارہ برس کا ایک لڑکا تھا۔ یہ ہر وقت مرزا صاحب کے اردل میں رہتا اور سائے کی طرح ساتھ ساتھ لگا پھرتا۔ بازار جاتے تو دس پانچ قدم چل کر پکارتے۔

"ابے او جمّن!"

اور لڑکا جواب دیتا

"یہ رہا مرزا جی۔"

یار لوگوں نے آپ کا نام بھی مرزا جمّن ڈال رکھا تھا۔

جب گھر سے نکلتے تو مرزا صاحب کی چھڑی بھی جمّن کے ہاتھ میں ہوتی اور حقہ بھی۔ ایک پنکھا بھی اور ایک پاندان بھی۔ خواہ گلی کے موڑ تک ہی جانا ہو۔ جمّن جلو کی یہ ضروری چیزیں بغل میں دبائے ساتھ ساتھ ہوتا۔ اب دیکھنے والے حیران ہیں کہ یہ کیا تماشہ ہے۔ ایک روز مرزا صاحب اس شان سے چوک میں کھڑے چند دوستوں سے باتیں کر رہے تھے۔ کچھ جنگ پر باتیں ہو رہی تھیں۔ مرزا صاحب فرما رہے تھے۔

"اجی! جرمن کی قوت کا بھی کیا ٹھکانا۔ ایسے ایسے جنگی آلات بنائے ہیں کہ فلک پر فرشتے بھی کان پکڑیں۔ یہ تو آپ نے سنا ہی ہوگا کہ ایسے گولے تیار کئے گئے ہیں جو دشمن کی بُو پا کر ان کے سر پر جا پھٹتے ہیں۔ اور یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ ناشن (خوراک) کی ایسی گولیاں تیار ہوئی ہیں۔ کہ ایک گولی کھا لینے سے سپاہی کو آٹھ روز تک بھوک اور پیاس نہیں لگتی۔"

ایک طرف سے آواز آئی۔

"واہ مرزا جمّن!"

آپ ادھر ادھر گھور گھور کر دیکھنے لگے۔

"بکنے دیجئے" ایک بولا۔ "اور ہاں مرزا صاحب ہم نے تو سنا ہے کہ جرمن والا ہندوستان پر بھی حملہ کرنے والا ہے۔"

مرزا جی بڑی سنجیدگی سے بولے۔

"اور اس میں شک ہی کیا ہے۔ اجی جرمن والا تو اس ملک کی چپہ چپہ زمین ماپ گیا ہے۔ اور خاص خاص مقامات پر گولے مارنے کے لئے نشانات بھی لگائے گئے ہیں۔"

"یہ آپ کیا فرما رہے ہیں۔ یہ گولے کہاں سے پڑینگے" ایک نے پوچھا۔ مرزا جی ہنسکر بولے۔

"اتنی بات بھی نہیں سمجھتے آپ۔ اجی حضرت! جرمن والوں نے اس قسم کی توپیں بنا رکھی ہیں۔ جن سے اپنے ملک سے بیٹھے یہاں گولے ماریں گے۔"

ایک آواز۔

"اجی کیا کہنے آپ کے مرزا جی۔ حد کر دی مرزا جمّن آپ نے۔"

مرزا صاحب پھر آستین چڑھا کر ادھر ادھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے۔

"اجی جانے بھی دیجئے آپ" ایک نے کہا۔ "ہاں مرزا جی یہ تو فرمائیے یہ آپ جب گھر سے نکلتے ہیں تو کام کو جاتے ہیں یا حج کرنے؟"

مرزا جی بولے۔

"کیوں بھئی یہ اعتراض کیا لے بیٹھے تم۔ کونسی بات ہم نے دنیا جہاں سے انوکھی کی۔"

"اب کہتے کیوں نہیں۔ کچھ بولو گے بھی؟"

"آپ خفا نہ ہوں تو کچھ عرض بھی کریں۔"

"کافر ہو جو خفا ہو" مرزا صاحب بولے۔ "لیکن اس قسم کی خرافات بکنے کا کچھ مطلب بھی۔ اجی تمہارے بڑوں کو بات کرنے کا سلیقہ نہ آیا۔ تمہیں کہاں سے آنا تھا۔ الم غلم جو منہ میں آیا بک دیا۔ انسان ہو حیوان تو ہو نہیں۔ اب کچھ کہو تو ہم سنیں بھی۔ کچھ پوچھو تو ہم تبلائیں بھی۔ اب بولتے کیوں نہیں؟"

"یہ چھڑی چھاتا۔ پنکھا اور گلاس اور پاندان کیوں ساتھ ساتھ اٹھائے پھرتے ہیں آپ؟"

"ہوں" مرزا جی بولے۔ "بس اتنی عقل پر آدمی بنے پھرتے تھے تم۔ انسان بات بھی کرے تو شعور سے تو کرے۔ لو اب سنو اب ہم سے۔ راستہ چلتے چلتے اگر کہیں سانپ وانپ نکل آئے تو پھر کیا لاٹھی ڈھونڈتے پھرینگے ہم۔ اور اگر بارش آجائے یا سخت دھوپ ہو تو کیا چھاتا کام نہ دیگا۔ گرمی سے پسینہ بہنے لگے تو کیا پنکھے کی ضرورت نہ ہوگی۔ اور پیاس لگے گی تو کیا اچھوتوں کی طرح چلّو سے پانی پئیںگے۔ اور پھر اگر گلوری کی ضرورت ہو تو کیا شہدوں کی طرح تنبولی کی دوکان پر جا کھڑے ہوں باپ دادا کی ناک کٹوائیں۔ کیوں اب تو سمجھ گئے تم۔ لیکن تم کیا سمجھوگے۔ یہ باتیں تو بہت ٹھوکریں کھانے سے حاصل ہوتی ہیں۔"

"سچ تو کہتے ہیں" ایک بولا۔ "گدھا ٹھوکر کھائے بغیر کب ٹھیک کام کرتا ہے۔ ایسے ہی تو مرزا جی نے بھی سیکھی ہیں۔"

"کیوں جی!" مرزا جی غصہ سے آستین چڑھا کر بولے۔ "تو گویا ہم گدھے ہوئے نا؟" اور پھر۔ "ابے او جمن!"

"سچ تو کہتے ہیں" جمّن اکڑ کر بولا۔ یار لوگوں نے ایک قہقہہ لگایا۔

"چپ بندر کہیں کا۔ سمجھ لیں گے تجھ سے گھر چل کر۔" اور پھر دوستوں کی طرف دیکھکر

"تو ہاں پھر تو ہم گدھے ٹھہرے نا۔"

ایک۔ "اپنی اپنی سمجھ ہے مرزا جی۔ جو آپ سمجھیں وہی درست۔ اب ہم جو اسکے خلاف کہیں تو گستاخ نہیں۔ بے ادب کہلائیں۔"

"لو جی! یہ ہے چودہویں صدی" مرزا جی بولے۔ "ابے او جمن!"

"یہ رہا مرزا جی۔ کیا دوں؟ چھڑی یا چھاتا؟"

"چپ رہ نامعقول۔ اب چل گھر۔ پیر جی سے پوچھیں گے۔ ایسے دوستوں سے ملنا جلنا حرام ہے یا حلال؟"

ایم اسلم

آمدِ بہار

نزہتِ فصلِ بہاری عیش کی بنیاد ہے ۔۔۔ محفلِ گلشن سزاوارِ مبارکباد ہے

کونسا دل ہے جو اب مجبور ہے ناشاد ہے ۔۔۔ بلبلِ فریاد کش بیگانۂ فریاد ہے

داستانِ قیس ہے، افسانۂ فرہاد ہے ۔۔۔ پتّے پتّے کی زباں پر عشق کی روداد ہے

پنجۂ شاہینِ وحشت سے چمن آزاد ہے ۔۔۔ تھا جو ویرانہ کبھی اب عندلیب آباد ہے

میرے دل کی اُجڑی دنیا میں بھی آجائے بہار
میرے باغِ آرزو کو جگمگا جائے بہار

(غیر مطبوعہ)

اختر انصاری
(دہلوی)

"چوری"

سائنس دان نے ایک چھوٹی سی شیشی کو خوردبین کے نیچے رکھتے ہوئے کہا :-

"اس شیشی میں ہیضہ کے جراثیم بند ہیں"۔

زرد رو آدمی نے خوردبین میں سے دیکھا اور بولا "مجھے تو کچھ نظر نہیں آتا"۔

سائنس دان نے کہا۔ "اس پیچ کو گھمائیے شاید آپ کو صاف طور پر نظر آ جائے"۔

ٹھیک ہے ٹھیک گلابی رنگ کے ہلکے ہلکے نشان ہیں کیا قیامت ہے کہ یہ ذرے بڑھکر ایک شہر کو تباہ کر سکتے ہیں"۔

پھر اُس نے شیشی کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا "یہ زندہ ہیں؟"

سائنس دان نے جواب دیا۔ "نہیں"۔

زرد رو آدمی نے مسکراتے ہوئے کہا "آپ کے پاس زندہ اور مہلک جراثیم تو نہ ہونگے"۔

"زندہ جراثیم بھی ہمارے پاس موجود ہیں مثال کے طور پر یہ شیشی"۔

سائنس دان نے الماری میں سے ایک شیشی نکالی اور کہا "یہ شیشی ہیضہ کے زندہ جراثیم سے پُر ہے"۔

زرد رو ملاقاتی کے چہرہ پر اطمینان کے آثار پیدا ہوئے۔ اُس نے شیشی کی طرف حریصانہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا "کسقدر خطرناک شے ہے"۔

سائنس دان اپنے ملاقاتی کے چہرہ کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے سیاہ بال گہری سیاہ آنکھیں بُتا ہوا چہرہ کئی اعتبارات سے جاذب توجہ تھا۔ یہ شخص سائنس دان کی ہر بات میں دلچسپی لیتا تھا۔ سائنسدان نے غور سے تنکر کہا "اس شیشی میں ہیضہ قید ہے۔ ایک بار اس شیشی کو پانی کے کسی حوض میں توڑ ڈالئے اور پھر موت کے کرشمے دیکھئے۔ پُر اسرار غیر متوقع خوفناک دردخیز موت شہر میں موت کا فرشتہ اپنے پروں کو پھڑپھڑاتا پھریگا۔ خاوند بیوی سے جدا ہو جائیگا۔ ماں بچے سے چھوٹ جائیگی۔ موت پانی کے ذریعہ سفر کرتی ہوئی گلیوں میں داخل ہو جائیگی کنوؤں کو مہلک کر دیگی۔ برتنوں میں چھپکر بیٹھ جائیگی۔ برف کے اجزا میں مل جائیگی۔ زمین میں غرق ہو کر ہزاروں جگہ اپنا خوفناک سر نکالیگی ایک بار اس شیشی کو شہر کے پینے والے پانی میں ملا دو پھر تماشا دیکھو۔"

زرد رو آدمی کا چہرہ مسرت سے تمتما رہا تھا اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

"میں کہتا ہوں کہ انارکسٹ جو نظام حکومت کو برباد کرنا چاہتے ہیں ہیضے کی شیشیوں سے کیوں نہیں کام لیتے"۔

دروازے کو کسی نے آہستہ سے کھٹکھٹایا۔ سائنس دان نے دروازہ کھولا اسکی بیوی دروازے کے پیچھے سے کہہ رہی تھی۔ "ذرا بات سننا"۔

جب سائنس دان واپس کمرے میں داخل ہوا تو اس کا ملاقاتی اپنی گھڑی دیکھ رہا تھا سائنس دان کو دیکھ کر اس نے کہا "مجھے گمان بھی نہ تھا کہ میں نے آپ کا ایک گھنٹہ ضائع کر دیا۔ مجھے خود چار بجے ایک جگہ پہنچنا ہے حقیقت میں آپ کی باتوں نے میرے دل میں کوئی اور خیال آنے ہی نہیں دیا۔

ملاقاتی کمرے سے باہر نکل گیا سائنس دان نے اپنے ملاقاتی کی طبعی خصوصیات پر غور کرنا شروع کیا "یقیناً وہ ایک غیر معمولی آدمی تھا۔ بیماری کے مہلک جراثیم دیکھ کر اسے کتنی مسرت حاصل ہوتی تھی اس کا چہرہ کسقدر تمتمانے لگتا تھا۔

معاً اسے ایک پریشان کن خیال آیا۔ اس نے اپنی جیبیں ٹٹولیں پھر میز کی طرف گیا پھر بھاگا بھاگا بیوی کے پاس پہنچا اور چلایا "نسرین" "کیوں کیا بات ہے"۔

"جب میں یہاں آیا تھا تو میرے ہاتھ میں کوئی چیز تو نہ تھی"۔

اسکی بیوی نے کچھ عرصہ خاموش رہنے کے بعد جواب دیا "نہیں

تو مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے۔"

سائنس دان یا اللہ کہتے ہوئے سلیپر پہنے ہوئے سرپٹ بھاگا نسرین دروازے کو زور سے بند کرنے کی آواز سنکر کھڑکی کی طرف آئی۔ ایک تپلا دبلا سیاہ بالوں والا آدمی ایک ٹانگے میں سوار ہو رہا تھا۔ سائنس دان سر ننگے سلیپر پہنے ہوئے ٹانگے کی طرف بھاگ رہا تھا اس کے پاؤں میں سے ایک سلیپر نکل گیا لیکن اس نے کوئی پرواہ نہیں کی نسرین نے اپنے دل میں کہا پاگل ہو گئے ہیں۔ سائنس نے ان کا دماغ خراب کر دیا اور وہ چاہتی تھی کہ وہ کھڑکی کھول کر اپنے خاوند کو آواز دے کہ دبلا تپلا آدمی دوڑ کر ٹانگے پر چڑھ گیا غالباً وہ بھی یہی سمجھ رہا تھا کہ سائنس دان پاگل ہوگیا ہے اس نے نیم برہنہ پا سائنس دان کی طرف اشارہ کیا اور ٹانگے والے سے کچھ کہا ٹانگے والے نے گھوڑے کو چابک لگایا اور گھوڑا ہوا ہوگیا۔ سائنس دان نے بھی گھوڑے کی سی تیز رفتاری سے بھاگنا شروع کیا۔

کچھ عرصہ نسرین کھڑکی میں کھڑی رہی اس نے سوچا "یہ تو بڑی آفت ہوئی مان لیا کہ سائنس دان اور شاعر سوسائٹی کے قواعد سے کسی حد تک آزاد ہوتے ہیں۔ لیکن آزادی کی کوئی حد بھی ہونی چاہیئے۔ اندنوں لاہور میں جرابیں پہنکر بھاگنا"——

اس نے اپنا برقع پہنا خاوند کے جوتے اور ٹوپی ہاتھ میں لی اور گھر سے باہر نکل آئی۔ اتفاق سے ایک ٹانگہ گزر رہا تھا وہ ٹانگے پر بیٹھ گئی اور کوچوان سے کہا "سیدھے چلو مجھے ایک ایسے آدمی کی تلاش ہے جو نیلا فراک کوٹ علی گڑھی شلوار پہنے ہوئے جوتی اور ٹوپی کے بغیر بھاگ رہا ہے۔"

ٹانگے والے نے اطمینان سے جواب دیا:۔

"نیلا کوٹ بیگم صاحب جوتی اور ٹوپی ندارد"

اور اس نے اس انداز سے گھوڑے کو چابک لگایا گویا وہ تمام عمر اس پتے سے ہر شریف آدمی کو ڈھونڈتا رہا ہے۔

کوئی پانچ منٹ کے وقفہ کے بعد لوہاری دروازے کے اڈے کے ٹانگے والے متحیر ہو گئے ایک ٹانگہ گزرا جسکا گھوڑا بگ ٹٹ جا رہا تھا۔

ایک بوڑھے کوچوان نے کہا "یہ تو ناجو کا ٹانگہ ہے آج اسے کیسا کرایہ دار مل گیا جو گھوڑے کو بگ ٹٹ دوڑائے لئے جا رہا ہے۔"

ایک نوجوان کوچوان بولا:۔

"دیکھو تو کمبخت چابک پہ چابک لگائے جا رہا ہے"

اتنے میں ایک اور ٹانگہ گزرا جو پہلے سے بھی زیادہ تیز جا رہا تھا۔

بوڑھا کوچوان بولا:۔

"لو اور تماشا دیکھو شاید دوڑ ہو رہی ہے یہ علو کا ٹانگہ ہے"

کئی کوچوان یک زبان ہو کر چلائے۔

"شاباش ناجو مار ایک اور چابک"

پھر یکبارگی ایک طوفان شور برپا ہو گیا:۔

"شابش ناجو واہ رے علو نکل جا صاف مار چابک اڑا لے جا بھگا لے جا"

ابھی یہ آوازیں فرو نہ ہوئی تھیں کہ ایک اور ٹانگہ گزرا۔ اس ٹانگے کو دیکھ کر کوچوانوں نے تالیاں بجائیں۔ پہلے ٹانگے میں جو شخص بیٹھا تھا وہ ہیضے کے مہلک جراثیم کی شیشی کو جان عزیز سے زیادہ گراں مایہ متاع سمجھکر مضبوطی سے ہاتھ میں تھامے ہوئے تھا اس کے دل میں متضاد جذبات کا ہجوم تھا وہ خائف تھا کہ کہیں اس کا مقصد پورا ہونے سے پہلے اسے گرفتار نہ کر لیا جائے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ شاداں بھی تھا وہ چاہتا تھا کہ اس شیشی کو جس میں اسقدر ہلاکت آفریں امکانات پوشیدہ ہیں شہر کے پانی کے ذخیرے میں انڈیل دے وہ ایک انارکسٹ تھا اور باقی انارکسٹ احمقوں کی طرح سمجھتا تھا کہ شاید عام ہلاکت سے بنی نوع انسان کو فائدہ پہنچ سکتا ہے وہ ابھی سے اپنے آپ کو ایک شہید تصور کر رہا تھا۔ یکایک شیشی اس کے ہاتھ میں ٹوٹ گئی کچھ سیال سی شے گر گئی کچھ شیشی میں رہ گئی۔

انارکسٹ کے بدن میں کپکپی پیدا ہو گئی۔ اس نے شیشی کو منہ کے ساتھ لگا کے باقی قطرے حلق میں انڈیل لئے۔ اب اسے احساس ہوا کہ سائنس دان سے بھاگنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہ اپنا کام کر چکا تھا۔ ہیضہ کے مہلک جراثیم اس کے بدن میں داخل ہو چکے تھے اور اب خدا نے چاہا تو یہ متعدی مرض دوسروں کو بھی لگ جائیگا وہ ٹانگے سے اتر پڑا۔ اور اطمینان سے سائنس دان کا انتظار کرنے لگا متوقع موت کے احساس نے اس کے انداز میں ایک شان وقار پیدا کر دی تھی جب سائنس دان قریب آیا تو انارکسٹ نے کہا:۔

"میرے عزیز دوست تم بہت دیر سے پہنچے"
اس نے ایک طنزیہ قہقہہ لگایا اور بولا :-
"میں نے ہیضے کے مہلک جراثیم پی لیئے ہیں اب ہیضہ شہر میں پھیل جائے گا - میں ایک انارکسٹ ہوں -
سائنس دان نے انارکسٹ کی طرف تعجب اور غور سے دیکھا -
"تم نے اسے پی لیا! انارکسٹ! اچھا اب میں سمجھا"
وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا لیکن کچھ سوچکر چپ رہا - اس کے چہرے پر ایک خفیف سا تبسم تھا - انارکسٹ تانگے میں سے اترا اور انارکلی کی طرف چلدیا - وہ قصداً دوسرے آدمیوں سے مس کرکے چلتا تھا تاکہ متعدی بیماری سبکو لگ جائے - ادھر سائنسدان اپنے خیالات میں اسقدر مستغرق تھا کہ اس نے اپنی بیوی کے آنے پر ذرا بھی اظہار تعجب نہ کیا -
"جوتے پہن لوں کیوں نہیں کوٹ بھی پہن لوں ہاں کیوں نہیں -"
اور یہ کہنے کے بعد سائنس دان پھر اپنے خیالات میں مستغرق ہوگیا - نسرین کو یقین ہوگیا کہ اس کا خاوند قطعی پاگل ہوگیا -
یکایک سائنسدان قہقہہ مار کر ہنسا -
"بات یہ ہوئی نسرین کہ صبح یہ شخص میرے پاس آیا اور میری باتوں میں بڑی دلچسپی لیتا رہا - دراصل وہ ایک انارکسٹ تھا - دیکھو غش نہ کرو - ورنہ میں اپنی کہانی ختم نہ کرسکونگا - مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ ایک انارکسٹ ہے - میں نے اس کی اشتہا کو بڑھانے کے لئے حماقت سے یہ کہدیا کہ اس شیشی میں ہیضے کے جراثیم بند ہیں - یہ بات بالکل غلط تھی دراصل اس شیشی میں بیکٹریم کی وہ قسم بند تھی جس کی وجہ سے بندروں کے جسم پر نیلے دھبے پڑ جاتے ہیں اور یہ شخص اس شیشی کو لے کر بھاگ گیا کہ لاہور کے پانی کے ذخیروں کو ہیضہ کے جراثیم سے آلودہ کردے اور اب اس نے وہ شیشی پی لی ہے - خدا ہی جانے اب کیا ہوگا - تمہیں یاد ہوگا کہ اس دوائی کا ایک قطرہ پینے سے بلی کا رنگ گہرا نیلا ہوگیا تھا - دیکھیں انارکسٹ صاحب کا رنگ کیا ہوجاتا ہے ——
"ابھی تک میں نے اپنا کوٹ نہیں پہنا؟ لیکن میں اپنا کوٹ کیوں پہنوں؟ ان گرمیوں میں کوٹ کی کیا ضرورت ہے —— اس لئے کہ راہ میں حکیم احمد علی کا مکان پڑتا ہے - لیکن میری جان حکیم احمد علی کوئی دسمبر کی ٹھنڈ تو نہیں ہے - جس سے بچنے کے لئے کوٹ پہنا جائے - کیا کہا؟ اچھا لاؤ کوٹ مجھے دو پہنے لیتا ہوں -

غزل

طوفاں بپا ہے اشکوں کا اور درد میں ڈوبے نالے ہیں!
وہ یاد آئے پھر ٹھیس لگی - پھر اپنی جان کے لالے ہیں
معلوم نہیں کیا بات ہے یہ - کیا بھید ہے یہ - کیا راز ہے یہ
اکثر وہی دیکھے وقفِ الم - جو سو نازوں کے پالے ہیں
امیدِ وفا و یادِ جفا - بے تابیٔ حسرتِ نظارہ
اک دل بیمارِ محبت ہے اور لاکھ ستانے والے ہیں!
کیوں صامت محوِ تفکر ہے - نادان تجھے معلوم نہیں!
ہر کالی رات کے پردے میں مستور سحر کے اجالے ہیں!

صامت شامی
بی۔اے

بچّے

یہ حسین معصوم بچّے ان کی عمریں ہوں دراز
ان کی روحیں عصمت و پاکیزگی کی جان ہیں
گلستانِ زیست کے یہ نرم و نازک نونہال
کسقدر سرسبز ہیں، شاداب ہیں، مسرور ہیں
آہ ان کو انقلابِ آسماں کی کیا خبر
خارزارِ زندگی ان کے لئے گلزار ہے
ان کے سینے آتشِ احساس سے ویراں[1] ہیں

مہ جبیں معصوم بچّے ان کی عمریں ہوں دراز
ان کی بھولی بھالی شکلیں زندگی کی شان ہیں
جن کے اک اک نقش سے مسحور ہے تابِ جمال
کسقدر مسرور ہیں بشاش ہیں مسحور ہیں
آہ ان کو گردشِ دورِ زماں کی کیا خبر
وادیٔ پُرشورِ عالم جنّت بے خار ہے
انکے دل بے لوث ہیں ٹھنڈے ہیں بے ہیجان ہیں

منحصر ہے ان کے ایما پر نظامِ کائنات
سب فرشتوں کی طرح معصوم تھے بیباک تھے
خون آشامی کا زہریلا نشہ چھایا نہ تھا

ان کے قبضے میں ہے گویا صبح و شامِ کائنات
خواہش و تحریص کے مہلک اثر سے پاک تھے
ظلم کی تحریک کا ہنگامِ بد آیا نہ تھا

انقلابِ آسماں کا دَور جاری ہے مدام
حشمتِ جمشید ہو یا بختِ دارا کا عروج
عالمِ فانی میں کوئی طاقتِ گردوں مدار

گردشِ پیہم سے ذرّوں کو نہیں حاصل قیام
ملّتِ بیضا کے ہوں یا نصارےٰ کا عروج
رہ نہیں سکتی ہمیشہ بامراد و کامگار

یہ حسین معصوم بچّے ان کی عمریں ہوں دراز
ان کو نیک اعمال کی توفیق دے ربِّ جلیل
ان کے سینے غیرت و اخلاق سے معمور ہوں
ایک دن نامِ خدا یہ بھی جواں ہو جائیں گے

مہ جبیں معصوم بچّے ان کی عمریں ہوں دراز
نیک و بد میں قوّتِ تفریق دے ربِّ جلیل
ان کی روشن خاک کے ذرّے مجسّم نور ہوں
اور ناموسِ وطن کے پاسباں ہو جائیں گے

عدمؔ

---

[1] ویراں — ؟

چند دکھنی مرثیہ گو

گذشتہ مضمون میں (جو جون ۱۹۴۳ء میں شائع ہوا ہے) ہم نے ذکر کیا تھا کہ عہد عادل شاہی اور قطب شاہی کے چند ایسے شعراء پیش کئے جائینگے جن کا گویا پیشہ ہی مرثیہ گوئی تھا۔ نہیں معلوم ایسے بھی کتنے شعراء تھے جنہوں نے مرثیہ گوئی کو اپنا پیشہ بنالیا تھا۔ یہاں ہم صرف چار نام پیش کرتے ہیں یعنی کاظم (گولکنڈہ) شاہی (گولکنڈہ) مرزا (گولکنڈہ) مرزا (بیجاپور)۔

(۱) کاظم۔ ان کا نام کاظم علی اور کاظم تخلص تھا۔ گولکنڈہ (حیدرآباد) کے باشندے تھے۔ عبد اللہ قطب شاہ کے عہد میں موجود تھے۔ کثرت سے مرثیئے کہے ہیں جو عام طور پر شہرت رکھتے ہیں۔ اڈنبرہ یونیورسٹی کے بیاض میں ان کے دس مرثیئے موجود ہیں۔

ان مرثیوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کاظم کا اسلوب بیان نہایت شگفتہ ہے۔ ان میں نہ صرف مرثیہ پن موجود ہے بلکہ ادبیت کی شان بھی پائی جاتی ہے۔ اس لحاظ سے کاظم اپنے زمانہ کا ایک اعلیٰ اور بلند پایہ مرثیہ گو قرار دیا جا سکتا ہے۔

جیسا کہ بیان کیا گیا ہے کہ کاظم کے دس مرثیئے اڈنبرہ کی بیاض میں موجود ہیں۔ ان کے اشعار کی تعداد (۲۰۴) ہے۔ افسوس ہے کوئی مرثیہ مکمل ہم نے نوٹ نہیں کیا۔ بطور نمونہ ان کا کلام پیش کیا جاتا ہے۔

تم اپنے دلبراں کی خبر لو علی ولی
بے تاج سروراں کی خبر لو علی ولی

نیزوں اد پر سراں کی خبر لو علی ولی
ظلم وستم گراں کی خبر لو علی ولی

آرام دل سکینہ بے تاب کوں نہیں
انکھیاں میں اس کے راہ خواب کوں نہیں

کہیں انتہا یو درد کے اسباب کوں نہیں
غم ہائے بے کراں کی خبر لو علی ولی

ایک دوسرے مرثیہ کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

آج پڑے رن میں بے جان حسینا
ظلم وستم سوں بن سنے حیران حسینا

جد کا دل میں لیچلے ارمان حسینا
پاسے نہیں اس درد کا درمان حسینا

ایک اور مرثیہ کے چند شعر

پیئے نہیں ابن حیدر آج پانی
پوکاریں دین کے رہبر آج پانی

کہاں روئے زمیں پر آج پانی
مگر در حوض کوثر آج پانی

دہن سو کا کہا ہے کاظم غم سوں میرا
نہیں یہاں لم اسرا میرا تیرا

قلم کرتا نہیں کاغذ پہ پھیرا
سپاہی کوں نہ رہبر آج پانی

مندرجہ بالا انتخابات سے کاظم کے مرثیہ کا اندازہ بخوبی واضح ہو سکتا ہے۔ ادبی حیثیت سے قطع نظر زبان کی صفائی کے لحاظ سے بھی قابل داد ہے۔ بلکہ صفائی کے لحاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ ایک قطب شاہی دور کے مرثیہ گو کا کلام نہیں ہے۔ بہرحال کاظم کا خاص درجہ ہے۔

(۲) شاہی۔ شاہ قلی خاں گولکنڈہ کا مرثیہ گو تانا شاہ کے ندیموں سے تھا۔ پہلے تو فوج سے تعلق تھا مگر علمی قابلیت کے باعث بہت جلد شاہی کو شاہی تقرب حاصل ہو گیا۔ مذہب کے لحاظ سے اس کو بڑا سخت تعصب تھا۔ اپنے مرثیوں میں صحابہ کی شان میں بڑی گستاخیاں کی ہیں۔

مرثیہ گوئی میں اس کو خاصی مہارت تھی۔ اور اس کے مرثیئے عام طور پر مشہور اور مقبول تھے۔ یہاں تک کہ اورنگ زیب کے سپاہیوں نے ان کو زبانی یاد کر لیا تھا۔ ان کے ذریعہ وہ شمالی ہند میں بھی پھیل گئے جہاں اٹھارہویں صدی عیسوی کے اوائل میں بھی پڑھے جاتے تھے

اس کے دو مرثیئے اڈنبرہ والی بیاض میں اور ایک مختصر مرثیہ مولوی صفی الدین مرحوم والی بیاض میں موجود ہے۔ ادبی لحاظ سے اس کے مرثیئے نہایت بلند پایہ ہیں۔ واقعہ نگاری کی صحیح ترجمانی کی گئی ہے۔ ادبی حیثیت کے سوا زبان کے لحاظ سے بھی وہ اعلیٰ شاعر قرار دیا جا سکتا ہے

کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

ہائے غریب یتیم نمانے عابد تیری زاری ہے۔

باپ کا مرنا دکھ کا بھرنا تس پر یوں بیاری ہے
تیغ کمڑی لے دشمن سر پر داویلا دکھ بھاری ہے
درد مصیبت عابد تم پر آج کے دن لبیاری ہے
جبرئیل کہیں بتلاؤ مجھ کو نام ہے کیا اس داڑی کا
سنا جب کربلا میں ہے مقتل حسین علی سے ہادی کا
کہا بہشت سے پیام لیا یا عابد تیری دادی کا
کٹھن گھڑی ہو پوتے میرے تجھ پر کیا سنگ ساری ہے

(۳) مرزا (قطب شاہی) مرزا ابوالقاسم نام مرزا تخلص تانا شاہ کا مصاحب تھا۔ اس کے گرفتار ہونے پر گوشہ نشینی اختیار کرلی۔ مرثیہ گوئی میں یدطولیٰ رکھتا تھا۔

قدیم تذکرہ نویسوں نے مرزا کا ذکر کیا ہے۔ اور اس کے بعض شعر نقل کئے ہیں۔ مگر کسی نے اس کے مرثیہ گو ہونے کی صراحت نہیں کی۔ ہماری تحقیقات کے لحاظ سے یہ مرثیہ گو تھا۔ کثرت کے ساتھ مرثیے کہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے بڑی عمر پائی۔ کیونکہ ۱۱۵۰ھ تک زندہ رہنے کا پتہ چلتا ہے۔

مرزا نے مختلف عنوان کے تحت مرثئے کہے ہیں۔ اور اکثر طویل ہیں۔ مثلاً قصہ امام حسین کے عنوان سے ایک مرثیہ ہے جس کے (۱۸۰) شعر ہیں۔ قصہ امام قاسم کے مرثیہ کے (۱۹۲) شعر۔ قصہ حر شہید کے (۱۹۷) شعر۔ مرثیہ حضرت امام کے (۲۰) شعر ہیں۔

ان مرثیوں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کیا بلحاظ واقعہ نگاری اور کیا بلحاظ اسلوب بیان اور طرز ادا اور کیا بلحاظ لطف زبان مرزا اپنے وقت کا کامل الفن مرثیہ گو تھا۔ اگرچہ زبان کی صفائی کے لحاظ سے وہ سلیس نہیں ہیں لیکن کلام میں بلا کا اثر ہے۔

ذیل میں مرزا کے مرثیوں سے کچھ انتخاب پیش کیا جاتا ہے جس سے ہمارے دعوے کی تائید ہو سکتی ہے۔

قصہ حسین والے مرثیہ میں اصغر کی شہادت کا حال

کہوں دکھ درد اصغر کا اور نور چشم سرور کا
شہ غازی کے جوہر کا کرو زاری مسلمانان
عزیزان دل ہوا پر خون پو سن اصغر کے ماتم کوں
کہ معصوم شہادت سوں کرو زاری مسلمانان

حسین اصغر کوں منگائے ان کے تیرے تو بسلائے
بزان لشکر کئے لاشے کرو زاری مسلمانان
جبنان پر ہانک تب مارے کہے لے سنگ دلان سارے
برائی مین نہ تم ہارے کرو زاری مسلمانان

مرزا کی تشبیہیں ملاحظہ ہوں۔

ہوئی جب تشنگی غالب امام انس و جان اوپر
خبر یوں سن کے پانی نے آپس میں بیچ کھایا ہے
شہیداں کا ہو پریا جب کربلائے میانتے
فلک تعظیم سوں اسکوں شفق کرنے اچایا ہے
ہوا تن سے جدا جب سر شہنشاہ دو عالم کا
گگن سرکات سورج کا شفق کے لہو میں بہایا ہے

"رات" کی صراحت۔

محنت قتل کی رات ہے اہل حرم پر گھات ہے
دل چور اس غم سات ہے تیرے فراقوں یا حسین
یوں رات جگ غمناک ہے عالم پو سب دتیاک ہے
پر خون جگر دل چاک ہے تیرے فراقوں یا حسین

جنگ کا دن تاریخ فوج کی تعداد کا ذکر۔

شہ پر یوں جس دن گھیر یا ماتم رہیا جگ میں یو سوز
تب محرم کی دہم تاریخ تھا ہور جمعہ روز
شہ کنے چالیس پیادے تیس ہور دو تھے سوار
ظالماں کے دل سے تب تھے سواران بیس ہزار

انتخاب بالا سے مرزا کے کلام کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ اڈنبرہ والی بیاض اور مولوی صفی الدین مرحوم والی بیاض میں اس کے متعدد مرثئے ہیں۔ جن کی صراحت طوالت کی موجب ہوگی۔

سرزمین دکن میں مرزا کا بلحاظ مرثیہ گوئی وہی درجہ ہے جو شمال میں انیس اور دبیر کا۔

(۴) مرزا (بیجاپوری) علی عادل شاہ ثانی کے عہد کا نامور مرثیہ گو تھا۔ جس نے سوائے مرثیے کے کسی اور صنف میں طبع آزمائی نہیں کی۔ مرثیہ نویسی کا ایسا شوق تھا کہ انتقال کے وقت بھی ایک مرثیہ کا عنوان ہی لکھ رہا تھا۔ بادشاہ کا تقرب حاصل تھا۔ مگر کبھی کوئی قصیدہ لکھا نہ مدح گوئی کی بادشاہ نے خود اس سے خواہش کی۔ مگر اس نے مدح کے بجائے ایک مرثیہ میں بجائے اپنے تخلص کے بادشاہ کا نام لکھ دیا۔

مرزا اپنی مرثیہ گوئی کو ایک مذہبی فرض تصور کرتا تھا۔ اسی انہماک کا نتیجہ تھا۔ اس کو خواب میں بھی اس کی تلقین ہوتی تھی۔ چنانچہ بیان کیا جاتا ہے مرزا اپنا مرثیہ سنا رہا تھا۔ ذیل کے شعر کے

دلان پاکہان اناران کرکہ سینہ طبق میا سے

مصرع ثانی کے لئے مضمون نہ مل رہا تھا اس پر بیہوشی طاری ہوئی۔ دیکھا کہ آنحضرت صلعم تشریف فرما ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے کہ

نبی رو بیگے محشر کون یوں تحفہ کرسے جانا ہے

مرزا نے اس کو کہکر مرثیہ ختم کیا۔ (ص ۲۹ بساطین السلاطین برٹش میوزیم) اس کی شہادت یوم عاشورہ ہوئی بیان کیا جاتا ہے۔ ایک مرثیہ لکھ رہا تھا۔ کسی ظالم نے خنجر سے ہلاک کردیا۔ شاہ مرتضیٰ قادری کی درگاہ میں دفن کیا گیا۔ افسوس ہے سنہ وفات معلوم نہیں ہوسکتا۔ مگر یہ تیقن کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ۱۰۸۳ھ کے قبل اس نے شہادت پائی۔

مصنف بساطین السلاطین نے مرزا کا ذکر تعریف کے ساتھ کیا ہے چنانچہ لکھتا ہے۔

"یکے از شعرائے مقبولین آں زماں مرزا مرثیہ خوانست کہ زبان خود وقف حمد و نعت حضرت سید المرسلین و منقبت آیمہ طاہرین نمود۔ ہرگز برائے احدے از شاہ و گدا شعر نگفت مرثیہ ہائے بے شمار کہ در ماتم شہدائے کربلا گفت زبان زد خاص مردم دکن و دیگر بلاد گردید" (ص ۲۹)

یہ سب کچھ ہے۔ مگر افسوس اسکے مرثیئے دستیاب نہیں ہوتے۔ مولوی صفی الدین والی بیاض میں جو (۳۵) مرثیئے ہیں وہ اپنے اندرونی شہادت کے لحاظ سے سب کے سب گولکنڈہ والے مرزا کے ہیں۔ البتہ اڈنبرہ یونیورسٹی کی بیاض میں مرزا کے سولہ مرثیئے ہیں۔ ممکن ہے ان میں سے بعض بیجاپور کے مرزا کے ہوں۔ مگر تیقن کے ساتھ کسی مرثیہ کو اس سے منسوب نہیں کیا جا سکتا۔

چونکہ ہم کو مرزا کا کلام دستیاب نہیں ہوا۔ اس لئے اس کے کلام کے متعلق کچھ نہیں لکھا جا سکتا۔ مگر یہ ظاہر ہے جس شخص کی تمام عمر ہی مرثیہ گوئی میں بسر ہوئی ہو تو اس کا کلام کس پایہ کا ہوگا۔

ذیل میں ایک مرثیہ کے چند شعر لکھے جاتے ہیں جو بعض اندرونی شہادتوں کے لحاظ سے بیجاپور کے مرزا کا مرثیہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

شریعت پاسا سی پہ اپیا ستم
حقیقت شناسی پہ ایتا ستم

نبی کے نواسے پہ اتیا ستم
سب امت کے آسے پہ اتیا ستم

دیا زہر پانی میں بانظالماں
ہوا کا کلیجے کون جاکرتہ ہاں

جگر گوشہ حسن کا پڑا بے گناہ
مدینہ کے باسی پہ ایتا ستم

حسین ابن حیدر خدا کا ولی
جگر گوشہ فاطمہ اور علی

بردرج دہ ودہ کا بدر جلی
شہ کربلا اسی پہ ایتا ستم

مبارک بدن سوں ہوا سر جدا
اسی غم سوں کہتا ہے مرزا سدا
کیا کیا دو بدبخت نے اے خدا
شہنشہ پیاسے پہ ایتا ستم

قطب شاہی اور عادل شاہی عہد کے یہ چند مرثیہ گو ہیں۔ امید ہے کہ اس صراحت سے ان کے کلام کا ایک خاکہ ذہن نشین ہوجائے۔ آئندہ صحبت میں اُن مرثیہ گویوں کو پیش کیا جائیگا۔ جو ان سلطنتوں کی شکست کے بعد ہوئے ہیں۔

نصیر الدین ہاشمی۔ ایم۔ آر۔ اے۔ ایس۔ ایف۔ آر۔ ایس۔ اے

(لندن)

"حُسنِ اتفاق"

پرانی وضع کی ایک بوسیدہ گھوڑا گاڑی شام کے سناٹے میں ایک ایسے پہاڑی مقام سے گزر رہی ہے جو حد درجہ وحشت ناک ہے۔ گاڑی شاندار ہے۔ اور کسی مرہٹہ سردار کی گذشتہ شان و شوکت کی یادگار معلوم ہوتی ہے۔ ہر قدم پر پہیوں کی چوں چوں حالت ماضی پر مرثیہ خوانی کر رہی ہے۔

گاڑی کے اندر ایک مرہٹہ سردار لیسونت راؤ اور ان کی لڑکی تلوتما ہیں۔ سامنے کی سیٹ پر پرانا جانثار بالاجی بیٹھا ہے۔

کسی زمانے میں سردار صاحب کی چاروں طرف دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ کئی قلعے اور گڑھیاں قبضہ میں تھیں مگر اب زمانہ بگڑ گیا، سرکار نے مقبوضات ضبط کر لئے۔ اور وہ پونا میں ایک گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ وہیں پونا کالج میں تلوتما پڑھتی ہے۔

کچھ عرصے سے اس کی صحت خراب ہو رہی ہے۔ اس لئے تبدیلی آب و ہوا کے لئے آج سردار صاحب اپنی پرانی سواری میں سوار ہو کر پونا سے جا رہے ہیں۔

تلوتما کے چہرے سے کمزوری کے آثار نمایاں ہیں، وہ مرہٹہ وضع کی ساڑھی پہنے ہے۔ سر کھلا ہوا ہے، ہوا سرد چل رہی ہے۔ اس لئے پاؤں پر ایک کمبل ڈال لیا ہے۔

رفتہ رفتہ دن کی آخری علامات زائل ہونے لگیں اور شب کی سیاہی بڑھنا شروع ہوئی۔ ان کی گاڑی اس وقت ایک ایسے پہاڑی راستہ سے گزر رہی تھی جو بہت ہی تنگ واقع ہوا تھا۔ پہاڑیوں کی خوفناک چٹانیں سڑک کی طرف جھکی ہوئی تھیں اور ان کے اوپر سفید سفید بکرے ہری ہری گھاس چر رہے تھے۔ کبھی کبھی گاڑی کی گڑگڑاہٹ اور گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سے چونک کر ان مسافروں کو دیکھنے لگتے تھے۔

اتنے میں مغرب کی طرف سے کالی گھٹا اٹھنی شروع ہوئی۔ موسم کے اثرات سے متاثر ہو کر سردار صاحب نے کھڑکی سے باہر کی طرف دیکھا۔ مگر دور تک کسی آبادی یا گاؤں کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ بالاجی اپنے آقا کی پریشانی کو سمجھ گیا۔ اور اس نے کوچوان سے ڈانٹ کر کہا۔ "گاڑی جلدی بڑھاؤ۔ اگر ایسے ہی چلو گے تو آدھی رات تک بھی سرائے نہ پہونچیںگے"۔

کوچوان نے کہا۔ "نہیں جی! سرائے وہ سامنے آگئی"۔

سردار صاحب کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی اور انہوں نے جلدی سے دریافت کیا۔ "کہاں"؟

کوچوان نے کچھ فاصلے پر ایک ٹیلہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "حضور وہ سامنے"؟

سردار صاحب نے غور سے دیکھتے ہوئے کہا "خوب یہ تو کھنڈر معلوم ہوتا ہے۔ سرائے ورائے تو کیا ہوگی، ہمارا تو خیال تھا کسی آرام دہ گاؤں میں رات بسر ہوگی"؟

شب کی آمد اور موسم کی خرابی دیکھتے ہوئے لیسونت راؤ کو مجبوراً اپنی کمزور اور بیمار لڑکی کی خاطر کوچوان کا کہنا ماننا پڑا۔ رات کی سرد ہوا ممکن تھا تلوتما کے لئے اس کمزوری میں نقصان رساں ثابت ہوتی۔ آخر کار سردار صاحب کے ایما سے گاڑی سرائے کے پرانے پھاٹک میں گڑگڑاتی ہوئی داخل ہو گئی۔

سرائے کی عمارت سے خوف اور وحشت ٹپکتی تھی۔ عمارت کافی بڑی تھی۔ اور متعدد کمروں کی دور تک قطار چلی گئی تھی۔ مگر ویران۔ جو لوگ گاڑی کے استقبال کو دوڑے ان کے چہرے بھی کچھ عجیب وحشیانہ تھے۔ سرائے کی مالک ایک عورت تھی۔ جو متوسط العمر تھی اور دیکھنے میں بجائے بھٹیاری کے ایک زیادہ موقر درجہ کی عورت معلوم ہوتی تھی۔ اس کے گلے اور ہاتھ پیروں میں چاندی سونے کا قیمتی زیور تھا۔ ایک ادنیٰ بھٹیاری کے پاس ایسے لباس اور زیور کا ہونا ضرور مشکوک نگاہوں سے دیکھا جائیگا۔

لیسونت راؤ نے ایک کمرہ اور اس کے آگے کا بڑا ہال پسند کیا۔ تلوتما کے لئے اندر کے کمرے میں سونے کا انتظام کر دیا گیا۔ بڑے ہال میں آگ روشن تھی مگر لکڑیاں گیلی تھیں اس وجہ سے دھواں گھٹ رہا تھا اور سانس لینا مشکل تھا۔

سرائے کی مالکہ مہمانوں کو ایک خادمہ کے سپرد کرتے ہوئے خود کھانے کے انتظام میں مصروف ہو گئی۔ خادمہ نہایت تنومند عورت

تھی ۔ سردار صاحب کو اس کی نظریں بہت ناگوار معلوم ہوتی تھیں جبکہ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ان تازہ وارد مسافروں کی طرف دیکھنے لگتی تھی۔

سردار صاحب نے ایک چارپائی آگ کے شعلوں کے قریب کھینچ لی اور تلوتما کو اس پر بٹھاتے ہوئے خود ایک ٹوٹے ہوئے مونڈھے پر بیٹھ گئے ۔ بالاجی سرائے کی حالت اور لوٹے پھوٹے سامان کو دیکھکر دل ہی دل میں کوچوان کو برا بھلا کہہ رہا تھا جسکی وجہ سے اس کے آقا اور ان کی لڑکی کو اتنی تکلیف ہو رہی تھی ۔ اگر ان کا بس چلتا تو وہ کوچوان کی ہڈی پسلی توڑ ڈالتا ۔

جب دھواں کسی طرح کم نہ ہوا سردار صاحب نے خادمہ سے کہا "لکڑیاں گیلی ہیں ۔ اچھی سوکھی لکڑیاں اگر ملیں تو لاؤ" یہ کہہ کر ایک روپیہ نکال کر خادمہ کو دیا ۔

خادمہ فوراً ہی جاکر لکڑیوں کا ایک گٹھا سر پر رکھ لائی ۔ معلوم ہوتا تھا سرائے ہی میں کہیں اسے سوکھی لکڑیاں مل گئیں ۔ ہال میں پہونچتے ہی اتفاق سے اس کا پاؤں پھسل گیا اور وہ بے تحاشا فرش پر گر پڑی ۔ کنپٹی سے خون جاری ہوگیا ۔ اور وہ بیہوش ہوگئی ۔ تلوتما نے اپنی ساڑھی کے پلے کو پھاڑ کر غریب عورت کی مرہم پٹی کی ۔ جب اُسے ہوش آیا اس نے حسین تلوتما کو اپنی تیمارداری میں مصروف پایا ۔ جوش سے اس کے آنسو نکل آئے ۔ اور تلوتما کے پاؤں چھو کر کہنے لگی ۔

"ایشور تمہاری رکھشا کریں ۔"

ابھی اس واقعہ کو زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ سرائے میں کچھ نئے مہمانوں کی آمد کا غل پڑ گیا ۔ تلوتما نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا، ایک نوجوان گاڑی سے اُترا ۔ اس نے سہارا دیکر ایک بوڑھی عورت کو اُتارا ۔ سرائے کی مالکہ نے ان دونوں کا گرمجوشی سے استقبال کیا ۔ ان کے ساتھ بہت سے نوکر تھے اور گاڑی بھی خوبصورت اور قیمتی تھی ۔ نوجوان کو دیکھ کر تلوتما کے چہرے پر ہوائیاں چھوٹنے لگیں ۔ اس نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا ۔ اور اپنے باپ کے پاس آکر چارپائی پر بیٹھ گئی ۔

سردار صاحب نے لڑکی کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار دیکھ کر دریافت کیا "کیوں تلوتما، کیسی طبیعت ہے ؟" مگر تلوتما نے بات ٹالتے ہوئے کہا "کچھ نہیں ۔" پھر بھی ایک غماز آنسو ڈھلک کر رخسار پر آگیا ۔ جسے اس نے اپنی ساڑھی کے آنچل سے فوراً خشک کر لیا ۔

سرائے کی مالکہ نے داخل ہوکر سردار صاحب کی توجہ ہٹا دی ورنہ ممکن تھا وہ تلوتما سے مزید سوالات کرتے ۔ مگر بھٹیاری کو بدحواس دیکھ کر انہوں نے کہا "کیا ہے ؟"

عورت نے معذرت کرتے ہوئے کہا "دوسرا کمرہ اسوقت گرم نہیں ہے اگر آپ مہربانی ...."

ابھی اس کا جملہ ختم نہیں ہوا تھا کہ وہی بوڑھی عورت جو گاڑی سے اتری تھی نوجوان کے ہاتھ کا سہارا لئے ہوئے ہال میں آموجود ہوئی ۔

سردار صاحب اس عورت سے واقف تھے ۔ وہ ایک خاندانی رانی تھی اور اس کے ساتھ والا نوجوان اس کا بھتیجا اور وارث جائیداد تھا ۔ پونا اور کئی مقامات پر سردار صاحب نے اسے دیکھا تھا ۔ اور تلوتما کے ساتھ کئی بار اس کے ساتھ دعوتوں میں بھی شرکت کی تھی ۔ جہاں اس کا نوجوان بھتیجا بھی اکثر موجود ہوتا تھا ۔

اس خاندانی عورت کو آتا دیکھ کر سردار صاحب تعظیماً کھڑے ہوگئے اور چارپائی پر بیٹھنے کا دونوں کو اشارہ کیا ۔ تلوتما کا بُرا حال ہو رہا تھا ۔ نوجوان نے بڑھکر اس سے کچھ رسمی جملے کہے ۔ مگر اس نے شرم سے سر جھکا لیا اور کچھ جواب نہ دیا آخر دونوں قریب بیٹھ گئے ۔

تھوڑی دیر باتیں ہوا کیں ۔ کہ کہاں سے آنا ہوا ۔ کہاں کا قصہ ہے وغیرہ پھر کھانا آیا ۔ سب نے مل کر کھایا ۔ کھانے کے بعد رخصت ہوتے وقت رانی صاحبہ کی نگاہ ایک ستار پر پڑ گئی جو سردار صاحب کے ساتھ تھا ۔ اور انہوں نے سردار صاحب سے کہا "شب بخیر کہنے سے پیشتر اگر اس ستار کے نغموں سے محظوظ ہوں تو کیا ہے ۔"

سردار صاحب نے کہا "ضرور ضرور" اور انہوں نے اپنی لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے آنکھ سے اشارہ کیا ۔ تلوتما بادل ناخواستہ ستار اُٹھا لائی ۔ اور سُروں کو ملانے لگی ۔ انہوں نے اس کو موسیقی کی خاص تعلیم دلائی تھی ۔ تلوتما کی انگلیاں ستار پر کام کرنے لگیں اور ساری فضا دلخوش کن نغمہ سے معمور ہوگئی ۔ آواز ملانے کے بعد تلوتما نے ایک مرہٹی گانا شروع کیا جس میں عشق کے جذبات کی ترجمانی کی گئی تھی اور جسے فارسی کے ان اشعار سے مناسبت ہوسکتی ہے ۔ ؎

صبحدم مرغ چمن با گل نوخاستہ گفت
ناز کم کن کہ دریں باغ بسے چوں تو شگفت
گل بخندید کہ از راست نرنجیم و لے
ہیچ عاشق سخن سخت بمعشوق نہ گفت

بار بار تلوتما کی کالی زلفیں اُڑ اُڑ کر اس کے رخسار پر آجاتی تھیں اس کا چہرہ شرم سے سُرخ ہوا جا رہا تھا ، وہ اپنے جذبات اور کیفیات دلی کو چھپانے کے لئے ہر ممکن کوشش صرف کر رہی تھی کبھی کبھی کن انکھیوں سے حاضرین کی طرف دیکھ لیتی تھی پھر جھک کر گانے

میں مشغول ہوجاتی تھی ۔ بہت جلد یہ صحبت برخاست ہوگئی ۔ سب لوگوں کے چلے جانے کے بعد تلوتما اپنے سونے کے کمرے میں آئی اور باہر کی طرف کھڑکی میں سر رکھکر پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی ۔ فاصلے پر رانی صاحبہ کے کمرے روشنی نظر آتی تھی اور کبھی کبھی کسی نوجوان کا چہرہ بھی کھڑکی میں سے جھانکتا ہوا معلوم ہوتا تھا ۔

تلوتما تھوڑی دیر وہاں کھڑی رہی پھر اس نے ایک گہری سانس لی اور کھڑکی بند کرنے لگی ۔ اتنے میں اسکو دو مانوس آوازیں کچھ سرگوشیاں کرتی ہوئی کھڑکی کے نیچے سنائی دیں ۔

" مگر اس بیچاری لڑکی کا کیا قصور ہے ۔"

غالباً کوچوان نے جواب دیا " ہم کیا کریں ۔ اسکی قسمت " ۔

خادمہ نے التجا کرتے ہوئے کہا " کیا اس کی جان بخشی نہیں ہو سکتی "

کسی نے ڈانتے ہوئے کہا " اری کم بخت تیری عقل کہاں گئی ہے ۔ ایک لڑکی کے لئے ہمارے گلے کٹانا چاہتی ہے "

اس کے علاوہ تلوتما کچھ نہ سن سکی ۔ اُسے خیال پیدا ہوا " کہیں یہ گفتگو میرے متعلق تو نہیں ہے ۔ کیا کسی سے اس کا تذکرہ کروں ۔ مگر ممکن ہے میرا یہ وہم ہی وہم ہو ۔"

وہ چاہتی تھی اپنے باپ سے یہ سب کہہ دے مگر پھر خیال کیا اگر کچھ نہ ہوا تو یونہی ان کو پریشانی ہوگی ۔ وہ انہی خیالات میں غوطے لگا رہی تھی کہ کمرے میں ایک خفیف سی آواز دستک کی آئی ، یہ آگے بڑھی اور کان لگا کر سنا ۔ کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے ۔ لیمپ ہاتھ میں لے کر اس نے دیوار کے اس حصہ کی طرف دیکھا جدھر سے آواز آرہی تھی ۔ وہاں ایک چھوٹا سا دروازہ نظر آیا ۔ دروازہ اندر سے بند تھا ۔ تلوتما نے کہا " کون ہے ۔"

خادمہ نے آہستہ سے کہا " میں ہوں ۔ ذرا دروازہ کھولو "

تلوتما نے ہمت کر کے دروازہ کھولا تو خادمہ کو دروازے پر کھڑا پایا ۔ اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کو کہا پھر اندر آکر کہنے لگی ۔

" جلدی سے اس سرائے سے بھاگ جاؤ نہیں تو تمہاری جان کی خیر نہیں ہے "

تلوتما گھبرا کر خادمہ کا منہ تکنے لگی ۔

خادمہ نے اپنے الفاظ پر زور دیتے ہوئے کہا " ایک منٹ بھی ضائع نہ کرو ۔ جس طرح ہو سکے اس جگہ کو فوراً چھوڑ دو ۔"

تلوتما نے کہا " اور سردار صاحب .... "

خادمہ نے پوچھا " وہ کہاں ہیں "

تلوتما نے اشارہ سے کہا " ہال میں "

خادمہ نے کہا " انہیں بلا لو مگر جلدی کرو "

تلوتما نے اپنے باپ کو جگا کر سب حال کہہ سنایا ، وہ بھی متوحش ہوگئے ۔ بالا جی بھی اٹھ کر پاس آگیا ۔ اور سب خادمہ کے پاس آئے جو ان کا انتظار کر رہی تھی ۔ سردار صاحب کو دیکھ کر کہنے لگی ۔ آپ فوراً یہاں سے اپنی لڑکی کو لے کر بھاگ جائیے ۔ ڈاکوؤں نے سرائے پر قبضہ کر لیا ہے ۔ آپ کی جان خطرے میں ہے ۔ آپ اس چور دروازہ سے نکل کر باہر چلے جائیے ۔ صحن سے گزر کر آپ کو ایک ایسا ہی دوسرا دروازہ ملیگا ۔ وہاں ایک گھوڑا دروازے کے باہر کھیت میں موجود ہے اس پر سوار ہو کر آپ اپنے بائیں ہاتھ کی طرف جائیں تھوڑی دور پر ایک چشمہ ملے گا آگے سیدھی سڑک چلی گئی ہے جو آپ کو ایک محفوظ گاؤں میں پہنچا دیگی ۔ یہ کہہ کر خادمہ جانے لگی ۔ تلوتما نے کہا ایک گھوڑا ہے ہم سب کیسے جائیں ۔ اور .... رانی صاحبہ بھی تو .... " کہتے کہتے اس کی آواز گلے میں پھنس گئی ۔

خادمہ نے تیوریاں چڑھا کر کہا " تم اور سردار صاحب اس پر جا سکتے ہو ۔ مجھے رانی وانی سے کیا مطلب ۔ میں تو تمہارے احسان کا بدلہ دینا چاہتی ہوں ۔ اب فوراً یہاں سے نکل جاؤ ۔ کہدینا میرا کام ہے ۔" یہ کہہ کر خادمہ چلی گئی ۔

تلوتما نے سردار صاحب کے چہرے کی طرف دیکھا ۔ ان کے چہرے پر ایک رنگ آتا تھا ایک رنگ جاتا تھا ۔ اور وہ بہت فکر مند نظر آتے تھے ۔

بالا جی نے موقع کی نزاکت اور خطرے کی قریب کو سمجھتے ہوئے سردار صاحب سے کہا " آپ دیر نہ کیجئے ۔ اور بائی جی کو لیکر اس راستے سے چلے جائیے ۔ میں سب نبٹ لونگا ۔ اور رانی صاحبہ کی مدد اپنی جان دیکر کرونگا ۔"

تلوتما نے مسکراتے ہوئے کہا " رانی صاحبہ کے ساتھ ایک اور نوجوان بھی ہے ۔"

بالا جی نے کہا " ہاں ہاں میں سب سمجھتا ہوں ۔ آپ کچھ فکر نہ کریں ۔ سب دیکھ لیا جائے گا ۔"

سردار صاحب کے لئے سوا اس کے اور کوئی چارہ کار نہ تھا کہ خادمہ کے بتائے ہوئے راستہ پر تلوتما کو لیکر روانہ ہو جائیں ۔ چنانچہ انہوں

نے وہی راستہ اختیار کیا۔

ان کو کھیت میں گھوڑا تیار ملا۔ رات کی سیاہی میں وہ بہت جلد سڑک پر ہو لئے۔ اور خیریت سے بتائے ہوئے گاؤں میں جا پہنچے۔ گاؤں والے خود سرائے کو مشکوک نظروں سے دیکھتے تھے۔ اور اکثر ان کو بھی مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ آج سردار صاحب کی زبان سب حالات سن کر ایک چھوٹی سی جماعت ڈاکوؤں سے مقابلہ کرنے پر تیار ہو گئی۔

ایک فوجی افسر نے جو اتفاق سے وہاں موجود تھا اس جماعت کی کمانڈ ہاتھ میں لے لی۔ اور بہت جلد یہ لوگ ڈاکوؤں کے سر پر جا پہنچے۔ وہاں بالاجی نے حکمت عملی سے کام لے کر رانی صاحبہ کے آدمیوں کو ہوشیار کر دیا اور سب لوگوں نے مل کر رانی صاحبہ اور نوجوان کو حلقے میں لے لیا۔ ڈاکوؤں سے بڈھا وفادار نام بالاجی خوب لڑا۔ گاؤں والوں کی نئی کمک پہنچ جانے سے ڈاکوؤں کی ہمت ٹوٹ گئی۔ اور وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے۔

رانی صاحبہ مع اپنے بھتیجے کے گاؤں میں سردار صاحب کے پاس لائی گئیں۔ تلوتما بہت بے چین تھی اور سردار صاحب اس کو بار بار بالاجی کی وفاداری کے قصے سنا کر اس کے دل سے وہم مٹانا چاہتے تھے۔

آخر اس قافلے کو خیریت سے دیکھ کر سب خوش ہو گئے۔ اور سب نے بالاجی کی بہت تعریف کی۔

اس کے بعد یہ کہنا بیکار ہوگا کہ تلوتما کی شادی رانی صاحبہ کے بھتیجے سے بخیر و خوبی ہو گئی اور دو بچھڑے ہوئے دل ہمیشہ کے لئے مل گئے۔

(واشنگٹن آئرونگ)　　**شمشیر صمدی**

تجلّیات

ترے ستم کا گلہ تجھ سے کر رہا ہوں میں
تری نگاہ کو سو بار دیکھتا ہوں میں

مجھے خبر ہے مآلِ بہار جو کچھ ہے
گلوں کو دیدۂ پرنم سے دیکھتا ہوں میں

سفر دراز نہ تھا ذوقِ جستجو کے لئے
حرم کو دیر سے ہوتا ہوا چلا ہوں میں

مری نگاہ میں دنیا کی کیا حقیقت ہے
تری نگاہ سے دنیا کو دیکھتا ہوں میں

مرے عروج کی شاہد ہیں پستیاں میری
بہت بلندیٔ پرواز سے گرا ہوں میں

فریبِ حسن مجھے میری آنکھ دیتی ہے
حسین وہ اتنے نہیں جتنا دیکھتا ہوں میں

ہر ایک راہ سے میں تجھکو ڈھونڈ لیتا ہوں
رہِ تلاش میں خود اپنا رہنما ہوں میں

وہ آئیں اور سکونِ دلِ حزیں کے لئے
الٰہی آج یہ کیا خواب دیکھتا ہوں میں

(غیر مطبوعہ)　　[illegible]

ایک ہزار کا نوٹ

خدا نے حکم دیا کہ :-

دو فرشتے جو زمین پر جانا چاہیں حاضر ہوں :-

اتنا سنتے ہی ایک درجن فرشتے حاضر ہو گئے - لیکن صرف دو منتخب کئے گئے -

تم ان کاغذوں کو لیکر زمین پر جاؤ -

فرشتے ان کاغذ کے پرزوں کو جن پر نقش و نگار بنے ہوئے تھے - بغور دیکھ رہے تھے اور بار بار خداوند کی طرف بھی نظریں اٹھاتے تھے -

کیا تم نہیں جانتے کہ یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے ؟ یہاں آسمان پر تو یہ صرف ایک منقش گل بوٹے والا کاغذ کا پرزہ ہے - لیکن یہی چیز دنیا میں انسانوں کی آسودگی کا ذریعہ ہے - یہ کاغذ روپیہ ہے اور ہر پرزہ ایک ہزار کی قیمت رکھتا ہے - تم اسے زمین پر لے جاؤ - اور اُس انسان کو جو تمہارے خیال میں سب سے زیادہ حاجتمند ہو دو - فوراً ہی دونوں فرشتے غایب ہو گئے - اور شام کو پھر حاضر ہوئے -

خدا تعالےٰ نے سوال کیا :-

اچھا میرے فرشتو بیان کرو - تم نے وہ نوٹ کیا کیئے ؟

پہلے فرشتے نے بیان کیا :-

میں زمین پر چلا جا رہا تھا - کہ ایک شکستہ حال فقیر نظر آیا - وہ نہایت ہی کثیف اور بدن پر میلے کچیلے چیتھڑے لگائے تھا - اس کے سر کے بال بکھرے ہوئے تھے - چہرہ سے بھوک اور مایوسی ظاہر ہوتی تھی شاید دو دن سے اس نے روٹی کا ایک ٹکڑا بھی نہیں کھایا تھا - وہ لاٹھی کے سہارے چلتا تھا -

فرشتے ہم آواز ہو کر چلائے ...... بدقسمت مفلوک الحال کبڑا ....

میں نے اُسے وہ نوٹ دیدیا - میرا خیال ہے کہ میں نے اس کے ساتھ بہت بڑی نیکی کی ہے - سب فرشتوں نے تعریف کی تم نے بہت اچھا کیا -

خدا نے فرمایا - نہیں -

میرے فرشتے تم نے روپیہ کو بری جگہ رکھا - اور تم نے میرے دوسرے فرشتے ایک ہزار کا نوٹ کس کو دیا -

دوسرے فرشتے نے عرض کیا -

میں ایک بڑے شہر میں پہنچا - میں نے ایک نہایت ہی حسین اور طرحدار نوجوان کو دیکھا وہ نہایت بیش قیمت لباس پہنے تھا - چمکدار جوتا اور بانکی ٹوپی اوڑھے تھا - اس کے تمام حرکات و سکنات سے غرور تمکنت ظاہر ہوتی تھی - لیکن اس کی جیبوں میں سوائے خطوط کے جو قرضخواہوں کے پاس سے آئے تھے ایک پائی بھی نہ تھی - اور وہ بھوکا تھا - مجھے اس کی حالت پر ترس آیا اور ایک ہزار کا نوٹ اس کو دیدیا - اس پر بھی فرشتوں نے کہا - "تم نے بہت اچھا کیا"

مگر خداوند نے انکار کیا -

میرے فرشتے تم نے بھی روپیہ کو خراب جگہ رکھا - اچھا آج سے ایک سال بعد پھر دنیا میں جانا - اور دیکھنا کہ ایک ہزار کے نوٹوں اور ان دونوں انسانوں کا کیا حشر ہوا -

---

پورا ایک سال گزرنے پر وہ فرشتے دنیا میں گئے - اور شام کو پھر خداوند تعالےٰ کے سامنے حاضر ہوئے -

خداوند نے سوال کیا -

میرے دوسرے فرشتے پہلے تم بیان کرو کہ تمہارا رنگیلا نوجوان کیا کرتا ہے ؟

فرشتے نے مسکرا کر جواب دیا -

وہ نوجوان تو بڑا بدمعاش نکلا - سال بھر تک وہ اسی ایک ہزار کے نوٹ سے عیش و عشرت کے ساتھ زندگی بسر کرتا رہا - اور آج تک اس کی جیب میں وہ نوٹ موجود ہے -

یہ کس طرح ؟

اس طرح کہ وہ نوجوان صبح کو روزانہ نئے ہوٹل میں جاتا ہے اور کھانا کھا کر قیمت ادا کرنے کو وہ نوٹ خانساماں کو دیتا ہے - لیکن خانساماں جو کہ اس نوٹ کا پورا روپیہ ادا نہیں کر سکتا جھک کر نہایت ادب سے کہتا ہے -

"میں التماس کرتا ہوں کہ کھانے کی قیمت دوسرے وقت ادا کر دیجئیگا"

اسی طرح وہ شام کے کھانے پر کرتا ہے - اس نے درزی کو بھی کچھ نہیں دیا - کیونکہ اس کے پاس نقد روپیہ نہیں ہے - وہ اپنے حجام

کا بھی قرضدار ہے۔ مکان کا کرایہ بھی ادا نہیں کرتا۔ باوجود اس کے سب لوگ اس کا اعتبار کرتے ہیں اور اسے کچھ روپیہ قرض بھی دیدیتے ہیں۔ اور اس کی خوشامد کرتے ہیں۔ کیونکہ لوگ خیال کرتے ہیں۔ وہ بہت آسودہ اور خوش حال شخص ہے۔ جس کے پاس ایک ہزار کا نوٹ ہر وقت موجود رہتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ نوجوان بڈھا ہو جائیگا اور ہمیشہ فارغ البالی سے زندگی بسر کریگا۔

اس بیان پر فرشتے ہنسنے لگے اور خداوند نے دوسرے فرشتہ سے کہا۔

اور تمہارے مفلوک الحال فقیر کا کیا حال ہے؟ کیا وہ اسی طرح اس نوٹ کے ذریعہ زندگی بسر کر رہا ہے؟

فرشتہ نے افسوس کہ لہجہ میں جواب دیا۔

مجھے جلد واپس جانا چاہیئے کیونکہ وہ میرے ساتھ آیا ہوگا۔ جب میں روانہ ہوا ہوں اس وقت وہ پھانسی پر لٹکایا گیا تھا۔ یہ سنکر سب فرشتے تھرا گئے۔ خداوند نے کہا۔

——— کیسے جاؤ ———

جب اس مفلس کو ایک ہزار کا نوٹ ملا تو وہ بہت خوش ہوا۔ فوراً بازار کھانا خریدنے گیا۔ اور نہایت عمدہ اور نفیس غذائیں کھائیں۔

اس کے بعد جب اس نے قیمت ادا کرنے کے لئے وہ نوٹ دیا تو ہوٹل کے مالک نے اسکو پولیس کے حوالے کر دیا۔ سپاہی بدقسمت آوارہ گرد کو کوتوالی لے گئے۔ کئی روز تک اس سے دریافت کرتے رہے۔ کہ یہ نوٹ اس نے کہاں سے پایا۔ اس مفلس نے جواب دیا۔ یہ نوٹ مجھے ایک فرشتہ نے دیا ہے۔ اس جواب پر سب لوگوں نے ایک فرمائشی قہقہہ لگایا۔

چند روز کے بعد پولیس اس نتیجہ پر پہنچی کہ یہ نوٹ تین مرتبہ کے قتل کا نتیجہ ہے۔ اور اس پر خون کے چھینٹے بھی نظر آنے لگے۔ انکی تعداد اتنی ہی تھی۔ جتنی مرتبہ اس مفلس نے ڈکیتی کی تھی اس کی لاٹھی پر خون کے نشان پائے گئے۔ بہت سے گواہ بھی مل گئے جنہوں نے قاتل کو مقتول کے گھر کے آس پاس چکر کاٹتے دیکھا تھا۔ آخرکار اس بدقسمت کو موت کی سزا دی گئی۔ اور پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔

یہ ہے ایک ہزار کا نوٹ۔ ایک اس کے ذریعہ سے زندگی کا لطف اٹھاتا ہے اور دوسرا موت کی نذر ہوتا ہے۔ لیکن ہزار کا نوٹ ہر حال میں ہزار کا نوٹ ہے۔

(ماخوذ)

ملکی انصاری

غزل

پریشاں خاطری میں لب پہ کیوں آئے دعا میری
نہ رسوائے جہانِ آرزو ہوگی وفا میری

مجھے عہدِ گزشتہ کی وفائیں یاد آتی ہیں
میری اس انتہا سے خوب تھی وہ ابتدا میری

میری فطرت کا مقصد ہے تغیر آشنا رہنا
نہ غم ہی مستقل میرا نہ راحت دیرپا میری

مقدر میں نہیں ہے کامرانِ آرزو ہونا
سزاوارِ اجابت ہو نہیں سکتی دعا میری

نذیر عہدِ جنوں کی شوخیاں سب یاد ہیں اب تک
طبیعت تھی قیامت کی سکوں ناآشنا میری

نذیر
(رانڈیرہ اسمٰعیل خاں)

انتقاد

نغمۂ دل

(شیخ نذیر احمد صاحب ظفر گجراتی کی غزلوں نظموں، رباعیوں اور افسانوں کا مجموعہ۔)

مقام اشاعت مصطفائی بکڈپو۔ کوچہ چابک سواراں لاہور۔

قیمت ۱۲؁۔ کتابت و طباعت گوارا۔

بدقسمتی سے مجھے فاضل مصنف سے تعارف کا فخر حاصل ہے اور اگر یہ ناخوشگوار فرض کسی اور شخص کے سپرد کیا جاتا تو مناسب ہوتا۔ لیکن اس حالت میں کہ مولینا تاجور دورے پر ہیں اور ادبی دنیا کا شعبہ نقد و نظر ہمیشہ میرے سپرد رہا ہے۔ مجھے اس کام کو انجام دینا ہی پڑیگا۔ مکرمی نذیر احمد صاحب ظفر ایک نوجوان انشاء پرداز ہیں۔ اور میں ان کو تین چار سال کے عرصے سے جانتا ہوں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ مجھے "جانتے" ہیں یا نہیں۔ اگر وہ "جانتے" ہیں تو انہیں معلوم ہوگا کہ میری حق گوئی کبھی بلند بانگ دعووں اور مسحور کن خطابوں سے مرعوب نہیں ہوئی۔ میں نے کبھی جنبہ داری اور تعصب سے قصداً کام نہیں لیا۔ اور میرا منتہائے نظریہ رہا ہے کہ ایسی "تخلیقات" جو اردو ادب کے لئے مہلک ہیں۔ ان پر صحیح معنی میں تجزیہی تنقید کی جائے۔ "نغمۂ دل" میں دس افسانے ہیں دسوں کے دسوں اس انداز میں لکھے گئے ہیں جو ادب لطیف کی تخلیق کے ضامن ہیں۔

"نسیمہ فردوس کی شگفتہ کلی۔ فطرت کے منتہائے خیال کا ایک جاندار عکس رنگیں اپنی جوانی سے دنیا کو جوان بنائے ہوئے ہے۔ اس کے سنہری دراز بال روحانیت کے شبنمی قطروں میں بھیگے ہوئے ہیں۔ اس کی آنکھوں سے مستی و کیف کی ایک الوہیانہ بارش ہوتی رہتی ہے۔"

مندرجہ بالا اقتباس مشتے از خروارے کا مصداق ہے۔ میں نے یہ فقرے پڑھکر انتہائی کوشش کی کہ نسیمہ کے رنگ حسن و جمال کی ایک تصویر اپنے ذہن میں قائم کر سکوں۔ لیکن مجھے ناکامی ہوئی۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ افسانوں میں قطعاً صداقت حقیقت ہو۔ اور جو مصنف حقائق کائنات سے سر مو تجاوز کرے اُسے گنہگار قرار دیا جائے۔ لیکن میں اس بات پر یقیناً مُصر ہوں۔ کہ کوئی صناع صداقت شعری کے اصول و قوانین کے خلاف ورزی کر کے کامیاب نہیں ہو سکتا۔ "بالوں" کے ساتھ "روحانیت کے شبنمی قطروں" کو جو حقیقی تعلق ہے اس سے قطع نظر ان دونو چیزوں میں کیا نسبت ہے جو پرواز تخیل کا موضوع بن سکے۔

× × × × ×

× × × × ×

"مستی اور کیف کی بارش"، صداقت حقیقی نہ سہی۔[1] صداقت شعری تو ہے کہ نگار دل افروز کی غزال گیر آنکھیں واقعتاً سرچشمہ نشاط و کیف ہیں۔ لیکن مستی و کیف کی "الوہیانہ بارش" تو صداقت شعری کی حدود سے بہت دور جا پڑی۔ ہو سکتا ہے کہ کیف و مستی الوہیانہ ہو۔ لیکن یہ کہ ان کی بارش الوہیانہ ہو۔ ایک ایسا تخیل ہے جو صرف ایک مریض کے دماغ ہی میں آسکتا ہے۔

یہ تو ہوئیں تحریر کی خوبیاں۔ اب موضوع اور معانی کی سحر آفرینیاں دیکھئے۔

موضوع اور اس کی جزئیات سے عدم واقفیت افسانہ نویسی کا پہلا اصول یہ ہے کہ افسانہ نگار جس چیز کے متعلق لکھنا چاہتا ہے اس کی تمام جزئیات پر حاوی ہو۔ یہ نہیں کہ ہندوستان میں بیٹھکر محض تخیل سے کام لیکر چین کی معاشرت کا نقشہ کھینچدے۔ پریم چند کی کامیابی کا یہی راز ہے۔ اس کے برخلاف نغمۂ دل کا فاضل مصنف اپنے موضوع اور اس کی جزئیات سے اسقدر بے خبر ہے۔ کہ قاری کو یہ خیال گزرتا ہے۔ کہ وہ اپنا مذاق اڑانا چاہتا ہے۔ فیروزہ (افسانے کا نام ہے) میں منصور ہیرو ہے۔ اور اپنی محبوبہ کو نہیں پا سکتا۔ کہ محبوبہ کی ماں اپنی لڑکی کے لئے صرف تعلیمیافتہ شوہر کا انتخاب کرنا چاہتی ہے۔ وہ اپنی محبوبہ کی والدہ کے نام ایک خط لکھکر رکھ جاتا ہے جس میں مندرجہ ذیل فقرے ہیں۔

"آپ سے منصور کی آخری التجا یہی ہے کہ تین سال تک فیروزہ کسی سے وابستہ نہ کی جائے۔ اگر میں اپنے مقاصد میں کامیاب ہو کر واپس آؤں تو فیروزہ میری ہو گی۔ اگر میں نہ آؤں تو پھر آپ کو اختیار ہوگا۔"

---

[1] صداقت حقیقی صداقت شعری کے مقابلے میں استعمال کیا گیا ہے۔ ورنہ ہر صداقت حقیقی ہے۔

اس کے بعد منصور علیگڑھ میں پہلے تو کچھ دنوں پرائیویٹ پڑھتا رہا۔ پھر مصنف کے لفظوں میں "اس نے پہلا امتحان بی اے کا دیا"۔ فاضل مصنف کو معلوم ہونا چاہیئے کہ بی اے کا امتحان دینے کے لئے پہلے انٹرنس اور پھر الیف اے کا امتحان دینا ضروری ہے۔ ممکن ہے علیگڈھ میں لوگ "پہلا امتحان" بی۔ اے کا دیتے ہوں۔ اگر یہ صحیح ہے تو علیگڈھ کالج کے ٹرسٹیوں کو اس طرف متوجہ ہونا چاہیئے۔ اور اگر یہ صحیح نہیں تو فاضل مصنف کے اختراعات ذہنی کی داد دینی چاہیئے۔ بی۔ اے کرنے کے بعد فاضل مصنف کے الفاظ میں منصور کالج میں داخل ہوتا ہے۔ پھر یونیورسٹی نے اُسے اپنے خرچ پر انگلینڈ بھیجدیا جہاں اُس نے بڑی کامیابی سے ایم۔ اے کا امتحان دیا۔ لطف یہ ہے۔ کہ یہ تمام مراحل بقول مصنف صرف دو سال اور دس ماہ میں طے ہوئے۔ فرض کر لیجئے کہ منصور نے انٹرنس کا امتحان بھی پرائیویٹ دیا اور الیف۔ اے بی۔ اے کا بھی پرائیویٹ دیا۔ لیکن صرف ان ہی مراحل میں اس کے چار سال صرف ہو گئے ہونگے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ دو سال دس ماہ کے عرصے میں ان امتحانات کے علاوہ انگلستان جاکر ایم۔ اے کا امتحان بھی دے۔

قوت مشاہدہ کا فقدان | فاضل مصنف ناتجربہ کار ہے۔ اور صرف ناتجربہ کار ہی نہیں بلکہ اس کی قوت مشاہدہ اسقدر کمزور ہے کہ وہ ہزاروں مرتبہ دیکھی ہوئی چیزوں سے بھی صحیح نتائج نہیں نکال سکتا "خوش نصیب" کا ہیرو اصغر نامی ایک نوجوان ہے۔ جو کسی سادہ دل حسین عورت سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ ایک دن وہ سیر کے لئے جا رہا تھا کہ اس نے دیکھا کہ ایک عورت برقع میں ملبوس ٹہلتی ہوئی جا رہی ہے۔ یہاں فاضل مصنف رقمطراز ہے:۔ "اصغر نے اسے دیکھا۔ قرائن سے سادگی کے آثار ہویدا تھے" سمجھ میں نہیں آتا کہ اصغر نے کن قرینوں سے عورت کی سادگی پر استدلال کیا۔ عورت برقعہ میں ملبوس تھی۔ اور برقعہ کی تراش خراش کے متعلق مصنف خاموش ہے۔ پھر لکھتے ہیں:۔

تھوڑی دیر بعد اس نے پھر مُڑ کر دیکھا تو برقع پوش عورت نے اس کے قریب آکر کہا "کیا آپ میری مدد کر سکتے ہیں؟"

فاضل مصنف کو معلوم ہونا چاہیئے۔ کہ برقع پوش عورتیں اس طرح اجنبیوں سے کلام نہیں کرتیں۔ اگر کوئی شریف زادی برقع پوش اس طرح کرتی ہے تو کم از کم یہ بات میرے علم میں نہیں عصر حاضر کی جو لڑکیاں اجنبیوں سے بے تکلفانہ گفتگو کر سکتی ہیں وہ برقع پوش نہیں ہوتیں۔ اور میں تو سمجھتا ہوں کہ شاید بے پردہ بھی اجنبی مرد سے اس طرح تخاطب نہ کریں۔ اب معلوم ہوا ہے کہ برقع پوش عورت کا نام شکیلہ ہے اور وہ اپنے باپ کو ساتھ لیکر مسوری پہاڑ پر آئی تھی۔ وہ بے حد غریب ہے اور بقول خود روپیہ بالکل ختم ہو چکا ہے۔ للعجب یہ لڑکی مال روڈ پر کمرہ میں رہتی ہے۔ عسرت اور غربت اسقدر کہ ایک اجنبی سے بھیک مانگنے پر مجبور اور قیام مال روڈ پر۔

زندگی کے متعلق نقطۂ نظر | ہر ایک ناول اور افسانہ جہاں مصنف کے جذبات و اعتقادات و میلانات کا آئینہ دار ہوتا ہے وہاں بہت بڑی حد تک زندگی کے متعلق اس کے زاویۂ نگاہ کی ترجمانی بھی کرتا ہے۔ ناول اور افسانے کے کردار مصنف کے نظریۂ حیات کی نقاب کشائی کرتے ہیں اور اگرچہ کرداروں کی تخلیق اس صناعانہ طریقے سے کی جاتی ہے کہ وہ جیتے جاگتے آدمی معلوم ہوتے ہیں لیکن مصنف کے جذبات کا ایک رنگ ہمیشہ ان میں جھلکتا رہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ [illegible] اور ناول میں یہی فرق ہے کہ [illegible] میں صناع علی الاعلان انفرادی اور ذاتی جذبات کا اظہار کرتا ہے اور ناول میں درپردہ۔ اس طرح ناول "گفتہ آید در حدیث دیگراں" کا بہترین مصداق بنجاتا ہے۔ نغمۂ دل کے افسانوں میں اوّل تو کوئی مکمل نظام عمل اور نظریہ حیات موجود نہیں ہے۔ اور جہاں کہیں اس طرح کا رنگ جھلکتا ہے اس کے عناصر اسقدر مکروہ اور ذلیل ہیں کہ کوئی خوددار مصنف ایسے نظریے پر اعتقاد رکھتے ہوئے اپنی تخلیقات کو کامیاب نہیں کہہ سکتا۔ "فطرت کی منشا" نغمۂ دل کا دوسرا افسانہ ہے۔ اس کا ہیرو فاضل ملازمت کے برخلاف ہے اور اپنی فکرمندیوں سے مضمحل، وہ کسی مقصد کے بغیر کلکتے روانہ ہو جاتا ہے۔ راہ میں اُسے چیا نگ کانگ (چیانگ کام) کے جج کی لڑکی ملتی ہے۔ دونو کو ایک دوسرے سے عشق ہو جاتا ہے۔ فاضل جج کی لڑکی سے شادی کر لیتا ہے* اور یوں مصنف کے الفاظ میں فطرت کی منشا پوری ہوتی ہے۔ روپیہ پیدا کرنے کا اس سے ذلیل طریقہ شاید ہی کسی کے تصور میں آسکے۔ ملازمت کے علاوہ روپیہ کمانے کے سینکڑوں شریفانہ طریقے ہیں۔ لیکن افسوس فاضل مصنف نے اپنے ہیرو کے لئے کسی باعزت طریق کار کا انتخاب نہ کیا۔

* کچھ عرصے کے بعد جج مر جاتا ہے اور اپنی تمام دولت فاضل کے لئے چھوڑ جاتا ہے۔

"حسن مغلوب" "کامیاب مصور" "سلطان" "حسن کا فاتح" تمام فسانے مصنف کی مندرجہ بالا کمزوریوں کے آئینہ دار ہیں۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ ان افسانوں کی قیمت اس کاغذ سے کمتر ہے جس پر یہ شایع کئے گئے ہیں۔

نظمیں من حیث المجموع نظمیں شعر کے معیار پر پوری نہیں اترتیں۔ میں خود فارسی تراکیب کا مداح ہوں۔ لیکن یہ ناگوار ہے کہ مہمل ترکیبیں برتی جائیں۔ اور ان سے کلام میں ظاہری ٹیپ ٹاپ پیدا کرنے کی کوشش کیجائے "شاعر کے دل" میں مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں ؎

نغمۂ الہام پرور کا اسے کہئے رباب
یا مکمل تر سکون ابتہاج ماہتاب
یا وقار آدمیت کا نظام منجلی؟
نطق کی گنجالشوں کا مرمریں گوہر کہیں

اگر فاضل قارئین کرام میں سے کوئی صاحب آخری معمّے کا مطلب حل کر سکیں تو میں ان کا نہایت ممنون ہونگا۔ عورت کے عنوان سے انہوں نے جو نظم لکھی ہے سوائے اس کے کہ اُسے الفاظ کا گورکھ دھندا کہا جائے وہ کسی اور خطاب کی سزاوار نہیں عورت ایک ایسا عنوان ہے۔ جو دنیا کی بہترین نظم کا موضوع بن سکتا ہے لیکن میں ڈرتا ہوں کہ جنس لطیف اس نظم کی وجہ سے ہمیشہ ظفر صاحب کی شاکی رہیگی۔

چشمان تو زیر ابرو انند
دندان تو جملہ در دہانند

کی بہترین تفسیر ملاحظہ کرنی ہو۔ تو مندرجہ ذیل مصرع ملاحظہ فرمائیے۔

شوہر پرست بھی ہے خدمتگزار بھی ہے
نوہالکہ ہے گھر کی

بارش کا پہلا قطرہ ایک عامیانہ نظم ہے جس کا خیال غالباً

گھنگور گھٹا تلی کھڑی تھی
پر بوند ابھی نہیں پڑی تھی

سے مستعار لیا گیا ہے۔ اس نظم میں نہ تو مولوی اسمٰعیل میرٹھی کا سا ترنم ہے۔ نہ وہ سادگی۔ نہ وہ الفاظ کا دروبست، اس کے برخلاف بارش کا پہلا قطرہ ایک ایسی تھکا اور اکتا دینے والی ٹیپ ہے جو کتاب کو ہاتھ سے پھینک دینے پر مجبور کر دیتی ہے۔

غزلیات غزلیں نسبتاً اچھی ہیں۔ اور اگر ظفر صاحب مشق سخن کرتے رہے اور ادب لطیف کی نام نہاد رنگینوں۔ جادوئیوں۔ صباحتوں اور سیمینیوں کے دام سے آزاد ہو گئے تو اچھے شعر کہہ سکیں گے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے اشعار میں۔ تیر۔ نمکدان۔ واہ ہائے گریباں خنجر قاتل۔ بے آبروئی اکثر نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ خامیاں ایسی نہیں کہ دور نہ ہو سکیں۔ کہیں کہیں غیر ضروری ردلیف اور قافیہ شائگاں بھی دکھائی دیتا ہے۔ زبان صاف ہے اور نظموں کی طرح مغلق اور "رنگین" نہیں۔ مجھے ان کا یہ شعر مدت سے پسند ہے ؎

تیری بیداد کا انداز تغافل تو نہ تھا
تیری بیداد نہیں۔ یہ تری بیداد نہیں

مجھے حیرت ہوتی ہے اور افسوس بھی۔ کہ اس شعر کا مصنف نسائوں کے معاملے میں اسقدر کور ذوق ہے۔ ان کی غزلوں کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

شائد لحد کی گود میں راحت نصیب ہو
طے کر چکا ہوں منزل عمر رواں کو میں
رفعت پسندیاں ہیں یہ میری نگاہ کی
کعبہ سمجھ رہا ہوں ترے آستاں کو میں
جلوہ ہے ہر کلی میں کسی کے جمال کا
جنت سمجھ رہا ہوں ظفر گلستاں کو میں

آخری شعر کو پڑھ کر مجھے اپنا ایک شعر یاد آگیا ؎

جنت کو اُن کے حسن سے پہچانتا ہوں میں
جنت ہے ان کی صورت زیبا مرے لئے

بہر نوع میں محسوس کرتا ہوں کہ میں نے اس کتاب پر مفصل تنقید لکھ کر اپنے وقت کا ایک گرانقدر حصہ ضائع کیا۔ میں اپنے مقصد انتقاد کی طرف ابتدائے مضمون میں اشارہ کر چکا ہوں اور امید ہے کہ ظفر صاحب اس صاف گوئی کے لئے معاف فرمائیں گے۔

عابد

مولینا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی کی تصنیفات

"قول حق":- قیمت دو روپے - مقام اشاعت مینجر عبرت نجیب آباد

قول حق اس سوال کا جواب ہے - کہ مسلمانان عہد حاضر سے ہر اچھی چیز کیوں رخصت ہو رہی ہے - اور ہر برا وصف کیوں ترقی کر رہا ہے - کتاب کا موضوع اہم اور دلچسپ ہے - اس پر مصنف کے انداز بیان اور رنگ تحریر نے کتاب کی دلچسپی میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے - کتاب آٹھ ابواب پر مشتمل ہے - پہلے چار ابواب میں ان فتنوں کی تفصیل دی گئی ہے - جن کے باعث مسلمان قعر مذلت میں گرتے جا رہے ہیں - آخری چار ابواب میں ان فتنوں کے انسداد کے صحیح طریق بتائے گئے ہیں - یہ کتاب اس قابل ہے کہ ہر مسلمان اسے اپنی لائبریری کی زینت بنائے -

آئینہ حقیقت نما جلد دوم:- ہندوستان کی تاریخ کے متعلق یورپی مورخوں نے جسقدر غلط بیانی سے کام لیا ہے وہ اظہر من الشمس ہے - مولوی ذکاءاللہ صاحب اپنی تاریخ ہندوستان اور علامہ شبلی اپنی ہر تاریخی تصنیف میں ان باتوں کی طرف تفصیلی اور جزوی اشارات کر چکے ہیں - ہر شخص سلطان محمد تغلق کو ایک جابر و ظالم شہنشاہ تصور کرتا ہے - لیکن مولینا اکبر شاہ خاں صاحب نے اپنے ناقابل اتباع انداز استدلال سے ثابت کر دیا ہے کہ یہ تمام الزامات بے بنیاد ہیں - یہ کتاب تاریخ نویسی میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتی ہے قیمت ۱۲/ عہ

خواص خاں ولی:- خواص خاں ولی ہندوستان کے مشہور شہنشاہ شیر شاہ اعظم کا سپہ سالار تھا - مولینا نے اس کتاب میں اس نامور سپہ سالار کے حالات بڑی تفصیل سے رقم کئے ہیں - اس کی زندگی عبرت و بصیرت کا خزانہ ہے - اور ارباب نظر کے لئے اس کے حالات میں اتنے خزائن تفکر نہاں ہیں کہ آٹھ آنے کا صرف اس گرانقدر متاع کے مقابلے میں کچھ حقیقت نہیں رکھتا -

خان جہاں لودھی:- خاں جہاں لودھی عہد جہانگیری کا سب سے بہادر سپہ سالار تھا - یہ سپہ سالار شاہجہان کے عہد میں بڑی بیدردی سے قتل کیا گیا - مولینا موصوف نے اس نامور سپہ سالار کو بقائے دوام کا خلعت بخشا ہے - جس کے لئے ہر با حمیت مسلمان کو ان کا شکر گزار رہنا چاہئے - قیمت ۶/ ر

تاریخ اسلام دو جلدیں:- قیمت ساڑھے سات روپے

اس تاریخ میں خاندان عباسیہ تک ان تمام اسلامی حکومتوں کا حال مندرج ہے جو عہد عباسیہ کے آخر تک دنیا کے مختلف حصوں میں قائم ہوئیں یا قائم ہو کر فنا ہو چکی تھیں - مولینا کی دوسری تصانیف کی طرح یہ کتاب بھی نہایت محنت اور عرقریزی سے ترتیب دی گئی ہے - اس دور میں جبکہ نوجوان مسلمانوں کا گروہ اپنے آباو اجداد کے زریں کارناموں سے بے خبر ہوتا چلا جا رہا ہے - ان کتابوں کا ہر لائبریری میں موجود ہونا ضروری ہے -

سپاہیانہ زندگی:- اس کتاب میں یہ دکھایا گیا ہے کہ اسلامی زندگی نام ہے شجاعت اور دلاوری کی زندگی کا - جن لوگوں نے عیش و نشاط کی زندگی کو منتہائے مقصود سمجھ رکھا ہے وہ غلطی پر ہیں - اس کتاب کے مطالعے سے مستعدی اور محنت کی عادت پیدا ہوتی ہے - قیمت عہ ر

مذہب اور تلوار:- اس کتاب میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ یہ الزام قطعاً غلط ہے - کہ اسلام بزور شمشیر پھیلا - قیمت صرف ۹ ر

اکابر قوم:- اس رسالے میں مسلمان اکابر کے حالات زندگی درج ہیں - قیمت ۶ ر

پردے پر ایک نظر:- موضوع نام سے ہی ظاہر ہے - قیمت ۶ ر

گائے کی تاریخی عظمت:- " " قیمت ۴ ر

وید اور اس کی قدامت:- " " قیمت ۴ ر

دنیائے ادب

ابوالعتاہیہ اور اس کی شاعری

ابوالعتاہیہ عرب کے ان مسلمان شعراء میں سے ایک ہیں، جنکو اپنے وقت کا ملک الشعراء کہنا چاہئے - جو رتبہ ایران میں شیخ سعدیؒ کا فارسی میں ہے. وہی عرب میں ابوالعتاہیہ کو عربی شاعری میں دیا جاسکتا ہے - چنانچہ اس کی سادگی الفاظ سلاستِ زبان اور فطری طرزِ ادا قابلِ ستائش ہے -

ابوالعتاہیہ کے کلام میں سب سے زیادہ قابلِ تعریف یہ امر ہے کہ وہ فلسفہ کے بلند و وسیع خیالات تک کو نہایت سلیس عبارت میں بیان کردیتا ہے - جو قوانی اور بحور اس نے بالعموم استعمال کی ہیں وہ نہایت آسان اور بے حد سیدھی سادھی ہیں اس کے خیالات بھی زیادہ پیچیدہ نہیں ہوتے جس کے لئے زیادہ دماغ سوزی کرنا پڑے - جن خیالات کو وہ ظاہر کرتا ہے ان کے لئے وہ نہایت عمدہ چیدہ اور منتخب الفاظ استعمال کرتا ہے - اگر بغور دیکھا جائے تو یہی اس کی شاعرانہ کامیابی اور ہر دلعزیزی کا راز ہے - غالباً یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ عربی شاعری کا سب سے پہلا اور شاید سب سے آخری شاعر ہے جس نے سب سے پہلے اس قدر سادہ اور آسان زبان استعمال کی ہے اور اس طرح یہ ثابت کردیا کہ ایک شاعر بغیر ادق اور پیچیدہ زبان لکھے ہوئے بھی شاعری کو نبھا سکتا ہے - اس کے کلام میں متروک کا استعمال ایک لفظ بھی نہیں ملتا - اور نہ اس نے محض قافیہ کی پابندی کے لئے کسی جگہ بھی کوئی ناموزوں لفظ استعمال کیا ہے - اس کی تمام شاعری پر نظر غائر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ اس کو اپنے شاعرانہ انداز اور زبان پر اس قدر عبور ہے کہ گویا وہ نہایت روانی کے ساتھ برجستہ طور پر محض اشعار میں گفتگو کر رہا ہے - چنانچہ وہ کہا بھی کرتا تھا کہ اگر وہ چاہے تو محض اشعار میں بھی گفتگو کرسکتا ہے - اس سے اس کے قادر الکلام ہونے کا پتہ چلتا ہے اس نے جو فی البدیہہ نظمیں لکھی ہیں وہ اس کے معیارِ شاعری کے بالکل مطابق ہیں -

ابوالعتاہیہ کے تمام دیوان کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جن امور پر اس کا قلم بالعموم جولانگاہی کرتا تھا - وہ زیادہ تر زہد و اتقا، منظرِ موت قناعت حوادثاتِ زمانہ اور اسی قسم کے دیگر مضامین ہوتے تھے - چنانچہ اکثر مقامات پر اس نے بیان کیا ہے کہ یہ دنیا محض فانی ہے - اور اس کے بعد ایک اور عالم ہے - جس کو جاودانی کہا جاسکتا ہے - اور اس عالم میں انسان کی ذاتی نیکی اور زہد و اتقا ہی کام دے سکتا ہے - جس کے لئے ہر انسان کو ہمیشہ تیار رہنا چاہئے -

مسٹر نکلسن اس کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ابوالعتاہیہ یکسانیت کے ساتھ غم و اندوہ کے مناظر بیان کرتا ہے - انسانی مصائب اور اموات کا سچا خاکہ کھینچ دیتا ہے - وہ خدا سے ڈرانے اور نیکی کرنے کی ہدایت کرتا ہے - تاکہ وہ یہاں زادِ آخرت جمع کرلے - اگرچہ مسٹر نکلسن نے غم و اندوہ کے مضامین لکھنے پر اس کو ملامت کی ہے - لیکن دائرۃ المعارف اسلامیہ میں اس بارے میں اس کے بالکل خلاف شہادت ملتی ہے

ادب عربی میں ابوالعتاہیہ ہی پہلا وہ فلاسفر شاعر ہے - اور اگرچہ اس کی شاعری فلسفیانہ انداز میں ہے - لیکن وہ سب اسلامی عقائد کی روح رواں ہے - اور اس لئے اس کا اثر براہ راست ایک مسلمان کے دل و دماغ پر ہوتا ہے - ایک مرتبہ کسی نے اس سے یہ دریافت کیا کہ آیا وہ علم العروض سے بھی واقف ہے - اس نے اس کا یہ جواب دیا کہ میں عروض سے بالاتر ہوں -

چونکہ اس کو ادق الفاظ - پیچیدہ عبارت اور ناقابلِ فہم خیالات سے شروع ہی سے نفرت رہی - اس لئے اس کا کلام تمام دیگر عربی شعراء سے اپنی سادگی اور سلاستِ زبان کی وجہ سے متقدمین شعراء کے کلام میں ممتاز رہا - چنانچہ وہ اپنی سیدھی سادھی زبان میں، نہایت لطیف پیرایہ میں خواہشاتِ نفسانی اور پرہیزگاری کے متعلق بیحد مؤثر طور پر ایک جگہ لکھتا ہے -

اشد الجهاد جهاد الهوىٰ ⁂ وما كرم المرء الا التقىٰ

(سب سے زیادہ مشکل جہاد انسان کا اپنے نفس کے ساتھ ہے۔ اور بغیر پرہیزگاری کے کوئی شخص برگزیدہ نہیں ہو سکتا)

یہ شعر اگر غور سے دیکھا جائے تو اپنی سلامت اور راست گوئی میں بہترین شعر کہا جا سکتا ہے۔

ابوالعتاہیہ مدینہ منورہ کے قریب ایک گاؤں عین تمر میں پیدا ہوا۔ اس کا پورا نام ابوالاسحاق اسمٰعیل بن قاسم ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا باپ پیشہ کے اعتبار سے کوئی بڑا معزز شخص نہ تھا۔ بلکہ حجام تھا۔ چنانچہ اسی نسبی کمزوری کے متعلق اس نے کسی موقع پر کہا تھا۔

الا انما التقوی ھی العز والکرم ؛ وحبک للدنیا ھو الفقر والعدم
ولیس علی عبد تقی نقیصۃ ؛ اذا صحح التقوی وان حاک او حجم

(بجز ورع و پرہیزگاری اور کوئی چیز قابل عزت نہیں ہے اور تمھارے فقر اور ناداری کا سب سے بڑا سبب تمھاری دنیا کی محبت ہے۔ اور کسی پرہیزگار میں کوئی نقص نہیں ہو سکتا۔ اگر پورا پورا متقی ہو۔ خواہ کپڑا سینے یا حجامت کرے۔)

ایک اور موقع پر اسی کے متعلق اس نے ایک شعر کہا ہے۔

واذا تناسبت الرجال فما اری ؛ نسبا یقاس بصالح الاعمال

(لوگ اپنے نسب کے متعلق شیخی مارتے ہیں۔ لیکن میرے نزدیک کوئی نسب نیک افعال و اعمال کا مقابلہ نہیں کر سکتا)

ابوالعتاہیہ کی تربیت شہر کوفہ میں ہوئی اور یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ یہ اور اس کا بھائی مصر کے چند غلاموں کی شرکت میں مٹی کے برتن بنانے کا کام کیا کرتے تھے۔ اور جب کسی نے اس سے اس کے بارے میں کہا کہ تم کمہار ہو تو اس نے برجستہ جواب دیا کہ بیشک میں بحور اور قوافی کا کمہار ہوں۔ اس کے ہمعصروں میں سے کسی نے لکھا ہے کہ میں نے بچشم خود دیکھا ہے کہ اکثر نوعمر شاعری کے دلدادہ اس زمانے میں جبکہ وہ برتن بنایا کرتا تھا۔ اس کے پاس آیا کرتے تھے۔ اور اس کے کلام سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ جو اشعار ان کو پسند آتے تھے وہ وہیں اس کے پاس مٹی کے ٹھیکروں پر ان کو لکھ لیا کرتے تھے۔

ابوالعتاہیہ کے لغوی معنی "مغرور یا خبط الحواسی کے باپ" کے ہیں چونکہ اس کو ہمیشہ سے تبختر و تکبر تھا۔ اور وہ اپنی شہرت کا بھی بیحد شائق تھا۔ اس لئے اس کا لقب بھی ابوالعتاہیہ ہی ہو گیا۔ اور واقعہ بھی یہ ہے کہ یہ لقب اس کی عادات و فضائل کے اعتبار سے بیحد موزوں تھا۔ جس کی وجہ سے وہ عرب کی ادبی اور شاعرانہ دنیا میں زندہ جاوید ہو گیا۔

وہ عربوں کی طرح گورے چٹے رنگ کا نہایت وجیہ اور خوبرو شخص تھا۔ اس کے سر پر گھونگھر والے بال نہایت خوش وضع تھے۔ بہ حیثیت ایک شاعر کے اس کی جودت طبعی کسی ایک ہی مضمون تک مختص نہ تھی۔ بلکہ اس کی شاعری کے خوان یغما پر انواع و اقسام کے لذائذ موجود ہوتے تھے۔ چنانچہ اصمعی جیسا نکتہ چین اور دقیقہ سنج اس کے متعلق کہتا ہے کہ ابوالعتاہیہ کی شاعری ایک شاہانہ وسیع صحن کی مانند ہے۔ جس میں جواہرات۔ سونا۔ خاک۔ مٹی۔ اور کھجور کی گٹھلیاں تک ہوتی ہیں۔ اس مثال سے وہ اس کی شاعری میں تنوعات کو ثابت کرنا چاہتا ہے۔

جب ابوالعتاہیہ کو اپنے متعلق پورے طور پر یقین ہو گیا کہ خدا تعالیٰ نے اس کو شاعری کا جوہر ودیعت کیا ہے تو وہ اپنے گھر کی گمنامی سے نکل کر اس گوہر ناسفتہ کے قدردانوں کی خدمت میں روانہ ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ بغداد علم و ادب کا سرچشمہ تھا۔ چنانچہ یہ بھی اپنے ہمراہ موصل کے ایک دوست کو لیکر روانہ ہوا۔ لیکن دوران سفر میں ہی اس کا دوست اس سے الگ ہو گیا۔ اور یہ مقام حیرہ میں قیام پذیر ہو گیا۔ وہاں سے اسکی شاعری کی شہرت جا بجا پھیلی۔ اور جب اس کا چرچا خلیفہ مہدی کے کانوں تک پہنچا تو وہ اس کا نادیدہ مشتاق ہو گیا۔ اور نہایت شوق سے اس کو اپنے دربار میں طلب کیا۔ شاعر نے اپنی جودت طبع سے خلیفہ کی شان میں نہایت شاندار قصائد سنا کر شاہانہ عطیات حاصل کئے۔

اس کے بعد خلفا کے دربار میں اسی طرح وہ ممتاز رہا۔ چنانچہ خلیفہ ہارون الرشید۔ خلیفہ ہادی۔ مامون الرشید۔ اس کی شاعری کی داد اپنی شاہانہ فیاضیوں سے برابر دیتے رہے۔ اور وہ اس کے بے حد مداح تھے

اس کی شاعری کی بابت تمام شعرائے عرب باتفاق رائے اس کی تعریف میں رطب اللسان رہے ہیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ ابونواس اور چند دیگر ادیبوں میں سے کسی نے ابوالعتاہیہ کی شاعری کے متعلق دریافت کیا تو اس نے کہا کہ یہ مختلف حیثیتوں سے بہترین شاعر کہا جا سکتا ہے۔

ابوالعتاہیہ دربار خلیفہ مہدی میں ایک عرصہ تک خراج تحسین وصول کرتا رہا۔ اسی اثناء میں اتفاق سے اس کو خلیفہ کی ایک چھوکری عتبہ سے عشق ہو گیا۔ وہ شاعرانہ جذبات اور اپنی والہانہ طبیعت سے مجبور ہو کر اپنے اشعار میں بھی اس کا نام لکھنے لگا۔ اور اس کے متعلق عشقیہ اشعار کہنے لگا۔ جب اس کا علم خلیفہ کو ہوا تو وہ بہت خفا ہوا۔ اور بالآخر اس کو قید کر دیا گیا۔ کچھ عرصہ بعد جب قید خانہ کی تکالیف نے اس کے دماغ کو عشق کے تمام جراثیم سے پاک و صاف کر دیا۔ تو اس نے پھر دربار خلافت میں اپنی عفو تقصیر چاہی۔ خلیفہ کو اس کی حالت پر رحم آ گیا۔ اور بالآخر اس کو رہا کر دیا گیا۔

(معارف)

رنگِ تغزّل

مضمحل سعیِ چارہ گر نہ ہوئی | اور شفا قصہ مختصر نہ ہوئی
صبح ہوتی نہیں ہماری شام | ورنہ کس شام کی سحر نہ ہوئی
ترکِ تدبیر کو بھی دیکھ لیا | یہ بھی تدبیر کارگر نہ ہوئی
یوں ملی ہر نگاہ سے وہ نگاہ | ایک کی ایک کو خبر نہ ہوئی
اللہ اللہ یہ حُسنِ پرسشِ حال | کہ مرے حال پر نظر نہ ہوئی
ہجر کے بھی ہزار پہلو تھے | یوں بھی اک وضع پر بسر نہ ہوئی

آج تسکینِ دردِ دلِ فانیؔ
وہ بھی چاہا کئے مگر نہ ہوئی

فانیؔ

جہانِ دلبری میں دلرُبا تجھ سا نہیں پایا | ترے حُسنِ ستم کو بھی محبّت آفریں پایا
وہ آنسو جن کی کچھ قیمت نہ تھی تیری نگاہوں میں | اُنھیں کو رونقِ دکانِ جیب و آستیں پایا
سمجھتا تھا کہ ہے آزاد مطلق مملکت دل کی | اسے بھی بادشاہِ حسن کے زیرِ نگیں پایا
نیازِ عشق نے گل کے عوض سجدے بکھیرے ہیں | جہاں تیرا قدم دیکھا وہیں نقشِ جبیں پایا

محبت حشر ساز حسن کے تاروں کی جنبش ہے
اسی سے روحِ شاعر نے سرودِ شکریں پایا

حشر

فرانسیسی

علم انسانی

انسان کیا ہے؟ عظیم اشیا کے مقابلے میں اس کی ہستی کچھ نہیں اور حقیر اشیا کے مقابلے میں وہ ایک بڑی چیز ہے، فطرت کی عظمت سے وہ کوسوں دور ہے۔ ادھر دوسری طرف فطرت کی حقیر اشیا سے بھی اُسے کوئی علاقہ نہیں وہ اس عدم سے ناواقف ہے جہاں سے آیا ہے اور اس ابد کو پہچاننے سے عاری جو صرف خدا کی خصوصیت ہے۔ وہ ازل کے راز کو نہیں پا سکتا۔

ذہنی تخلیقات میں اس کا دماغ وہی حیثیت رکھتا ہے جو اس کا جسم جسمانی اشیا میں۔ اس کا دماغ صرف حیات کے مراکز کا ایک مبہم سا تصور قایم کر سکتا ہے۔ اور کچھ نہیں۔ نہ اُسے مخزن کا کچھ پتا نہ مجموعہ کا۔ ہر شے عدم سے پیدا ہوتی ہے۔ پھر ازل اور ابد کے رموز میں گم ہو جاتی ہے۔ کون اس تسلسل کا راز دریافت کر سکتا ہے۔ ان رموز کا خالق قادر مطلق ہے اور صرف وہ ان رموز کو سمجھتا ہے۔ یہی حال ہمارے حواس کا ہے۔ انتہا پر پہنچکر وہ بیکار ہو جاتے ہیں۔ وہ کسی انتہائی مصیبت کو برداشت کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ بہت زیادہ شور ہمیں بہرا کر دیتا ہے۔ بہت زیادہ روشنی ہمیں اندھا کر دیتی ہے۔ ایک خاص نقطے سے قریب تریا دور تر ہو کر ہماری قوت بصیرت میں فرق آ جاتا ہے۔ تقریر زیادہ طوالت زیادہ اختصار سے بے معنی ہو جاتی ہے۔ گرمی ہو یا سردی جب حد سے گذر جائے۔ پھر ہمیں اس کا احساس نہیں ہوتا۔ تمام انتہائی کیفیات ہماری دشمن ہیں۔

یہ ہے ہماری صحیح حالت۔ ہم ایک وسیع مرکز پر قایم ہیں اور ادھر سے اُدھر اُدھر سے اِدھر حرکت کر رہے ہیں۔ علم اور جہالت کے درمیان اگر ہم زیادہ آگے بڑھنے کی کوشش کریں تو ہمارا منتہائے نظر جھلملا کر آنکھوں کے آگے سے غائب ہو جاتا ہے۔ ہوا میں تحلیل ہو جاتا ہے اور ہمیشہ کے لئے ہمارے دام تصور سے نکل جاتا ہے۔ یہی ہماری فطرتی حالت ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ یہ حالت ہماری طبیعت کے خلاف بھی نہیں۔ ہمارے دل میں ہر شے کا راز دریافت کرنے کا شعلہ بھڑکتا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ایک بلند تعمیر تیار کریں اور اس قدر بلند کہ آسمان سے باتیں کرنے لگے۔ اور پھر بلند ہوتا ہوتا خدا کی ہستی تک پہنچ جائے۔ لیکن ہماری عمارت تڑق جاتی ہے۔ زمین پھٹ جاتی ہے۔ اور ہماری کوششیں برباد ہو جاتی ہیں۔

(پاسکل)

بلجیم

محبت اور خاموشی

جب جوشِ حیات مکدر ہو جاتی ہے اور اس وقت ہم گفتگو کرتے ہیں۔ جب ہم حقیقت سے کوسوں دور ہو جاتے ہیں اور اپنے بھائیوں کی طرف سے بے پرواہ تو ہم زبان کھولتے ہیں اور پھر جونہی کہ ہم زبان کھولتے ہیں۔ ہمیں احساس ہو جاتا ہے کہ آسمانی بادشاہت کے مقدس دروازے ہمارے لئے بند ہو گئے۔ اس لئے ہم خاموشی کو سینے سے لگا کر رکھتے ہیں۔ اور تحمل سے کام لیتے ہیں۔ ہمارے دل میں مافوق الفطرت صداقتوں کا احساس کرنے کی ایک جبلی قوت موجود ہے جو بر وقت کام کرتی ہے۔ ہم احساس کرتے ہیں کہ ان لوگوں کے سامنے خاموش رہنا جن سے ہم کو کوئی تعلق نہیں یا جن سے ہم محبت کرنا نہیں چاہتے خطرناک ہے۔ صرف وہی زندگی باقی کہلا سکتی ہے جس کے اجزا خاموشی سے بنے ہوں۔ خوب غور سے سوچو۔ دل کی گہرائیوں میں جہاں فرشتے اپنے پر پھیلا کر رقص کرتے ہیں۔ خاموشی کس قدر اچھی معلوم

ہوتی ہے۔ جب تم ان لوگوں کا تصور کرتے ہو جن سے تم کو محبت رہی ہے۔ تو ان کی گفتگو کے بدلے ان کی خاموشی کا خیال آتا ہے۔ خاموشی خاموش لمحات محبت ایک ایسی نعمت الٰہی ہیں جنکا جواب نہیں ہو سکتا۔ ہم خوب جانتے ہیں کہ خاموشی کے کیا معنی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم خاموشی سے اس قدر ڈرتے ہیں۔ ہم اپنی خاموشی، سنسان اور تنہا مقامات کی خاموشی تو برداشت کرتے ہیں۔ لیکن اجتماعی خاموشی۔ ہزارہا آدمیوں کی خاموشی برداشت نہیں ہوتی۔ اس قسم کی خاموشیاں ما فوق الفطرت بوجھ ہیں۔ جنکو اُٹھانے کی تاب شاید ہی کسی میں ہو۔ ہم اپنی عمر کا حصہ خاموش مقامات کو ترک کرنے اور غیر خاموش مقامات کو ڈھونڈنے میں گذار دیتے ہیں۔ بہت سی دوستیاں ایسی ہیں جو صرف ایک مشترک عناد خاموشی پر قایم ہیں۔ اگر یہ زہریلا سانپ آدمیوں کی مجلس میں گھس آئے تو لوگ طرح طرح کے حیلوں سے اسے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں اور اکثر ناکام بھی رہتے ہیں۔

زندگی میں صرف ایک یا دو بار ایسا ہوتا ہے کہ ہم خاموشی کے صحیح معنی کو سمجھ لیتے ہیں۔ نہایت سنجیدہ مواقع پر اس ناخواندہ مہمان کو بلایا جاتا ہے۔ لیکن ان موقعوں پر بیوقوف سے بیوقوف آدمی اس طرح عمل کرتے ہیں۔ گویا دیوتاؤں نے ان کو خاموشی کے صحیح معنی بتا دیئے ہیں۔

جرمنی

ابتذال و صنعت

جب کوئی مصنف اہم واقعات کو کوئی وقعت نہیں دیتا اور معمولی واقعات کو غیر معمولی اہمیت دیتا ہے۔ اس وقت کہا جاتا ہے کہ اس کے آرٹ میں ابتذال کے عناصر ہیں۔ ہو مر جانتا ہے کہ اچلیز کی ڈھال کے متعلق کیا کہنا چاہئے۔ وہ ڈھال کے اجزائے ترکیبی کے متعلق کچھ نہیں کہتا۔ وہ جو کچھ کہتا ہے اس کا جواب نہیں ہو سکتا۔

اس کے علاوہ ایک اور عنصر ہے جسے کمینہ پن کہا جاتا ہے۔ یہ غیر منفی نہیں بلکہ اثباتی ہے۔ یعنی ابتذال تو نام ہے اچھی خصوصیات کی نفی کا۔ اور کمینہ پن نام ہے، بری خصوصیات کی موجودگی کا۔ جب تحریری بد اخلاقی۔ معکوس ذہنیت۔ اور قابل نفرت جذباتی نقطۂ نظر کا رنگ پایا جاتا ہے۔ تو کہا جاتا ہے کہ آرٹ میں کمینہ پن آگیا۔

مثال کے طور پر انتقام لینا بری بات ہے۔ مبتذل ہے۔ یعنی ہم میں شرافت اور علو تخیل کی کمی ہے۔ لیکن ذلیل ذریعوں سے انتقام۔۔ لینا کمینہ پن ہے کہ اس میں اثباتی شان پائی جاتی ہے۔

(شلر)

اطالوی

عصر حاضر کا آرٹ

افسوس پرانے زمانے کے رسوم و رواج مٹ گئے۔ صنعت کا سنہری دور گذر گیا۔ صحت اور اطمینان قلب کا زمانہ جاتا رہا۔ آج کل سائنس اور فلسفے نے پرانی قیود کو توڑ کر گذشتہ آرٹ کی راکھ پر ایک اور قصر کی بنیاد رکھی ہے۔ افسوس پرانی قیود کے ٹوٹنے کے ساتھ حسن، شرافت اور محبت کے خوشنما محل بھی مسمار ہو گئے۔ پچھلے زمانے میں بڑے بوڑھے بچوں کی طرح خواب دیکھتے تھے اور ان خوابوں میں ایک رنگ حسن و جمال ہوتا تھا۔ آج کل کے بچے بھی فلسفیانہ تشکک سے لبریز نظر آتے ہیں۔ انسان نے ہر چیز کو تا اینکہ اپنی ذات کو بھی اعتراضات کا آماجگاہ بنا لیا ہے۔ آج کل کوئی مذہب نہیں۔ کوئی اصول نہیں۔ کوئی حسین و جمیل شہزادی نہیں جس کے لئے صناع اپنی جان دیکر آرٹ کا بہترین نمونہ تخلیق کرنے کی کوشش کرے۔

جہاز چٹانوں سے ٹکرا کر چور چور ہو جاتا ہے تو ہر شخص ذاتی اغراض کو مدنظر رکھتا ہے۔ اسی طرح آج کل کی تہذیب سائنس اور فلسفے کی چٹانوں سے ٹکرا کر چور چور ہو گئی ہے۔ اور اس تہذیب کا ہر ایک جز اپنے

آپ کو برقرار رکھنے کی کوشش میں مصروف ہے۔ عصر حاضر کے صناع نے اپنے آپ کو بچانا چاہا۔ اور فطرت کے ایک سنسان میدان میں آ رہا۔ دیکھئے اس کا کیا حشر ہو۔

ہسپانوی

بیوی کی خصوصیات

میں جانتا ہوں کہ میری بیوی نہ امیر ہو نہ مفلس۔ نہ میں اُسے خریدوں نہ وہ مجھے۔ جہاں نیکی اور خلق بستے ہیں وہاں دولت کی کمی نہیں ہوتی۔

میں چاہتا ہوں کہ وہ خوش مزاج ہو۔ کیونکہ قیود حیات میں ہم اس طرح بندھے ہوں گے کہ اگر وہ بدمزاج ہوئی تو ان کی سختی اور بھی ناخوشگوار معلوم ہو گی۔

میں چاہتا ہوں کہ وہ اچھا لباس پہنے۔ اس لئے نہیں کہ دوسرے اُسے دیکھ کر خوش ہوں۔ اور اس کے حسن مذاق اور رنگ انتخاب کی تعریف کریں بلکہ اس لئے کہ وہ مجھے مسرور کر سکے۔

مجھے اس کی پرواہ نہیں کہ اس کا رنگ گورا ہو یا سانولا۔ اس کے بال بھورے ہوں یا سنہری لیکن میں یہ ضرور جانتا ہوں کہ اگر اس کا رنگ سانولا ہو تو وہ اپنے آپ کو پوڈر اور غازے سے دلفریب اور صبیح بنانے کی کوشش نہ کرے دھوکے سے مجھے نفرت ہے۔

وہ بلند قامت ہو یا پست قد۔ مجھے کوئی پروا نہیں۔ جوتوں کی ایڑیاں اسی لئے بنی ہیں کہ قد کے نقائص کو دور کر دیں۔ (کیوویڈو)

عربی

اقوال صائبہ

(۱) ذہین لوگوں کو عیب لگانا گویا تمام کینہ توزوں کا بدلہ لینا ہے۔ کیونکہ دنیا میں کوئی شخص ایسا نہیں جو اپنے آپ کو ذہین خیال کرتا ہو۔

(۲) ہر شخص شر (برائی) کو دوسرے کی طرف سے تو مکروہ جانتا ہے مگر خود اس کا مرتکب ہو جاتا ہے۔

(۳) ہمہ دانی اور خود آرائی کا وہی شخص دعویٰ کرتا ہے جو اپنی حقیقت سے ناآشنا ہو۔

(۴) جو غضب دشمن کے مقابلے پر ہو وہ باعث ناموری ہے۔ اور جو بطور تمسخر یا استہزاء ہو وہ ذلیل کرتا ہے۔ (البلاغ (قاہرہ)) انیس احمد فاروقی

ہندی

نہ وہ دن رہے نہ وہ راتیں۔ پرمیشور جانے کیا ہو گیا کہ دل کسی چیز میں لگتا نہیں جنگل۔ پہاڑ، چشمے۔ تمام دردسے اور غم سے بھرے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑ کسی غم کے بوجھ کے نیچے دبے ہوئے ہیں۔ خاموش چپ چاپ جنگل بھی اُداس اُداس نظر آتے ہیں چشمے چل رہے ہیں۔ لیکن گانے کی بجائے رو رہے ہیں۔ نہ وہ دن رہے نہ وہ راتیں پرمیشور جانے کیا ہو گیا کہ دل کسی چیز میں لگتا ہی نہیں۔ (زندہ حسن)

بنگالی

اے دوست! تو مجھے تنہا چھوڑ کر کہاں چلا گیا۔ رات اندھیری ہے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ موسلادھار بارش ہو رہی ہے۔ میں خوف کے مارے کانپ رہا ہوں۔ لرز رہا ہوں۔ کیا ہوگا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فطرت میرے ساتھ جنگ کرنا چاہتی ہے۔ میں اس سے کس طرح مقابلہ کروں تو میرے ساتھ تھا دنیا ہنستی تھی۔ کوئی چیز میرے لئے خوفناک نہ تھی۔ لیکن اب تیز ہوا کی سائیں سائیں بھوتوں کی ہنسی کی آواز معلوم ہوتی ہے۔ اے دوست تو نے مجھے

۷۸۶

رجسٹرڈ ..... ایل نمبر ۲۴۸۲

فہرست مضامین

جلد ۳ | بابت ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۳۰ء | نمبر ۴

تصاویر:- (۱) سہ رنگی، شالامار باغ کشمیر۔ یک رنگی (۲) حضرت خواجہ حسن نظامی (۳) زغارت چمنت بر بہار منت ہاست کہ گل بدست تو از شاخ تازہ تر ماند (۴) مسز گریس ڈارلنگ کی قبر۔ (۵) خواجہ عبدالرحیم بی۔ اے۔ آئی۔ سی۔ ایس۔ (۶) مسٹر خورشید احمد بی۔ اے، آئی۔ سی۔ ایس۔ (۷) جاپانی شہزادی۔ (۸) معصوم محبت (۹) صیاد خانہ بدوش۔

مولوی احمد عبداللہ خاں صاحب ارشد نے مرکنٹائل پریس ریلوے روڈ لاہور میں چھپکر دفتر ادبی دنیا کشمیر بلڈنگ میکلوڈ روڈ لاہور سے شایع کیا۔

حال وقال

انتظامی مشکلات نے ادبی دنیا کی ترتیب کی جانب توجہ کرنے کی مجھے کبھی فرصت نہیں دی۔ حال وقال، آئینۂ عالم اور کبھی کبھی بزمِ تحقیق کی سرخیوں پر چند صفحات لکھ پاتا ہوں۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ اپنے متعلقہ صفحات وقت پر نہ لکھ سکنے کے سبب کاپیاں پریس جانے سے رُکی پڑی رہیں۔ اور پرچہ وقت پر شایع نہ ہو سکا۔ رہی مضامین کی ترتیب و تہذیب اور زبان کی تسہیل واصلاح۔ اس کی طرف تو شاید ابتدا ہی سے مجھے توجہ کرنے کا موقعہ نہیں ملا۔

اگرچہ اِس میں شک نہیں کہ ادبی دنیا کے اسٹاف میں منتخب اہلِ قلم شریک ہیں اور وہ مضامین کی ترتیب واصلاح میں کوئی خامی باقی نہیں چھوڑتے۔ لیکن مَیں نے جن اصول پر جن مقاصد کو پیشِ نظر رکھ کر ادبی دنیا کو جاری کیا ہے اُنہیں میں دوسروں سے زیادہ سمجھتا ہوں۔ مَیں نے دس بارہ سال تک طلبہ اور عام اردو خوانوں کی لسانی ضروریات کا مطالعہ کیا ہے۔ مجھے اندازہ ہے کہ ہمارے نوجوان نئی تعلیم کے طفیل ملکی زبان سے کس درجہ ناآشنا ہو رہے ہیں۔ اور اُن میں ادبی استعداد پیدا کرنے کے لئے کس قسم کی عام فہم اور سلیس زبان کی ضرورت ہے۔ ادبی دنیا کے مضامین کی زبان اگرچہ دوسرے ادبی رسالوں کے مقابلے میں آسان ہے لیکن مَیں اُسے اِس سے بہت زیادہ آسان بنانا چاہتا ہوں۔

اب تک مَیں ادبی دنیا کی مشکلات کو حل کرنے میں اپنا تمام وقت ضائع کرتا رہا۔ اب سولہ ماہ کے تجربے سے اِس نتیجے پر پہنچا ہوں۔ کہ مالی مشکلات کی یہ گتھی میرے ناخنِ تدبیر سے کھلنے والی نہیں ہے۔ اور دماغ میں ادبی دنیا کے دفتر کو قایم کر لینے سے بلوں کے تقاضے اور تنخواہ طلب جماعت کے ہجوم کم نہیں ہو سکتے۔ اِس لئے مَیں نے فضائے دماغ سے ادبی دنیا کے دفتر کو اُٹھا لینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اور اب توفیق ملی تو خدا کے کاروبار میں دخل دینے کی غلطی نہیں کروں گا۔ کیونکہ مَیں اِس حقیقت کو سمجھ چکا ہوں کہ مشکلات بھی اُدھر ہی سے آتی ہیں اور اُن کا حل بھی۔ عاجز انسان نہ مشکلات پیدا کرنے کا ذمہ دار ہے نہ اُنہیں مٹانے ہی پر کچھ دسترس رکھتا ہے۔

آئندہ میں اُس دفتر میں آٹھ پہر حاضر رہنے کی بجائے جو میرے دماغ میں قائم تھا ادبی دنیا کے اِس دفتر میں کام کروں گا جو میکلوڈ روڈ پر واقع ہے۔ ہر نمبر کے مضامین خود دیکھوں گا۔ مضامین کی پیچیدہ زبان کو آسان کروں گا۔ اور جو مشاہیرِ علم وادب اپنے مضمون میں قلم لگانے کی اجازت نہ دیں گے اور اُن کے مضامین ادبی دنیا کیلئے ناگزیر سمجھے جائیں گے اُن کے مندرجہ مضمون کے مشکل الفاظ کے لئے اخیر میں فرہنگ لگاؤں گا۔ یہ کوشش برابر جاری رکھوں گا کہ ادبی دنیا کے مضامین کی بلندی۔ گہرائی اور دلچسپی زبان کے ثقل اور پیرایۂ بیان کی پیچیدگیوں میں گم نہ ہو جائے۔

وی۔ پی واپس۔ ادبی دنیا کے نقصانات کی گراں باری میں کمی واقع نہیں ہوئی۔ گذشتہ ایک سال میں نو ہزار روپے کا نقصان اُٹھا چکا ہوں۔ اِس کے باوجود ادبی دنیا کو زیادہ مفید، زیادہ دلچسپ اور زیادہ شاندار بنانے میں ناعاقبت اندیشی کی حد تک روپیہ صرف کر رہا ہوں۔ ہندوستان کے قابل ترین انشا پردازوں سے گرانقدر معاوضے پر مضامین حاصل کر کے ہر نمبر کو پہلے سے زیادہ مفید اور کارآمد بنانے کی کوشش میں دن رات لگا رہتا ہوں۔

ادبی دنیا کے رجسٹروں سے اِس کی تصدیق کی جا سکتی ہے کہ اِس کے ایڈیٹوریل سٹاف (عملۂ ادارۃ) کی تنخواہوں اور مستقل قلمی معاونین کے معاوضوں کی مجموعی رقم اتنی ہے کہ اِس سے ایک اچھے روزنامے کیلئے ایک اچھا اسٹاف بہم پہنچایا جا سکتا ہے۔ پھر اِس کی تصاویر کے اخراجات نے تو مجھے اور میرے معاصرین کو سخت مشکل میں ڈال رکھا ہے۔

ادبی دنیا کو مسلسل دیکھنے پڑھنے اور دوسرے رسالوں سے اِس کا مقابلہ کرنے والے ادبی دنیا کی اِن تمام خصوصیات کو اچھی طرح جان چکے ہیں۔ ہر خریدار کو اِس کا اعتراف ہے کہ ایسا مفید شاندار اور پھر اس قدر سستا اور کوئی رسالہ نہیں ہے۔

اپنا تمام وقت، تمام سرمایہ اور تمام جدوجہد کو نثار کرنے کا صلہ

ادبی دنیا کے خریداروں کی جانب سے یہ ملتا ہے کہ سال بھر کے بعد ایک ماہ پہلے وی پی کی اطلاع دینے کے باوجود جب اُن کے نام وی پی بھیجا جاتا ہے تو واپس کر دیتے ہیں - کارکنوں کو اُن خریداروں سے متعلق شکایت نہیں - جو دفتر کی وی پی کی اطلاع پاکر انکار لکھ دیتے ہیں - شکایت کیسی ایسے حضرات شکریہ کے مستحق ہیں - کہ وی پی کرنے سے پہلے انکاری خط لکھ کر وہ دفتر کو دس آنے کے نقصان سے بچا لیتے ہیں - ہاں شکایت اُن حضرات سے ہے جنہیں ایک ماہ پہلے وی پی کی اطلاع دیجاتی ہے - اُس اطلاع میں کھول کر لکھ دیا جاتا ہے کہ اگر آپ کی طبیعت ادبی دنیا کے مطالعہ سے سیر ہو چکی ہو تو آپ کا بڑا احسان یہ ہوگا کہ آپ ہمیں وی پی بھیجنے سے ایک انکاری اطلاع دیکر روک دیں - اِس طرح آپ ہمیں وی پی کے محصول اور واپسی کی صورت میں رسالہ کی بربادی کے نقصان سے بچا لینگے - مگر حیرت ہے کہ ادبی دنیا کے اکثر تعلیم یافتہ خریدار تعلیم اور اخلاق کی تمام ذمہ داریوں سے یکسو ہو کر ایک اطلاعی کارڈ سے وی پی کو روک دینے کی بجائے اُسے واپس کر کے دفتر کو دس آنے کا نقصان پہنچا دیتے ہیں -

جس ملک کے تعلیم یافتہ اپنی ملکی زبانوں کے خدمت گزار پرچوں سے یہ بیدردانہ سلوک روا رکھیں اُس ملک کی زبان اور ادبیات کا خدا ہی حافظ ہے -

کیا وی پی واپس کرنے والے حضرات کا یہ قابلِ اعتراض رویہ اسی طرح جاری رہے گا - سال بھر ادبی دنیا پڑھنے کے بعد ادبی دنیا کا اپنے خریداروں پر اتنا بھی حق نہیں کہ وہ آئندہ خریداری جاری رکھنا نہ چاہیں تو وی پی کی اطلاع پاتے ہی انکاری خط لکھ کر ادبی دنیا کو واپسی کے نقصان سے بچا لیں ؟

شالامار باغ:- اِس نمبر میں کشمیر کے شالامار باغ کی سہ رنگی تصویر شائع کی جارہی ہے - یہ پُرفضا باغ مغلیہ سلطنت کے صنعتی کارناموں میں شمار کیا جاتا ہے - ریلوے جاری ہونے سے پہلے ملک کے دُور دراز حصّوں سے سیّاح ہزاروں میل کی کٹھن منزلیں طے کر کے اِسے دیکھنے آیا کرتے تھے - جب سے ریلوے کا اجرا ہوا ہے - اور ہفتوں کی راہ گھنٹوں میں طے کی جانے لگی ہے - ہر موسم گرما ہندوستان کے ہر گوشے سے اِس باغ کے ہزاروں تماشائی نارتھ ویسٹرن ریلوے کی سہولتوں کے طفیل کشمیر میں جمع کر دیتا ہے -

---

گریس ڈارلنگ کی قبر:- یہ اُس جانباز لڑکی کی قبر ہے جس نے جان پر کھیل کر ڈوبتے ہوئے جہاز میں سے بہت سے مسافروں کی جانیں بچائی تھیں -

---

ملک کے جن اہلِ قلم نے ادبی دنیا کے غیر مقامی اسٹاف میں کام کرنے پر آمادگی ظاہر فرمائی ہے - اگلے پرچے میں اُن کے ناموں کا اعلان کیا جائے گا -

---

معزز مضمون نگاروں کی خدمت میں گذارش ہے کہ ادبی دنیا کے لئے مضمون لکھتے ہوئے کاغذ کے صرف ایک جانب لکھا کریں تاکہ ضروری ترمیم و تسہیل میں ایڈیٹر کو دقّت پیش نہ آئے -

---

نومشق حضرات سے مودبانہ التماس ہے کہ وہ اپنی پہلی مشق کو ادبی دنیا میں شائع کرنے کے لئے بھیجنے کی زحمت ہرگز نہ فرمایا کریں ہر نومشق کے لئے یہ ضروری ہے کہ دو تین سال اپنے طور پر مضمون نگاری کی مشق کرے - کسی مقامی مضمون نگار سے اصلاح لیتا رہے اور پھر جب اُس کی مشق میں پختگی پیدا ہونے لگے تو اپنی قلمی شہرت کا آغاز اُن اخباروں سے کرے جو بچّوں کے لئے شائع کئے جاتے ہیں - بچّوں کے اخبارات میں جب ایڈیٹر کی ترمیم و اصلاح کے بغیر اُس کے مضمون شایع ہونے لگیں تو پھر چھوٹے چھوٹے ادبی رسالوں کا مضمون نگار بنے - اور اِسی طرح ترقی کرتے کرتے اردو ادب کے بلند پایہ رسالوں کے حال زار پر توجہ ارزانی فرمائے -

"روم ایک دن میں روم نہیں بن گیا تھا"

پھر کوئی ایک مشق میں آزاد و حالی کیونکر بن سکتا ہے ؟

حضرت خواجہ حسن نظامی:- محترم خواجہ صاحب کی تصویر اِس نمبر میں شائع کی جارہی ہے -

ادبی دنیا کے قارئین یہ سُن کر خوش ہوں گے کہ خواجہ صاحب نے ادبی دنیا کے ہر نمبر کے لئے مضمون لکھنے کا حتمی وعدہ فرمایا ہے - ادبی دنیا کی یہ انتہائی خوش نصیبی ہے کہ ایسا عالی جاہ انشاپرداز اُسے اس کے معاصرین میں ممتاز بنانے پر متوجہ ہوا ہے -

تاجور

شالامار باغ کشمیر

باغ پاکر خفقانی یہ ڈراتا ہے مجھے
سایۂ شاخِ گل افعی نظر آتا ہے مجھے (غالب)

چھپ گیا دامانِ مغرب میں نگارِ آفتاب
بجھ گیا طوفانِ ظلمت میں شرارِ آفتاب
اشہبِ نوریں سے اترا شہسوارِ آفتاب

ساغرِ خورشید سے چھلکی شرابِ لالہ فام
گیسوؤں کو آ گئی کھولے ہوئے لیلائے شام
جسکی محفل ہیں ستارے رقص کرتے ہیں مدام

آسماں سے دیوِ ظلمت نے بڑھائے اپنے ہات
نوچ ڈالا اپنے چنگل سے لباسِ کائنات
یہ شفق کی احمریں موجیں ہیں یا خونِ حیات

دیکھ کر تاریکیاں ہوتا ہے دل کو اضطراب
سرو کے سائے میں لہراتی ہوئی ہیں شاخِ گلاب
جسطرح غصے میں ناگن کھاری ہو بیچ و تاب

ذرہ ذرہ اس گلستاں کا شبستاں زاد ہے
موت کے سایوں میں یہ رنگیں چمن آباد ہے
ہر گلِ خنداں مجسم اک لبِ فریاد ہے

درد کے نغموں سے لرزاں ہے ربابِ آبشار
پتھروں پر مارتا ہے اپنا سر دیوانہ وار
یاد میں ہے عظمتِ ماضی کی گویا بیقرار

کس نزاکت سے گلوں پر پاؤں دھرتی ہے نسیم
سن رہا ہوں میں کہ ٹھنڈے سانس بھرتی ہے نسیم
مرنے والوں کی دل آرائی پہ مرتی ہے نسیم

عظمتِ ماضی تو مٹ جائے رہے وہ ارجمند
اپنی رعنائی پہ نادم ہے یہاں سروِ بلند
لالہ و گل کی ہنسی کیا ہے مگر اک زہرخند

دیکھتا ہے دیر سے یہ منظرِ حیرت فروش
کوہسارِ برف پوش و سخت کوش و بے خروش
دیکھئے کب اس سکوں پرداز کو آتا ہے جوش

عابد

آئینۂ عالم

کوئلہ اور ہوا

جریدہ "الخاف" اپنی تازہ ترین اشاعت میں رقمطراز ہے:۔

آج کل کسی قوم کی دولت و طاقت کا انحصار عام طور پر کوئلے اور تیل پر رہ گیا ہے۔ یہی دو ذرائع ایسے ہیں جن سے موجودہ سلطنتیں اپنی قوت کو ناپتی ہیں۔ ڈاکٹر لیونیسٹن نے ایک لکچر کے دوران میں ارشاد فرمایا تھا کہ طاقت کے اس ذخیرے پر انحصار کرنا جو صدیوں سے محفوظ چلا آتا ہے۔ (یعنی کوئلہ) برطانیہ کی کمزوری ہے۔ دوسرے ممالک مدوجزر۔ آبشار۔ ہوا اور سورج کی روشنی سے وہ تمام فائدے اٹھا رہے ہیں جو برطانیہ کوئلے سے اٹھاتا ہے۔ کوئلے کا زمانہ اب ختم ہونے کے قریب ہے اور اس بات کی ضرورت ہے کہ ہوا اور دوسرے فطرتی عناصر سے کوئلہ حاصل کرنے کے طریقے سوچے جائیں:۔

اس تجویز کی تکمیل میں ڈاکٹر لیونیسٹن نے ایک ایسا طریقہ ایجاد کیا ہے جس سے ہوا کے ایک جزیعنی کاربانک الیسڈ سے وہی مسالے حاصل کئے جا چکے ہیں جو کوئلے سے حاصل کئے جا چکے ہیں یا جو کوئلے سے حاصل ہوتے ہیں۔ کاربانک الیسڈ کو کوئلے کی گیس (میتھین) کی صورت میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ اور ابھی اس طریق کار میں مزید ترقی کی امید ہے۔

اس طرح یہ اندیشہ کہ دنیا کا کوئلہ ختم ہونے والا ہے۔ اہم نہیں رہا۔ سائنسدان اب ہوا سے وہی کام لے رہے ہیں جو کوئلے سے۔

پنجاب لٹریری لیگ

ہم اس سے پہلے پنجاب لٹریری لیگ کے نام کی اطلاع دے چکے ہیں۔ اس انجمن کے قیام کے مقاصد یہ ہیں۔ کہ اہل قلم حضرات کی تنظیم کی جائے۔ تاریخ اور ادب پر مشاہیر سے لیکچر کرائے جائیں اور ایک دارالمطالعہ قائم کیا جائے۔ لیگ کا ایک ماہواری رسالہ پنجاب لٹریری ریویو کے نام سے شائع ہونے والا ہے۔

یہ مقاصد واقعی مبارک ہیں۔ پنجاب کے تمام اکابر نے لیگ کی سرپرستی منظور فرمائی ہے۔

ان اکابر میں مسٹر اے سی ولز۔ علامہ سر محمد اقبال۔ سر شہاب الدین مسٹر جسٹس آغا حیدر۔ سر عبدالقادر۔ سر محمد شفیع۔ راجہ نرندرا ناتھ۔ سر جوگندر سنگھ۔ نواب احمد یار خاں۔ حکیم احمد شجاع۔ ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین۔ پروفیسر ایم۔ اے غنی۔ پروفیسر محمد شفیع۔ پرنسپل مرزا محمد سعید۔ رائے بہادر لالہ کنور سین۔ اور ان کے علاوہ کئی اور حضرات شامل ہیں۔

حال ہی میں اس لیگ نے علمی ادبی تاریخی لیکچروں کا انتظام کیا ہے۔ مندرجہ ذیل اصحاب مضمون پڑھیں گے۔

مندرجہ ذیل حضرات نے مضمون پڑھنے کا وعدہ فرمایا ہے۔

پروفیسر جے گوپال بینرجی (کلکتہ یونیورسٹی) پروفیسر کے ٹی شاہ (بمبئی یونیورسٹی) پروفیسر کے سدہانت (لکھنؤ یونیورسٹی) پرنسپل (مس) منشی پریم چند۔ مسٹر او سی گنگولی۔ حضرت نیاز فتحپوری۔ پروفیسر نذیر احمد ہاشمی۔ خواجہ غلام السیدین۔ سر عبدالقادر۔ حکیم احمد شجاع۔ مسٹر محمد حبیب (علیگ) مسز مجید ملک۔ مسٹر بھولا ناتھ۔ سید عابد علی ایم۔ اے۔ ڈاکٹر محمد اقبال مسٹر برج لعل نہرو۔ پروفیسر مترا۔ پنڈت برج موہن دتاتریہ۔ پروفیسر موہن سنگھ۔ مسٹر ہرکشن لعل۔ مسٹر رتن چند۔ ڈاکٹر وبیلٹے۔ وغیرہ۔

مندرجہ بالا فہرست سے اس انجمن کے مقاصد کی وسعت کا اندازہ قائم کیا جا سکتا ہے۔ ہمیں اس انجمن کے ساتھ دلی ہمدردی ہے۔ اور ہم سمجھتے ہیں کہ اگر اہل وطن نے اس انجمن کی قرار واقعی قدر دانی کی تو ملک و قوم کی فلاح کا موجب ہوگا۔

جو صاحب اس لیگ کے ممبر بننا چاہیں وہ مسٹر ڈی۔ آر چودھری سکرٹری لٹریری لیگ پنجاب ۶۶ بیڈن روڈ لاہور سے خط و کتابت کریں۔

مغرب میں ادبی تحریروں کے معاوضے

مسٹر کولج صدر جمہوریہ امریکہ اور گورنر سمتھ نے اپنے سوانح حیات قلمبند کرنے کا معاوضہ ایک ڈالر فی لفظ کے حساب سے وصول کیا۔ اس حساب سے مسٹر کولج نے سوانح حیات کی تصنیف سے ایک سال کی تنخواہ سے زیادہ رقم حاصل کر لی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک ڈالر فی لفظ کی شرح معاوضہ حیرت انگیز ہے۔ لیکن مغرب کی تاریخ ادب ایسے واقعات سے خالی نہیں۔ اس سے پہلے جیمز نے اپنی نظم "میری پرانی معشوقہ" لکھکر اتنا روپیہ کمایا تھا کہ بحساب اوسط ایک لفظ کی قیمت ۵۰۰ ڈالر ہو جاتی تھی۔ الگزنڈر پوپ نے ایلیڈ کے ترجمے کے لئے ۵۰۰۰ ڈالر وصول کئے۔ اور وہ بھی اس وقت میں جب ڈالر کی قیمت آج سے پانچ گنا زیادہ تھی۔ سر والٹر سکاٹ کو لیڈی آف دی لیک کیلئے ۱۵۰۰۰ ڈالر ملے۔ ٹینین کو اپنی ایک نظم کا معاوضہ ۲۵۰۰ ڈالر وصول ہوا۔ مقابلتہً ملٹن کو "جنت گمشدہ" کے لئے صرف ۵۰ ڈالر وصول ہوئے۔

چین کے طالبعلم

پیکن کی قومی یونیورسٹی کے ۵۱۷ طالبعلموں میں سے ۳۲۸ طالبعلم شادی کرنے کے بعد پچھتا رہے ہیں۔ کچھ دن ہوئے طالبعلموں سے کچھ سوال پوچھے گئے تھے جن میں سے ایک یہ بھی تھا "کیا تم اپنی شادی سے مطمئن ہو" ۳۲۸ طالبعلموں نے نفی میں جواب دیا۔ ۱۳۱ طالبعلموں نے اثبات میں۔ باقی یا تو غیر شادی شدہ تھے۔ اور یا اپنے جذبات کا اظہار نامناسب خیال کرتے تھے۔ عام طور پر طالبعلم حسن کو بیوی کی سب سے ضروری خصوصیت تصور کرتے تھے۔ چین کے طالبعلم میسولینی کی بہت عزت کرتے ہیں اور اس کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتے ہیں۔

جغتصادیات

ایک نیا فن جو جغرافیے اور اقتصادیات کے اجتماع سے وجود میں آیا ہے۔

پچھلے دنوں پروفیسر میرز نے اڈنبرا یونیورسٹی میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:-

"جغرافیے اور اقتصادیات کے باہمی تعلق کے متعلق کوئی تحقیقات نہیں کی گئی۔ اس کمی کو پورا کیا جائے تو ایک نیا علم عالم وجود میں آجائیگا۔ جسے بجا طور جغتصادیات کہا جا سکتا ہے۔ اس علم کے ذریعے علم جغرافیہ ہر شخص کیلئے انفرادی طور پر سود مند ثابت ہو سکتا ہے۔

جغرافیہ حقیقت میں ام العلوم ہے۔ نجوم۔ کیمیا۔ علم الحیوانات علم النباتات۔ علم الآثار وغیرہ تمام اس علم کی تحقیقات کے شاندار نتائج ہیں مختصر الفاظ میں کہا جا سکتا ہے۔ کہ علم انسانی کی پہلی کڑی جغرافیہ ہے۔

اگرچہ اس ترقی کے دور میں بھی بعض استاد ایسے ہیں جو کسی ملک کا حدود اربعہ یاد کراتے ہیں۔ لیکن عام طور پر اب جغرافیے سے بہت زیادہ فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ اور اگر جغتصادیات کا علم عالم وجود میں آگیا تو اس فایدے کا دائرۂ عمل اور بھی زیادہ وسیع ہو جائیگا۔

کھانے والی قوم اور کمانے والی قوم کا فرق

ہندوستان کے کسی شہر، کسی قصبہ، کسی گاؤں میں آپ چلے جائیے آپکو سیکڑوں ایسے لوگ ملینگے جن کے آبا و اجداد کے اونچے محلوں کو آسمان بوسہ دیتا تھا مگر اب ان کی ٹوٹی پھوٹی جھونپڑیاں زمین کو سجدے کر رہی ہیں۔ جن کے آبا و اجداد کی چوکھٹوں پر ہاتھی جھومتے تھے مگر آج انکے گھروں میں چوہے قلابازیاں کھا رہے ہیں۔ مگر امریکہ میں اکثر تعداد ایسے لوگوں کی ہے جن کے باپ لکھپتی تھے اور وہ آج ارب پتی ہیں۔ مثال کے طور پر چند دولت مندوں سے آپکو روشناس کراتا ہوں۔

مسٹر اسٹلو امریکہ کے ایک مشہور دولتمند تھے ۱۸۴۸ء میں جب ان کا انتقال ہوا تو انہوں نے ۲۰ ملین ڈالر کا ترکہ اپنی اولاد کے لئے چھوڑا تھا۔ ان کی اولاد تجارت کے ذریعہ سے برابر اسے بڑھاتی ہی رہی حتیٰ کہ اب وہ ۱۵۰ ملین ڈالر ہے جس میں سے تنہا مسٹر فلسٹ اسٹور ۱۰۰ ملین ڈالر کا مالک ہے۔

اسٹینڈرڈ آئیل کمپنی کے دو حصہ دار مسٹر چارلس اور مسٹر اسٹیفن اپنے انتقال کے وقت ۵۰ ملین ڈالر کے مالک تھے لیکن آج اول الذکر کی اولاد ۳۰۰ ملین ڈالر اور موخر الذکر کی اولاد ۴۰۰ ملین ڈالر کی مالک ہے۔ مسٹر ڈیونٹ نے اپنے انتقال کے وقت ۲۰ ملین ڈالر چھوڑے تھے لیکن آج انکی اولاد ۵۰۰ ملین ڈالر کی مالک ہے۔ —— دیکھا آپ نے یہ ہے کھانے والی قوم اور کمانے والی قوم کا فرق۔ تاجور

عمر خیام اور اُسکا عہد

خیام کی صناعی

(گذشتہ سے پیوستہ)

الفاظ و معانی کا حسین و جمیل تعلق

کہا گیا ہے کہ ادب خیالات عالی کو الفاظِ عالی میں ملبوس کرنے کا نام ہے۔ یعنی الفاظ اور معانی میں ایک موزوں رابطہ پیدا کرنا صناع کا پہلا فرض ہے۔ خیام اس فرض کی اہمیت کو سمجھتا ہے۔ اور اپنے معانی کے ہر پہلو کو اور ان پہلوؤں کے نازک سے نازک فروقِ مفاہیم کو ادا کرتا ہے۔ معانی کے اظہار کے لئے وہی الفاظ انتخاب کرتا ہے جن کے اثرات، جن کی دلالتہائے[۱] التزامی تمام معانی کے کسی پہلو کو روشن کرتی ہیں۔ وہ مرکزی خیال کو ایک تراشیدہ لعل تصور کرتا ہے اور الفاظ کے مہر عالمتاب سے اس لعل شب چراغ کو ہر طرف سے منور کرتا ہے۔

کہتا ہے ؎

آمد سحرے ندا ز میخانۂ ما
کے رند خراباتی و دیوانۂ ما
برخیز کہ پُر کنیم پیمانہ زمے
زاں پیش کہ پُر کنند پیمانۂ ما

خیال یہ ہے کہ بے ثباتیٔ عمر کی تلخی کو کم کرنے کے لئے شراب لعل کے جام پیتے جاؤ۔ یہ تلقین بظاہر عقل دور اندیش کو خطرناک معلوم ہوگی۔ خیام نے اس تلقین کو جس حسین رنگ میں پیش کیا ہے۔ اس کے پہلو دیکھئے۔

صبح کا لفظ اپنے اندر صباحت و لطافت کے ذخیرے پنہاں رکھتا ہے۔ اس وقت نیاز و عجز کے سجدوں کا خلوص روح کو عرفان کے سرچشمے سے سیراب کرتا ہے۔ پھر صبح فطرتاً شاعر اور شاعر ہی پر کیا منحصر ہے ہر ذوقِ جمال رکھنے والے شخص کے لئے نشاط و مسرت کا سرچشمہ ہوتی ہے۔ "صبح بنارس" کی شعریت آفریں ترکیب کس نے نہیں سنی۔

جہانگیر کہتا ہے:۔

وقت نیاز و عجز جہانگیر بادشاہ
امید آں کہ شعلۂ برق اثر رسد

سحرے کہکر خیام نے یہ تمام پہلو ادا کر دئے ہیں۔ پھر شراب نوشی کی تلقین کے لئے کسی انسان کو مشخص نہیں کیا۔ بلکہ صرف ایک "ندا" آتی ہے۔ اس ندا کا ابہام حد درجہ خیال آفریں ہے۔ یہ لفظ ذہن میں امکانات کا ایک سلسلہ پیدا کر دیتا ہے۔

"میخانہ" کا لفظ اسبات پر دلالت کرتا ہے کہ جس شخص کو تلقین شراب نوشی کی جارہی ہے وہ ایک میگسار ہے۔ جو خواب غفلت میں مدہوش ہے۔ "دیوانۂ ما" کہکر ندا کے ہاتفِ غیب نے میگسار کی ہمدردی حاصل کر لی ہے۔

"برخیز" کسل اور ماندگی کی جان گداز کیفیات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ قوت تخیل میگساروں کی اعضا شکن انگڑائیوں۔ اور خمار کی کاہشوں کا تصور کر سکتی ہے۔ پھر اس کے ساتھ ہی "برخیز" شہب عمل کے لئے ایک تازیانے کا کام دیتا ہے۔

"پُر کنند پیمانۂ ما"، پیمانۂ عمر کے لبریز ہوجانے سے عبارت ہے۔ اور اتحاد الفاظ و معانی کی اس سے بہتر مثال کیا ہوسکتی ہے کہ عمر دو روزہ کے ختم ہوجانے کو بھی میگساری کے اصطلاحی الفاظ میں ادا کیا ہے۔ یعنی ایسے محاورے کے ذریعے جس سے شراب نوش کے کان سب سے زیادہ آشنا ہوتے ہیں۔

محض الفاظ اور ان کے اتار چڑھاؤ کے نقطۂ نظر سے رباعی میں موسیقی کا اثر دیکھئے۔ سروں کا اختلاف اور ان کے مجموعی توازن سے موسیقی میں اثر حسن پیدا کیا جاتا ہے۔ اس رباعی میں سحرے کی یے کی کشش اور ندا کے الف کا اختلاف دیکھئے۔ پھر سحرے ما،

۱؎ الفاظ کا اپنے موضوع کے تمام لازم معانی پر دلالت کرنا

اور "میخانہ" ما کے ہم قافیہ ہونے کے علاوہ توازن صوتی پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ خیام کا آرٹ کسقدر مکمل ہے۔ مجموعی طور پر جو ترنم پیدا کیا گیا ہے وہ اس کے علاوہ ہے۔ آخری دو مصرعوں میں "برخیز" اور "زاں پیش" کی ہم آہنگی اور تیسرے مصرعے کا چوتھے مصرعے سے موزوں تطابق تعریف سے بے نیاز ہے۔

ہر چند کہ رنگ و بوئے زیباست مرا
چوں لالہ رخ و چو سرو بالاست مرا
معلوم نشد کہ در طرب خانۂ خاک
نقاشِ من از بہر چہ آراست مرا

اس سے پہلے کئی بار اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے کہ خیام ہر حسین شے کی ہلاکت سے متاثر ہوتا ہے۔ "حسن" کی بہترین تصویر اور نازک ترین مظہر انسان ہے جو تخلیق اکبر ہے۔ یہ تخلیق اکبر جو اپنی عقل و ذہن کی ہنگامہ آفرینیوں سے بحر و بر پر حکومت کرتی ہے آخر موت کا جام پینے پر مجبور ہوتی ہے۔ پھر اس کے ساتھ یہ قیامت ہے کہ آفرینش کائنات کا راز سمجھ میں نہیں آتا معلوم نہیں ہوتا کہ اگر اس حسن و جمال کا انجام فنا تھا تو انسان کو پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اگر نشاطِ کار کو غم میں تبدیل ہونا تھا تو "نشاطِ کار" کی ہوس ہی کیوں پیدا کی گئی۔ مندرجہ بالا رباعی میں یہی خیال ہے۔

"رنگ و بوئے زیبا" انسان کے کمالاتِ ظاہری و باطنی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ خوبصورت رنگ آنکھوں کے ذریعے دل میں کھب جاتا ہے۔ اور بوئے خوش مشام کے ذریعے روح انسانی کو شگفتہ کرتی ہے۔ رنگ پھول کا ظاہری حسن ہے اور بو۔ باطنی اسیطرح انسان کے کمالات ظاہری و باطنی خالق اکبر کی صفات کے آئینہ دار ہیں۔

"لالہ" کا لفظ کہکر خیام نے نشاط و مسرت کی تصویر کھینچی ہے۔ گلابی اور سرخ رنگ مسرت کے آئینہ دار ہیں۔ خوشی میں چہرہ تمتماتا ہے۔ اسی لئے "روئے ارغواں" کی "رنگ آفریں" شعرا کا محبوب موضوع ہے۔ لالے کا پھول اپنے سرخ رنگ کے لئے مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ یوں بھی رنگوں میں اس کا رنگ زیادہ گہرا۔ زیادہ دلربا۔ زیادہ جاذب توجہ ہوتا ہے۔

"سرو" کو قد انسانی سے تشبیہ دیکر خیام نے "قامت رعنا" کی دلربائیوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ سرو باغ کے تمام درختوں میں سب سے زیادہ حسین بلند اور دلکش ہوتا ہے۔ "بلندی قامت" ایک عنصر جمال ہے۔ چنانچہ غالب کہتا ہے۔

ترے سرو قامت سے اک قدِ آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

سعدی کہتا ہے۔

مدیں باغ سروے نیامد بلند

سرو کو ادب میں ایک تمثیلی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔ قامت کی درازی اور دلربائی کے لئے اس سے بہتر شے کا انتخاب نہ ہو سکتا تھا۔

"طرب خانۂ خاک" اُن تمام دلچسپیوں کی طرف اشارہ کرتا ہے جو انسان نے اپنی دوروزہ زندگی کے لئے قائم کر لی ہیں۔ مسرت و نشاط کے جلسے۔ احبابِ زندہ دل کی تلاش۔ وہ تمام وسائل جو انسان زندگی کو کامیاب بنانے کے لئے اختیار کرتا ہے "طرب خانۂ خاک" کی ترکیب نے ادا کر دئے ہیں۔

خدا کو "نقاش" کے لفظ سے مخاطب کر کے اُس کی تخلیقات کے حسن و جمال موزونی۔ اور تناسب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ جس طرح نقاش کا مقصد اعلیٰ آفرینش حسن ہے۔ خدا نے بھی کائنات کے مظاہر کو حسین بنا کر ذوقِ جمال کی تسکین کی ہے۔ یہ موضوع شروع سے شاعروں اور فلسفیوں کو دعوت دیتا آیا ہے۔

غالب کہتا ہے۔

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خودبیں

آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

پھر نقاش کے لفظ میں صرف صناع کائنات کی حسین و جمیل تخلیقات کی طرف ہی اشارہ نہیں کیا گیا۔ بلکہ "نقوش" کی بے بسی اور بیکسی کی طرف بھی اشارہ ہے۔ جس طرح نقش نقاش سے شکایت نہیں کر سکتے۔ کہ انہیں کیوں ایک خاص شکل دی گئی۔ جس طرح نقش اپنے وجود کی اہمیت سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں اُسی طرح انسان بھی خالق کائنات سے شکوہ کرنے کا اہل نہیں ہے۔ وہ بھی نقوش کی طرح اپنی تخلیق کا مقصد سمجھنے سے قاصر ہے

شاید غالب نے اپنا ایک معرکۃ الآرا مضمون خیام ہی سے لیا ہو

وہ کہتا ہے ؎

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

ایک جگہ غالبؔ "نقاش" کو "چمن طراز" بھی کہتا ہے ؎

رُخِ گل ز غازہ کاری بہ نگاہ بندہ آئیں
نہ رسد بہ خس شکایت ز چمن طراز کردن

دورے کہ درد آمدن و رفتن ماست
آں را نہ بدایت نہ نہایت پیداست
کس مے نزند دمے درین معنی راست
کیں آمدن از کجا و رفتن بکجاست

معمۂ کائینات کے انکشاف کی کوشش انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ موت اور حیات کے پیچیدہ مسائل ذہن انسانی کو بے اختیار اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ دیکھا جاتا ہے کہ کسی کو کائینات کی ابتدا اور انتہا کے متعلق صحیح علم نہیں۔ یہ راز خدا کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔ روز حشر اور روز ازل کے اسرار اسی طرح سربستہ ہیں۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

حالِ دلِ دردناک معلوم نہیں
کیفیتِ روحِ پاک معلوم نہیں
جھوٹی ہے تمام علم کی لاف زنی
خاکی انسان کو خاک معلوم نہیں

یہی خیال اس رباعی میں ہے "آمدن و رفتن" انسان کی مسافرانہ حالت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اقامت چند روزہ۔ ہوس کار حصولِ نشاط کی ناکام کوشش اور پھر موت:

کوئی نہیں غمگسارِ انسان
کیا تلخ ہے روزگارِ انسان

بدایت و نہایت انسانی زندگی کے بے شمار امکانات اور کائینات کے رموز کی پیچیدگی پر دلالت کرتے ہیں۔

"کس مے نزند دمے درین معنی راست" سے انسان کی ان تھک کوششوں کی انتہائی ناکامی مراد ہے "کس" کہکر خیام نے عظیم سے عظیم شخصیت کی کوششوں کا بیکار ہوجانا مراد لیا ہے۔

"راست" اس بات کا مظہر ہے کہ راز کائینات کے انکشافی نظریے یوں تو بہت سے ہیں لیکن درست کوئی بھی نہیں۔ آج جو حالت علم انسانی کی ہے کل اُسی کا مذاق اڑایا جائیگا۔ کل تک یہ بحث تھی کہ راز کائینات کیا ہے۔ آج یہ سوال ہے کہ ہمیں کسی چیز کے متعلق کس حد تک علم ہوسکتا ہے۔ آہ عرفی!

حدِ حسن تو بہ ادراک نہ شاید دانست
ویں سخن نیز بہ اندازۂ ادراک من ست

"کیں آمدن از کجا و رفتن بکجاست" ایک صحرائے ناپیدا کنار کا منظر پیش کرتا ہے۔ دور حد نظر تک دونوں طرف سے کارواں آرہے ہیں جا رہے ہیں۔ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کارواں کہاں سے آیا۔ اور کہاں جائیگا۔ نگاہ اِس صحرا کے ابتدا و انتہا کو دریافت کرنا چاہتی ہے لیکن ناکام رہتی ہے۔ کائینات کے رموز کی طرف اِس سے بہتر انداز میں اشارہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

مے در کفِ من نہ کہ دلم مضطرب ست
ویں عمر گریز پائے چوں سیماب ست
برخیز کہ بیداریٔ دولت خواب ست
دریاب کہ آتش جوانی آب ست

انسان نشاط کی تلاش میں سرگرداں ہے اور یہ شے ایک بار جلوہ دکھا کر غائب ہوجاتی ہے۔ عشرت کاروئے دل افروز بس ایکبار نظر آتا ہے اور پھر غم کے گہرے پردوں میں چھپ جاتا ہے۔ پارے کی طرح یہ شے انسان کے ہاتھ سے نکل جاتی ہے۔ "عمر گریز پا" کو سیماب سے تشبیہ دیکر خیام نے یہی خیال ادا کیا ہے۔

"بیداریٔ دولت" کو خواب کہکر یہ ثابت کیا گیا ہے کہ خوش نصیبی اور فرخندہ اختری عارضی ہے۔ جس طرح انسان پیدا ہونے کے بعد خواب کے حالات کو بھول جاتا ہے۔ اُسی طرح خوش طالعی کا دور فوراً گزر جاتا ہے۔ اور ہجوم افکار میں خواب کے واقعات کی طرح دھندلا دھندلا نظر آتا ہے۔

جوانی کی آگ واقعی پانی ہے۔ پانی کو مٹھی میں کس نے بند کیا ہے۔ جوانی کو جاتے ہوئے کس نے روکا ہے؟ جوانی کو آگ کہکر خیام نے جوانی کے ہلاکت آفریں عناصر اور جوانی کی شعلہ مزاجی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جب یہ شعلہ بجھ جاتا ہے تو پھر دنیا کی کوئی طاقت اس راکھ میں شرر پیدا نہیں کر سکتی۔

صداقت احساس ۔ جذبہ

ادب کی بہترین تعریف میری نظر میں یہ ہے کہ اُسے "تفسیر حیات" کہا جائے زندگی کے جو مختلف مناظر و مظاہر ادیب کی نظر سے گزرتے ہیں۔ تفسیر کا نام ادب ہے۔ اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ "شعری تفسیر حیات" کی خصوصیت کیا ہے۔ شاعر اور نثر نگار کے نقطۂ نظر میں کیا فرق ہے شعر کے ضروری عناصر تخیل اور احساس ہیں۔ معلوم ہوا کہ زندگی کی تخیلی اور احساسی تفسیر کا نام شاعری ہے۔ گویا حیات کی وہ تفسیر جس میں تخیل اور جذبہ نمایاں طور پر نظر آئے۔ شعر ہے۔ اس اعتبار سے "جذبہ" یا "احساس" وہ شعلہ ہے جو بے جان الفاظ کو ایک "آتشکدہ" بنا دیتا ہے یہ وہ شے ہے جو تخیل کے پھولوں کو شاداب رنگ و بو کرتی ہے۔ اس کے بغیر معانی اور الفاظ مردہ نظر آتے ہیں۔ موجِ حیات کا دوسرا نام "احساس" ہے۔

یہی وجہ ہے کہ "صداقت" اور "صداقت شعری" میں فرق ہے۔ صداقت نام ہے بیان واقعات کا۔ اور یہ خصوصیت ہے سائنس کی۔ صداقت شعری سے یہ مراد ہے کہ شاعر حقائق کے ادراک احساسی کو الفاظ کا جامہ پہنائے۔ یعنی ان جذبات کا ذکر کرے جو کسی خاص شے کو دیکھکر۔ کسی نغمے کو سُنکر۔ کسی حسین و جمیل چیز سے متاثر ہو کر اُس کے دل میں پیدا ہو۔ مسرت و غم۔ امید و بیم کی جو کیفیات حقایق پیدا کرتے ہیں ان سے بحث کی جائے۔ حقایق سے نہیں۔

شاعری میں اشیاء سے نہیں بلکہ اشیاء کے حسن اُن کے راز۔ اُن کی دلچسپی اور اُن کی احساسی قدر و قیمت سے بحث کی جاتی ہے۔

مندرجہ بالا سطور سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ شاعری "حقایق" سے بے نیاز ہے یا مبالغہ شاعری کی جان ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شاعر مرکزی طور پر صرف حسنِ اشیا اور جذبات کا بیان کرتا ہے۔ لیکن اِس کے یہ معنی نہیں کہ وہ خارجی حالات کو یا حقایق کو غیر صحیح رنگ میں پیش کرنے کا مجاز ہے۔ شاعر کے لئے یہ لازمی ہے کہ وہ زندگی کے تمام مناظر و مظاہر کو صاف اور صحیح رنگ میں پیش کرے۔ "یہ صداقت" اُس شاعری کی خصوصیت ہوتی ہے۔ جسکو بقائے دوام حاصل ہوگی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض دفعہ شاعر خارجی واقعات کو غیر صحیح رنگ میں پیش کرنے سے مضمون کو زیادہ دلفریب اور دلرُبا بنا دیتا ہے۔ لیکن جو شخص واقعات کی اصل نوعیت سے باخبر ہوتے ہیں ان پر یہ فریب نہیں چل سکتا۔

تاروں بھری رات کے متعلق ایک شاعر کہتا ہے :-

وہ روشنی کا فرش سرِ عرش دور دور

"نور" کی عالمگیری کو "روشنی کا فرش" کہکر شاعر نے واقعے کو شعریت سے لبریز کر دیا ہے۔ "پھر" "کا فرش" اور "سرِ عرش" کا امتزاج بھی درجہ دلفریب ہے۔ لیکن جن لوگوں کی قوتِ مشاہدہ اچھی ہے انہوں نے غور کیا ہو گا کہ تاروں بھری رات میں جو نور جلوہ گر ہوتا ہے۔ وہ بہت لطیف ہوتا ہے۔ اسے روشنی کا فرش کسی طرح بھی نہیں کہا جا سکتا۔ روشنی کا فرش دلالت کرتا ہے۔ نور کی چمکتی ہوئی۔ صاف سطح پر۔ اور تاروں کے نور کی روشنی۔ نہ صاف ہے۔ نہ اسقدر تاباں۔ کہ اُسے "روشنی کا فرش" کہا جا سکے۔

اس اعتبار سے غالب کی "صداقت" شعری اور صداقتِ احساس کی تعریف نہیں کیجا سکتی۔ وہ کبھی کائنات کے حقائق کو غیر صحیح رنگ میں پیش نہیں کرتا۔ ایک جگہ کہتا ہے :-

باغ پا کر خفقانی یہ ڈراتا ہے مجھے
سایۂ شاخِ گل افعی نظر آتا ہے مجھے

اکثر غزل گو شعراء کے کلام میں مرکزی جذبہ "محبت" ہوتا ہے۔ محبت کی کیفیات کی تشریح و توضیح ان کا محبوب موضوع۔ لیکن خیام کے دل میں "شراب" احساسات و جذبات کا ایک طوفان پیدا کر دیتی ہے اس کے لئے دنیا کی تمام نشاط و مسرت "تہِ ساغر" میں پنہاں ہے۔

ہے یوں کہ مجھے دردِ تہِ جام بہت ہے۔

یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ کسی محبوب و مرغوب شے کو حاصل کرنے کے جو وسیلے اختیار کئے جاتے ہیں* مثلاً روپیہ کی قدر و قیمت محض اس لئے ہے کہ اس سے انسان عیش و نشاط کے سامان خرید سکتا ہے۔

زر بر سر فولاد نہی نرم شود

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ یہ نکتہ بہت کم لوگ سمجھتے ہیں۔ دولت محض اپنی خاطر پسند کی جاتی ہے۔ یہ بات نہ ہوتی تو دنیا بخیلوں کے وجود سے پاک ہوتی۔

خیام بھی شراب سے اتنی محبت کرتا ہے کہ ساقی جو شراب عطا کرتا ہے۔ اس کے لئے بھی اس کا دل محبت سے لبریز ہے۔ جذبے کی صداقت کی اس سے بہتر مثال کیا ہو سکتی ہے۔

عابد

* مثلاً دولت سے وہ دنیاوی اشیاء مطلب ہیں جو مرغوب و محبوب ہوتی ہیں۔

چند بچّوں کو دیکھ کر

جہاں میں مَیں نے دیدہ زیب ایوانوں کو دیکھا ہے
امیروں کے نظر افروز کاشانوں کو دیکھا ہے

ہُوا ہوں مہ رخوں کی محفلوں میں باریاب اکثر
رہا ہے حاضراں کے درمیان میرا شباب اکثر

سُنے ہیں نغمہ ہائے چنگ و نے عشرت سراؤں میں
رہا ہوں مدتوں مشرق کی متوالی فضاؤں میں

مگر اب رُوح اِن کے ذکر سے بیزار ہوتی ہے
کہ اِن میں صرف مصنوعی خوشی تیار ہوتی ہے

خوشی خالص خوشی بچّوں کے سادہ دلمیں رہتی ہے
یہ لیلائے حیات افروز اِس محمل میں رہتی ہے

خوشی کی جستجو میں اپنے غم خانے سے نکلا ہوں
تلاشِ نور میں تاریک کاشانے سے نکلا ہوں

یہ دولت لے کے میرے پاس اے مہ پیکرو آؤ!
محبت کے فرشتو! اے حسیں جادو گرو آؤ!

تمہارے حُسن سے دنیا حسیں معلوم ہوتی ہے
بہارِ زندگی خلدِ بریں معلوم ہوتی ہے

سُنا ہے میں نے تم کو رنجِ بیش و کم نہیں ہوتا
تمہارے ساتھ رہنے والوں کو کچھ غم نہیں ہوتا

سُنا ہے آسماں سے "وہ" تمہارے پاس آتے ہیں
محبّت کے رسیلے رس بھرے پیغام لاتے ہیں

سنا ہے مَیں نے تم غمگیں دلوں کو پیار کرتے ہو
اور اُن پر شادمانی کے محل تیار کرتے ہو

یہ سچ ہے تو اِدھر بھی ایک اُلفت کی نظر ڈالو
مرے دل کو جلا کر خاک سے اکسیر کر ڈالو

لبِ معصوم کی رنگینیوں سے پھول برسا کر
بہارِ عہدِ طفلی کے طلسمی گیت گا گا کر

مجھے بہلاؤ اپنی دلرُبا شیریں نواؤں سے
کرو مسحور نوزایدہ طفلانہ اداؤں سے

یہ ممکن ہے کہ کیفیاتِ روحانی میں کھو جاؤں
تمہارے سحر سے اک بار پھر معصوم ہو جاؤں

فاخر

ماں

ماں کے سمجھانے بجھانے کے باوجود جب رامیشور کو حصول معاش کی فکر نہ ہوئی تو ماں عاجز آکر خاموش ہو رہی۔ رامیشور کی طفلانہ فطرت چاہتی تھی کہ خرچ کی قلت تو نہ ہو لیکن کمانا بھی نہ پڑے۔ وہ دل ہی دل میں عہد کرتا کہ وہ کل سے ضرور کوئی نہ کوئی کام شروع کریگا لیکن جب دوسرا دن طلوع ہوتا تو وہ پھر کسی آسان تدبیر کے سوچنے میں مصروف ہو جاتا۔

ماں نے بھی نوشتۂ تقدیر کے سامنے سر تسلیم خم کر کے اس ۲۲ سال کے پڑھے لکھے بچے کی پرورش و پرداخت کرنا اپنا فرض سمجھا۔

رامیشور بڑا صالح نوجوان تھا۔ اس کا چال چلن ہر عیب سے پاک تھا۔ صرف اتنی بات تھی کہ وہ طبیعت کا بے فکر واقع ہوا تھا۔ اس نے نہایت کامیابی کے ساتھ بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی تھی۔ مگر وہ نہیں جانتا تھا کہ اس دو حرف کے دم چھلے سے کہاں اور کس طرح فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ وہ احمق یہ بھی نہیں سمجھتا تھا کہ یہ دُم چھلا حاصل کرنے کے بعد کالے آدمیوں کو حقارت کی نظر سے دیکھنے کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔

تصویر کشی اختیار کر لینے کے بعد وہ بازو پر اپنا کیمرہ لٹکائے اور ہاتھ میں اسٹینڈ کو چھڑی کی طرح گھماتا ہر جگہ نظر آتا تھا۔ اسکی تصویریں دیہاتی مناظر سے لبریز ہوتی تھیں روزمرہ کی معمولی زندگی اُسے بہت دلفریب معلوم ہوتی تھی۔

(۲)

جب وہ اس کام کے سلسلے میں دلی سے علیگڈھ گیا تو اپنے ساتھ چھ پلیٹ لیگیا تھا۔ جنہیں اس نے پہلے ہی روز استعمال کر لیا۔ چار کو سنبھال کر بیگ میں رکھ لیا تھا اور دو سلائیڈ ہی میں چھوڑ دئے تھے۔

جب وہ علیگڈھ سے دلی واپس آنے کے لئے اسٹیشن پر آیا۔ اور اکسپرس کے انٹر کلاس میں داخل ہوا تو اس کے پاس ایک بھری اور ایک خالی سلائیڈ تھی۔

گاڑی روانہ ہوئی۔ اس نے سامنے کی بنچ پر ایک بچے کو دیکھا جو ماں کی گود میں مچل رہا تھا۔ لڑکا نہایت خوبصورت تھا۔ سرخی مائل گورے گورے گال اور پیشانی کے اردگرد بکھرے ہوئے گھنگھریالے بال نئے فوٹو گرافر کو دلفریب معلوم ہوئے۔ اس نے ایسا خوبصورت لڑکا کبھی نہیں دیکھا تھا۔

ماں بھی بالکل بچے کے ہمشکل تھی۔ وہی پاکیزہ حسن، وہی پیاری صورت، لیکن ماں میں عفت و حیا تھی اور بچے میں شوخی اور چلبلاپن، بچہ برابر مچل رہا تھا۔ کسیطرح مانتا نہ تھا۔

رامیشور نے کیمرہ کھولکر کہا —— آؤ شیام! تمہیں ایک تماشا دکھائیں۔

بچہ کیمرے کو دیکھتے ہی کھیلے کو بھول گیا اور آکر رامیشور کی گود میں بیٹھ گیا۔

رامیشور نے پوچھا۔ تصویر کھنچواؤ گے؟

بچے نے تتلی زبان میں کہا۔ ہاں کھچوائیں گے۔

بچے کو خوش دیکھ کر ماں کا دل بھی خوشی سے لبریز ہو گیا اور وہ بیساختہ بول اُٹھی کہ ہاں کھینچدو۔

رامیشور نے بچے کو ماں کے پاس بنچ پر بٹھا کر کیمرے کو درست کرنا شروع کیا۔

بچہ بڑے اشتیاق سے ایک عجب چیز ملنے کی امید میں کیمرے کے لینس کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا تھا۔ ماں بھی بڑے غور سے یہ دیکھ رہی تھی کہ تصویر کس طرح کھینچی جاتی ہے۔

رامیشور نے کیمرہ ٹھیک کر لیا لیکن پھر نہ جانے کیا سمجھ کر ہچکچاتے ہوئے ماں سے کہا ”آپ کی بھی تصویر اتر آئیگی۔ اس میں کچھ مضائقہ تو نہیں ہے؟“

ماں نے کچھ جواب نہ دیا۔ بیگ میں سے عینک نکالکر لگائی اور کپڑے کی شکن درست کر کے بچے کے پاس آ بیٹھی۔

رامیشور کے پاس خالی سلائیڈ تھی، اس نے فوکس لگایا شیام کو لینس دکھا کر کہا۔ اس میں سے چڑیا نکلیگی۔ پھر قاعدہ کے مطابق ایک۔ دو تین گنکر کہا — تصویر کھنچ گئی۔

تصویر کشی تو تھی نہیں، ایک تماشا تھا جو ختم ہو گیا۔ رامیشور کیمرہ بند کر کے رکھنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ ماں نے کہا — لائیے

تصویر دیجئے ۔

رامیشور بڑی مشکل میں پڑ گیا ۔ تصویر کہاں کھنچی تھی ۔ وہ تو ایک تماشا تھا ۔ سلائیڈ تو خالی تھی ، اور تصویر کھنچتی بھی تو دی کیسے جا سکتی تھی ؟ اسے تیار کرنے میں کم سے کم دو روز کی ضرورت ہوتی ۔ لیکن اس سے پھر کہا گیا ۔۔۔ جتنی قیمت ہو لے لیجئے تصویر دیدیجئے ۔

رامیشور کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی ، اس نے سوچا ۔ کیا وہ یہ کہدے ، وہ تو ایک بہلاوا اور کھیل تھا ۔ نہیں یہ تو نہیں کہا جا سکتا ۔ ماں نے کتنے شوق سے اپنی اور بچے کی تصویر کھنچوائی ۔ پھر کیا سچ سچ کہہ کر اس کا دل توڑ دیا جائے ؟ نہیں یہ مناسب نہیں ہے ۔

ماں نے پھر کہا ۔۔۔ دیکھئے یہ ٹھیک نہیں ہے ۔ تصویر دیدیجئے ۔

رامیشور نے کہا ۔۔۔ ابھی تصویر کیسے دی جا سکتی ہے ؟ وہ ابھی دھوئی جائیگی ۔ چھاپی جائیگی جب کہیں تیار ہوگی ۔

ماں نے کہا ۔۔۔ اچھا ہم لاہور میں دھلوا لیں گے ۔

رامیشور نے کہا ۔۔۔ جی نہیں ۔ اسے ذرا سی دھوپ لگی کہ خراب ہوئی ۔

ماں نے پھر کہا ۔۔۔ یہ ٹھیک نہیں ہے ۔ آپ تصویر دیدیجئے ہمیں یہ معلوم نہ تھا ۔

رامیشور نے کہا ۔۔۔ کیا آپ سمجھتی تھیں کہ تصویر ابھی تیار ہو جائیگی اور آپ کو مل جائیگی ؟

جواب ملا ۔ ہمیں یہ نہیں معلوم تھا کہ تصویر آپ ہی کے پاس رہیگی ۔

رامیشور نے کہا ۔۔۔ تو اس میں ہرج ہی کیا ہے ؟

عورت تنہا نہیں تھی ۔ اس کے ساتھ ایک اور عورت بھی تھی ۔ ایک بوڑھا ملازم تھا ۔ کئی اور لڑکے تھے ۔ اس نے ایکبار اپنی ساتھی عورت کی طرف دیکھا اور دیکھکر کہا ۔۔۔ نہیں نہیں آپ تصویر دیجئے ۔

رامیشور کبھی کا دے چکا ہوتا لیکن دیتا تو جب کہ کوئی چیز ہوتی بھی ۔ اس نے کہا ۔۔۔ آپ کو دینے کے معنی یہ ہیں کہ اسے خراب کر دیا جائے ۔ اس سے تو بہتر یہی ہے کہ توڑ دیا جائے ۔ آپ کیوں میری محنت برباد کرتی ہیں ؟

اس عورت نے پھر اپنی ساتھن کی طرف اس انداز سے دیکھا گویا وہ خود رامیشور کا پیچھا چھوڑ دینا چاہتی ہے ۔ لیکن شائد اسے ساتھن کی طرف سے اشارہ ہوا کہ لاہور جا کر یہ بات پوشیدہ نہ رہ سکیگی ۔ پھر کیا ہوگا ؟

اس نے کہا ۔۔۔ تو توڑ ہی ڈالئے ۔

رامیشور نے اپیل کرتے ہوئے کہا ۔۔۔ جی ، دیکھئے ۔ میرا وطن دہلی ہے ۔۔۔ آپ لاہور جا رہی ہیں ۔ میرا آپ کا تعارف بھی نہیں ہے ۔ آج کے سوا پھر شائد کبھی ملاقات بھی نہ ہوگی ۔ میں پیشہ ور فوٹوگرافر بھی نہیں ہوں ۔ میرے پاس تصویر رہے تو آپ کا کچھ نقصان نہ ہوگا ۔

ماں نے پھر ساتھن کی طرف دیکھا پر اس کی تصویر تو کھنچی نہ تھی ماں نے کہا ۔۔۔ آپ اخبار میں بھیجدیں گے ۔ اپنے کمرے میں لگائیں گے ۔

رامیشور نے ساتھ ہی کہا ۔۔۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ نہ میں خود لگاؤنگا اور نہ کہیں بھیجونگا ۔ آپ میری محنت ضائع نہ کیجئے ۔

ماں کو یقین ہو چکا تھا کہ یہ بات لاہور میں بچے کے باپ تک ضرور پہنچ جائیگی ۔ وہ غریب مجبور تھی اس نے پھر کہا ۔۔۔ نہیں آپ توڑ ہی دیجئے ۔

رامیشور کے لئے یہ امر سوہان روح ہو رہا تھا کہ وہ اس درجہ بے اعتبار سمجھا جا رہا ہے ۔ اس نے چاہا کہ سچی بات کہدے لیکن خیال آیا کہ یہ بات کب سچ سمجھی جائیگی ۔ میں کہونگا کہ تصویر نہیں کھنچی گئی تھی ۔ بچے کے بہلانے کے لئے ایک کارروائی کی گئی تھی ۔ وہ سمجھینگی میں تصویر رکھنا چاہتا ہوں اس لئے جھوٹ بولتا ہوں ۔ اس کو اپنی اس بیچارگی پر سخت افسوس ہوا ۔

اس نے پھر کہا ۔۔۔ اگر آپ نہ مانینگی تو میں تصویر کو توڑ ہی ڈالونگا ۔ لیکن میں پھر آپ سے کہتا ہوں کہ میں دلی چلا جاؤنگا ۔ اس کے بعد کبھی آپ سے ملاقات کبھی نہ ہوگی ۔ ایسی صورت میں اگر آپ کی تصویر میرے پاس رہی تو اس میں آپ کا کیا ہرج ہے ؟ دیکھئے شیام کی تصویر میرے پاس رہنے دیجئے ۔ آپ کی تصویر کے بارے میں میں نے پہلے ہی آپ سے دریافت کر لیا تھا ، آپ کا یہ شیام مجھے پھر کہاں ملیگا ؟ اس کا مرقع آپ مجھ سے کیوں چھین رہی ہیں ؟

اس نے کہا ۔۔۔ تو شیام کی دوسری تصویر آپ لے لیجئے ۔

لیکن رامیشور کے پاس خالی پلیٹ کہاں تھا ؟ اگر ہوتا تو جھگڑا ہی کیا تھا ؟

اس نے کہا ۔۔۔ افسوس کہ میرے پاس کوئی خالی پلیٹ نہیں ہے ۔

جب رامیشور نے دیکھا کہ چھٹکارا ناممکن ہے تو اس نے مجبور ہو کر کہا ۔۔۔ اچھا لیجئے ۔ اور بھری سلائیڈ کھول ڈالی ۔

ماں نے کہا ۔۔۔ دیکھئے بدل نہ لیجئے گا ۔

رامیشور نے کہا ۔۔۔ اتنی بے اعتباری نہ کیجئے ۔ یہ کہکر اس نے پلیٹ نکالکر چلتی ہوئی ریل کے نیچے ڈالدیا ۔

جس عورت کی تصویر نہیں کھنچی تھی شاید اس کا شبہ باقی رہا ۔ اس

لئے ماں نے کہا — ذرا وہ دکھائیے تو۔ دیکھیں آپ نے پھینکا بھی یا نہیں۔

رامیشور کو بڑا صدمہ ہوا۔ اس نے اٹھکر شیام کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا — میں اتنا جھوٹا نہیں ہوں۔ یہ کہکر اس نے ماں کو سلائیڈ دکھا دی۔

ماتھن نے سلائیڈ کو کھولکر اس کے ہر حصے کو انگلی سے دبا دبا کر اور ہر کونے کو ٹٹول ٹٹول کر ماں کو اطمینان دلایا کہ سچ مچ اس کے اندر کوئی چیز نہیں ہے جب اس کو رامیشور پر کسیقدر اعتبار ہوا۔

اب رامیشور نے شیام سے خوب دوستی پیدا کر لی۔ یہانتک کہ دلی پہنچتے پہنچتے وہ شیام کا پورا ماموں بن گیا۔

دلی پہنچکر ان سب کو لاہور کی گاڑی میں بٹھانے کے بعد رامیشور شیام کی ماں سے معافی مانگ کر اور سوتے ہوئے شیام کے منہ کا بوسہ لیکر اس کی ماں سے رخصت ہوا۔

دلی میں اور کاموں کی عدم موجودگی میں رامیشور کوشش کر کے جرنلسٹ اور ایک سیاسی لیڈر بن گیا۔

(۳)

لاہور ضلع کانفرنس میں صدارتی تقریر کرنیکے بعد پہلے اجلاس کی کارروائی ختم کر کے رامیشور قیام گاہ پر آیا تو اس کے کوئی ۱۵ منٹ کے بعد اسے ایک رقعہ ملا جس میں لکھا تھا۔

"کیا آپ مجھے چار بجے پارک میں مل سکیں گے؟

"شیام کی ماں"

علیگڈھ کے سفر کا واقعہ پرانا ہو چکا تھا۔ پھر بھی رامیشور اس نقش کو نہ مٹا سکا تھا جو اس کے دل کے صفحے پر ثبت تھا۔ زمانے کی طوالت اور اس کے انقلابات نے اس نقش کو کسیقدر دھندلا کر دیا تھا رقعہ کے الفاظ نے اسے تازہ کر دیا۔

رامیشور کو خیال آیا کہ — شیام! — آہا! وہ بھی ساتھ ہوگا، وقت کا انتظار کرتے کرتے چار بجے رامیشور پارک میں پہنچا تو شیام کی ماں اس کی طرف آ رہی تھی۔

اس نے پوچھا — تمہارا نام کیا ہے؟

رامیشور — رامیشور۔

شیام کی ماں — اب میں تمہیں تمہارے نام سے بلاؤنگی — رامیشور! کیا تم اب بھی تصویر کھینچ سکتے ہو؟

رامیشور نے دیکھا وہی شیام کی ماں ہے۔ پھر بھی کچھ اور ہے وہ اس کی اس عاجزانہ درخواست کا مطلب سمجھ نہ سکا۔ اس کو کچھ اندیشہ سا معلوم ہونے لگا۔ اس نے کہا — اسوقت تو کیمرہ نہیں ہے۔ اور مشق بھی نہیں ہے۔

وہ۔ کیمرہ لا نہیں سکتے؟

رامیشور۔ ابھی؟

وہ۔ ہاں۔ ابھی۔

رامیشور۔ ابھی کہاں سے ملیگا؟

وہ۔ کیوں؟ کیوں نہ مل سکیگا؟ تم تو لیڈر ہو۔ اتنا بھی نہیں کر سکتے؟

رامیشور۔ جاتا ہوں کوشش کرونگا۔

رامیشور کچھ ہی دور گیا ہوگا کہ ماں نے بلا کر کہا — رامیشور! سنو یہ روپے لیلو۔ کیمرہ ملے تو نیا خرید لانا۔

رامیشور۔

وہ۔ جاؤ۔ ابھی جاؤ۔ جلد ہی واپس آنا۔ نہیں تو تصویر نہ کھنچ سکے گی۔ رات ہو جائیگی۔

رامیشور کچھ نہ کہہ سکا۔ اس منت آمیز حکم میں کچھ ایسا اثر تھا جسکی مخالفت ناممکن تھی۔

رامیشور چلا گیا۔ اور ماں بیخود اور بیجان سی وہیں بیٹھ گئی۔

گھنٹے بھر کے بعد رامیشور کیمرہ لیکر واپس آیا تو ماں ہنسنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس سے پہلے شاید وہ رو رہی تھی۔

ماں بڑی سج دھج سے آئی تھی۔ فوکس ٹھیک کر کے جب رامیشور کے ایک۔ دو۔ تین کہنے کا وقت آیا تو ماں نے اپنی تمام قوت اس کوشش میں صرف کر دی کہ چہرے پر ہنسی کی شگفتگی اور چمک نمایاں ہو جائے۔

آہ! یہ ہنسی کسقدر پُر اسرار اور دردناک تھی۔ اُس سے جتنی خوشی ظاہر ہوتی تھی۔ اس سے زیادہ غم کا اظہار ہوتا تھا۔

تصویر کھنچوانے کے بعد وہ اپنی تمام قوت صرف کر کے بمشکل سنبھلی رہی پھر رامیشور کے قریب آکر بولی — ایک روز تم نے شیام کی اور میری تصویر ایک ساتھ کھینچی تھی، یاد ہے نا؟ وہ بہن نے توڑوا دی تھی۔ کہیں بھول تو نہیں گئے؟ اب ایک کام کرو گے؟

رامیشور نے اقرار اور قبولیت کی نگاہوں سے ماں کی طرف دیکھا۔

ماں نے کہا — سنو میری تصویر تیار کرنا — ماں نے اندر کے جیب سے ایک فوٹو نکالکر دیتے ہوئے کہا — اور یہ لو شیام کا فوٹو۔ ان دونوں کی ایک تصویر بنانا۔ اور اس کا بڑے سے بڑا سائز

کرکے اپنے ہاں لگالینا۔

یہ کام تمہیں کرنا۔ کسی دوسرے کے سپرد نہ کردینا۔ جانتے ہو شیام تمہیں کتنا چاہتا تھا۔

دلی سے جب تم جدا ہوئے تو شیام سو رہا تھا۔ اس نے جاگتے ہی پوچھا۔ کہ ماں! انچھویل والے ماموں کہاں گئے؟ جانتے ہو اب شیام کہاں ہے؟ .... کیا دیکھتے ہو؟ وہ میری گود میں چھپکر تھوڑا ہی بیٹھا ہے۔ یہاں نہیں، وہ بہت بڑی گود میں بیٹھا ہے۔ دیکھتے ہو یہ سب کیا ہے؟ ــــ یہ آسمان ہے۔ یہ آسمان ہی پرماتما کی گود ہے، شیام اسی گود میں چھپا بیٹھا ہے۔ نظر بھی تو نہیں آتا۔ دیکھو چاروں طرف آسمان ہے۔ چاروں طرف دیکھو، کیا کہیں نظر آتا ہے؟ نظر آئے تو مجھے بھی دکھا دینا۔ میں بھی دیکھونگی۔ چپ چاپ ہی چلا گیا۔ اگر میں اسے دیکھ پاؤں تو کہوں۔ دیکھ تیرا انچھویل والا ماموں دیکھ رہا ہے؟

رامیشور کا گلا بھرا ہوا تھا۔ جیسے آنسوؤں کا گھونٹ گلے میں پھنس گیا ہو۔ ماں کی زبان برابر چل رہی تھی۔ گویا جسم کی رہی سہی طاقت ایک بار ہی نکل نکل کر ختم ہو رہی تھی۔

جانتے ہو ــــ یہی چوتھی مارچ تھی، اسی روز اسی وقت وہ گیا۔ میں سال بھر سے اسی چوتھی مارچ کا انتظار کر رہی تھی۔ سوچ رہی تھی کہ تم ملوگے تو تصویر کھنچواؤنگی۔ تصویر میں ہم دونوں ساتھ رہینگے اور وہ تصویر تمہارے پاس رہیگی۔ تم مل گئے۔ تصویر کھینچ گئی۔ دونوں کو ملا کر تم ایک تصویر بناؤگے نا؟ دیکھو ضرور بنانا۔ بڑی سے بڑی بنانا اور اپنے کمرے میں لگانا۔ جہاں چاہے بھیجنا۔ اخباروں میں دینا۔ دوستوں کی نذر کرنا۔ جہاں نظر آئیں شیام اور شیام کی ماں دونوں ساتھ نظر آئیں۔ اب جا رہی ہوں۔ اسی کے پاس جا رہی ہوں ــــ ہمیشہ اسی کے پاس رہنے جا رہی ہوں۔

ماں کی حالت خراب ہوتی جا رہی تھی۔ ماں نے کہا ــــ سنو ایک مہینہ ہوا میں بیوہ ہو چکی ہوں۔ وہ بھی چوتھی ہی تاریخ تھی۔ چوتھی تاریخ اور مارچ کا مہینہ، آج کی اس چوتھی مارچ کا دن میری زندگی کا آخری دن ہے۔ میں زہر کھا چکی ہوں۔ تین گھنٹے ہو چکے ہیں۔ اب زہر کے آخری عمل کا لمحہ دور نہیں ہے۔ میں پھر دنیا میں نہ ہونگی۔

رامیشور کے دیکھتے ہی ماں کا جسم بیجان ہو کر گر پڑا۔

جرنلزم اور لیڈری کو خیرباد کہکر رامیشور پھر اپنی بھولی ہوئی فوٹوگرافی کو یاد کرنے لگا وہ سال بھر میں شیام اور اس کی ماں کی تصویر مکمل کرنے میں کامیاب ہو گیا جس کمرے میں وہ تصویر لگی وہ اس کی یادگار کا کمرہ بنگیا۔ وہاں کوئی تصویر باقی نہ رہ سکی۔

اب رامیشور نے فوٹوگرافی ہی کو اپنا ذریعۂ معاش بنالیا۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں وہ کامیاب فوٹوگرافر ہوگیا۔

تمام بڑے بڑے اخبارات میں شیام اور اس کی ماں کی تصویر شائع ہوئی اور ہر جگہ اس کی تعریف کی گئی۔

(ہنس)

مختار
ابو محمد امام الدین۔
(مدیر ترجمان)

جب یہ صرفِ رنگ و بو ہو جائیگی — گل کی ہستی آرزو ہو جائیگی
اب نگاہِ شوق کو رسوا نہ کر — بے نیازِ آرزو ہو جائیگی
عرضِ حسرت پر نہ تو مجبور کر — بے نیازی تیری خو ہو جائیگی
غور سے تم میری صورت دیکھ لو — شرحِ لفظِ آرزو ہو جائیگی
میری خاموشی ہی جوہر ایکدن
داستانِ آرزو ہو جائیگی

جوہر

رواقیت

تمہید

اگرچہ اخلاقی برائیوں، اور آرام طلبی کی وجہ سے یونان کی شہرت ماند پڑچکی تھی لیکن پھر بھی بعض نیک افراد ایسے موجود تھے جن کے دل میں قدیم اصول موجزن تھے۔ اور وہ حتی الوسع تمام مختلف قوتوں کا مقابلہ کررہے تھے۔ تاریخ میں یہ لوگ رواقیین کے نام سے مشہور ہیں کیونکہ اس مذہب کا بانی زینو، اسٹوا۔ یعنی رواق میں بیٹھکر درس دیا کرتا تھا۔

اِس اسکول (مذہب) نے بڑے بڑے نامور حکماء اور مصنفین پیدا کئے ہیں۔ چونکہ اس کی تعلیمات، رومی اصولِ زندگی سے مطابقت رکھتی ہیں۔ اِس لئے بہت سے رومن افراد اس مذہب کے پیرو ہوگئے۔ سیسرو (Cicero) سینکا اور مارکس آریلیس وغیرہ سب رواقی گزرے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر رومی قوم بجا طور سے فخر کرسکتی ہے۔ اور اگر تمام رواقی زعماء کا حال قلمبند کیا جائے تو ایک کتاب تیار ہوجائے۔

زینو کی لائف

یہ برگزیدہ انسان ۳۵۰ ق م میں بمقام سنستن واقع جزیرہ سائپرس پیدا ہوا تھا۔ اس کا باپ ایک دولتمند تاجر تھا۔ اُس نے اپنے بیٹے کو بھی اسی کام پر لگایا لیکن زینو کی قسمت میں تو فیلسوف ہونا لکھا تھا جب پہلی مرتبہ سامانِ تجارت لیکر تبرص سے ایتھنز کو روانہ ہوا تو تمام سامان سمندر میں تلف ہوگیا۔ اور زینو محض متاعِ جان لیکر یونان کے دارالخلافہ میں وارد ہوا یہاں آکر اُس نے فیصلہ کیا کہ ایسی دولت جمع کرنا چاہیئے جو نہ آگ میں جل سکے نہ پانی میں غرق ہوسکے۔ سقراط، افلاطون۔ ارسطو اور تمام مشہور حکماء کی تصنیف کا مطالعہ کیا لیکن کسی مذہب سے تسلی نہ ہوسکی بہرکیف بیس سال تک فلسفہ کے مطالعہ میں مصروف رہا۔ اور ۳۱۰ ق م میں بطور خود درس دینا شروع کردیا، اور اٹھاون سال یعنی ۲۵۲ ق م تک پابندی کے ساتھ، درس وتدریس میں مشغول رہا۔ ایک دن جبکہ مدرسہ سے باہر نکلکر، کسی کام کے لئے جارہا تھا تو راستہ میں ٹھوکر کھاکر گر پڑا۔ فوراً اپنی پیرانہ سالی اور جسمانی کمزوری پر خیال کرکے گھر واپس آیا اور کہنے لگا "اے زمین! اگر تو نہیں چاہتی کہ آئندہ مجھ پر چلوں پھروں تو میں تیرے ارشاد کی تعمیل کرنے کو تیار ہوں"۔ یہ کہکر وصیت کی۔ کلینا تیھز کو اپنا جانشین مقرر کیا اور پھانسی کا پھندا گلے میں ڈال لیا۔

زینو کی زندگی سرتاپا زاہدانہ اور پارسایانہ تھی۔ باشندگانِ ایتھنز اُس کو اس درجہ ایماندار سمجھتے تھے کہ قلعہ کی کنجیاں اُس کی تحویل میں رکھ چھوڑی تھیں۔ اگرچہ اٹھانوے سال کی عمر پائی لیکن آخر دم تک حواسِ خمسہ میں کسی قسم کا فرق نہیں آیا۔ اور دل ودماغ نوجوانوں کی طرح روشن اور مستعد رہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُس کی زندگی نہایت پاکیزہ اور سادہ تھی تمام عمر انجیر، شہد اور روٹی کے علاوہ اور کسی چیز کی طرف رغبت نہ کی۔ اُس کی وفات کا لوگوں نے بڑا قلق کیا اور بطور اظہارِ عقیدت ہموطنوں نے ایک مجسمہ اُس کی یادگار میں نصب کیا اور اس کے نیچے کتبہ لگایا۔ "زینو وہ شخص تھا جس کی زندگی، اُس کے عقائد سے مطابقت کلی رکھتی تھی" یہ فقرہ بظاہر معمولی ہے لیکن دنیا میں پیغمبروں کو چھوڑ کر شاید دس پانچ نفوس ہی ایسے گزرے ہوں جن پر یہ تعریف صادق آسکتی ہے۔

گلی آینیتیز کے بعد کریسی کپس جو بلحاظ تعدادِ تصانیف تمام حکماء سے گوئے سبقت لے گیا ہے۔ زینو کے قائم کردہ مدرسہ کا صدر مقرر ہوا۔ یہ شخص تمام علوم میں مہارت رکھتا تھا۔ اور روزانہ پانچ سو سطور کے حساب سے تصنیف کیا کرتا تھا۔ مورخین نے اس کی تصانیف کی تعداد ۷۰۵ بیان کی ہے۔ افسوس کہ آج ایک تصنیف بھی دستیاب نہیں ہوسکتی۔

رواقی فلسفہ پر ایک عام تبصرہ

ارسطو اور افلاطون کی تصانیف کسی زمانہ میں مفید مطلب نہیں لیکن جوں جوں علمی ذوق کم ہوتا گیا، اُن کی تصانیف بھی طبائع پر بار ہونے لگیں۔ لہذا کسی ایسے فلسفہ کی ضرورت محسوس ہوئی جو سلیس اور عام فہم ہو۔ چنانچہ رواقیت اِسی ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ اس فلسفہ میں عملی پہلو کو نمایاں جگہ حاصل ہے چنانچہ اِس فلسفہ کا لبِ لباب یہ ہے کہ انسانی زندگی کا مقصد نہ تحصیلِ حکمت ہے نہ حصولِ راحت بلکہ پاکیزہ اور نیک زندگی بسر کرنا تاکہ انسان اپنی جوانی سے بدرجۂ اتم بہرہ اندوز ہوسکے۔ یہ فلسفہ انسان کو علم اور نیک عمل کی طرف مائل کرتا ہے۔ سرتاپا اخلاقیات سے تعلق رکھتا ہے اور روزمرہ زندگی میں کارآمد ہوسکتا

ہے یہ بات دوسرے مذاہب میں نہیں پائی جاتی ۔ انسان کی خوبی یہ نہیں کہ اُسے حکماء کی تصانیف پر عبور ہو بلکہ اُس میں "اخلاق حسنہ" موجود ہوں جو فلسفہ، انسان کو نکوکاری کی جانب مائل نہ کرے اُس کا حاصل کرنا بالکل فضول ہے ۔ لہذا زینو کی نظر میں سچا فیلسوف وہی ہے جو اعلیٰ درجے کی پاکیزہ اور نیک زندگی بسر کرتا ہے ۔ اِس کے معنی یہ ہوئے کہ اُس نے فلسفہ اور مذہب کے ڈانڈے ایک دوسرے سے ملا دئے ۔ نیز حکمت (فلسفہ) کا تعلق چونکہ خیال علم اور عمل یعنی (Practice) سے ہے ۔ اِس لئے اُس نے فلسفہ کو منطق طبیعات اور اخلاق تین علوم پر تقسیم کیا ۔ وہ کہتا ہے کہ "منطق مثل انڈے کے چھلکے کے ہے ۔ طبیعیات مثل سفیدی کے اور اخلاق مثل زردی کے ۔" نیز یہ کہ انسان صرف غور و فکر کرنے یا سامان عیش و راحت مہیا کرنے کے لئے نہیں پیدا کیا گیا ۔ بلکہ عمل اور نیک عمل کرنے کے لئے ۔

منطق زینو اور اُس کے جانشینوں نے افلاطون کی منطق سے اختلاف کیا ہے اور ارسطو کی منطق کو، قدرے ترمیم کے ساتھ اختیار کر لیا ۔ رواقی بھی یہی کہتے ہیں کہ کلیات کا وجود، خارج میں کہیں نہیں پایا جاتا ۔ کریسی پس کا قول ہے کہ روح یا نفسِ ناطقہ سادہ صفحہ کی طرح ہے ۔ جب انسان صاحب شعور ہو جاتا ہے تو مختلف احساسات انسان میں دماغی تبدیلی، ترقی، نشو و نما وغیرہ پیدا کرتے ہیں ۔ اِن احساسات سے "مظاہر" ہی کا علم حاصل نہیں ہوتا بلکہ خیالات عقلی کا بھی ۔ گویا اِس معاملہ میں ابیقوریت، اور رواقیت دونوں ہمخیال ہیں ۔ ان لوگوں نے برخلاف ارسطو کے صرف چار مقولے قرار دئے ۔

(۱) ذات شے (τὸ ὑποκείμενον)

(۲) اعراض یا صفات (τὸ ποιόν)

(۳) نسبتِ شے بذات خود (τὸ πὼς ἔχον)

(۴) نسبتِ شے بدیگراں (τὸ πρός τι πὼς ἔχον)

طبیعات اُن کی طبیعات زیادہ تر ہرقلیطوس[۵۱] اور ارسطو کے فلسفہ پر مبنی تھی ۔ یہ لوگ ہر شے کو مجسم خیال کرتے تھے ۔ صرف خلاء ۔ زماں ۔ مکاں اور خدا کو غیر مجسم سمجھتے تھے ۔ اُن کے نزدیک جسمانی اشیاء میں صرف ابعادِ ثلاثہ (طول عرض عمق) ہی نہیں ہوتا ۔ بلکہ فاعلیت یا انفعال میں سے بھی کسی ایک بات کا ہونا ضروری ہے ۔ نیکی بدی ۔ خیال ۔ عادت ۔ موسم ۔ ماہ و سال ۔ عقل و فہم غرضکہ ہر چیز جس میں خواص پائے جائیں اُن کی نظر میں جسمانی یا مادی ہے ۔ بلکہ خواص بھی ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ شے اور اُس کے خواص میں امتیاز نہیں کرتے ۔ کائنات میں دو عناصر پائے جاتے ہیں ۔ ایک تو "ہیولیٰ" جو عنصر انفعالی ہے ۔ دوسرا "عقل" جو عنصر فاعلی ہے ۔

اگر کائنات فنا ہو جائے تو صرف دو چیزیں باقی رہ جائیں گی خدا اور یہ دونوں باہم متحد ہیں بلکہ ایک ہی ذات یا جوہر کے دو پہلو ہیں بلحاظ فاعلیت اُسی کو خدا کہتے ہیں جسے بلحاظِ انفعالیت مادّہ کہا جاتا ہے ۔ خدا ۔ عقل کل ہے ۔ جو ہر شے کا صانع ہے ۔ تمام کائنات میں جاری و ساری ہے جس طرح روح، جسم میں ۔ علیم ہے حکیم ہے مُدبّر ہے ۔ "مالکِ یوم الدین" ہے، کامل ہے ۔ خیر محض ہے اور صاحبِ ارادہ ہے خدا، دنیا سے جدا ہے مگر اسی طرح جس طرح روح، جسم سے، اور جس طرح روح بغیر جسم کے نہیں رہ سکتی، اسی طرح خدا بغیر کائنات کے ہماری سمجھ میں نہیں آ سکتا، اور جس طرح روح اور جسم دونوں ملکر ایک وجود یعنی "انسان" قرار پاتے ہیں اُسی طرح خدا اور کائنات بھی ملکر ایک وجود[۵۲] قرار پاتے ہیں ۔ دنیا میں بدی کا وجود ہے ۔ لیکن خدا کی مشیئت کی بناء پر نہیں ہے ۔ اس کا یہ منشاء نہیں کہ دنیا میں بدی کا رواج ہو ۔ اخلاقی بُرائی تکمیل کائنات کیلئے ضروری ہے ۔ کیونکہ جب تک سردی نہ ہو گرمی کا لطف، اور نار نہ ہو نور کا لطف تلخی نہ ہو شیرینی کا لطف نہیں آ سکتا ۔ پس "بدی" نہ دنیا سے مفقود ہو سکتی ہے ۔ اور نہ ایسا ہونا قرینِ مصلحت ہے ۔ ہرقلیطوس کہتا ہے کہ کائنات کی بنیاد "اضداد" پر قائم ہے ۔ پس نیکی کا وجود بھی بغیر بدی کے متحقق

---

۵۱ انہی باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے الہامی مذاہب کی ضرورت تسلیم کرنی پڑتی ہے ۔ اہل الرواق نے دراصل وحدت الوجود، کثرت الوجود اور توحید ذات باری تینوں کو سمو کر ایک جداگانہ مذہب ایجاد کیا تھا اور جو لوگ فلسفہ یونان سے واقف ہیں اُن کو دیمقراطیسی افلاطونی اور مشائی تینوں رنگ اُن کے فلسفہ میں صاف نظر آ سکتے ہیں ۔ رواقی ایک طرف خدا کو مادہ سے جدا ہی نہیں مانتے بلکہ مادہ ہی کو خدا سمجھتے ہیں ۔ دوسری طرف اُسے "مالک یوم الدین" یعنی نیکی، بدی کا حساب کرنے والا نیکوں کو جزاء اور بدوں کو سزا دینے والا بھی سمجھتے ہیں ۔ سچ ہے اگر انسان بغیر واسطۂ "روح قدس" حقیقت سے آشنا ہو جاتا تو غارِ حرا کی آواز مذہبی دنیا میں قطعاً بے سود بلکہ تحصیل حاصل قرار پاتی ۔ ۱۲ مولف

۵۲ ذوق دہلوی نے بھی غالباً رواقیوں کی تصانیف کا مطالعہ کیا ہوگا جو کہتے ہیں :-

اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے ۔

نہیں ہوسکتا۔

دنیا چونکہ ایک کامل اور نیک ہستی نے بنائی ہے۔اس لئے لازمی طور پر بہترین اور جمیل ہوگی اور اسی لئے اختلاف، کثرت اور اضداد کا وجود پایا جاتا ہے۔ کائنات میں اسدرجہ اختلاف ہے کہ ایک مخلوق دوسری سے قطعاً نہیں ملتی۔ حد ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان سے نہیں ملتا۔ اور یہ اختلاف ہی باعثِ حسن وجمال یا موجب زیب وزینت ہے۔

پودے اور درخت حیوانات کے فایدہ کے لئے بنائے گئے ہیں۔ حیوانات انسان کے لئے، انسان، جماعت کے لئے، اور جماعت دیوتاؤں کی خدمت کے لئے، اور دیوتا جماعت کو فائدہ پہنچانے کے لئے۔

جملہ اشیاء عناصر چہارگانہ (آتش۔آب۔خاک وباد) سے ملکر بنی ہیں۔ اور سوائے روح کے سب فانی ہیں۔ روح، بھی بالذات فانی ہی ہے۔ لیکن وفات انسانی کے بعد ایک غیر معین عرصہ تک زندہ رہیگی، جس کے بعد ایک زبردست واقعہ (طامّۃ الکبریٰ[1]) رونما ہوگا اور ساری ارواح، خدا کی ذات سے متحد ہو جائینگی (قطرہ دریا سے مل جائیگا) کریسی پس نے اپنے استاد سے اس معاملہ میں اختلاف کیا ہے وہ کہتا ہے کہ صرف نکوکاروں کی ارواح، مرنے کے بعد باقی رہتی ہیں۔ بد اور شریر انسانوں کی ارواح جسم ہی کے ساتھ مٹی میں مل جاتی ہیں، اور روح، ایک لطیفۂ آتشیں ہے۔ جو تمام جسم میں جاری و ساری ہے۔ اور اس کا مرکز ...ب ہے نہ کہ دماغ۔ روح کے خاص اجزائے ترکیبی آٹھ ہیں۔ ایک قلب ہیں جو تمام جسم پر حکمران ہے۔ پانچ پانچوں حواس میں کارفرما ہیں۔ ایک آواز (صوت) میں جلوہ گر ہے اور ایک توالد وتناسل میں معاون ہے۔ ہر شہوت۔ جذبہ خواہش یا ہیجان، ایک خیال ہے۔ مگر ناقص۔ نیست روح کے لئے محرک ہوتی ہے۔ انسان نہ بالکل مجبور ہے نہ قطعاً مختار بلکہ جبر واختیار کے درمیان

اخلاقیات

زینو کے فلسفہ میں اخلاقیات کو خاص مرتبہ دیا گیا ہے اور اُس کے فلسفۂ اخلاق کو پورے طور سے سمجھنے کے لئے، اُن کے تصورِ ذاتِ باری سے واقفیت حاصل کرنا ضروری ہے۔ زینو کی رائے میں کائنات دو عناصر کا مجموعہ ہے۔ (۱) ھیولیٰ یعنی مادہ جو مختلف اشیاء میں صورت پذیر ہونے کی استعداد رکھتا ہے۔ (۲) عقل یعنی خدا جو مادہ کو مختلف صورتیں عطا کرتا ہے۔ عقلِ الٰہی نے مادہ پر حکومت کرنے کے لئے چند قوانین بنا دئے ہیں جنکو ([illegible]) یعنی اسباب مولّدہ کہتے ہیں۔ پس اگر عقل ہی خالق وصانعِ کُل شئی ہے تو عقلی اصولوں کے مطابق زندگی ہی اخلاقی زندگی قرار دیجا سکتی ہے۔ اور چونکہ تمام کائنات، قانونِ عقل کے ماتحت ہے اس لئے اخلاقیات کے لئے بھی ایک ہی اصول معین ہے۔

([illegible]) یعنی "قوانین فطرت کے مطابق زندگی بسر کرنی چاہئے"۔ زینو کہتا ہے کہ جو شخص فطرتِ الٰہیہ کے مطابق زندگی بسر نہیں کرتا وہ کسی صورت سے نکوکار نہیں کہلا سکتا۔ "نیکی" کی استعداد ہر ذی عقل میں ودیعت شدہ ہے۔ اُس کی نشو ونما "عقل" پر منحصر ہے۔ جو شخص عقل و حکمت کی طرف متوجہ ہوگا وہی "نیک" زندگی بسر کر سکیگا۔ اور یہی خصوصیت انسان کو حیوانات سے ممتاز کرتی ہے۔ پس "فطرت[2]" کی متابعت کرو اور فطرت کے مطابق وہی زندگی قرار دیجا سکتی ہے جسمیں "زندگی کے جملہ ارکانِ ترکیبی باہمدگر ہم آہنگ اور متوازن ہوں۔ افعال انسانی کا اچھا بُرا ہونا فاعل کی نیت[3] پر منحصر ہے، اور نیت کی پاکیزگی عقل کی متابعت سے حاصل ہو سکتی ہے۔

گویا زندگی کے ہر شعبہ میں عقل ہی کو حاکم بنانا چاہئے۔ یعنی انسان سراپا "ادراک[4]" ہے۔ اِس نظریہ کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ ہر بات، جو انسان کی حیاتِ مدرکہ میں مزاحمت کرے۔ زندگی کے لئے خطرناک ہے۔ لہذا اُس سے پرہیز کرنا چاہئے جسمانی راحت وسرور لائق اعتناء نہیں ہے۔ ہر عقلمند آدمی کو اِن باتوں سے احتراز لازم ہے کیونکہ "جذبات" انسان کو اپنا غلام بنا لیتے ہیں، عقل ہی کی بدولت اِس غلامی سے نجات حاصل ہوتی ہے۔ لہذا انسان پر فرض ہے۔ کہ "جذبات" پر غالب آئے اور "لذاتِ حسّی" سے کنارہ کرے تاکہ پاکیزہ زندگی بسر کر سکے۔

---

[2] یہ ایک عظیم الشان حقیقت ہے جسکو ابھی تک انسان نے پورے طور سے نہیں سمجھا ہے۔ اگر بنی نوع آدم "فطرت اللہ" کی اطاعت اپنا شعار بنالیں تو "حرم ودیر کے جھگڑے" آن واحد میں مٹ جائیں اور دنیا میں صرف ایک ہی مذہب باقی رہجائے جو یہ کہتا ہے" فاقم وجہک للدین حنیفا۔ فطرت اللہ التی فطرالناس علیہا لاتبدیل لخلق اللہ ذالک دین القیم ولکن اکثرالناس لا یعلمون"

[3] انما الاعمال بالنیات یعنی خوبی وزشتئی اعمال، نیت پر موقوف ہے۔

[4] حالانکہ انسان میں ادراک کے علاوہ جذبات اور وقوف بھی پایا جاتا ہے۔ ۱۲

---

[1] قیامت

فی الجملہ رواقیوں نے یہ سمجھا کہ احساسِ کلفت سے بالاتر ہوجانا ۔ انسانیت کی دلیل ہے حالانکہ جذباتِ طبعی کو بلکلی فنا کردینا سراسر منافیٔ انسانیت ہے ۔ مذہب یا فلسفہ وہی لائقِ قبول ہے جو اِن دونوں پہلوؤں کو برقرار رکھے ۔ انسان میں عقل بھی ہے ۔ اور احساس بھی پس وہ مذہب یا فلسفہ کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا جو عقل کو خارج کردے اور محض جذبات ہی سے اپیل کرے ۔ اِسی طرح وہ مذہب یا فلسفہ بھی مقبول نہیں ہوسکتا جو جذبات کو فنا کرکے محض عقل ہی سے سروکار رکھے ۔ اگر ایسا ہوتا تو پیشوایانِ مذاہب قطعاً تارک الدنیا ہوجاتے لیکن ہم جانتے ہیں کہ دنیا کی سب سے بڑی اور مذہبی شخصیتوں میں سب سے کامیاب ہستی نے شادی بھی کی اور مثل انسانوں کے زندگی بسر کی، نیز رام چندر کرشن موسیٰ عیسیٰ کنفوشس ۔ نانک زرتشت ۔ بدھ یہ سب برگزیدہ افراد "جذبات" اور انسانی جذبات کے حامل تھے اِن کے پہلو میں وہ دل تھا جو راحت والم سے متاثر ہوتا تھا ۔ پس کسی شخص کا یہ کہنا کہ ہم خوشی اور تکلیف سے بالاتر ہیں ۔ اپنے نفس کو دھوکا دینا ہے ۔ یہ ہوسکتا ہے کہ جب کسی شخص پر مصیبت آئے تو وہ خاموش رہے لیکن اِس کے یہ معنیٰ تو نہیں ہیں کہ اُسے رنج نہیں ہے ۔ رواقیوں کی نظر میں فقدانِ احساس سب سے بڑی خوبی ہے ۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو دنیا کے راحت و الم سے بے نیاز ہوجانا کوئی قابلِ تعریف بات نہیں ہے ۔ دنیا میں رہ کر پھر علائق دینوی سے آزاد ہونا بیشک مستحسن قرار دیا جاسکتا ہے ۔ جس کے پاس پھوٹی کوڑی نہ ہو وہ کیا دعویٰ کرسکتا ہے کہ میں شراب نہیں پیتا یا کمزور انسان کیا دعویٰ کرسکتا ہے کہ میں کسی کو ایذا نہیں پہنچاتا ۔

رواقیت کا روشن پہلو

لیکن اِس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ رواقیت میں کوئی خوبی نہیں ۔ بلاشک میں اِس فلسفہ کو نہایت عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں ۔ مولٰنا حالیؔ فرماتے ہیں ؎

کچھ نقص انار کی لطافت میں نہیں
ہوں اُس میں گلے سڑے اگر دانے چند

رواقیت میں جو ایک اصولی کمزوری تھی وہ میں نے بیان کردی کہ اِس فلسفہ نے انسان کی فطرت کے ایک پہلو کو نظر انداز کردیا ۔ لیکن اِس کے یہ معنی نہیں کہ رواقیت سراپا مردود ہے ۔ باوجود اِس نقص کے، میں اِس فلسفہ کو ماقبلِ اسلام کے تمام فلسفوں سے بہتر اور برتر خیال کرتا ہوں ۔ اور زینو کو ملہم ربانی تو نہیں لیکن نہایت بلند پایہ شخصیت یقین کرتا ہوں ۔ کیونکہ اِس کے فلسفہ کی تمام بنیاد اِس بات پر ہے کہ انسان کو خدا نے اسقدر اعلیٰ[1] اور ارفع مرتبہ پر پیدا کیا ہے کہ جو شخص پاکیزہ زندگی بسر نہیں کرتا وہ اپنے آپ کو مطلق نہیں جانتا اگر وہ یہ جانتا کہ خدا نے مجھے زمین پر آسمانی زندگی بسر کرنے کے لئے پیدا کیا ہے تو اُسے بالضرور اپنے مرتبہ کا احساس ہوتا، اور انسان کو نیکی کی طرف مائل کرنے کے لئے کسی خارجی اثر کی ضرورت نہیں صرف یہ کہدینا کافی ہے کہ اے انسان! تو اپنے مرتبہ کو پہچان اور شایانِ شان زندگی بسر کر ۔ رواقیت ہمارے اندر خودداری، اعتماد علی النفس[2]، اور انضباط ذاتی جیسی خوبیاں پیدا کرتا ہے کیونکہ یہی خوبیاں اِس فلسفہ کا مقصود اور نصب العین قرار دی گئی ہیں ۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اِس مضمون کو ختم کرنے سے پہلے چند نامآور رواقی مصنفین کے خیالات سے، اِن اوراق کے ناظرین کو روشناس کرادوں :۔

(۱) سینکا لکھتا ہے "لوگوں کی خاطر کوئی کام نہ کرو ۔ بلکہ ضمیر کی خوشنودی کی خاطر" "وہ کام کرو جس سے خدا خوش ہو نہ کہ وہ جس سے بندے خوش ہوں"۔ "جو شخص اِس لئے نیکی کرتا ہے کہ اُسے شہرت حاصل ہو وہ نکوکار نہیں بلکہ خود غرض ہے"

"بڑا آدمی، خاک میں ملجانے کے بعد بھی بڑا ہی رہتا ہے"

(۲) مارکس آرنیلیس لکھتا ہے ۔ "اِس بات کو فراموش نکرنا چاہیئے ۔ کہ یہ بات ممکن ہے کہ ایک شخص بالکل گمنام ہو لیکن سب سے بڑا ہو"

"اگر تم نیکی کا معاوضہ طلب کرو تو اِس کے یہ معنی ہیں کہ تمہاری آنکھ تم سے معاوضہ طلب کرے ۔ محض اس بات کے لئے کہ اُس کی بدولت تم مناظرِ کائنات سے لطف اندوز ہوئے ہو"

چونکہ رواقی الٰہیات میں روحِ انسانی کو لطیفۂ ربانی بلکہ بحرِ وحدت کا ایک قطرہ، قرار دیا گیا ہے ۔ اِس لئے رواقی اخلاقیات اور الٰہیات باہم مربوط ہوگئی ہیں ۔ مثلاً :۔

"نیک شخص وہ ہے جسے ہر دم رفاقتِ آلہی نصیب ہو" "خدا سے کوئی بات پوشیدہ نہیں ہے" "خدا ہمارے خیالات میں بھی مداخلت کرتا ہے"

تسلیم و رضا کی تعلیم بھی بخوبی دی گئی ہے مثلاً ایپکٹیٹس لکھتا ہے ۔ "خدا نے جس حالت میں تمہیں رکھا ہے اُس میں خوش و خرم رہو" "اگر تمہیں نقصان ہو تمہاری اولاد ضائع ہوجائے تو شکایت

---

[1] لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم ۔ انی جاعل فی الارض خلیفہ

[2] خود اعتمادی

مت کرو۔ جس نے یہ دنیوی چیزیں دی تھیں، اُسی نے واپس لیں اور وہ پھر بھی عطا کر سکتا ہے۔"

سینیکا لکھتا ہے "یہ ضروری نہیں کہ نیکو کار دنیاوی لحاظ سے فارغ البال اور دولتمند ہوں: خدا بعض ابتلاء نازل کرتا ہے تاکہ کریکٹر کی تکمیل ہو اور انسان الٰہی صفات سے متصف ہو کر معیت الٰہیہ کے لائق ہو جائے۔

یوسف سلیم

فرہنگ و حواشی متعلقہ مضمونِ ہذا

۳ تان سین۔ اکبر اعظم کا خاص گویا تھا، قوم کا برہمن تھا۔ ہری داس سوامی سے موسیقی کی تعلیم حاصل کی تھی۔ علامہ ابو الفضل آئین اکبری میں لکھتے ہیں کہ "ایسا گویا اس ہزار سال کے اندر پیدا نہیں ہوا۔" تان سین کے قبضہ کا راگ "کانہرہ" تھا جسے سنگیت درپن میں "کرناٹکی" کے نام سے بیان کیا گیا ہے۔ اکبر کو یہ راگ بیحد پسند تھا اور چونکہ "کانہرہ" ثقیل لفظ ہے۔ اس لئے اس کا نام بدلکر "درباری" رکھدیا، یہ راگ اس نام سے تمام ہندوستان میں مشہور ہے۔ تان سین نے اپنی خداداد لیاقت کی بدولت کئی راگ نئے ایجاد کئے جن کا نام و نشان "گرنتھوں" میں نہیں پایا جاتا مثلاً میاں کی ملار میاں کی ٹوڈی۔ میاں کا سارنگ وغیرہ۔ تان سین کے باپ مکرند پانڈے نے دہلی میں برضا و رغبت خود اسلام قبول کیا تھا۔ چنانچہ تان سین مسلمان گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ اس کی قبر گوالیار میں آج بھی زیارتگاہِ خاص و عام بنی ہوئی ہے۔ ۱۲

۳ الف بیجو باورا۔ گوالیار کے فرمانروا راجہ مان تنوار کے دربار میں ملازم تھا۔ یہ راجہ موسیقی کا بڑا ماہر اور قدردان تھا۔ زمانۂ حکومت ۱۴۸۶ء سے ۱۵۱۶ء تک ہے۔ بیجو کا اصلی نام بیجناتھ تھا۔ موسیقی میں عدیم النظیر تھا اور اسدرجہ محو کہ لوگ اسے بیجو باولا یا باورا کہتے تھے۔ راجہ مذکور کی وفات کے بعد بیجو کی آخر عمر سلطان بہادر والئی گجرات (زمانۂ حکومت ۱۵۱۶ء تا ۱۵۲۶ء) کے دربار میں کٹی اسی زمانہ میں نائیک بیجو نے ایک نئی قسم کی ٹوڈی ایجاد کی جس کا نام بادشاہ کے نام پر "بہادری ٹوڈی" رکھا۔

۴ دُہرپد۔ خیال ہوری۔ ٹھمری وغیرہ یہ سب گانے کی اقسام ہیں۔ جن کی تفصیل اس لئے نظرانداز کی جاتی ہے کہ ناظرین کی طبایع پر بار نہ ہو۔ ۱۲

۵ عند العقل۔ عقل کے نزدیک۔

۶ فاتحہ خلف الامام۔ مقتدی کا امام کے پیچھے، سورۂ فاتحہ نماز میں تلاوت کرنا۔

۷ قایدین و زعمائے ملت۔ سرداراں اور قوم کے رہنما۔

۸ [illegible]۔ جزیرۂ صقلیہ کا خود مختار حاکم جو عیش و عشرت کی غرض سے اپنا نیلوفت ایتھنز میں صرف کیا کرتا تھا۔

۹ داعی الی الشر۔ بدی کی طرف بلانے والا، خواہ انسان ہو یا کوئی اور۔

۱۰ سانکھیہ درشن۔ ہندوؤں میں فلسفہ کے چھ درشن (مذاہب یا اسکول) ہیں منجملہ اُن کے ایک سانکھیا درشن بھی ہے جس کا بانی کپل گزرا ہے جس نے دیمقراطیس کی طرح یہ تعلیم دی ہے کہ مادہ ازلی ہے، کائنات خود بخود بنگئی، خدا کا وجود نہیں ۱۲

۱۱ معتزلہ۔ یہ لفظ اعتزال سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں علیحدہ ہونا یا کنارہ کرنا۔ اس اسکول کا بانی واصل ابن عطا ہے جو امام حسن بصری کا شاگرد تھا کسی مسئلہ پر استاد اور شاگرد کے درمیان ناچاقی ہوگئی ابن عطا درس سے اُٹھکر چلا آیا۔ استاد نے کہا "اعتزل عنا" یعنی وہ شخص ہم سے جدا ہوگیا۔ اُسدن سے لوگ اُسے معتزلی کہنے لگے۔ یہ لوگ اپنے آپ کو "اصحاب العدل والتوحید" کہتے تھے۔ قرآن شریف کی تفسیر عقلی اصولوں پر کی۔ شیعہ فرقہ کی دینیات زیادہ تر معتزلی عقاید پر مبنی ہے۔ مامون الرشید کے زمانہ میں ان لوگوں کو بہت عروج ہوا۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد ان کا زور جاتا رہا۔ آج خال خال، اس خیال کے لوگ کہیں نظر آجاتے ہیں۔ سر سید رح نے اپنی تفسیر قرآن انہی بزرگوں کے اصول تفسیر پر لکھی تھی۔ ۱۲

۱۲ اسی لئے حافظ کہتے ہیں:۔ حدیث از مطرب و مے گو و رازِ دہر کمتر جو ✦ کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت این معمارا

۱۳ ہیوم (David Hume) بقول ڈاکٹر ونڈل بینڈ، ہیوم انگلستان کا سب سے بڑا فیلسوف گزرا ہے ۱۷۱۱ء میں پیدا

ہوا ۱۸۸۱ء میں وفات پائی ۔ مفصل آئندہ ۔ ۱۲

۱۴؎ گلیڈسٹن ۔ انیسویں صدی میں مشہور انگلستانی مدبر گزرا ہے ۔ وکٹوریہ کے عہد میں کئی دفعہ وزیر اعظم منتخب ہوا ۔ ترکوں کا جانی دشمن تھا ۔

۱۵؎ گلیڈسٹن کہا کرتا تھا کہ دنیا میں جنگ و جدل کا باعث قرآن کا وجود ہے لیکن ۱۹۱۴ء میں جو خوفناک لڑائی یورپ میں چھڑی تھی اس کا باعث قرآن نہ تھا ۔ بلکہ گلیڈسٹن کے ہم مذہب تھے ۔ اور سوائے ترکوں کے باقی سب متخاصمین غیر مسلم تھے ۔ عارضی طور پر یہ جنگ ۱۹۱۹ء میں ختم ہو گئی ۔

۱۶؎ حسن صباح ۔ فرقہ باطنیہ اسمعیلیہ کا بانی ، اشر الناس ، بلکہ ابلیس مجسم جس نے لاکھوں انسانوں کو جن میں بڑے بڑے علماء ، حکما ، صوفیا ، مشاہیر اور ملوک بھی شامل ہیں ، محض اختلاف عقاید کی وجہ سے ، اپنے اندھے فدائیوں کے ہاتھوں سے ہلاک کرا دیا ۔ اس شخص نے دامن کوہ میں ایک فرضی جنت بنائی تھی جس میں حسین و جمیل عورتیں بوالہوسوں کے پھانسنے کے لئے مہیا کی تھیں ۔ ان کے لالچ میں اس کے مرید جن کو حشیش (بھنگ) پلا کر بدمست کر دیا جاتا تھا (اسی وجہ سے اس کے متبعین کو حشیشی بھی کہتے ہیں) ناگفتہ بہ ظالمانہ کاروائیاں کر گزرتے تھے ۔ مذہب اس کے نزدیک شہوت پرستی کا دوسرا نام تھا ۔

۱۷؎ cyrenism ۔ اس فلسفہ کا بانی Aristippus بمقام سائرین واقع ملک افریقہ غالباً ۴۳۵ ق م میں پیدا ہوا تھا ۔ اس کے والدین خوشحال تھے اس لئے ارسٹی پس کا ابتدائی زمانہ بہت عیش و عشرت میں بسر ہوا ۔ جوانی میں فلسفہ کا شوق ہوا غالباً ۴۱۶ ق م میں یونان کا رخ کیا اور سقراط کے حلقۂ درس میں شامل ہوا ۔ ۳۹۹ ق م تک ساتھ رہا ۔ سقراط کی وفات کے بعد خود فلسفہ کا درس دینے لگا ۔ اس نے لذت و سرور کو حیات انسانی کا مقصد قرار دیا ہے اور اپی قورس نے اسی کے فلسفہ پر اپنے خیالات کی بنیاد رکھی تھی ۔ یہ شخص حساب مساحت اقلیدس ، نجوم ، ہیئت ان تمام علوم کو بیکار سمجھتا تھا ۔ کیونکہ افعال انسانی کو ان سے کوئی علاقہ نہیں ہے ۔ ۱۲

۱۸؎ سسرو ۔ مشہور رومن فلاسفر ولادت ۱۰۶ ق م وفات ۴۳ ق م ۔

۱۹؎ سینکا ۔ ولادت ۳ء وفات ۶۵ء نیرو قیصر روم کا اتالیق تھا ۔ اصلی باشندہ اسپین کا تھا لیکن روم میں عمر بسر ہوئی ۔ ۱۲

۲۰؎ مارکس ۔ شہنشاہ روم ۱۶۱ء سے ۱۸۰ء تک حکومت کی بادشاہ بھی تھا اور فلاسفر بھی ، صوفی بھی اور حکیم بھی ۔ ۱۲

۲۱؎ ہرقلیطوس ۔ تاریخ ولادت و وفات متحقق نہ ہو سکی لیکن اسقدر معلوم ہے کہ ۵۰۰ ق م میں فلسفہ کا درس دے رہا تھا ۔ قدیم فلاسفہ میں نہایت نامآور گزرا ہے ۔ اس کا نظریہ یہ ہے کہ "آگ" اصل کائنات ہے ۔ ۱۲

۲۲؎ حالی ۔ خواجہ الطاف حسین حالی پانی پت کے رہنے والے ۱۸۳۷ء تا ۱۹۱۴ء اردو میں نیچرل شاعری کی بنیاد ڈالی ۔ ان کی مسدس ان کا نام زندہ رکھنے کے لئے کافی ہے ۔ ۱۲

۲۳؎ Epictetus یہ حکیم بچپن میں کسی کا غلام تھا لیکن اسکی آزادی روح دیکھکر اس کے مالک نے آزاد کر دیا ۔ روم میں مدتوں تک رہا لیکن وہاں سے کسی بات پر جلا وطن کر دیا گیا تو یونان میں درس دینا شروع کر دیا ۔ اس کی تعلیمات اس کے شاگرد ایریانس نے نہایت شرح و بسط کے ساتھ قلمبند کی تھیں ۹۰ء کے قریب اس کی شہرت دور و نزدیک پھیل چکی تھی ۔ تاریخ ولادت و وفات معلوم نہ ہو سکی ۔

۲۴؎ سیکٹس ۔ نام ہے ایمپریکس لقب ہے شہر مٹلینی کا باشندہ اور ہیروڈوٹس لا ادری کا شاگرد رشید تھا ۔ اس نے فلسفہ تشکیک کو منتہائے عروج پر پہنچا دیا ۔ ابتدائی تعلیم یونان میں حاصل کی بعد ازاں سکندریہ چلا گیا کیونکہ ایتھنز کی علمی رونق سب سکندریہ میں مجتمع ہو گئی تھی ۔ وہیں عمر گذار دی ۔

نغمہ

ہلکی، ہلکی سرد ہوا میں   کالی، کالی مست گھٹا میں
"چاند" کی وجد آموز ضیا میں   رات کی اس خاموش فضا میں

کون ترنّم ریز ہوا

کون ترنّم ریز ہوا   عالم حشر انگیز ہوا

بجلی کی ہر لہر کے ساتھ   بادل کے ہر قہر کے ساتھ
یعنی سازِ وھر کے ساتھ   ہوش رُبا، سرمست ادا میں

کون ترنّم ریز ہوا

کون ترنّم ریز ہوا   کون ترنّم ریز ہوا

رُوح کو تڑپا، تڑپا کر کے   سینہ میں دل کو گرما کر کے
"عالم نغمہ پر چھا کر کے   کیف اثر، پُر جوش صدا میں

کون ترنّم ریز ہوا

کون ترنّم ریز ہوا   عالم حشر انگیز ہوا

ساز وہ چھیڑا جاتا ہے   عالم کھویا جاتا ہے
"نغمہ" ڈوبا جاتا ہے   دردبھری، دلسوز نوا میں

کون ترنّم ریز ہوا

کون ترنّم ریز ہوا عالمِ حشر انگیز ہوا
ہوش برنگِ مستی ہے کھوئی ہوئی سی ہستی ہے
سونی دل کی بستی ہے سحر اثر انداز و ادا میں

کون ترنّم ریز ہوا

کون ترنّم ریز ہوا عالمِ حشر انگیز ہوا
نظریں آج پریشاں ہیں روحیں وجد بداماں ہیں
حُسن کی موجیں رقصاں ہیں شعبدۂ اعجاز نما ہیں

کون ترنّم ریز ہوا

کون ترنّم ریز ہوا عالمِ حشر انگیز ہوا

وفا فرخ آبادی

غزل

کہیں ایسا نہ ہو اُٹھ جائے دستِ ناتواں میرا جنوں انگیزیٔ اُلفت نہ لے اب امتحاں میرا
کوئی بے شُبہ اِس پردے میں سرگرمِ نوازش ہے وہیں پر کیوں گری بجلی جہاں تھا آشیاں میرا
نہ پوچھیں اہلِ دل ہنگامہ آرائی محبّت کی وہی اب دشمنِ جاں ہے جو کل تھا رازداں میرا
قیودِ رہبر و منزل سے میں آزاد ہوں لیکن مرے نقشِ قدم پر آرہا ہے کارواں میرا
کوئی حد بھی تو ہونی چاہیئے اِس نامرادی کی لُٹے گا ہر نئی منزل پہ کب تک کارواں میرا
حیات و مرگ کی ہر جستجو بیکار ہے نیّرؔ
مری منزل وہیں ہے سانس رُک جائے جہاں میرا

نیّرؔ

سزا و جزا

(ایک نہایت سبق آموز افسانہ)

اِس واقعہ کو صدیاں گزر چکی ہیں کہ ایک شام کو بوڑھا بشیر اور اسکی بوڑھی بیوی رقیہ اپنی جھونپڑی کے آگے بیٹھے ہوئے سورج کے غروب ہونے کے خاموش اور دلفریب نظارہ میں محو تھے۔ وہ تھوڑا بہت کھانا، جو اُن کو میسر آیا تھا کھا چکے تھے اور سونے سے پہلے ایک دو گھنٹے آرام سے گزارنا چاہتے تھے۔ اس لئے آپس میں اپنے باغیچہ کے، اپنی گائے کے، اپنی پالی ہوئی مکھیوں کے، اور اپنی انگور کی بیلوں کے (جو جھونپڑی کی دیواروں پر چڑھی ہوئی تھیں اور جن پر بہت سے گچھے پکنے کے قریب تھے) متعلق باتیں کر رہے تھے۔ لیکن لڑکوں کی وحشیانہ چیخ پکار اور کتوں کے بھونکنے کی خوفناک آوازیں، نزدیک کے گاؤں میں زیادہ سے زیادہ تیز ہوتی گئیں یہاں تک کہ اُن کو ایک دوسرے کی بات سننی دشوار ہو گئی۔

"آہ! پیاری" بشیر نے جوش سے چلّا کر کہا۔ "کوئی نہ کوئی غریب مسافر ہمارے ہمسایوں میں رات گزارنے کی فکر میں ہوگا۔ اور اُنہوں نے اُسے کھانا کھلانے اور آرام دینے کی بجائے، جیسا کہ اُن کی عادت ہے۔ اپنے کتے اُس کے پیچھے لگا دئیے ہیں۔"

"افسوس!" رقیہ نے جواب دیا "ہمارے ہمسائے اپنے مظلوم بھائیوں سے ذرا بھی مہربانی سے پیش نہیں آتے، وہ اپنے بچوں کو کس بُری طرح سے پرورش کرتے ہیں۔ اور جب وہ مسافروں پر پتھر پھینکتے ہیں تو والدین خوش ہوتے ہیں اور انہیں شاباش دیتے ہیں۔"

"ان کا انجام اچھا نہ ہوگا" بشیر نے اپنے روئی کے گالے ایسے سفید سر کو ہلاتے ہوئے کہا۔

"پیاری! سچ تو یہ ہے کہ کوئی عجب نہیں اگر یہ لوگ اپنے عادات و اطوار کو درست نہ کریں تو کوئی خوفناک بلا تمام گاؤں پر آجائے۔ اُسے ہر ایک چیز پر قدرت حاصل ہے۔ کل ہی گاؤں میں طاعون، ہیضہ یا کوئی اور خطرناک بیماری بھیج دے یا آسمان سے آگ برسانے لگے، پھر یہ کیا کریں گے؟ ...... میرے اور تمہارے لئے یہی بہتر ہے کہ جب تک خدا ہمیں روٹی کا ایک ٹکڑا بھی دے، ہمیں خانماں برباد اور محتاج مسافر کو وہی دینا چاہئیے"

"بالکل ٹھیک" رقیہ نے کہا۔ "اور ہم ایسے ہی کریں گے۔"

یہ بوڑھے میاں بیوی بہت ہی غریب تھے۔ میاں بیوی کو پیٹ بھرنے کے لئے بیحد محنت کرنا پڑتی تھی۔ بوڑھا بشیر تمام دن اپنے باغیچہ میں کام کیا کرتا تھا۔ اور رقیہ ہر وقت یا تو چرخہ کاتتی رہتی، یا اپنی گائے کے دودھ سے مکھن اور پنیر بناتی یا کوئی اور کام کرتی رہتی۔ ان کی خوراک روٹی، دودھ اور سبزی کے علاوہ کچھ نہ ہوتی تھی۔ کبھی مکھیوں کے چھتے سے شہد اور کبھی کبھی بیلوں کے پکے ہوئے انگور بھی میسر آجاتے تھے۔ دونوں بہت رحمدل تھے۔ وہ خوشی سے بغیر کھانا کھائے تمام دن گزار دیتے اور اپنی روٹی، تازہ دودھ کا پیالہ اور چمچہ بھر شہد اُس تھکے ماندے مسافر کو جو ان کے دروازے پر آکر دستِ سوال دراز کرتا تھا، دیدیتے۔ ان کا خیال تھا کہ مہمان خدا کے بھیجے ہوئے ہوتے ہیں۔ اسی لئے وہ ان کا اپنے سے زیادہ خیال رکھتے تھے۔

اُن کی جھونپڑی گاؤں سے کچھ دور، نصف میل کے قریب کشادہ وادی میں ایک ٹیلے پر واقع تھی۔ جب دنیا نئی نئی بنائی گئی تھی اُس تمام وادی میں ایک جھیل پھیلی ہوئی تھی۔ وہاں مچھلیاں اِدھر سے اُدھر اُدھر سے اِدھر اچھلا کرتی تھیں۔ پانی کے کنارے لمبی لمبی گھاس اُگی ہوئی تھی، لمبے لمبے درختوں اور اونچی اونچی پہاڑیوں کا عکس جھیل کے شفاف اور کشادہ دامن پر ہر وقت پڑتا رہتا تھا۔ آہستہ آہستہ پانی خشک ہو گیا۔ اِدھر اُدھر سے لوگ آگئے، زمین کو کاشت کیا اور مکان بنا لئے۔ اور اب یہ ایک زرخیز زمین کا ٹکڑا تھا۔ اس میں اب پرانی جھیل کا کوئی نشان باقی نہ تھا۔ البتہ ایک چھوٹی سی ندی گاؤں کے بیچوں بیچ بہتی تھی اور تمام گاؤں

کو سیراب کرتی تھی جھیل کو خشک ہوئے اتنی مدت گزر چکی تھی کہ وہاں ناریل کے درخت اُگے، بڑھے، پھلے پھولے اور بہت پرانے ہو کر گر گئے۔ اُن کی جگہ اور درخت اُگے اور اُتنے ہی بڑے ہو کر گر گئے۔ پھر اُن کی جگہ اور......... اسی طرح پانچ چھ دفعہ اُگے، بڑھے اور بڑھ کر گر گئے......... ایسی اچھی اور زرخیز وادی کہیں دُور دُور نہ تھی۔ وہاں ہر قسم کی نعمتیں موجود تھیں۔ مگر وہاں کے باشندے ظالم تھے اور سنگدل۔ وہ اُن نعمتوں پر بھی خدا کا شکر ادا نہ کرتے تھے۔ اور اپنے آدم زاد بھائی بہنوں پر ظلم و ستم روا رکھتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ اس قابل ہی نہ تھے کہ ایسی جگہ رہیں جہاں قدرت نے اتنی فراخدلی سے سب نعمتیں مہیا کر رکھی تھیں۔ وہ پرلے درجے کے سنگدل اور خود پرست تھے۔ اُن کے پتھر کی طرح سخت دلوں میں نہ غریب کے لئے رحم تھا نہ بے گھروں کے لئے ہمدردی۔ جب اُنہیں کوئی یہ بتاتا کہ ہر انسان کو ایک دوسرے کی محبت کا فرض ادا کرنا ہے کیونکہ کوئی دوسرا طریقہ ایسا نہیں کہ جس سے ہم خدا کی مہربانیوں اور عنایتوں کا شکریہ ادا کر سکیں تو وہ نہایت بے پروائی سے ہنس دیتے۔ وہ شریر النفس آدمی اپنے بچوں کو بھی اپنا جیسا ہی بناتے اور اُنہیں اپنی تمام عادتیں سکھاتے تھے۔ اور جب وہ اپنے لڑکوں اور لڑکیوں کو کسی غریب مسافر کے پیچھے دوڑتے، چیختے اور پتھر پھینکتے ہوئے دیکھتے تو اُن کا دل بڑھانے کے لئے تالیاں بجاتے اور "شاباش" کہتے۔ انہوں نے بڑے قدآور اور خونخوار کتے بھی پال رکھے تھے۔ یہ ظالم خوفناک کتے، مسافروں کے پیچھے بھونکتے، غُراتے اور لمبے لمبے سفید دانت نکالتے۔ پھر وہ اُن میں سے کسی کی ٹانگ کسی کا کپڑا پکڑ لیتے۔ اور اگر مسافر تھکا ماندہ ہوتا تو اس سے پہلے کہ وہ اپنی جان بچا کر بھاگے اُس کی حالت دگرگوں اور قابلِ رحم ہو جاتی۔ وہ غریب مسافروں کے ساتھ بہت ہی وحشیانہ اور مضرت رساں سلوک کرتے تھے۔ خاص طور پر اُس وقت جب کوئی مسافر بیمار، نحیف و ناتواں، یا لنگڑا، لولا اور بوڑھا ہوتا۔ اگر مسافروں کو ایک دفعہ بھی معلوم ہو جاتا کہ گاؤں کے بے رحم آدمی، ظالم بچے۔ اور خونخوار کتے اِس بُری طرح سے پیش آتے ہیں تو وہ اس راستے سے میلوں دور پرے چلے جاتے اور بھولے سے بھی گاؤں کے قریب نہ پھٹکتے۔ اُن دیہاتیوں میں اِس سے بھی زیادہ بُری بات یہ تھی کہ جب امیر آدمی اپنی پُر تکلف گاڑیوں میں، یا خوبصورت گھوڑوں پر سوار ہو کر گاؤں سے گزرتے اور ان کے نوکر نئے نئے بھڑکیلے کپڑے پہنے جلو میں ہوتے، تو دیہاتی بہت ہی زیادہ مہذب اور خوشامدی بن جاتے، اپنی ٹوپیاں اُتار اُتار کر بہت ادب سے جھک کر سلام کرتے۔ اگر لڑکے کچھ شرارت کر بیٹھتے تو انہیں سزا دی جاتی اور اگر کتے ذرا بھی بھونکتے تو مالک انہیں لاٹھیوں سے مارتے اور رسی سے باندھ دیتے اور دو دو روز کھانے کو نہ دیتے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ دیہاتی اُس روپے کی زیادہ قدر کرتے تھے، جو مسافروں کے پاس ہوتا تھا۔ اور اُس انسانی جوہر کی کچھ پروا نہ کرتے تھے جو بادشاہ اور فقیر میں یکساں ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب بوڑھے بشیر نے گلی کے دوسری طرف لڑکوں کا شور اور کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سُنیں تو وہ بے چین اور ملول ہو کر اپنی بیوی سے باتیں کرنے لگا۔ ایک دفعہ بہت ہی زیادہ شور اٹھا اور بہت دیر تک رہا۔

"میں نے کتوں کو ایسے بے تحاشا بھونکتے نہیں سنا۔" بوڑھے بشیر نے فکر کے لہجہ میں کہا۔ "اور نہ بچوں کو اتنا چیختے۔" اس کی نیک دل بوڑھی بیوی نے جواب میں کہا۔

وہ دونوں اپنی کٹیا کے آگے بیٹھے ہوئے، ایک دوسرے کی باتوں پر سر ہلاتے رہے، اور آوازوں کا شور نزدیک سے نزدیک تر آتا گیا۔ وہ اضطراب کی حالت میں کھڑے ہو گئے اور اُس ٹیلے کے قریب ہی، جس پر اُن کی کٹیا تھی، دو مسافروں کو پیدل آتے ہوئے دیکھا۔ ان کے پیچھے پیچھے خونخوار کتے ایڑیوں پر دانت مارتے ہوئے آ رہے تھے۔ تھوڑی دور پر لڑکوں کا ایک جتھا تھا۔ بیدرد لڑکے اپنی پُوری پوری طاقت سے اُن پر پتھر پھینک رہے تھے۔ اور آوازے کستے تھے۔ دونوں مسافروں میں جو زیادہ کم عمر دبلا اور پھرتیلا تھا کبھی کبھی پیچھے مڑ کر اپنی لاٹھی سے کتوں کو ہٹا دیتا تھا۔ اور دوسرا مسافر جو بہت لمبا تھا چپ چاپ چل رہا تھا گویا ان شریر لڑکوں اور ناپاک کتوں کے اذیت پہنچانے کی پروا کرنا اُس کے نزدیک غیر شریفانہ فعل تھا۔

دونوں مسافر بہت پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ اُن کی جیب میں ایک پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی اور شاید اسی وجہ سے دیہاتیوں نے اپنے بچوں اور کتوں کو اس وحشیانہ سلوک سے نہ روکا۔

"میری پیاری!" بشیر نے رقیہ سے کہا۔ "آؤ ہم چل کر اُن کا استقبال کریں۔ وہ بہت تھکے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں۔ دیکھو! تو پہاڑی پر نہیں چڑھ سکتے۔"

"تم جاؤ اور اُن کا استقبال کرو۔" رقیہ کٹیا میں گھس گئی اور بشیر کچھ دور آگے انہیں لینے چلا گیا۔ وہاں جا کر اُس نے اپنے ہاتھ ایسی

مہمان نوازی کے انداز میں پھیلائے کہ "خوش آمدید مہمانو! خوش آمدید!" کہنے کی بھی ضرورت نہ رہی۔

"شکریہ" نوجوان مسافر نے اپنی تکلیف اور تکان کو خیال میں نہ لاتے ہوئے نہایت نرمی سے کہا۔ "یہ اُس سلوک کے بالکل برعکس ہے جو گاؤں والوں نے ہمارے ساتھ کیا۔ خدارا جلدی بتائیے، آپ ایسے برے ہمسایوں میں کیوں رہتے ہیں؟"

"آہ" بوڑھے بشیر نے مسکراتے ہوئے کہا "خدا نے مجھے یہاں آباد کر رکھا ہے، وہی بہتر جانتا ہے۔ لیکن دوسری وجہوں کے علاوہ ایک وجہ شاید یہ بھی ہو کہ میں اپنے ہمسایوں کی بدسلوکی کا کچھ تھوڑا بہت بدل دے سکوں۔"

"بہت اچھا۔ بزرگوار صاحب! بہت اچھا!" مسافر نے ہنستے ہوئے کہا "اور اگر آپ سچ سچ پوچھتے ہیں، تو میرے ساتھی کو اور مجھے واقعی آرام کی ضرورت ہے۔ اُن بدکار بچوں نے ہم پر پتھر پھینکے۔ اور کتوں نے کاٹنے کی بہت کوشش کی۔ ایک نے میرا چوغہ بھی پھاڑ ڈالا...... میں نے بھی اپنی لاٹھی سے اُس کی ناک پر ایسی ضرب لگائی کہ آپ نے اتنی دور بھی اُسے درد سے کراہتے سنا ہوگا۔"

بشیر کو اُس کی خوش مزاجی پر بہت ہنسی آئی۔ مسافر کی شکل دیکھنے سے یہ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ دن بھر کے لمبے سفر سے تھکا ہوا ہے۔ اُس کا لباس بہت ہی بھدا تھا۔ اُس کے سر پر ایک ایسی ٹوپی تھی جس کے کنارے پھٹ کر دونوں کانوں پر آگئے تھے۔ گرمی کا موسم ہونے کے باوجود اُس نے ایک لمبا چوغہ پہن رکھا تھا۔ پہن کیا رکھا تھا بدن پر لپیٹ رکھا تھا۔ شاید اس وجہ سے کہ کپڑے بہت ہی میلے کچیلے تھے۔ اس کے پاؤں میں جوتیاں ضرور تھیں مگر ایک تو اندھیرا چھا گیا تھا اور دوسرے بشیر کی نظر تیز نہ تھی لہذا وہ اُن میں کوئی خاص بات نہ دیکھ سکا۔ مسافر اتنا ہلکا پھلکا تھا کہ اُس کے قدم خود بخود زمین سے اوپر اٹھتے معلوم ہوتے تھے، یا یوں نظر آتا تھا کہ وہ کوشش کر کے اُنہیں نیچے رکھتا ہے۔

"میں بھی جوانی میں سُبک رو[1] تھا" بشیر نے مسافر سے کہا "مگر ہمیشہ شام کو تھکن محسوس ہونے لگتی تھی۔"

"سفر میں انسان کو لاٹھی سے بہت مدد ملتی ہے" مسافر نے کہا "اور یہ دیکھئے! میرے پاس بھی ایک خوشنما چھڑی ہے۔"

یہ چھڑی بشیر کے لئے بہت ہی عجیب چیز تھی۔ اس نے اس کی چھڑی کبھی نہیں دیکھی تھی۔ زیتون کی لکڑی چوٹی پہ دو پر لگے ہوئے تھے اور دو مصنوعی سانپ بل کھاتے ہوئے اوپر چڑھ رہے تھے۔ اور چونکہ بشیر کی نظر کمزور تھی اور اندھیرا بھی ہوگیا تھا۔ اس نے انہیں اصلی سانپ سمجھا۔

"یقیناً کتنا عجیب عصا[2] ہے" اس نے کہا "دو پروں والا عصا! یہ لڑکوں کے پھُدکنے کے لئے بہت کارآمد ثابت ہوگا۔"

دونوں مسافر اور بشیر جھونپڑی کے دروازہ پر پہنچ گئے۔

"دوستو!" بوڑھے بشیر نے کہا "اس چارپائی پر بیٹھ جاؤ۔ میری بیوی، رقیہ آپ کے لئے کھانا لینے گئی ہے۔ ہم غریب آدمی ہیں۔ مگر جو کچھ بھی حاضر ہوگا آپ کی خدمت میں پیش کر دیا جائے گا۔"

نوجوان مسافر نے کمال بے پروائی سے اپنے آپ کو چارپائی پر گرا دیا اور جونہی وہ گرا اُس کی لاٹھی بھی زمین پر گر پڑی۔ عصا کے گرنے سے ایک نہایت عجیب و غریب مضحکہ انگیز بات وقوع پذیر ہوئی۔ عصا خود بخود زمین سے اٹھا اور اپنے ننھے ننھے پر پھیلا کر کودتا اڑتا جھونپڑی کی دیوار سے لگ کر کھڑا ہوگیا۔ وہاں یہ چپ چاپ کھڑا رہا۔ البتہ سانپ اُسی طرح بل کھاتے رہے۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ بوڑھے بشیر کو اُس کی نظر دھوکا دے رہی تھی۔

وہ ابھی کوئی سوال نہ کرنے پایا تھا کہ بڑے مسافر نے اُس کی توجہ عجیب و غریب عصا کی طرف سے اپنی طرف منتقل کر لی۔

"کیا" اُس نے دبی ہوئی آواز میں پوچھا "اس جگہ جہاں آپ کا گاؤں ہے پرانے زمانہ میں ایک جھیل پھیلی ہوئی نہ تھی؟"

"جب سے میں پیدا ہوا ہوں" بوڑھے بشیر نے کہا "اور آپ دیکھتے ہیں کہ میں کتنا بوڑھا ہوں، یہاں سرسبز کھیت اور چراگاہیں ہیں۔ بڑے بڑے درخت ہیں۔ اور ایک ندی گاؤں کے درمیان بہتی ہے۔ نہ میرے باپ نے اور نہ اُس کے باپ نے کبھی گاؤں کو دوسری حالت میں دیکھا ہے، اور یہ میرے مرنے کے بعد بھی جب کہ دنیا مجھے فراموش کر دیگی، اسی طرح رہیگا۔"

"ایسی باتیں پیش گوئی کرنے کے قابل نہیں ہوتیں" مسافر نے کہا، اور اُس کی موٹی آواز کچھ کرخت بھی تھی۔ اس نے اپنے سر کو ہلایا اور سیاہ گھنگریالے بال ہوا میں لہرانے لگے "چونکہ اُنہوں نے خدا کے احسانات اور مہربانیوں کو بھلا دیا ہے۔ اس لئے یہی بہتر ہے کہ یہاں وہی پرانی جھیل موجیں مارنے لگے۔"

---

[1] تیز رفتار

[2] لاٹھی۔

بشیر نے مسافر کی طرف دیکھا اور سہم گیا۔ اُس کا خوف اور زیادہ ہوگیا، جب اُس نے دیکھا کہ اجنبی کے غصہ نے روشنی کو تاریکی میں تبدیل کر دیا ہے، اور اُس کے سر کی ایک خفیف جنبش نے فضائے بسیط میں رعد و برق کا ایک طوفان اٹھا دیا ہے۔ لیکن ایک ہی لمحہ میں مسافر کا چہرہ اتنا نرم اور خوشگوار ہوگیا۔ کہ بوڑھا تمام ڈر بھول گیا۔ اور اُسے اِس بات کا احساس ہونے لگا کہ مسافر اگرچہ ظاہراً غریب ہے اور پا پیادہ سفر کر رہا ہے، تاہم کوئی معمولی آدمی نہیں۔ اُس نے سمجھا کہ وہ کوئی شہزادہ ہے جو بھیس بدل کر رعایا کا حال معلوم کرنا چاہتا ہے۔ یا اسی قسم کا کوئی اور آدمی ہے اور بہت زیادہ عقلمند، جو دنیا میں اس لئے گھوم رہا ہے کہ اُس کی عقل میں اضافہ ہو۔ یہ خیال زیادہ درست تھا۔ کیونکہ جب اُس نے مسافر کے چہرہ پر نظر ڈالی، تو دیکھا کہ اُس کی ایک ہی نظر میں اتنے خیالات پوشیدہ تھے جن کا وہ عمر بھر مطالعہ نہ کر سکتا تھا۔

رقیہ کھانا تیار کر رہی تھی۔ مسافر بشیر سے نہایت مہذبانہ گفتگو کرنے لگے۔ چھوٹا بہت زیادہ باتونی تھا اور ایسی حرکتیں اور نقلیں کرتا تھا کہ بوڑھا بشیر ہنستا ہی رہا اور کہنے لگا "میں نے آپ سا ظریف اور ہنس مکھ آدمی عمر بھر نہیں دیکھا"

"میرے نوجوان دوست!" اس نے کہا۔ کیونکہ وہ اچھی طرح ایک دوسرے سے کھل گئے تھے۔

"آپ کو کس نام سے پکاروں؟"

"جیسا کہ آپ دیکھتے ہیں میں بہت سبک رو ہوں" مسافر نے کہا "اس لئے اگر آپ مجھے "سیماب" کے نام سے پکاریں تو بہت موزوں ہوگا۔"

"سیماب۔ سیماب" بشیر نے مسافر کے چہرے پر نظریں جما کر کہا۔ گویا اُس کی ہنسی اڑا رہا ہے۔ "یہ تو بہت عجیب نام ہے۔ اور کیا آپ کے ساتھی کا نام بھی ایسا ہی ہے؟"

"یہ بات رعد سے دریافت کیجئے" سیماب نے بعید از فہم انداز میں کہا "اس سے زیادہ بلند کسی کی آواز نہیں"

یہ بات خواہ مذاق میں کہی گئی تھی یا سنجیدگی سے۔ مگر بشیر کے دل میں دوسرے مسافر کی طرف سے دہشت ضرور بٹھا دیتی۔ اگر بڑے مسافر کے چہرہ پر مہربانی اور تلطف کے آثار اسے نظر نہ آتے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہ تھا کہ جھونپڑی کے دروازہ کے سامنے ایک بہت بڑا جسیم آدمی سکڑا ہوا بیٹھا تھا۔ جب بشیر اُس سے ہمکلام ہوا

تو اُس نے ایسی سنجیدگی اور عقلمندی سے جواب دیا کہ بشیر اپنے دل کے تمام راز اُسے بتانے کے لئے تیار ہوگیا۔ انسان کی فطرت ہے۔ کہ جب اُسے کوئی ایسا شخص مل جاتا ہے جو اُس کے نیک و بد میں اُس سے زیادہ تمیز کر سکتا ہو، تو وہ اپنا دل کھول کر اُس کے آگے رکھ دیتا ہے۔ اور یہ نہیں سوچتا کہ کبھی سے دل کی بات نہ کہنی چاہئے۔ بشیر سیدھا سادہ اور نیک دل تھا، اُس کے دل میں کوئی خاص راز نہ تھا۔ اُس نے اپنی زندگی کے تمام جھگڑے چھیڑ دئے۔ اُس نے بتایا کہ وہ اور اُس کی بیوی رقیہ لکھنؤ کے رہنے والے ہیں۔ بیس سال کی عمر میں آ کر یہاں آباد ہوئے تھے اور اُس کے بعد اُن میں سے کوئی بھی اس کٹیا سے پندرہ بیس میل پرے نہیں گیا۔ دیانتداری اور محنت سے پیٹ بھرتے ہیں۔ اُس نے یہ بھی ظاہر کیا کہ وہ غریب ضرور تھے مگر صبر و قناعت کی دولت سے مالا مال۔ اور رقیہ بہت عمدہ پنیر اور مکھن بناتی ہے انہیں ایک دوسرے سے بہت زیادہ محبت ہے۔ اِس لئے اُن کی خواہش ہے کہ موت انہیں جدا نہ کر سکے۔ اور جس طرح اپنی تمام زندگی میں ایک ساتھ رہے ہیں، اُسی طرح ایک ساتھ اس دنیائے فانی کو الوداع کہیں۔

مسافر چپ چاپ بیٹھا ہوا سب کچھ سنتا رہا۔ جب بشیر خاموش ہوگیا تو اس کے پُرنور چہرہ پر مہربانی کا تبسم برسنے لگا۔

"آپ بہت اچھے بزرگ آدمی ہیں" اس نے بشیر سے کہا۔ "اور آپ کی شریک زندگی بھی بہت نیک دل بوڑھی عورت ہے۔ یہ مناسب ہے کہ آپ کی خواہش پوری کر دی جائے"

بشیر نے محسوس کیا کہ شفق سے ایسی روشنی نمودار ہوئی، جس سے تمام آسمان جگمگا اٹھا۔

رقیہ اِس اثنا میں کھانا تیار کر چکی تھی۔ وہ دروازہ پر آئی اور معافی مانگنے لگی۔ کہ "ہم آپ کی خاطر تواضع نہ کر سکیں گے۔ جو کچھ تھوڑا بہت میسر آیا وہ حاضر ہے۔ اگر ہم جانتے کہ آپ آ رہے ہیں" تو میں اور میرا خاوند ایک لقمہ بھی نہ کھاتے اور آپ کو اچھا کھانا مل جاتا۔ خیر میں نے آج کے دودھ میں سے تھوڑے سے کا تو پنیر بنا لیا تھا اور باقی رکھ چھوڑا ہے ہم اپنی روٹی بھی آدھی کھا چکے ہیں۔ آہ..... مجھے غریب ہونے کا کبھی رنج نہیں ہوتا۔ سوائے اُس وقت کے جب کوئی غریب مسافر ہمارے دروازے پر دستک دیتا ہے"

"سب کچھ ٹھیک ہو جائیگا میری اچھی ملکہ! آپ تکلیف نہ کریں" بڑے مسافر نے کہا "مہمانوں کے ساتھ ہمدردی خوراک میں

۱؎ کرڈک

کرامت و معجزہ کا کام کرتی ہے اور بُری سے بُری خوراک بھی آبِ حیات اور امرت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔"

"ہمیں آپ سے دلی ہمدردی ہے" رقیہ نے زور دیتے ہوئے کہا "اور تھوڑا سا شہد جو بچ رہا ہے، اور انگوروں کا گچھا بھی آپ ہی کے لئے ہے"

"محترمہ رقیہ! یہ تو دعوت ہے دعوت!!" سیماب نے مسکراتے ہوئے کہا "اور آپ دیکھینگی میں کتنی دلیری سے اپنا کام سرانجام دونگا۔ مجھے اپنی عمر میں اتنی بھوک نہیں لگی جتنی کہ آج لگ رہی ہے"

"افسوس ہے ہم پر" رقیہ نے اپنے خاوند کے کان میں کہا۔ "اگر نوجوان اتنا زیادہ بھوکا ہے تو یہ کھانا بہت کم رہیگا"

سب کے سب جھونپڑی میں چلے جاتے ہیں۔

آپ کو یاد ہوگا کہ سیماب کا عصا جھونپڑی کی دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ جب اُس کا مالک اُسے چھوڑکر دروازہ میں داخل ہو گیا تو اُس نے کیا کیا؟ اپنے پر پھیلا دئے اور باورچیخانہ کے فرش پر اچھلتا ہوا سیماب کی کرسی کے پیچھے نہایت سلیقہ سے کھڑا ہو گیا۔ بوڑھا بشیر اور اُس کی بیوی مہماں نوازی میں اتنے منہمک تھے کہ اُنہیں عصا کی کارگذاریوں کی مطلق خبر نہ ہوئی۔

جیسا کہ رقیہ نے کہا تھا کھانا واقعی دو مسافروں کے لئے بہت ہی کم تھا۔ ایک چھوٹی سی چوکی پر کچھ حصہ بھوری ڈبل روٹی کا رکھا ہوا تھا۔ اُس کے ایک طرف پنیر کا ٹکڑا تھا اور دوسری طرف ایک پیالی میں شہد۔ انگوروں کے گچھے بھی تھے اور تختے کے ایک طرف مٹی کا چھوٹا سا لوٹا رکھا ہوا تھا جس میں دودھ تھا اور جب رقیہ نے دو گلاس بھر کر مسافروں کے آگے رکھدئے تو بہت کم دودھ اُس میں باقی بچا.........

رقیہ آئندہ ہفتے بھر فاقہ کرنے کے لئے تیار تھی۔ اگر ایسا کرنے سے مسافروں کے لئے کچھ زیادہ کھانا میسر آجائے۔ چونکہ کھانا کم تھا۔ اِس لئے وہ یہ آرزو کئے بغیر نہ رہ سکی کہ "کاش یہ اتنے زیادہ بھوکے نہ ہوتے"

دونوں مسافروں نے بیٹھتے ہی دودھ کے دونوں گلاس ایک ہی دفعہ میں خالی کر دئے۔

"مہربان ماں۔ تھوڑا سا دودھ اور دیدیجئے" سیماب نے کہا "آج گرمی بہت زیادہ تھی اور مجھے بہت زیادہ پیاس لگ رہی ہے۔"

"معزز مہمانو" رقیہ نے گھبراہٹ میں کہا "گو یہ باعث افسوس ہے اور باعث شرم بھی، مگر سچ تو یہ ہے کہ لوٹے میں مشکل سے ہی دودھ کے ایک دو قطرے ہونگے۔ آہ آج ہم نے فاقہ کیوں نہ کر لیا؟"

"کیوں" سیماب بولتے ہوئے اٹھا اور برتن کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا "میرے خیال میں دراصل معاملہ اتنا بڑا نہیں جتنا کہ آپ بتاتی ہیں۔ ابھی تو لوٹے میں بہت دودھ باقی ہے"

یہ کہکر اُس نے لوٹے سے، جو رقیہ کے خیال میں بالکل خالی تھا نہ صرف اپنا گلاس بھرا بلکہ اپنے ساتھی کا بھی۔ رقیہ حیران رہ گئی اُسے اپنی نگاہ پر سخت تعجب ہوا کہ وہ کیا دیکھ رہی ہے؟ اُس نے یقیناً تمام دودھ اُلٹ لیا تھا اور لوٹے کو چوکی پر رکھنے سے پہلے اُس کے اندر بھی نظر ڈال لی تھی۔

"لیکن میں بوڑھی ہوں" رقیہ نے خیال کیا "شاید مجھے یاد نہ رہا ہو۔ کچھ بھی ہو سب لوٹا ضرور خالی ہو گیا۔ اِس میں سے دو گلاس اور بھر لئے گئے ہیں"

"کیا خوش ذائقہ دودھ ہے!" سیماب نے دوسرا گلاس ختم کرتے ہوئے کہا "مجھے آپ معاف فرمائینگی۔ اگر میں تھوڑا سا دودھ اور مانگوں"

رقیہ نے اچھی طرح دیکھ لیا تھا کہ سیماب نے لوٹے کو بالکل اُلٹ لیا ہے اور خاص طور پر دوسرا گلاس بھرتے ہوئے ایک ایک قطرہ نچوڑ لیا تھا۔ تاہم اُس نے عملاً بتانے کے لئے لوٹا اٹھایا اور سیماب کے گلاس پر اِس طرح اُلٹا کہ وہ واقعی دودھ ڈال رہی تھی اُسے یقین تھا کہ دودھ کی ایک بوند بھی گلاس میں نہ گریگی۔ لیکن وہ یہ دیکھکر ششدر رہ گئی کہ لوٹے سے دودھ اتنی تیزی سے گرا کہ گلاس کو لبالب بھر کر چوکی پر بہنے لگا۔

دونوں سانپ، جو سیماب کے عصا پر بل کھا رہے تھے، بڑھے اور گرے ہوئے دودھ کو چاٹنے لگے۔ مگر نہ رقیہ نے اُنہیں دیکھا اور نہ بشیر نے۔ اِس دودھ سے نہایت عمدہ خوشبو آتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بشیر کی گائے نے اچھی سے اچھی بوٹیاں، جو زمین پر پیدا ہو سکتی ہیں چری تھیں۔ ہماری یہ خواہش ہے کہ آپ میں سے ہر ایک کو کھانا کھاتے ہوئے اِس خوش ذائقہ اور خوشبودار دودھ کا ایک ایک پیالہ نصیب ہو۔

"اور اپنی بھوری ڈبل روٹی کا بھی ایک ٹکڑا" سیماب نے کہا "اور تھوڑا سا شہد بھی"

رقیہ نے ٹکڑا کاٹ کر دیدیا - جب اُس نے اور اُس کے شوہر نے کھانا کھایا تھا تو یہ روٹی اتنی خشک اور سخت تھی کہ آسانی سے کٹتی بھی نہ تھی اور اب ایسی نرم ہوگئی تھی گویا چند گھنٹے پہلے تنور سے نکالی گئی تھی - رقیہ نے وہ ریزے جو کاٹتے ہوئے چوکی پر گر گئے تھے اٹھا کر اپنے منہ میں ڈال لئے - اُن کا ذائقہ نہایت لذیذ تھا - اُسے مشکل سے یقین آیا کہ یہ وہی روٹی تھی جو اُس نے خود اپنے ہاتھ سے پکائی ہے - اور ہاں! شہد کے متعلق تو ہم نے بتایا ہی نہیں کہ وہ کتنا نفیس تھا اور اُس میں سے کیسی خوشبو آتی تھی اور دیکھنے میں کسقدر خوشنما معلوم ہوتا تھا - اُس کا رنگ اصلی سونے کے مانند تھا اور اُس میں ہزاروں پھولوں کی خوشبو بسی ہوئی تھی - مگر اِن پھولوں کی نہیں جو زمین کے باغوں میں پیدا ہوتے ہیں، بلکہ فردوسی پھولوں کی جن کی تلاش میں مکھیوں کو ضرور آسمان پر جانا پڑتا ہوگا - تعجب اس بات کا ہے کہ مکھیاں اُن غیر فانی، خوبصورت اور نہایت خوشبودار پھولوں کو چھوڑ کر دوبارہ بشیر کے باغ میں کیوں آجاتی تھیں - ویسا شہد نہ کبھی کسی نے چکھا تھا، نہ سونگھا تھا اور نہ دیکھا تھا تمام باورچیخانہ اُس کی خوشبو سے مہک رہا تھا اور خوشبو بھی اتنی تیز اور اچھی تھی - کہ اگر کوئی شخص وہاں کھڑا ہو کر آنکھیں بند کر لیتا تو جھونپڑی کی چھوٹی چھوٹی گرد آلود دیواریں اُس کے دل و دماغ سے فراموش ہو جاتیں اور یہ خیال کرتا کہ وہ باغ کے ایک ایسے گوشے میں ہے جہاں ہر چہار طرف چھتے ہی چھتے لگ رہے ہیں -

گو رقیہ ایک نیک دل بوڑھی عورت تھی مگر اُس کے دل میں بھی یہ خیال آ ہی گیا کہ سب باتیں غیر معمولی طور پر وقوع پذیر ہو رہی ہیں اس لئے وہ مہمانوں کو روٹی اور شہد دیکر اور اُن کے آگے انگوروں کا ایک ایک گچھا رکھ کر بشیر کے پاس بیٹھ گئی اور جو کچھ دیکھا تھا اُسے بتایا -

"دیکھنا تو درکنار کبھی تم نے ایسا سُنا بھی ہے؟" اس نے دریافت کیا -

"نہیں - کبھی نہیں" بشیر نے جواب دیا اور ایک خفیف سی مسکراہٹ اُس کے لبوں پر آگئی "میری پیاری بیوی! میرا خیال ہے کہ تمہارا دھیان کسی اور طرف ہوگا - اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو ضرور لوٹے کو دیکھتا ممکن ہے کچھ دودھ رہ گیا ہو اور تم نے دیکھا ہو - بس -"

"آہ - میرے سرتاج! جو تمہارے دل میں آئے کہتے رہو" رقیہ نے کہا "مگر یہ معمولی آدمی نہیں ہیں"

"اچھا! اچھا!" بشیر نے مسکراتے ہوئے کہا "شاید ہوں اور ظاہر بھی ہے کہ یہ کبھی امیر آدمی ہونگے اور مجھے یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ یہ ایسا اچھا کھانا کھا رہے ہیں"۔

ہر ایک مہمان نے اپنا اپنا انگوروں کا گچھا اٹھالیا -

رقیہ (جس نے اپنی آنکھیں بھی مل لی تھیں تاکہ زیادہ صاف دکھائی دینے لگے) کی رائے تھی کہ گچھے بڑے ہوگئے ہیں اور پہلے سے بہت اچھے - ہر ایک انگور سے الگ الگ رس بہا جاتا تھا - اُسے حیرت ہو رہی تھی کہ اُن ناتراشیدہ بیلوں پر ایسے اچھے انگور کیسے آگئے -

"کیا اچھے انگور ہیں!" سیماب نے اپنے منہ میں ڈالتے ہوئے کہا "معزز میزبان! فرمائیے آپ یہ انگور کہاں سے لائے تھے؟"

"اپنی بیلوں سے" بشیر نے جواب میں کہا - "آپ اُن کی ایک شاخ سامنے کی کھڑکی سے دیکھ سکتے ہیں لیکن میں اور میری بیوی سمجھتے تھے کہ اِن میں انگور اچھے نہیں لگتے -"

"میں نے ان سے اچھے انگور کبھی نہیں کھائے" مہمان نے کہا "کیا آپ مہربانی فرماکر دودھ کا ایک اور گلاس عنایت کریں گے - اور پھر میں شہزادوں سے بہتر کھانا کھاؤنگا"

اِس دفعہ بشیر خود آگے بڑھا - جو باتیں اُسے رقیہ نے بتائی تھیں وہ اُن کی حقیقت معلوم کرنا چاہتا تھا، گو وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اُس کی بیوی کبھی جھوٹ نہیں بول سکتی - اور جس بات کو وہ ایک مرتبہ سچ مان لے وہ کبھی غلط نہیں ہوتی، مگر یہی ایک ایسا معاملہ تھا جسے وہ اپنی آنکھ سے دیکھنا چاہتا تھا - اُس نے لوٹا اٹھایا اور اُس کے اندر کنکھیوں سے جھانکا - اُسے کامل یقین ہوگیا کہ لوٹے میں دودھ کی ایک دو ہی بوندیں ہیں، زیادہ نہیں لیکن فوراً ہی لوٹے کے تلے سے ایک چھوٹا سا سفید چشمہ اُبلا اور لوٹا کنارے تک شیریں اور خوش ذائقہ دودھ سے بھر گیا - یہ بھی غنیمت ہوا کہ بشیر نے حیرت میں معجز نما لوٹا زمین پر نہ گرا دیا -

"کمالات دکھانیوالے مسافرو! آپ لوگ کون ہیں؟" اُس نے اپنی بیوی سے بھی زیادہ حیران ہو کر دریافت کیا؟ -

"آپ کے دوست نیک نہاد بشیر! اور آپ کے مہمان" بڑے مسافر نے اپنی مخصوص نرم اور گہری آواز میں کہا، اور اُس کی آواز کی ملائمت سے بشیر کا خوف فوراً ہی کافور ہوگیا -

"مجھے بھی ایک گلاس اور عنایت کیجئے - اور خدا کرے آپ کا لوٹا دودھ سے کبھی خالی نہ ہو -"

کھانا کھا چکنے کے بعد مسافروں نے لیٹنے کے لئے کہا - بشیر اور

رقیہ یہ چاہتے تھے کہ تمام رات بیٹھے ہوئے اُن سے باتیں کئے جائیں اور جو جو عجائبات اِن میاں بیوی نے دیکھے ہیں۔ اُن کے متعلق دریافت کریں۔ مگر بڑے مسافر کا ایسا رعب پڑا کہ وہ ایک لفظ بھی نہ کہہ سکے۔

اور جب بشیر نے سیماب کو علیحدہ لے جا کر یہ دریافت کیا کہ آسمان کے نیچے یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ کہ ایک پرانے لوٹے سے دودھ کا چشمہ پھوٹ نکلے، تو اس نے اپنے عصاء کی طرف اشارہ کیا۔

"سب کچھ بھید اِس میں ہے" سیماب نے کہا "اور اگر آپ کو کچھ پتہ چل جائے تو مجھے بھی بتائیں، میں آپ کا بہت ممنون ہونگا۔ میں نہیں جانتا کہ اِس عصاء میں کیا راز ہے؟ یہ ہمیشہ ایسے ہی عجیب کام کرتا رہتا ہے۔ اکثر میرے لئے کھانا لاتا ہے اور بہت دفعہ چرا لے جاتا ہے۔ اگر مجھے بیہودہ باتوں پر یقین ہوتا تو میں یہ ضرور کہتا کہ اِس عصاء پر کسی جن یا جادو کا اثر ہے۔"

اُس نے اور کچھ نہیں کہا اور اُن دونوں کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کر دیکھنے لگا۔ وہ فی الفور تاڑ گیا کہ میاں بیوی، دونوں سمجھ رہے ہیں کہ وہ اُن سے مذاق کر رہا ہے۔

عصاء بھی سیماب کے ہمراہ اُچھلتا ہوا باہر چلا گیا۔

بشیر اور رقیہ کچھ دیر بیٹھے ہوئے شام کے واقعات پر گفتگو کرتے رہے اور پھر فرش پر لیٹ کر گہری نیند سو گئے۔ جس کمرے میں وہ خود سویا کرتے تھے اُس میں مہمانوں کو لٹا دیا تھا اور اُن کے پاس لکڑی کے تختوں کے علاوہ کوئی بستر نہ تھا.......... خدایا! وہ لکڑی کے تختے اتنے نرم ہو گئے ہوں جتنے کہ اُن کے دل۔

بوڑھے بشیر اور اُس کی بیوی کی صبح سویرے آنکھ کھل گئی۔ مسافر بھی اُٹھ بیٹھے اور چلنے کی تیاری کرنے لگے۔

بشیر نے مہمان نوازی کے طور پر کہا "آپ ذرا سی دیر اور ٹھہریں رقیہ گائے کا دودھ دوہنے گئی ہے وہ آکر آپ کے لئے روٹی پکا دیگی اور شاید ناشتے کے لئے ایک دو انڈے بھی مل جائیں"

مگر اُن دونوں نے اِس خیال سے کہ سورج کی گرمی سے پہلے سفر کا کچھ حصہ طے کر لیا جائے، جانے کی اجازت چاہی اور بشیر اور رقیہ کو کچھ دور اپنے ساتھ چلنے کے لئے کہا۔ تاکہ وہ اُنہیں راستہ بتا دیں۔

وہ چاروں، بے تکلف دوستوں کی طرح ہنستے بولتے جھونپڑی سے روانہ ہو گئے۔ تعجب ہے کہ بوڑھا جوڑا بڑے مسافر سے بھی بے تکلف ہو گیا تھا اور اُن کی روحیں اِس کی روح میں ایسے مل گئی تھیں جیسے کہ پانی کی دو بوندیں بے پایاں سمندر میں، اور سیماب اپنی صاف، تیز اور ظریف طبیعت سے اُن کے دل کی باتیں معلوم کر رہا تھا۔ مگر بوڑھا جوڑا یہ چاہتا تھا کہ وہ اتنا حساس نہ ہوتا۔ اور اپنے پُر اسرار عصاء کو جس پر سانپ لہرا رہے تھے کہیں دور پھینک آتا۔ لیکن پھر سیماب کوئی نہ کوئی ایسی مذاق کی بات کہہ دیتا کہ وہ اُسے اور اُس کے سانپوں والے عصاء کو تمام عمر کے لئے اپنی جھونپڑی میں ٹھہرانے کو خوشی سے تیار ہو جاتے۔

"آہ۔ کیا ہی اچھا ہو" بشیر نے جب دروازہ سے تھوڑی دور چلے گئے۔ سانس کھینچتے ہوئے کہا "اگر ہمارے پڑوسیوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ مسافروں سے ہمدردی کرنے سے کیا چیز حاصل ہوتی ہے تو وہ ضرور اپنے کتوں کو باندھ لینگے اور اپنے بچوں کو کبھی پتھر نہ پھینکنے دیں گے"

"یہ گناہِ کبیرہ ہے اور باعثِ شرم" رقیہ نے جلدی سے کہا "اور میرا ارادہ ہے کہ میں آج جا کر اُنہیں اُن کی بُری حالت سے آگاہ کر دوں"

"مجھے ڈر ہے" سیماب نے مسکراتے ہوئے کہا "آپ اُن میں سے ایک کو بھی نہ پائینگی"

بڑے مسافر کی پیشانی پر بل آ گئے اور پسینے کے چند قطرے بھی نمودار ہوئے۔ رقیہ اور بشیر کو اتنا خوف محسوس ہوا کہ اُن کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ اور وہ حیرت سے اُس کے چہرہ کو تکنے لگے۔

"جب وہ غریب مسافروں سے برادرانہ سلوک کرنے کے روادار نہ تھے" بڑے مسافر نے کہا "تو وہ اِس زمین پر، جسے خدا نے انسانی ہمدردی اور محبت کا مسکن بنایا ہے، رہنے کے قابل نہ تھے!"

"اور میرے دوست! یہ تو بتائیے" سیماب نے مذاق کے پیرایہ میں دریافت کیا اور اُس کی آنکھوں میں شرارت بھری ہوئی تھی۔ "جس گاؤں کے متعلق آپ باتیں کر رہے ہیں، وہ ہے کہاں؟ ہمارے کس طرف ہے؟ مجھے تو دکھائی دیتا نہیں"

بشیر اور رقیہ وادی کی طرف مڑے۔ جہاں ایک دن پہلے، ہاں صرف ایک دن پہلے سورج غروب ہوتے وقت، اُنہوں نے چراگاہیں بھی دیکھی تھیں، مکانات و باغات بھی، درختوں کے جھنڈ بھی، کشادہ گلیاں بھی، کھیلتے ہوئے بچے بھی، چلتے پھرتے دیہاتی بھی، اور خوشی اور خوشحالی بھی۔ اُن کی حیرت کی کوئی حد نہ رہی جب

انہیں گاؤں کا کوئی نشان نظر نہ آیا۔ یہاں تک کہ وہ زرخیز وادی بھی جس میں گاؤں واقع تھا، غائب تھی۔ ہر چہار طرف جھیل کا پانی ہی پانی نظر آتا تھا۔ اور اُس ساکن اور شفاف پانی میں آس پاس کی پہاڑیوں کا عکس پڑ رہا تھا۔ ایک لمحہ تک جھیل بالکل ساکن رہی، پھر اُس میں اُبال سا آگیا اور دیکھتے ہی دیکھتے پانی اُچھلنے اور چھلکنے لگا اور اُس میں سورج کی شعاعوں سے ایک خاص قسم کی چمک پیدا ہوگئی۔ بوڑھے جوڑے کو محسوس ہوا کہ وہ جھیل کو وہاں سالہاسال سے دیکھتے رہے ہیں اور گاؤں کے متعلق سب باتیں اُنہیں خواب معلوم ہوئیں۔ مگر پھر اُنہیں برباد عمارتیں اور وہاں کے باشندوں کی صورتیں اور عادات و اطوار یاد آگئیں۔ یہ کوئی خواب نہ تھا۔ وہاں کل شام گاؤں بھی تھا اور گاؤں والے بھی تھے مگر اب کچھ بھی نہ تھا، صرف جھیل ہی جھیل تھی۔ بوڑھے اور نرم دل بشیر اور رقیہ نے بسورتے ہوئے کہا "اور ہمارے غریب ہمسایوں کا کیا حال ہوا"

"اب وہ انسان نہیں رہے" بڑے مسافر نے اپنی بارعب آواز میں کہا اور اُس کی آواز کے ساتھ فضا میں بہت دور گرج کی آواز سنائی دی۔ "اُن کی زندگی سے نہ کوئی فائدہ تھا نہ بھلائی۔ اُن کے دل اپنے بھائیوں کی مصیبتوں پر بھی نہ پسیجتے تھے اور انہیں اپنی زندگی کے سُدھارنے کا ذرا بھی خیال نہ تھا۔ اِس لئے وہی پہلی جھیل اُن پر پھیل گئی ہے تاکہ آسمان اُس کے صاف و شفاف آئینہ میں اپنا منہ دیکھا کرے۔"

"اور اُن جاہل آدمیوں کے متعلق یہ ہے" سیماب نے شرارت آمیز مسکراہٹ سے کہا "کہ وہ سب کے سب مچھلیاں بنا دیئے گئے ہیں۔ تبدیلی اُن میں بہت کم کی گئی ہے۔ کیونکہ اُن کے خون سفید ہوگئے تھے اور اُن کے دل ایسے ہی سخت تھے جیسے کہ مچھلی کی کھال۔ اِس لئے مہرباں ماں رقیہ! جب آپ کو یا آپ کے خاوند کو بھُنے ہوئے گوشت کی خواہش ہوا کرے تو کانٹے ڈالکر نصف درجن اپنے پڑوسیوں کو کھینچ لیا کیجئے!"

"نہیں" رقیہ نے کانپتے ہوئے کہا "میں ہرگز ایسا نہ کرونگی۔ اپنے پیٹ کے لئے اُن کے کباب نہ بناؤنگی"

"نہیں" بشیر نے بھی ڈرتے ہوئے کہا "ہم اُنہیں کبھی نہ کھائینگے"

"نیک نہاد بشیر!" بڑے مسافر نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "اور مہربان رقیہ! آپ نے بے گھر مسافروں کی خاطر و مدارات میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ اور آپ ہی کی نیک باطنی کی وجہ سے دودھ نے آبِ حیات کا مزا دیا اور بھدی روٹی اور شہد نے امرت کا، آپ کی جو دلی خواہش ہو، ارشاد فرمائیے، پوری کردی جائیگی۔"

بشیر اور رقیہ ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے، یہ بتانا مشکل ہے کہ اُن میں سے کون بولا، مگر ایک ہی نے دونوں کی دلی آرزو بیان کی۔

جب تک ہمارے دم میں دم ہے، ہم ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں اور جب مریں تو ایک ساتھ مریں۔ کیونکہ ہم ہمیشہ اپنے سے دوسرے کا خیال زیادہ رکھتے رہے ہیں۔"

"ایسا ہی ہوگا" مسافر نے مہربانی سے کہا "اور اب اپنی جھونپڑی کی طرف خیال کیجئے۔"

انہوں نے نظر اٹھائی اور سنگ مرمر کا عالیشان اور کشادہ مکان اپنی کٹیا کی بجائے دیکھکر غرقِ حیرت ہوگئے۔

"وہ آپ کا مکان ہے۔" مسافر نے دونوں کو محوِ حیرت دیکھکر ہنستے ہوئے کہا "اِس محل میں اُسی دل سے مہمان نوازی کیجئے، جس سے کہ کل اِس کٹیا میں ہمارے ساتھ کی تھی۔"

میاں بیوی شکریہ ادا کرنے کے لئے اُس کے پاؤں پر گر پڑے مگر نہ وہاں وہ تھا نہ سیماب۔

بشیر اور رقیہ اُس سنگ مرمر کے محل میں رہنے لگے، اُن کا تمام وقت چین آرام اور اطمینان میں گزرتا تھا۔ اور جو مسافر اِس طرف آنکلتا تھا اُس کی دل سے خاطر و مدارات کرتے اور اُسے ذرا بھی تکلیف نہ ہونے دیتے تھے۔ دودھ کے لوٹے میں وہی عجیب بات رہی۔ وہ کبھی خالی نہ ہوا۔ جب کبھی کوئی شریف، نیک باطن اور دیانتدار آدمی اُس میں سے دودھ پیتا تو اُسے محسوس ہوتا کہ اُس نے اِس سے اچھا، خوش ذائقہ اور تقویت بخش دودھ کبھی نہیں پیا اور اگر کبھی کوئی لالچی اور بددل آدمی پیتا تو وہ یہ اعلان کرتا کہ دودھ بہت کڑوا اور خراب ہے۔

دونوں میاں بیوی، اپنے سنگ مرمر کے محل میں رہتے رہے۔ بہت مدت رہتے رہے یہاں تک کہ وہ بے حد بوڑھے ہوگئے۔ آخرکار ایک ایسی صبح آئی جب بشیر اور رقیہ کی خوشگوار صورتیں جن پر ہمیشہ مہمان نوازی کی مسکراہٹ برستی رہتی تھی۔ غائب ہوگئیں۔ مسافروں نے اِدھر اُدھر، مکان کی چھتوں پر، تہ خانوں میں، غرضیکہ ہر جگہ اُن کی تلاش کی مگر بے سود۔ بہت جستجو کے بعد اُنہوں نے دروازے کے سامنے دو بڑے بڑے درخت دیکھے اور اُن میں سے کسی کو

بھی یہ یاد نہ پڑتا تھا کہ وہ دونوں درخت ایک دن پہلے وہاں موجود تھے۔ اُن کی جڑیں زمین میں بہت گہری جمی ہوئی تھیں اور نازک نازک شاخیں اور چھوٹے چھوٹے پتے محل پر اور دالان پر سایہ کئے ہوئے تھے۔ ایک بلوط کا درخت تھا اور دوسرا زیتون کا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اُن کی شاخیں آپس میں بہت ہی خلط ملط تھیں اور ایسے بل کھا رہی تھیں گویا کہ بغل گیر ہو رہی ہیں۔

مسافر اُن عجیب وغریب درختوں کے نیچے کھڑے ہوئے حیرت سے باتیں کر رہے تھے کہ اُن کے اُگنے اور اتنے بڑھ جانے کے لئے کم سے کم ایک صدی درکار ہے۔ ایک ہی رات میں یہ کیونکر اُگے، بڑھے، پھلے پھولے اور اتنے بڑے ہو گئے کہ بادِ صبا کا جھونکا آیا اور درختوں کی ملی جُلی شاخوں میں حرکت پیدا ہو گئی اور ایک خفیف سی آواز آئی جیسا کہ دونوں درخت سرگوشی کر رہے ہوں۔

"میں بوڑھا بشیر ہوں"، شاہ بلوط کے درخت نے کہا۔

"میں بوڑھی رقیہ ہوں" زیتون کے درخت سے آواز آئی۔

لیکن چونکہ ہوا تیز چلنے لگی تھی۔ اس لئے دونوں درخت ایک ساتھ ہی بول اُٹھے۔ "بشیر، رقیہ رقیہ بشیر" گویا کہ ایک ہی ہیں دونوں تھے اور دونوں میں ایک، یا دوسرے معنوں میں وہ دونوں ایک قالب دو جان کی مثال تھے اور دل کی گہرائیوں میں باتیں کرنے لگے۔ بوڑھے جوڑے نے ایک نئی زندگی اختیار کر لی تھی اور اس طرح بشیر کو بلوط کی اور رقیہ کو زیتون کی شکل میں خوشی کے ساتھ ایک صدی اور گزارنی تھی۔ اُن کا تاریک وسیاہ سایہ بھی مہماں نواز تھا جب کوئی راہ چلتا مسافر وہاں آکر بیٹھ جاتا تو اُسے اپنے سر کے اوپر پتوں میں سے آواز آتی جو بشیر اور رقیہ کی آواز سے بالکل مشابہ تھی۔

"خوش آمدید! خوش آمدید!! پیارے مہمان! خوش آمدید!!!"

کسی نیک دل آدمی نے اِن درختوں کے اردگرد ایک پکا چبوترا بنوا دیا جس سے بوڑھے بشیر اور رقیہ کی روحیں بہت خوش ہوئیں۔ مدتوں تک تھکے ماندے، بھوکے پیاسے مسافر وہاں آکر آرام کرتے اور اُس معجز نما لوٹے سے دودھ پیتے رہے۔

(ماخوذ) حمید الظفر احمد شاہ آبادی

قصرِ گیتی

(از حضرت عطاء اللہ کلیم)

سراب رنگ وبو ہے، ایک پُراسرار بستی ہے
جہاں کے ہر در و دیوار پر ہیبت برستی ہے

یہ سقفِ منقش، فرشِ دلکش ہے زمرّد کا
مگر فطرت سکوں کو قصرِ گیتی میں ترستی ہے

کہیں ہے منظرِ عشرت، کہیں تصویرِ ناکامی
نقوشِ مختلف سے زینتِ ایوان ہنستی ہے

ازل سے آنکھ محوِ جستجو ہے، ہمنشیں، لیکن
ابھی تک صاحبِ خانہ کی صورت کو ترستی ہے

غمِ انجام سے اس قصر میں آتش بجاں ہوں میں
خدا جانے اگرفتارِ بلا یا میہماں ہوں میں

(از سر ولیم واٹسن) کلیم

اجتماعِ اضداد

اور

مرزا غالب

دنیا جسے کہتا ہے زمانہ فانی
ہے ایک طلسمِ "اجتماعِ اضداد"

وجود و عدم، امید و بیم، راحت و تکلیف، افراط و تفریط۔ نیکی و بدی اور ہاں اور نہیں وغیرہ الفاظ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اسی طرح خیالات و معانی بھی ایک دوسرے کی ضد ہو سکتے ہیں مثلاً یہ کہنا کہ :-

میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا

یا ایسا ہی کوئی اور خیال ظاہر کرنا جس میں متضاد رعائتیں برتی گئی ہوں یعنی اُس میں "اجتماعِ ضدین" ہو اور بظاہر الفاظ و خیالات ایک دوسرے کی ضد معلوم ہوتے ہوں خواہ خیالات فلسفہ سے متعلق ہوں مثلاً ؎

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی
ہر چند کہیں کہ "ہے" "نہیں ہے"

یا علم النفس و جذبات سے مثلاً ؎

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

خواہ تنقیدِ معاشرت سے متعلق ہوں مثلاً ؎

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے

خواہ محض حسنِ خیال سے مثلاً ؎

جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی
لکھ دیجیو یارب اُسے قسمت میں عدو کی

اندازِ بیان کی یہ شان جیسا کہ مندرجۂ بالا اشعار سے ثابت کیا گیا ہماری زبان کے مایۂ ناز شاعر مرزا غالب میں بڑی اہمیت رکھتی ہے کیونکہ یہ ایک ایسا انداز ہے جس کو قدرت نے نظامِ عالم کے لئے منتخب کر لیا ہے۔

کون نہیں جانتا کہ ہر وجود عدم کی دلیل ہے۔ ہر امید کے ساتھ بیم و حرمان کی نیش زنی موجود ہے۔ ہر تکلیف راحت کی رہنما ہے اور ہر عیش میں ایک کیفِ غم پنہاں ہے۔ روزِ روشن کے بعد شبِ تاریک ہے اور ہر کمال وابستۂ زوال ہے۔ یعنی "اجتماعِ اضداد" پر تنظیمِ عالم کا دار و مدار ہے اور جسے "راحت" کہتے ہیں وہ محض "سکونِ اعتدال" ہے جو "ابتدا" اور "انتہا" کے درمیانی منازل میں سعیِ ناتمام کی ایک خوشگوار کیفیت کے سوا کچھ نہیں۔ غرض ؎

یاں ہوش سے بیزار ہوا بھی نہیں جاتا
اُس بزم میں ہشیار ہوا بھی نہیں جاتا

شعرائے اردو میں میر صاحب کا کلام نہایت سادہ اور نازک ہوتا ہے۔ مومن کے کلام میں طنز غالب ہے اور اکبر الہ آبادی کی شاعری چونکہ تنقیدِ معاشرت پر وقف ہے۔ اس لئے اُس کو "ہجوِ ملیح" (parody) پر مبنی سمجھنا چاہیئے۔ اسی طرح غالب کے کلام میں "اجتماعِ اضداد" (Complexity of Extremes.) ہے کیونکہ دیوانِ غالب میں شاید ہی کوئی ایسا شعر ملے جس میں متضاد رعایتیں نہ موجود ہوں۔ یا جس میں ایک قسم کا تضادِ ملیح نہ پایا جاتا ہو۔ خواہ ایک خیال دوسرے خیال کی ضد ہو یا ایک لفظ، ایک فقرہ یا ایک مصرعہ دوسرے لفظ، فقرہ یا مصرعہ کی ضد ہو۔ شعر میں "اجتماعِ اضداد" ضرور ہوگا ؎

یار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

غرض "اجتماعِ اضداد" سے وہ خاص قسم کا اندازِ بیان مراد ہے۔ جس میں بظاہر متضاد رعایتوں کی زیادتی پائی جاتی ہو۔ مرزا صاحب نے (۱) بہ اعتبارِ اندازِ بیان لفظی ترکیبوں میں (۲) اور بہ اعتبارِ اظہارِ

خیال معانی و مفہوم میں متضاد رعائتیں رکھی ہیں جن کی مثالیں ذیل میں لکھی جاتی ہیں۔

(۱) اندازِ بیان میں متضاد ترکیبیں بالکل مخالف مفہوم رکھنے والے فقروں اور الفاظ سے ظاہر کی گئی ہیں مثلاً :- درد کا دوا ہونا، مشکل کا ذریعۂ آسانی ہونا۔ مرنے سے جینے کا لطف ثابت کیا جانا وغیرہ حتیٰ کہ اشعار میں الفاظ کی ترکیبیں بھی اسی انداز پر شاہد ہیں ؎

سفینہ جبکہ کنارے پہ آلگا غالب
خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہئے

عشق و عاشقی کی داستان ہی عموماً رنگِ تغزل کی جان ہے اور شکوہ و شکایت سے اس میں ایک نرالی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ ذرا اشعارِ ذیل میں شکوہ و شکایت کی دلفریبیاں ملاحظہ ہوں۔ اور یہ کہ ایک مصرعہ دوسرے مصرعے کی ضد ہے۔ گویا ہر شعر ایک ترازو ہے اور دونوں مصرعے ترازو کے دو پلّے جن میں نیکی و بدی کی طرح متضاد مفہوم رکھنے والے الفاظ وزن کئے گئے ہیں اگرچہ اس موازنہ سے محض شکوہ و شکایت مقصود ہے ؎

واں کرم کو عذرِ بارش تھا عناں گیرِ خرام
گریہ سے یاں پنبۂ بالش کفِ سیلاب تھا
واں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال
یاں ہجومِ اشک میں تارِ نگہ نایاب تھا
جلوۂ گل نے کیا تھا واں چراغاں آبجو
یاں رواں مژگانِ چشمِ تر سے خونِ ناب تھا
یاں سرِ پرشور بے خوابی سے تھا دیوار جو
واں وہ فرقِ ناز محوِ بالشِ کمخواب تھا
یاں نفس کرتا تھا روشن شمعِ بزمِ بیخودی
جلوۂ گل واں بساطِ صحبتِ احباب تھا
فرش سے تا عرش واں طوفاں تھا موجِ رنگ کا
یاں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا

اسی طرح سیکڑوں اشعار رنگِ تضاد میں ڈوبے ہوئے معلوم ہونگے۔ ذیل میں بہت زیادہ نمایاں اشعار کا انتخاب کیا جاتا ہے :-

(۱) قطع کیجے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

(۲) بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

(۳) زخم گر دب گیا لہو نہ تھما
کام گر رک گیا روانہ ہوا

(۴) گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا
بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

(۵) پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

(۶) رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

(۷) ہم وہاں ہیں جہاں سے ہمکو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

(۸) مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی

(۹) ہم کو ان سے وفا کی ہے امید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

(۱۰) مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے
تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

(۱۱) ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

(۱۲) عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام
مجنوں کو برا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے

مندرجۂ بالا اشعار اور اُن کے مفہوم میں بظاہر کوئی نہ کوئی تضاد ضرور ہے۔ اسی بنا پر اکثر نقادانِ سخن غالب کو "انتہا پسند" بتلاتے ہیں۔ لیکن بہ اعتبار اظہارِ حقیقت مرزا صاحب نے ہر انتہا کو اعتدال کے ماتحت رکھا ہے۔ اور یہ ثابت کر کے دکھلایا ہے کہ ہر انتہا میں کوئی نہ کوئی ابتدا پنہاں ہوتی ہے اور ہر ابتدا دلیلِ انتہا ہے۔ مثلاً یہ کہ ہمارا وجود فنا کی دلیل ہے :-

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی

یا یہ کہ ہر مایوسی میں امید پنہاں ہے :-

کفِ افسوس ملنا عہدِ تجدیدِ تمنا ہے

لہ "عیش، مایوسی اور غالب"

یا یہ کہ موت ہی سے زندگی کا لطف ہے۔ یعنی موت کا خیال ہی دنیا میں ہمارے کاموں کا محرک ہے اِس لئے ؎

نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

چنانچہ ایسی ہی متضاد ترکیبوں سے غالب نے نہایت مشکل اور پیچیدہ حقائق پر روشنی ڈالی ہے۔ اور اس قسم کی مثالوں سے غالب کا پورا دیوان مملو ہے مثلاً ؎

(۱) ذرہ بے پرتو خورشید نہیں۔
(۲) ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں
(۳) نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی
(۴) مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیئے۔
(۵) دشوار۔ تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

علیٰ ہذالقیاس اِن متضاد رعایتوں کو خواہ "اجتماع اضداد" کہئے یا "جدت مبالغہ" سے تعبیر کیجئے بہرحال اِن میں سے ہر ایک کسی نہ کسی حقیقتِ پنہاں کی تفسیر ہے۔

(۲) بہ اعتبار خیال آفرینی و فلسفہ غالب اخلاقِ مسیحی کے پیرو ہیں۔ اور اُن کا فلسفہ برکلے کے فلسفہ پر مبنی ہے۔ فلسفۂ اخلاق (ETHICS) کے اعتبار سے غالب "اجتماع اضداد" کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے متضاد طرزِ بیان میں یہ کہتے ہوئے نظر آئیں گے ؎

جو مدعی بنے اُس کے نہ مدعی بنئے
جو ناسزا کہے اُس کو نا سزا کہئے

اور مواعظ نہایت سادہ اور فصیح ہونگے جن میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں مثلاً ؎

نہ سنو گر بُرا کہے کوئی
نہ کہو گر بُرا کرے کوئی
روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی
جب توقع ہی مٹ گئی غالب
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

جس طرح برکلے کہتا ہے کہ عالم محض "نقشِ خیال" ہے۔ اِسی طرح مرزا صاحب بھی فرماتے ہیں کہ "عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے"۔ برکلے کہتا ہے کہ کوئی شے انسان کی نظروں میں ہمیشہ یکساں نظر نہیں آتی۔ اگرچہ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی چیز ہے مگر دراصل وہ نہیں ہوتی۔ غالب کا شعر ہے ؎

در ہر مژہ برہم زدن ایں خلق جدید است
نظارہ شناسد کہ ہماں است ہماں نیست

اور اسی مفہوم کو لئے ہوئے غالب کا یہ دوسرا شعر ہے ؎

ہاں کھائیو مت فریب ہستی
ہرچند کہیں کہ ہے۔ نہیں ہے

یہ بھی بظاہر ایک قسم کا "تضادِ ملیح" ہے۔ یعنی جو چیز نظر کے سامنے ہو اس کو یہ کہنا کہ نہیں ہے۔ بالکل ایک ایسی بات ہے جو بظاہر مہمل ہو۔ مگر حقیقتاً ایسا نہیں۔

میر صاحب کی طرح غالب نے بھی دنیاوی زندگی کو ازل و ابد کے درمیان ایک منزل مانا ہے۔ میر صاحب کہتے ہیں ؎

مرگ اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

مرزا صاحب کسی قدر اختلاف کے ساتھ موت کو زندگی اور زندگی کو موت کی دلیل سمجھتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ہمارا وجود فنا کی دلیل ہے۔ یعنی ؎

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولا برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

اور چونکہ ہر انتہا سے کسی نہ کسی قسم کی ابتدا کا وجود ضروری ہے اس لئے فنا کے بعد پھر بقا ممکن ہے ؎

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا
حباب موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا

اس طرح مرزا صاحب اپنی ہمت عالی میں میر صاحب سے بھی بڑھ گئے ہیں۔ لیکن میرؔ و مرزاؔ دونوں نے تسلیم کیا ہے کہ مقصدِ وجود محبت ہے۔ اِس کو بھی مرزا صاحب اپنے متضاد انداز میں یوں بیان فرماتے ہیں ؎

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی دردِ لا دوا پایا

غرض مرزا کی دشوار پسندی، دقتِ نظر، فلسفہ پردازی، دقیق ترکیبوں اور عجائب لغات کا بہت کچھ راز اُن کے مخصوص اندازِ بیاں یعنی "اجتماع اضداد" میں پنہاں ہے۔ "اجتماع اضداد" کی کسی ایک چیستاں کو لیجئے اور متضاد الفاظ کو الگ الگ کر کے معانی و خیالات

کو بھی فرد فرد کر لیجے تو "گنجینۂ معانی کا طلسم"[1] بالکل ٹوٹا ہوا نظر آئیگا۔ اور معلوم ہوگا کہ مرزا نے متضاد ترکیبوں میں کوئی نہ کوئی ایسا "پیامِ غیب" پنہاں کر رکھا تھا جس میں اگرچہ بظاہر ایک کیفِ مایوسی شامل ہے مگر وہ دراصل "ہمت افزائی" اور "امید افزائی" کا شاہکار اور "عیشِ روحانی" کا حامل ہے۔

غالب پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور نہیں معلوم کہ "گنجینۂ معانی" سے آئندہ کتنے نوع بنوع جواہرات اور بھی حاصل کئے جائیں مگر "اجتماعِ اضداد" اہلِ نظر کی نگاہوں میں بالکل ایک نئی تحقیق ہے۔ امید تو ہے کہ کلامِ غالب سے ذوق رکھنے والے احباب اور غالب کی شاعری پر رات بھر غور و خوض کرنے والے طالب علم مرزا کے اندازِ بیان یا اسٹائل کی اس کارآمد تحقیق سے بھی بے خبر نہ رہیں گے۔

سید مقبول حسین احمدپوری

---

[1] خود غالب کا شعر ہے ؎

گنجینۂ معنی کا طلسم اسکو سمجھیے
جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آئے

عظمتِ ایثار

یوں کرمکِ شب تاب بھی ہے شعلہ بداماں — جو کود پڑے آگ میں "پروانہ" وہی ہے
ہونے کو تو دیوانوں سے معمور ہے دنیا — لیلیٰ کو جو محبوب ہو دیوانہ وہی ہے
لاحق نہ جسے عشق میں ہو فکرِ پس و پیش — دانائے خرد ہے وہی، فرزانہ وہی ہے
جو مردِ وفا آگ میں غیروں کی بھی جل جائے — شمعِ رخِ محبوب کا پروانہ وہی ہے

دل ہی نہیں جو درد کی تصویر نہ بنجائے!
ہو صید کوئی خود ہدفِ تیر نہ بنجائے!

اللہ کے بندوں سے نہیں جس کو محبت — اللہ کی الفت کا سزاوار نہیں ہے؛
اس چشم سے نکلیں گے کہاں گوہرِ الفت — غیروں کی مصیبت میں جو خونبار نہیں ہے؛
کمزور کے آگے جسے جھکنا نہیں آتا — وہ مجرمِ اخلاق ہے خوددار نہیں ہے؛
پائیگا وہ کیا دولتِ یزداں کے خزانے — جس دل میں غریبوں کیلئے پیار نہیں ہے؛

جو مستِ مئے الفتِ نوعِ بشری ہیں
اللہ کے دربار میں مقبول وہی ہیں

روشؔ صدیقی

مصر قدیم کی حیاتِ اجتماعی

زمانۂ قدیم میں مصروالے حسن وجمال کی پرستش ' آرائش وزیبائش کے ساتھ شغف ' اپنی سحر آموز موسیقی ' لطیف اور دلکش رقص فرحت انگیز عطر، روح پرور ادویات بے نظیر مجسمہ سازی عیش کوشی × × × × × تصویر کشی اور سنگ تراشی کی وجہ سے تمام دنیا میں امتیاز خصوصی کے سرمایہ دار تھے۔ زمانۂ قدیم میں ان کے ارتقا کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اُنھوں نے عورت کو نہایت بلند اور رفیع مرتبہ عطا کیا تھا۔ عورت تمام اُن امتیازات اور حقوق سے متمتع ہوتی تھی جو مردوں کو حاصل تھے مصریوں کا عورتوں کے ساتھ یہ سلوک اُس زمانے کے یونانیوں کے طریقہ سے قطعاً مخالف تھا۔ یونانیوں نے مرد کے مقابلہ میں عورت کو بہت پست اور ذلیل مرتبہ سمجھا تھا۔ حق تو یہ ہے کہ اُس زمانہ میں جب دُنیا تہذیب و تمدن کے نام سے ناآشنا تھی عورتوں کے ساتھ مصریوں کا سلوک بیحد تعجب انگیز ہے۔ یونانی خود اعتراف کرتے ہیں کہ مصر قدیم کی عورت ایسے عظیم و رفیع مرتبہ پر پہنچی ہوئی تھی کہ مرد شادی سے قبل عورت کو اپنی اطاعت اور محبت کا یقین دلانے پر مجبور ہوتا تھا۔ غریب اور امیر ہر شخص صرف ایک ہی عورت کو اپنا شریک حیات بناتا تھا۔ وہ عورت کو ہر حیثیت سے مرد کے مساوی سمجھتے تھے۔ شاہی فرامین ' معاہدات اور حکومت کے تمام احکام پر شاہ کے نام کے ساتھ ملکہ کا نام لکھنا بھی ضروری سمجھا جاتا تھا۔ جب بادشاہ فوت ہو جاتا تھا تو ملکہ اس کی جگہ حکمران تسلیم کیجاتی تھی۔ چنانچہ مصر کے تختِ حکومت پر بہت سی عورتیں فائز ہوئی ہیں اور اُنھوں نے انتہائی ہوشمندی اور دانائی سے فرائضِ حکومت انجام دئے۔

قدما مصر آج کل کی طرح اپنی نسبت باپ کی طرف نہیں کرتے بلکہ ماں کی طرف کرتے تھے۔ زمین کی مالک صرف عورت ہوتی تھی۔ اور اسے کُل اختیار حاصل ہوتا تھا کہ وہ اپنے ترکہ کے لئے جس کے حق میں چاہے کر جائے۔ موجودہ زمانہ کے اجتماعی فیصلہ کے خلاف اُن کا عقیدہ تھا کہ بھائی بہن کی شادی جائز ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آجکل یہ بات بہت مذموم نظر آتی ہے لیکن تاریخ کے حقایق کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ اس قسم کی شادیوں کا طریقہ عام طور پر رائج تھا۔ . . . .

اُس زمانہ کے تمام واقعات شاہد ہیں کہ عموماً ان کی حیاتِ زوجیہ نہایت مبارک و مسعود ثابت ہوتی تھی۔ عورتیں سیر گاہوں اور شکارگاہوں میں اپنے شوہروں کے ساتھ جایا کرتی تھیں۔ زمانۂ قدیم کی اکثر تصاویر میں دکھا جاتا ہے کہ عورت اپنے شوہر کے پہلو میں بیٹھی ہوئی ہے

چھوٹے چھوٹے بچے ان کے قدموں میں بیٹھے ہوئے ہیں اور شیر خوار بچہ ماں کے کاندھے سے لپٹا ہوا ہے یا بڑا بیٹا باپ کے برابر بیٹھا ہوا ہے۔ یہ ایک خاندان کے اتحاد و محبت اور اُس کے افراد کے ارتباط کی حقیقی صورت ہے۔ گھر والے ایک دوسرے کو ہمیشہ عزّت و احترام کے ساتھ پکارتے تھے مثلاً کہتے تھے " ننھے محبوب " " لطیف محبوبہ " " جانِ عشق " وغیرہ۔ یہ پیار یہ محبت اور یہ اُلفت ایک خاندان کو بالکل متفق اور متحد بنا دیتا تھا۔ قدمائے مصر کا ایک مصنف لکھتا ہے کہ

" مرد کے لئے اس کے گھر سے زیادہ عزیز کوئی چیز نہیں "

" عقلمند نوجوان وہ ہے جو اپنے نفس کے لئے ایک گھر بنائے اور اپنی زوجہ کے ساتھ محبت کرے "

ایک مصری باپ کا سب سے بڑا فرض یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ اپنا گھر بیٹے کے لئے چھوڑ جائے۔ اور اپنی حرفت اسے سکھا جائے۔

اگر بیٹا اپنے ضعیف باپ کی اعانت نہ کرنا چاہے۔ یا اس کی مساعدت پر قادر نہ ہو تو قانون یہ فرض لڑکی پر عائد کر دیتا تھا کہ وہ اس کی کفالت اور اعانت کرے۔ اگرچہ بظاہر یہ ایک عجیب بات معلوم ہوتی ہے لیکن جب ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہی باپ کے متروکہ کی حقیقی وارث ہوتی تھی تو یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ ضعیف باپ کی خدمت کا مطالبہ بھی قانوناً اس سے کیا جا سکتا ہے۔ البتہ بیٹا بعض دوسرے امور کا ذمہ دار تھا مثلاً اس کا فرض تھا کہ وہ باپ کے ذکرِ جمیل کو ہمیشہ قائم رکھنے کی کوشش کرے ' مذہبی مراسم ادا کرے ' ضروری قربانیاں دے اور اُسے اپنے خاندان کے قبرستان میں دفن کرے۔ جو بیٹا ان تمام واجبات کو ادا کر دیتا تھا اور اپنی ماں سے محبت اور اخلاص کا معاملہ کرتا تھا۔ وہ بہت سعادت مند اور نیک بخت سمجھا جاتا تھا۔

وہ منظر بھی کتنا پیارا ہوتا تھا جب باپ اپنے بیٹے کو اپنی آخری ساعتوں میں نصیحت کرتا تھا کہ

" میں نے تمھاری ماں کو تمھارے سپرد کیا ' اس نے تمھیں اپنے بطن

میں رکھا ـــــــ تمھارے لئے طرح طرح کے مصائب برداشت کئے، اس نے تمھیں مدرسے میں داخل کیا تاکہ تم علم حاصل کرو، وہ ہر روز مدرسہ میں تمھارے لئے کھانے پینے کی اچھی اچھی چیزیں بھیجتی تھی، اور جب تم بڑے ہوئے تو اُس نے تمھارے لئے اچھی بیوی تلاش کرکے اُس سے تمھاری شادی کر دی۔

لہٰذا اب جبکہ تم متاہل ہو گئے اور اپنے گھر کے سردار بن گئے تو تمھیں اپنی اس ماں سے کبھی آنکھیں نہ پھیرنی چاہئیں جس نے تمھیں جنا۔ اور نہ اپنی بیوی سے بیمروتی اور نامہربانی کا برتاؤ کرنا چاہیئے جس نے اپنی تمام خواہشات تمھاری مرضی کے تابع کر دیں۔ ان دونوں میں سے کسی کو بھی زجر و توبیخ نہ کرو۔ تاکہ وہ تمھارے لئے کبھی بددعا نہ کرے۔

ماں اپنے بچّوں کی تربیت کرتی تھی اور ایّام طفولیت میں انھیں تعلیم دلاتی تھی۔ وہ تمام متاع کا وارث اپنی بڑی بیٹی کو قرار دیتی تھی۔ باپ اپنے بچّوں کو ادب و تہذیب سکھاتا تھا۔ اور اپنے بڑے بیٹے کو اپنی صنعت کی تعلیم دیتا تھا۔ اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ ایک خاندان کے افراد کتنی مضبوطی کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہو جاتے ہونگے۔ یہ وابستگی صرف رشتۂ محبت ہی کے ذریعہ نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ اُن کے فرائض اور ذمہ داریاں بھی ایسی تھیں جن سے ارتباط کا پیدا ہونا لازمی تھا۔

قدمائے مصر اپنی صبح کی قیمتی ساعات کو کھُلے میدانوں، صاف سُتھری ہوا، سرسبز و شاداب باغات اور فرحت افزا مقامات میں صرف کرتے تھے۔

عام طور پر مکانات میں بہترین قسم کی قلعی کرنے اور اعلیٰ قسم کے روغنوں سے اُن پر خوشنما بیل بوٹے بنانے کا رواج تھا۔

ایک شریف آدمی کا مکان مندرجۂ ذیل مکانیت پر مشتمل ہوتا تھا۔

اہلِ خاندان کے رہنے کے مکان، چوپایوں اور جانوروں کے مکان، غلہ رکھنے کے مکان، مہمان خانہ، ملاقات کا کمرہ، حیوانات کی تربیت گاہ، خُدّام اور ملازمین کے رہنے کے مکانات، مختصر یہ کہ اس کی ذات کے ساتھ ایک اچھا خاصا قریہ آباد ہوتا تھا۔ چنانچہ آمتن کا قصر، جو جنوبی مصر کا ایک امیر تھا" مربع شکل کا ہے۔ اور اس کے ایک ضلع کی لمبائی تین سَو قدم ہے۔ زمانۂ قدیم میں بعض مکان لکڑی کے بھی ہوتے تھے۔

مکانوں میں بہترین قسم کا قیمتی اثاثہ جمع کیا جاتا تھا۔ چنانچہ سونے کے کمرہ میں خوبصورت تخت، آرام دہ اور خوشنما بستر، قیمتی قالین جو زمین پر بچھائے جاتے تھے یا ان سے دیواروں کو مزیّن کیا جاتا تھا۔ انواع و اقسام کی عمدہ عمدہ کُرسیاں، اطلس و دیبا کے نرم نرم گاؤ تکئے، دروازوں پر حریر وغیرہ کے پردے، سونے چاندی کے ظروف، ہاتھی دانت کے صندوق قد آدم آئینے جن کے چوکھٹے سونے یا چاندی کے ہوتے تھے، رنگارنگ عطروں کے قرابے، اور اسی طرح کی دوسری بیشمار چیزوں کا ہونا ضروری تھا۔

یہ حقیقت ہے کہ آج مصری خاتون جس تہذیب و ترقی کی مالک ہے اب سے ہزاروں سال پہلے کی مصری عورت بھی اس سے کسی طرح کم نہ تھی۔ اور مصر کا موجودہ تمدن جسے مغربی تمدن سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ زمانۂ قدیم کے تمدن سے بہت زیادہ ملتا جُلتا ہے۔ بلکہ زندگی بہت سے شعبوں میں تو قدیم تمدّن جدید تمدن سے کہیں آگے تھا +

بچّوں کی تعلیم

زمانۂ قدیم میں مصریوں کا یہ قاعدہ تھا کہ جب کوئی بچّہ اپنی عمر کے چوتھے سال میں قدم رکھتا تھا اس کے والدین اسے کسی مدرسہ میں داخل کر دیتے تھے۔ بچّہ کو صرف اتنا لباس پہنایا جاتا تھا کہ جس سے اس کا جسم چھپ سکے۔ اس کے کالے کالے بال داھنے کان پر گندھے ہوئے لٹکتے رہتے تھے۔

بچّہ کو سب سے پہلے مدرسہ میں لکھنا اور پڑھنا سکھایا جاتا تھا۔ اس امر کا بہت خیال رکھا جاتا تھا کہ اس کی عقل پر کسی طرح کا بار نہ پڑے کیونکہ مصر کا قدیم رسم الخط بہت مشکل تھا۔ طالب علم کے لئے ضروری تھا کہ وہ مصر کے دونوں رسم الخطوں کو اچھی طرح سمجھ لے اور ان کے فرقوں کو یاد رکھے۔ یہ سُن کر تعجب ہوگا کہ قدمائے مصر کے جو مخطوطات ہمارے ہاتھ آئے ہیں ان میں سے ہر ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ اور جو شخص ان مخطوطات کو زیادہ کاوش کے ساتھ دیکھے گا اسے معلوم ہوگا کہ اساتذہ جب شاگردوں کی کاپیوں پر اصلاح کرتے تھے تو پہلے خود کسی دوسری چیز پر لکھ کر دیکھ لیتے تھے اس کے بعد شاگرد کی کاپی یا تختی پر بین السطور میں لکھتے تھے۔ کافی تحقیق کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ ان کی اکثر تجویزیں حکمائے قدیم کے فلسفہ اور ماضی بعید کے قصہ کہانیوں کے متعلق ہوا کرتی تھیں۔

بچّے مدرسہ کے نام سے کانپتے تھے اور اوقات مدرسہ کو نہایت بیم و ہراس کی حالت میں گذارتے تھے۔ کیونکہ وہاں وہ اکثر پٹ جایا کرتے تھے۔ چنانچہ اُس زمانہ سے یہ مثل مشہور ہے کہ "طالب علم کے کان اس کی پشت پر ہوتے ہیں اور وہ بغیر پٹے کچھ سُنتا ہی نہیں"۔

ایک نوجوان نے اپنے اُستاد کو اس کے احسانات کے شکریہ میں لکھا ہے۔

کہ جب میں بچہ تھا۔ آپ نے اپنی بیش بہا معلومات سے مجھے مالا مال کر دیا۔ بالخصوص آپ کی ضربات نے مجھے معارف علیہ سے سیراب ہونے میں بڑی مدد دی۔

جب کسی اُستاد کو یہ معلوم ہوجاتا تھا کہ فلاں شاگرد اس قدر سرکش ہے کہ اس پر کوڑوں کی مار کا کوئی اثر ہی نہیں ہوتا تو اس کے ساتھ نہایت سخت اور لرزہ براندام کر دینے والا معاملہ کیا جاتا تھا۔

اس تشدّد کا فائدہ یہ سمجھا جاتا تھا کہ دوسرے لاپروا اور سرکش طلبہ اس سے عبرت اندوز ہونگے۔

دوپہر کے وقت مدارس میں چھٹی ہوجایا کرتی تھی۔ اُس وقت طلبہ پر بہجت و سرور کی ایک عجیب کیفیت مستولی ہوتی تھی۔ اور یہ اس بات کی دلیل تھی کہ اب انھیں مدرسہ کا کوئی کام گھر پر کرنا باقی نہیں ہے۔ اس پر ہم قیاس کر سکتے ہیں کہ سخت سزاؤں کی وجہ سے اُن مدارس کی بدحالی کا جو قیاس ہم نے کیا تھا وہ صحیح نہ تھا۔

جب طالب علم کا خط پختہ اور عمدہ ہوجاتا تھا تو اُستاد اُسے عصر حاضر کی بہترین کتابوں کے مختلف قطعات لکھنے کے لئے دیتا تھا۔ اس طریقہ کو اختیار کرنے سے اُستاد کی دو غرض ہوتی تھیں۔ اول یہ کہ طالب علم کا خط خوبصورتی اور حُسن کے انتہائی مراتب پر پہنچ جائے۔ دوسرے یہ کہ وہ قدماء کے بہتر اسلوب تحریر سے واقف ہوکر اپنے طرز نگارش کو بہتر بنا سکے۔ دلکش الفاظ چُست ترکیبوں کے استعمال پر قادر ہوسکے۔ یہی وجہ تھی کہ اُستاد کبھی تو شاگرد سے کسی دینی کتاب کی عبارت نقل کرواتا تھا اور کبھی اُستاد قصّے لکھنے کے لئے دیتا تھا۔ کیونکہ زمانۂ قدیم میں مصری افسانوں اور قصوں سے بے انتہا شغف رکھتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وضعِ قصص کی اولیت کا فخر مصریوں کو حاصل ہے۔

تجربہ سے یہی ثابت ہوا کہ ان قطعات کے نقل کرنے سے طلبہ کا خط بھی اچھا ہوجاتا تھا اور ان کی عقل و خصائل حمیدہ کبھی منجلی ہوجاتے تھے اور ان کی معلومات میں نہایت گراں قدر اضافہ ہوجاتا تھا۔

بسا اوقات اُستاد اپنے شاگردوں کو ایسی نصیحتیں سنایا کرتا تھا جو کسی مدبر بادشاہ نے اپنے ولی عہد کو کی ہوں۔ یا اُس کی کتاب سے اس قسم کی باتیں پڑھ کر سُناتا تھا۔

کبھی اُستاد شاگرد سے کہتا تھا کہ یہ فرض کرکے کہ تمہارا اُستاد کسی دور دراز مقام پر مقیم ہے اسے ایک خط لکھو۔ اس قسم کے خطوط میں طلبہ نہایت وسیع اور قوی آراء و امثال کا اظہار کیا کرتے تھے۔

جب طالب علم کا خط درست ہوجاتا تھا تو اسے حساب بھی سکھاتے تھے لیکن اس وقت تک حساب کے بہت ہی کم قاعدے لوگوں کو معلوم تھے۔ صرف جمع، تفریق اور ضرب کی تعلیم نہایت اختصار کے ساتھ دیجاتی تھی۔ تقسیم کا طریقہ نہیں پڑھایا جاتا تھا کیونکہ اساتذہ اس سے خود بھی نابلد

تھوڑی سی مساحت کی تعلیم بھی دیجاتی تھی۔ ابتدائی تعلیم مدارس کی یہاں پہونچکر ختم ہوجاتی تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ بچوں کی تعلیم کی نوعیت ان اعمال پر موقوف ہونی چاہیئے جن سے اسے مستقبل میں سابقہ پڑنے والا ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص کاتب عمومی ہونے کا ارادہ رکھتا تھا تو اُسے لکھنا، پڑھنا اور حساب کتاب جاننا ہی کافی تھا اور اس سے زیادہ معلومات کی اسے ضرورت نہ تھی۔ لیکن جو شخص یہ چاہتا تھا کہ اسے کوئی فوجی عہدہ ملجائے اُس کے لئے ضروری تھا کہ کسی مدرسۂ حربیہ میں داخل ہوکر خاص طور پر اس فن کی تعلیم حاصل کرے۔ اسی طرح اگر کسی شخص کی خواہش ہوتی تھی کہ وہ مذہبی ذمہ داریوں کا بار اُٹھائے تو اس کے لئے لازم تھا کہ کسی دینی درس گاہ میں داخل ہوکر علوم دینیہ کی تحصیل کرے۔

قدمائے مصر صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتے تھے کہ بچے ابتدائی یا اعلیٰ تعلیم سے فارغ ہوجائیں۔ بلکہ اس کے علاوہ بھی بہت سی ایسی چیزیں تھیں جن کو بچوں کے ذہن میں راسخ کرنے کے لئے وہ انتہائی کوشش کرتے تھے۔ مثلاً بڑوں کا احترام کرنا، آداب مجلس کا سیکھنا، والدین کے حقوق کو پہچاننا وغیرہ +

عبدالوحید صدیقی

خمیدہ درخت

دو گھنٹے کے سفر کے بعد سرو قد درختوں اور گھنی جھاڑیوں نے میری توجہ کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ اور میرے دل میں درختوں کے سائے میں آرام لینے کی خواہش پیدا ہوئی۔ میں ایک چھوٹی سی پہاڑی کے دامن میں تھا۔ نصف گھنٹہ کی چڑھائی کے بعد مجھے ایک میدان نظر آیا۔ میں آگے بڑھا تاکہ کسی نہایت ہی دلفریب مقام پر بیٹھکر اپنے دل کی کلفتوں کو دور کرسکوں۔ مجھے ایک خمیدہ درخت نظر آیا۔ پہاڑی کے دامن میں ایک دریا مرغزاروں میں بہتا ہوا دور نیلے افق میں گم ہوگیا تھا۔ وہاں تمدن کا نام ونشان نہ تھا۔ کہیں کہیں جگہ گاؤں میں پرندوں کے گھونسلے نظر آتے تھے۔ پتوں کی سرسراہٹ۔ مکھی کی بھنبھناہٹ اور مرغزاروں میں مویشیوں کی آواز اس جگہ کے سکوت کو توڑ رہی تھی۔

میں اس خمیدہ درخت کے تنے پر بیٹھ گیا۔ اور گردو نواح پر ایک نظر ڈالی تو مجھے معاً خیال ہوا کہ یہ جگہ ضرور قدیم دیوتاؤں کا مسکن ہوگی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ میری نگاہ ایک سفید مربع کاغذ پر جا پڑی جو درخت کے ساتھ چسپاں تھا۔ میں نے جو غور سے دیکھا تو اس پر سیاہی سے یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے :-

"کھانا کھانے کے لئے گھر جا رہا ہوں۔ بیس منٹ کے اندر واپس آجاؤں گا۔"

اگر کوئی شے میرے لئے باعث رنج ہوسکتی ہے تو وہ اُن لوگوں کے افعال ہیں جو قدرتی اشیاء کو بدنما کرتے ہیں۔ لیکن جب میں نے دفتری ضابطے کی ایک یادگار اِس دلفریب جگہ پر درخت کے ساتھ چسپاں دیکھی تو میرے دل میں مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ مجھے محسوس ہوا کہ یہ کسی چالاک اور ہوشیار ظریف کا فعل ہے۔

اِس فقرہ سے ظاہر ہوتا تھا کہ کوئی شخص اس جگہ اپنا دنیاوی کاروبار سرانجام دیتا ہے اور اس کا وقت نہایت قیمتی ہے۔ چائے کی ایک پیالی پینے کے بعد اپنے کام میں مشغول ہوجاتا ہوگا۔ مجھے اسقدر ہنسی آئی کہ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں چاہتا تھا کہ کوئی ایسا رفیق ملجائے جو میرے ساتھ بیٹھے اور خوب زور سے ہنسے۔ میں نے دوبارہ اِس کاغذ کو دیکھا وہ الفاظ بالکل صاف تھے۔

اب میں سوچنے لگا کیا وہ ستم ظریف اب لوٹے گا؟ کیا واقعی یہ کاغذ کچھ حقیقت رکھتا ہے؟۔ آخر میں نے ارادہ کیا کہ اُس مقررہ وقت تک یہاں انتظار کروں اور میں خمیدہ درخت کے تنے پر لیٹ گیا اور سگرٹ جلاکر اس منظر کی خاموشی سے لطف اندوز ہونے لگا۔ ابھی بمشکل دس منٹ گزرے ہونگے کہ کسی آدمی کے پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ اُس کا قد درمیانہ تھا۔ چہرہ پژمردہ۔ اور آنکھوں کے گرد حلقے پڑے ہوئے تھے۔ اُس کا کوٹ لمبا اور ٹوپی گول تھی۔ وہ شاخوں کو ہٹاتا ہوا جلدی جلدی درختوں کے درمیان قدم اٹھاتا تھا۔ اُس نے اُسی جگہ پہنچ کر ٹوپی اتاری اور ایک اضطراب کے ساتھ کسی کیل کا متلاشی ہوا۔

اس نے مسکراتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے۔ کہ میں نے آپ کو بہت دیر تک زحمت انتظار نہیں دی۔"

میں نے کہا۔ "ہرگز نہیں"

اس نے پوچھا۔ "کیا آپ کو مسٹر رشید نے یہاں بھیجا ہے؟"

میں نے نیچے اترتے ہوئے جواب دیا "نہیں" میں یونہی اِدھر نکل آیا تھا"

اُس کے چہرے پر ایک ناامیدی کا سا رنگ جھلکنے لگا۔

اُس نے کہا "مسٹر رشید اور اُس کے احباب سے میرے تعلقات ہیں کیا آپ ان لوگوں کو جانتے ہیں جو ممتاز منزل میں رہتے ہیں"

میں جانتا تھا کہ ممتاز منزل کوئی دو میل کے فاصلے پر ایک گاؤں میں عظیم الشان کوٹھی ہے۔ اُس گاؤں میں تقریباً پچاس سست آدمی رہتے تھے۔

میں نے جواب دیا۔ "جی"

وہ چند لمحوں تک میری طرف دیکھتا رہا پھر اُن گھنی جھاڑیوں کے قریب جاکر وہ نیچے جھکا اور غور سے دیکھکر ایک پتھر اٹھایا جس کے نیچے سے اُس نے کاغذوں کا ایک پلندا نکالا۔ پھر بولا۔ "معلوم نہیں آپ میری مدد کرسکتے ہیں یا نہیں .... ازراہ کرم ایک سگرٹ عنایت کیجئے۔"

میں نے اپنا سگرٹ کیس نکالا اور اُسے ایک سگرٹ دیا۔

اس نے کہا "شکریہ۔ گھر میں میری سگرٹ نوشی پسندیدگی کی نظروں سے دیکھی نہیں جاتی۔ یہ کہکر اُس نے شمال کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے

اس طرف نگاہ کی تو درختوں میں سے سرخ اینٹوں کی ایک عالیشان عمارت نظر آئی۔

میں نے چند لمحوں کے بعد کہا۔ "یہ نہایت خوشگوار جگہ ہے۔"

ان الفاظ نے میرے ساتھی پر حیرت انگیز اثر کیا۔ وہ ایک شکستہ ٹہنی پر بیٹھ گیا اور غیظ و غضب کی حالت میں ہزاروں صلواتیں سنا ڈالیں

"میں اس مقام سے نفرت کرتا ہوں۔ دن رات یکساں ہیں۔ درخت اور مرغزار ایک ہی حالت میں رہتے ہیں۔ کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوتی۔ میرے لئے اس میں کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی۔ میں ہمہ تن گوش رہا۔ آخر کچھ دیر کے بعد وہ اٹھا اور سگرٹ کے دو تین کش لگا کر ادھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ کبھی کبھی وہ کھڑا ہو جاتا اور ان جھاڑیوں سے اشارۃً گفتگو کرنے لگتا۔

آخر اس نے میری طرف مشکوک نگاہوں سے دیکھا اور اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھا۔ اس نے غم انگیز آواز سے کہا: "میں نے تیس سال ایک غلام کی طرح کام کیا ہے۔ اور لوگ بھی اسی طرح کام کرتے ہیں مگر بالکل تندرست ہیں۔ میں بدنصیب ہوں۔ میں اب بھی کام کر سکتا ہوں۔ اور اس غرض سے یہاں آتا ہوں۔ اس کام میں مسٹر رشید میری مدد کرتے ہیں۔ وہ گاہکوں کو میرے پاس بھیجتے ہیں۔ اور کیا آپ جانتے ہیں" اس نے رازداری کے لہجہ میں آہستہ سے کہا۔ "میں نے ایک چٹھی رسان مقرر کر رکھا ہے جو میری چٹھیاں یہاں پہنچا جاتا ہے۔ دیکھئے یہ میری ڈاک کا صندوق ہے۔" وہ نیچے جھکا اور ایک بڑا پتھر اٹھایا۔ آپ کوئی حصہ خریدنا چاہیں تو میں کوشش کر سکتا ہوں۔"

وہ میری طرف نہایت متردد نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ اور جب میں نے اس سنہری موقعہ سے فائدہ اٹھانے سے انکار کیا۔ اس نے ایک آہ بھری اور اُس پتھر کے نیچے ان کاغذوں کو دوبارہ دبا دیا۔

اُس نے پوچھا۔ "کیا آپ نے کسی اہم کام میں حصہ لیا ہے؟"

میں نے جواب دیا۔ "ایسے کاموں میں کوئی حصہ نہیں لیا۔"

اُس نے نہایت درشتی سے کہا: "کیا آپ جانتے ہیں کہ میرا "اہم کام" سے کیا مطلب ہے۔" "لاکھوں انسان کام کرتے ہیں۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ میں اس مقام پر کیوں آتا ہوں۔ یہ میرے قدیم دفتر کی یاد تازہ کرتا ہے۔ دیکھو اس کا سائز اتنا تھا۔ یہاں پر میری میز تھی اور میرے سیکرٹری کی میز یہاں تھی۔ یہاں آتشدان تھا اور کھڑکی کے نزدیک ایک پریس تھا۔ اور یہاں الماریوں میں کاغذات تھے۔ ربڑ کی منڈی میری تبعۂ قدرت میں تھی۔ اور پھر آہ! سعد!!

اس نے کوٹھی کی طرف اشارہ کیا۔ "دو سال سے میں یہاں مقید ہوں۔"

میں نے کہا "قدرت پر بھروسہ رکھو۔"

وہ چلا کر بولا۔ "قدرت"۔ "قدرت"۔ "قدرت"۔ "قدرت کے متعلق کچھ نہ کہو۔ دو آدمی تالاب میں گرتے ہیں۔ قدرت کو اس بات کی کیا پروا ہے کہ ایک اپنے دشمن کو غرقاب کرنے میں کوشاں ہے اور دوسرا ایک کتے کی جان بچانے میں۔ دیکھئے دو نو موت کے پنجہ میں ہیں قدرت آپ کو غیر معلوم راستوں اور دلدلوں میں پھنسا کر تباہ کرتی ہے۔ اِس کے علاوہ انسان خود قدرت ہے۔

دور کھیتوں میں دھواں آسمان کی طرف آہستہ آہستہ جا رہا تھا

"میرا باپ خرادئی[1] تھا۔ وہ مجھے بڑھئی کا کام سکھانے کا متمنی تھا لیکن میری امیدیں زیادہ دلفریب تھیں۔ میں نے ایک سٹوک فروش کے ہاں ملازمت کر لی۔ تین سال تک میں نے اس کے تہ خانہ میں بجلی کی روشنی سے کام کیا۔ پھر میں اس دوکان کا منتظم مقرر ہو گیا۔ پانچ سال تک منتظم کا کام کرتا رہا۔ تقریباً چار ہزار روپیہ میرے نام بنک میں جمع تھا۔ اس کے بعد کئی سال تک بشیر کی معیت میں کمیشن ایجنٹ رہا۔ لیکن ربڑ کی خرید و فروخت نے میری زندگی کو بالکل بدل دیا۔ میرا تعارف ارشد سے ہو گیا جو ربڑ کی تجارت کو خوب سمجھتا تھا۔ اُس کے ذریعے ربڑ کا تمام کام میرے قبضے میں آ گیا۔ میں نے صرف ایک ہی دن میں ٹیلیفون پر گفتگو کر کے چار ہزار روپیہ کما لئے۔"

سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے اس نے کہا۔

"ان دنوں ارشد کے دوست و احباب کے ذریعے ہم نے خام اشیاء کی خرید و فروخت سے واقفیت حاصل کر لی۔ پھر وہ جزائر ملایا چلا گیا اور ہم دونوں دو سال تک نہایت محنت سے کام کرتے رہے۔ کہ یکلخت مصیبت کا پہاڑ میری گردن پر ٹوٹ پڑا۔ اس کے مرنے کا تار موصول ہوا۔ اس کے بعد میں نے نہایت محنت اور جانفشانی سے کام کیا لیکن بے سود۔ سکاٹ لینڈ کی ایک دکان کے مالک میری تباہی کے متمنی تھے اور میں ان کے ہاتھوں تباہ و برباد ہو گیا۔

اُس نے اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیرا اور کچھ لمحوں کیلئے خاموش بیٹھا رہا۔ وہ ذہن میں گزشتہ واقعات کو دہرا رہا تھا۔

اُس نے اچانک سرخ اینٹوں والی عمارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "میرا بھائی بہت نیک تھا۔ وہ تادم زیست میرے ساتھ مہربانی اور شفقت سے پیش آتا رہا۔

پھر اُس نے نفرت سے کہا۔ "وہ بڑھئی تھا۔ اس کی آمدنی لاسختاً

[1] بڑھئی

سو ددسو ماہوار ہوگی ۔ وہ شادی شدہ تھا اور اُس کے پانچ بچے تھے ۔

کچھ عرصہ خاموش رہنے کے بعد وہ بولا۔ تم بھی عام آدمیوں کی طرح ہو۔ تم جیسے سیکڑوں آدمیوں سے سابقہ پڑا تھا ۔ میں تمہیں بتاتا ہوں میں لاکھوں روپے کا مالک تھا۔ ہزاروں آدمی ملازم تھے ۔ تم لوگ یہاں آئے ہو اور "قدرت" "قدرت" کہنے لگے ہو۔ ان بدنصیب درختوں کی طرف دیکھو۔ وہ گرمی میں سرسبز، موسم خزاں میں زرد اور موسم سرما میں بے برگ وبار ہوتے ہیں۔ سالہا سال سے یہی کیفیت ہے میں اِس منظر سے اُکتا گیا ہوں ۔ انسان کی طرف دیکھو۔ اُس کی زندگی اور تغیر و تبدل کا ملاحظہ کرو۔ وہ کیا کر سکتا ہے ۔ اُس کے لباس ۔ سامان ۔ مکان شہر اور اس کی طاقت کا اندازہ لگاؤ ۔

میں نے پوچھا۔ " آپ کا مطلب تجارتی کاروبار کو فروغ دینے کی طاقت سے ہے "

" ہاں بالکل درست "

" تجارت کو فروغ دینے کی طاقت .... انسان کو امیر یا غریب بنانے کی طاقت "

اُس وقت ہمیں معلوم ہوا کہ کوئی اور آدمی بھی اِس جگہ موجود ہے وہ خوش پوش اور خوش وضع تھا ۔ وہ نیلے سرخ کا کوٹ اور ترکی ٹوپی پہنے ہوئے تھا ۔ اس نے میرے ساتھی سے کہا ۔

" السلام علیکم ۔ مسٹر خالد آپ یہاں موجود ہیں ۔ اب تمہارے قیلولہ[1] کا وقت ہے ۔ پھر اس نے میری طرف رُخ کر کے سلام کہا ۔ اُس کی شیریں آواز نے میرے ساتھی پر تعجب انگیز اثر ڈالا ۔ اس کے چہرے کی شگفتگی زائل ہوگئی ۔ بڑھاپے اور پژمردگی کے آثار نمایاں ہو گئے ۔ اُس کا سر جھک گیا اور بمشکل چند لمحے کھڑا رہا ۔ وہ نووارد کے ساتھ ہو لیا ۔

راہ میں مجھے ایک چٹھی رسان ملا ۔ میں نے مزید حالات کی تحقیق کے لئے اُسکو روک لیا ۔ اور یونہی ایک جگہ کا پتہ دریافت کیا ۔ پھر میں نے پوچھا " تم کہاں جا رہے ہو "

" تین چار میل کے فاصلے پر ایک مقام ہے وہاں جا رہا ہوں "

" جہاں تک تم جانا چاہتے ہو وہاں تک چڑھائی ہے نا ؟ "

اُس نے پوچھا ۔ " میں کہاں جانا چاہتا ہوں "

" اُس مکان تک جس کے تین سرخ مینار ہیں "

" آپ کا اشارہ مسٹر خالد کی طرف ہے جو "گلستان" کا مالک ہے "

اس نے پوچھا ۔ " کیا وہ گلستان نامی کوٹھی کا مالک ہے "

اگر اسکو اپنے روپے کے ضائع ہو جانے کا خوف نہ ہوتا تو وہ ایسی نئی کوٹھیوں کا مالک ہو جاتا ۔

میں نے آہستہ سے کہا ۔ " دلچسپ بات ہے ۔ ایک عظیم الشان کوٹھی کا مالک اور پھر اس اجاڑ بیابان پہاڑی کے قریب اپنی چھٹیاں وصول کرتا ہے "

اس نے جواب دیا ۔ " جن لوگوں کے پاس روپیہ ہے وہ اپنی ہر خواہش کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکتے ہیں "

میں نے اس معاملہ میں زیادہ معلومات حاصل کرنے کی غرض سے کہا ۔ " معلوم ہوتا ہے کہ دولت اس کے لئے باعثِ مسرت نہیں "

چٹھی رسان نے دائیں پائدان کو گھمایا گویا وہ چلنے کی تیاری کر رہا ہے ۔ پھر اس نے جیب سے سگرٹوں کی ڈبیہ نکالی اور ایک سگرٹ سلگایا ۔ پھر اس نے ہینڈل پر جھککر کہا ۔ " اگر ایک شخص دولت سے تہی دست ہے تو وہ اپنے دل کو صرف اس خیال سے خوش کر سکتا ہے ۔ کہ کم از کم کسی دوسرے انسان کے پاس تو دولت موجود ہے اور اگر کوئی شخص دولت سے مالامال ہے تو وہ دوسرے کو تہی دست دیکھکر خوش ہو سکتا ہے ۔" اُسنے زندگی کے راز کو ان الفاظ میں حل کر دیا ۔ " اگر انسان ان واقعات پر غور کرے تو سب کچھ حاصل ہو سکتا ہے "

(ترجمہ) علاؤالدین

[1] کھانے کے بعد دوپہر کو کچھ دیر کے لئے سو جانا ۔

زندگی کیا ہے سکوں ناآشنا رہنے کا نام
موت فقدانِ طلش کی سختیاں سہنے کا نام

رُوح کو بیدار کرنا ہے تو فریادی نہ بن
اصل نغمہ ہے ربابِ دل کے چپ رہنے کا نام

عشق کیا ہے رُوح کے بیدار ہونیکی نوید
شاعری لوگوں میں اُس کے برملا کہنے کا نام

[illegible]

جوگن اور پپیہا

"گیت"

سُن لے میرا گیت

پپیہے سُن لے میرا گیت

جوگن ہوں مَیں گانے والی پریم کا راگ سُنانے والی

پی پی کرنا پریم سے پیارے ہے یہ تیری ریت اُلفت کا ہے جام پپیہے سُن لے میرا گیت

پپیہے سُن لے میرا گیت

جوگن ہوں مَیں گانے والی پریم کا راگ سُنانے والی

میرے من کی بات

پپیہے میرے من کی بات

پی پی کا تجھ کو دُکھ بھاری پریم کی میرے لگی کٹاری

غم کی سر پہ چھائی گھنا سی بیرن کالی رات تیرے من کی بات پپیہے میرے من کی بات

پپیہے میرے من کی بات

پی پی کا تجھ کو دُکھ بھاری پریم کی میرے لگی کٹاری

مجھے وہی بیراگ

پپیہے مجھے وہی بیراگ

جس کے ہے تو پریم کا پیاسا اُسی کی ہے اِس دل میں لالسا

دونوں ہی کے لگی بدن میں ہائے برہ کی آگ تجھکو جو احساس پپیہے مجھے وہی بیراگ

پپیہے مجھے وہی بیراگ

جس کے ہے تو پریم کا پیاسا اُسی کی ہے اِس دل میں لالسا

اندرجیت شرما

اسپرانٹو

ایک بین الاقوامی زبان

ادبی دنیا کے کسی گزشتہ نمبر میں ہم "اسپرانٹو" کے متعلق ایک مضمون لکھ چکے ہیں۔ آج ہم چاہتے ہیں کہ اسی سلسلہ میں کچھ مزید معلومات ناظرین کے سامنے پیش کریں۔

عرصہ دراز سے دنیا کی حریف قوموں کو گلے ملانے کے لئے جہالت کی گھٹا ٹوپ تاریکی کو علم کی روشنی سے جگمگانے کے لئے، صنعت و حرفت کو بام ترقی پر پہنچانے کے لئے اور تجارت کو کامیاب بنانے کے لئے ایک بین الاقوامی زبان کی ضرورت شدت کے ساتھ محسوس کی جا رہی تھی۔

سب سے پہلے مشہور فاضل لیبنتز نے اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے یہ تجویز پیش کی کہ حروف ہجا کی جگہ ہندسوں کو استعمال کیا جائے اور کلمے بجائے حرفوں سے مرکب ہونے کے ہندسوں سے مرکب ہوا کریں۔ اس لئے کہ جس طرح حروف معانی پر دلالت کر سکتے ہیں اسی طرح ہندسے بھی معانی پر دلالت کر سکتے ہیں لیکن اس کی یہ تجویز عملی جامہ نہ پہن سکی اور ضرورت جوں کی توں باقی رہی۔

لیبنتز کے بعد ایک جرمنی عالم ہرمن ویلز اس میدان میں آیا۔ اس کی تجویز تھی کہ لاطینی زبان کا انتخاب کر کے اسے دنیا کی بین الاقوامی زبان بنا دیا جائے۔ لیکن اس سلسلہ میں اس کی اور اس کے ساتھیوں کی تمام کوششیں بیکار ثابت ہوئیں اور کامیابی کا جھنڈا اس کے ہاتھ بھی نہ آیا۔

ان کے بعد لیون بولاک نے "نیلی زبان" شیلیر نے "وولاپوک" اور مولیا رنے "نوترال" اور "بازومان" ایجاد کر کے دنیا کی اس اہم تمدنی عمرانی تجارتی اقتصادی علمی اور ادبی ضرورت کے حل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن کسی کی کوشش ٹھکانے نہ لگی۔ اور یہ زبانیں کسی نہ کسی خرابی کی وجہ سے غیر مقبول ہو کر رہ گئیں۔

حتیٰ کہ ۱۸۸۷ء میں پولینڈ کے ایک نوجوان فاضل ڈاکٹر لوئس زامنہوف نے اپنی ایک انقلابی کوشش اسپرانٹو کی صورت میں پیش کی۔ اسپرانٹو ان تمام خرابیوں سے مبرا تھی جو اس سے پہلے بعض دوسری زبانوں کو غیر مقبول بنا چکی تھیں اور ان تمام خوبیوں سے مرصع تھی جو ایک بین الاقوامی زبان کی کامیابی کے لئے ضروری ہیں۔ چنانچہ دنیائے علم و ادب میں اس کا پُرتپاک خیر مقدم کیا گیا اور قبولیت عامہ کا تاج اس کے سر پر رکھ دیا گیا۔

اسپرانٹو کی مقبولیت کی سب سے بڑی وجہ یہ ہوئی کہ اس کے معاونین نے کبھی یہ ارادہ نہیں کیا کہ اپنی زبان کی بیل منڈھے چڑھانے کے لئے دوسری زبانوں کی جڑیں کاٹ دیں۔ بلکہ اسپرانٹو کی ترویج سے ان کا مقصد محض یہ تھا کہ دنیا کا ہر شخص اپنی ملکی زبان کے ساتھ ساتھ اسپرانٹو جیسی سہل و مختصر زبان سے بھی واقف ہو جائے تاکہ وہ ضرورت کے وقت ان پریشانیوں سے محفوظ رہے۔ جو بعض اوقات اجنبی زبانوں کے نہ جاننے کے سبب پیدا ہو جاتی ہیں۔

ویلز کی طرح زامنہوف کا بھی پہلے پہل یہی خیال تھا کہ لاطینی زبان کا انتخاب کر کے اسے دنیا کی بین الاقوامی زبان بنا دے۔ لیکن بہت جلد اسے اپنی رائے کی غلطی معلوم ہو گئی اور اس نے اپنی کوششوں کی باگ دوسری طرف پھیر دی۔ اس نے دنیا کی مختلف زبانیں سیکھنی شروع کیں اور اپنی قابل رشک ذہانت اور حافظہ کی مدد سے تھوڑے ہی عرصہ میں ستائیس زبانوں کا ماہر ہو گیا۔ وہ ان ستائیس اجنبی زبانوں کو اپنی مادری زبان کی طرح بولتا تھا۔

اس نے عرصہ دراز کی مسلسل محنت کے بعد ان تمام زبانوں میں سے وہ الفاظ انتخاب کر لیے جن کا تلفظ سہل اور دائرہ استعمال وسیع تھا اور وہ قواعد چھانٹ لیے جو بے انتہا جامع اور حد درجہ آسان تھے۔ اور اس طرح دنیا کی تمام زبانوں کا بہترین سرمایہ اسپرانٹو کی گود میں لا کر ڈال دیا۔ یہ اس کی مختلف زبانوں کی اس حیرت انگیز واقفیت ہی کا صدقہ تھا کہ وہ اسپرانٹو جیسی آسان اور جامع زبان کی ایجاد میں کامیاب ہو گیا۔

زبان اسپرانٹو کی گرامر محض سولہ آسان قاعدوں پر مشتمل ہے اور اس زبان کی ڈکشنری میں محض اتنے الفاظ ہیں کہ ایک شخص انہیں

لہ انٹرنیشنل

محض چند گھنٹوں میں یاد کر سکتا ہے۔

اسپرانٹو کی سہل الحصولی

اسپرانٹو کی پہلی خاص خوبی اس کی سہل الحصولی ہے۔ ایک جاپانی عالم جو عرصہ دراز سے اسپرانٹو کی تعلیم دیرہا ہے اس کی سہل الحصولی پر بحث کرتا ہوا لکھتا ہے "میرا تجربہ ہے کہ اگر ایک معمولی ذہن و حافظہ والا طالب علم صرف ایک گھنٹہ روزانہ اس زبان پر صرف کیا کرے تو وہ ایک مہینہ میں بخوبی اس زبان کا ماہر ہو سکتا ہے۔"

اگر کوئی شخص کسی ایسے شخص سے خط و کتابت کرنا چاہے جس کی زبان سے وہ واقف نہیں ہے تو اب اسے اس بات کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ مکتوب الیہ کی زبان کو سیکھنے کی الجھنوں میں پڑے یا اس زبان کے کسی جاننے والے کی تلاش میں ٹھوکریں کھاتا پھرے۔ بلکہ اس کے لئے بہترین طریقہ یہ ہے کہ وہ اسپرانٹو کی کتاب کا صرف دو گھنٹے مطالعہ کرے۔ اس مختصر مطالعہ کے بعد وہ اس زبان میں ایک غلطیوں سے پاک و صاف خط لکھنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ اگر مکتوب الیہ اسپرانٹو سے واقف ہے تب تو کوئی دشواری ہی نہیں ورنہ وہ بھی خط پڑھنے کے لئے یہی تدبیر کر سکتا ہے۔

اسپرانٹو کے بے انتہا آسان اور بے انتہا مفید ہونے پہ مندرجہ ذیل واقعہ سے کچھ روشنی پڑے گی۔

۱۹۰۵ء کا واقعہ ہے کہ فرانس کے کسی شہر میں ایک نووارد روسی استروفسکی نامی کو چوری کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ ملزم روسی کے سوا کوئی اور زبان نہ جانتا تھا اور اس شہر کے حکام روسی زبان نہ جانتے تھے۔ اب شہر میں کسی روسی زبان جاننے والے کی تلاش شروع ہوئی تاکہ مقدمہ میں وہ ملزم کی ترجمانی کر سکے۔ لیکن یہ کوشش بیکار تھی اس لئے کہ شہر بھر میں کوئی شخص روسی زبان جاننے والا نہ تھا۔ مجبوراً یہ تجویز ہوئی کہ کسی مترجم کو پیرس سے بلایا جائے۔ اور ملزم کو اس دوران میں جیل خانے میں رکھا جائے جس وقت غریب روسی کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈالکر اسے جیلخانے بھیجا گیا تو اس کے رخساروں پہ آنسو بہ رہے تھے اور اس کے غم آلود چہرے سے اس کی بیگناہی ظاہر ہو رہی تھی۔ وہ اشاروں سے سب کچھ کہنا چاہتا تھا مگر کوئی کچھ نہ سمجھ سکتا تھا۔

ایک خدا ترس وکیل جو اسپرانٹو کے معاونین میں سے تھا اس کی اس بیچارگی اور بیگناہی سے بہت متاثر ہوا۔ اور اس نے اس بیگناہ کو اس مصیبت سے چھڑانے کی ایک کامیاب تدبیر کی۔ یہ وکیل سیدھا اپنے گھر گیا اور اپنی لائبریری میں سے ایک چھوٹی سی کتاب نکال لایا۔ جس میں روسی زبان میں اسپرانٹو کے قواعد لکھے تھے اور عدالت سے حکم حاصل کر کے یہ کتاب ملزم کو پکڑا دی۔ دو دن کے بعد وکیل جیل میں ملزم سے ملنے آیا۔ ملزم اس دوران میں اسپرانٹو پر عبور حاصل کر چکا تھا۔ چنانچہ اس نے نہایت صفائی کے ساتھ وکیل سے اپنے مقدمہ کے متعلق بات چیت کی اور دلائل سے یہ بات ثابت کر دی کہ جو الزام اس پر لگایا گیا ہے وہ بالکل غلط ہے۔ وکیل نے اس کے بیان کئے ہوئے واقعات کی روشنی میں عدالت میں اس کی طرف سے پیروی کی اور غریب روسی کو بری کر دیا گیا۔ ایک اور واقعہ سنیے۔

اسوج کے رہنے والے دو دوستوں نے روس کے راستہ سے رومانیا کے سفر کا ارادہ کیا۔ لیکن یہ دونوں اسوجی زبان کے سوا کوئی اور زبان نہ جانتے تھے۔ اس لئے ان کے واسطے بڑی مشکل کا سامنا تھا۔ اس مشکل کو حل کرنے کی انہوں نے یہ تدبیر نکالی کہ اسپرانٹو سیکھنی شروع کی۔ چند روز میں جب یہ اسپرانٹو سے اچھی طرح واقف ہو گئے تو انہوں نے ان رئیسوں کے پتے معلوم کئے جو اسپرانٹو جانتے تھے اور روس کا سفر شروع کر دیا۔ روس کے جس شہر میں یہ داخل ہوتے تھے وہاں کے اسپرانٹو جاننے والے ان کا پرتپاک خیر مقدم کرتے تھے۔ اور ان کے ذریعہ سے ان کی تمام ضروریات پوری ہو جاتی تھیں۔

اس طرح کامیابی کے ساتھ روس کا سفر ختم کر کے جب یہ دونوں دوست رومانیا کے سرحدی شہر میں داخل ہوئے تو وہاں کے دارالسلطنت کے ایک مشہور اخبار نے اپنے ایک نمائندہ کو ان سے سب سے پہلے انٹرویو کرنے کیلئے سرحد کی طرف چلتا کیا۔ چلنے کو تو یہ صاحب چل دیئے لیکن انہیں راستہ میں خیال آیا کہ میں اسوجی زبان سے ناواقف ہوں اور اسوجی میری زبان سے۔ گفتگو ہوگی تو کیونکر ہوگی؟ زبان یار من ترکی و من ترکی نمیدانم۔ لیکن بہت جلد انہیں اپنی مشکل کا حل سمجھ میں آگیا۔ انہیں اخبارات کے ذریعہ سے معلوم ہو چکا تھا کہ دونوں اسوجی اسپرانٹو جانتے ہیں۔ لہذا ان حضرات نے اسپرانٹو کی کتاب حاصل کر کے اس کا مطالعہ شروع کیا اور منزل مقصود تک پہنچتے پہنچتے اس زبان میں ماہر ہو گئے اور جس تدبیر سے دونوں اسوجیوں نے اپنی مشکل آسان کی تھی۔ اسی تدبیر سے انہوں نے بھی اپنی مشکل آسان کر لی اور اسپرانٹو کی جان کو ہزاروں دعائیں دیں۔

اسپرانٹو کی جامعیت

اسپرانٹو کی دوسری خاص خوبی اس کی جامعیت

ہے۔ دقیق سے دقیق علمی مفہوم اور لطیف ادبی تخیل جسے دنیا کی اکثر زبانیں باوجود اپنے سرمایہ کی کثرت کے ادا کرنے سے قاصر ہیں اسپرانٹو میں نہایت آسانی کے ساتھ بہترین طریقہ پر ادا کیا جا سکتا ہے جن لوگوں کو کسی علمی یا ادبی تصنیف کے ترجمہ کرنے کا اتفاق ہوا ہے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ بعض اوقات مترجمین کو اپنی زبان میں وہ مخصوص الفاظ نہیں ملتے جو بعض مخصوص معانی کو ادا کرنے کے لئے اصل کتاب میں استعمال کئے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بالعموم ترجمہ میں کتاب کے اصلی خدوخال ظاہر نہیں ہوتے اور اُس کی حقیقی روح فنا ہو کر رہجاتی ہے۔ لیکن نہایت فخر کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اسپرانٹو کا دامن اس عیب سے پاک ہے۔ پیرس یونیورسٹی کے پروفیسر مسٹر بوراک نے حال ہی میں لیبنٹز کی ایک دقیق فلسفی کتاب کا ترجمہ اسپرانٹو میں کیا ہے۔ آپ یہ معلوم کر کے تعجب کریں گے کہ ترجمہ کا دامن اصل کتاب کی تمام خوبیوں سے بھرا ہوا ہے اور اگر کوئی فاضل شخص اصل و ترجمہ دونوں کا گہری نظر سے بھی مطالعہ کرے تو بھی اسے ترجمہ میں کسی قسم کی کوئی کمی نہیں معلوم ہوگی۔

یہ بات نہ بھولنی چاہئے کہ اسپرانٹو میں ترجمہ جہاں اپنی جامعیت کے اعتبار سے بے مثال ہے وہاں اپنی آسانی کے لحاظ سے بھی بے نظیر ہے۔ اس زبان کی یہی دو خوبیاں ہیں جن کے دم سے دنیائے علم و ادب کی بڑی بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔

انجمن ترقی اسپرانٹو

۱۹۰۵ء میں فرانس کے شہر بولون سومیر میں ایک عجیب و غریب منظر دیکھا گیا۔ یہاں یورپ اور امریکہ کے مختلف حصوں سے رنگ برنگ کے سیکڑوں "ناطق جانور" آ جمع ہوئے۔ اور انہوں نے بھانت بھانت کی بولیاں بولنی شروع کر دیں۔ شہر والے سہمی ہوئی نظروں سے انہیں دیکھتے تھے اور حیرت و تعجب کے ساتھ ان کی بولیوں کو سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ مگر یہ کوشش فضول تھی۔ انگریز، ہسپانی، بلغاری، اطالوی، امریکی، روسی، اور دوسری قومیں اپنی اپنی بولیاں بول رہی تھیں اور کچھ عرصہ کے لئے بولون سومیر چڑیا گھر بن کر رہ گیا تھا۔

لیکن دوسرے ہی دن اس حالت میں عظیم الشان تغیر پیدا ہو گیا۔ یہ مختلف رنگ اور مختلف زبانوں کے انسان ایک بڑے ہوٹل کے ہال میں جمع ہوئے۔ اور کندھوں سے کندھے ملا کر بیٹھ گئے۔ زبانوں اور لہجوں کی ساری تفریق مٹ گئی اور سب کے سب ایک ہی زبان میں گفتگو کرنے لگے۔ اب ایسا معلوم ہونے لگا کہ یہ سب ایک ہی ملک کے فرزند اور ایک ہی مدرسہ کے طالبعلم ہیں۔

آپ سمجھے یہ لوگ کون تھے؟ یہ انجمن ترقی اسپرانٹو کے پہلے اجلاس کے شرکاء تھے جو مختلف ملکوں سے ڈیلیگیٹ بن کر آئے تھے اور یہ جلسہ انجمن ترقی اسپرانٹو کا پہلا اجلاس تھا۔ اس اجلاس کی صدارت خود اسپرانٹو کے موجد ڈاکٹر زامنہوف نے کی تھی اور وہ اسی جلسہ میں اسپرانٹو کے حق ایجاد سے انجمن ترقی اسپرانٹو کے حق میں دستبردار ہو گیا تھا۔ اس نے انجمن مذکور کو پوری طرح حق دیدیا تھا کہ وہ اسپرانٹو کی ترقی و اشاعت کے لئے جو وسائل مناسب سمجھے اختیار کرے اور وقتاً فوقتاً اس میں جس قسم کی ترمیمیں ضروری سمجھے عمل میں لائے۔

اگرچہ انجمن کے اس اجلاس میں کل ۶۵۰ ڈیلیگیٹ شریک ہوئے تھے مگر یہ تعداد ہر سال زیادہ ہوتی گئی۔ چنانچہ انجمن کے دوسرے اجلاس میں جو جنیف میں منعقد ہوا ایک ہزار ڈیلیگیٹ شریک ہوئے اور لیبنٹز کا مشہور ڈراما "جبریہ شادی" فرانسیسی سے اسپرانٹو میں ترجمہ کر کے کامیابی کے ساتھ کھیلا گیا۔ انجمن کے تیسرے اجلاس میں جو کیمبرج میں منعقد ہوا تین ہزار ڈیلیگیٹ شریک ہوئے اور مشہور ڈراما "ترستان بزنار" کھیلا گیا۔ حتیٰ کہ ۲۸ اگست ۱۹۲۸ء کو بلجیم کے شہر انتورپ میں جب اس انجمن کا بیسواں اجلاس منعقد ہوا تو اس میں دنیا کے مختلف حصوں سے پندرہ ہزار ڈیلیگیٹ شریک ہوئے جو دنیا کی تیس قوموں کے نمائندے بن کر آئے تھے۔ اس موقعہ پر یہاں اسپرانٹو کے ایک بین الاقوامی کالج کے افتتاح کی تقریب بھی نہایت شان و شوکت کے ساتھ منائی گئی۔

انجمن ترقی اسپرانٹو کے سالانہ جلسوں کی اس بڑھتی ہوئی رونق اور ان کے اس ابھرتے ہوئے جذبہ عمل کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ کرنا غلط نہیں ہے کہ عنقریب اسپرانٹو مشرق و مغرب میں اپنے جھنڈے گاڑ دیگی اور کالوں اور گوروں کی زبانوں پر اس کا سکہ چلیگا۔

سجاد

مصنّف

مرزا نے کہنا شروع کیا "میرے ماموں (آپ جو کچھ بھی کہئے) ایک لکھ پتی کروڑ پتی - یا ارب پتی تھے - اُن کی جایداد لاکھوں کی تھی اور وہ سب کی سب میرے لئے چھوڑ گئے -"

مَیں نے مرزا کے پھٹے پرانے کپڑوں کی طرف دیکھا جن میں پیوند لگے تھے - اتفاق سے میری نظر اُن کی عینک پر پڑ گئی جس کا شیشہ تک ٹوٹا ہوا تھا - مرزا نے دوبارہ زور دیتے ہوئے کہا "جناب ذرا خیال تو کیجئے "سب جایداد" ایک ایک کوڑی -

مَیں نے حیرت سے مرزا کو خوش کرنے کے لئے کہا "آپ کی خوش نصیبی پر رشک آتا ہے"۔

مرزا نے گلاس منہ سے لگاتے ہوئے کہا "آہ وراثت کی جایداد اکثر بُرے نتیجے پیدا کرتی ہے - اُس کا لہجہ یاس آمیز تھا -

مَیں نے کہا "شاید"

"میرے ماموں مصنف تھے - انہوں نے ڈھیر کی ڈھیر کتابیں لکھ ڈالیں"

"اچھا"

مرزا نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "یہی تو بڑی خرابی تھی"۔ پھر دانتوں میں خلال کرنے لگے -

مرزا نے ہونٹ چاٹتے ہوئے کہا "حضرت! میرے ماموں کو کتابیں لکھنے کا مرض تھا - بلکہ یوں کہئے خبط تھا - وہ کتب خانہ عامہ کے لائبریرین تھے - جیسے ہی جایداد میں انہوں نے کتابیں لکھنا شروع کر دیں - میرے خیال میں یہ ایک بالکل بیکار اور واہیات مشغلہ ہے - خیر - اگر کسی دوسرے باوقار شخص کو اتنی جایداد ملتی وہ فوراً ٹھاٹ سے رہنا شروع کر دیتا - دو درجن پاجامے بنواتا اور وہ بھی کس سے - وہائٹ وے لیڈلا کی دکان سے - مگر ہمارے ماموں میاں ہمیشہ اِن باتوں سے دور رہے - آپ کو غالباً یہ سُن کر تعجب ہوگا کہ اُن کے پاس مرتے دم تک سونے کی ایک گھڑی بھی نہ تھی - ایسے لوگوں کے پاس دولت کا کیا کام ہے - مگر دولت اندھی مشہور ہے - ہمارے ماموں نے کیا کیا - ایک بڑا سامان کرایہ پر لے لیا - لاکھوں کتابیں خرید ڈالیں

چالیس من کاغذ - کئی درجن قلم اور سیاہی کی بوتلوں کے لئے آرڈر دے دیا اور اطمینان سے کتابیں تصنیف و تالیف کرنے لگے - میری سمجھ میں اِس کی علتِ غائی ابھی تک نہیں آئی - مگر انہوں نے دنیا میں آکر صرف یہی کام کیا"

اپنے ماموں سے کافی جایداد ملی تھی - اِس وقت اُن کی عمر پینتیس سال کی تھی - دنیا میں صرف میری والدہ (چند رشتہ کے بھائیوں کے علاوہ) اُن کی حقیقی قرابت دار تھیں - اُن کا کوئی اولاد نہ تھا - اور میں اپنی ماں کا اکلوتا بیٹا ہوں -

دوسرے رشتہ داروں کے یہاں بھی صرف ایک ہی لڑکا تھا - وہ اُسے لیکر اُن کے پاس پہنچے - کمرے میں پہونچتے ہی لڑکے نے بدتہذیبی شروع کی - بچپن ہی سے اُن لوگوں نے اُس کی عادتیں بگاڑ دی تھیں - ماموں صاحب نے ناراض ہوتے ہوئے ڈانٹا، اِس کو یہاں سے لے جاؤ .... اِس واقعہ کو میری خوش قسمتی پر دال سمجھا گیا - میری والدہ بہت ہوشیار واقع ہوئی ہیں - انہوں نے کل باتیں دل ہی دل میں طے کر لیں مگر زبان سے ایک حرف نہ نکالا -

"ہمارے ماموں بھی عجب قطع کے شخص تھے - آپ کا لباس سبحان اللہ - سر پر چاروں طرف تو سخت بال تھے لیکن بیچ میں چاند نظر آتی تھی - جیسے جاپانی گڑیا - آپ ہمیشہ ٹخنوں تک نیچی اچکن اور گھٹنا پہنتے تھے - سر پر مارواڑی وضع کی پگڑی ہوتی تھی - کپڑوں کے شوقین تو بہت تھے مگر ظاہری حالت فقیروں سے بدتر معلوم ہوتی تھی - خیر - آپ کسی ایک مکان میں جم کر نہیں رہے - آج یہاں ہیں تو کل وہاں - آپ کا ایک مخصوص گاؤ تکیہ تھا اور ایک بوریا - گاؤ تکیہ کے متعلق مشہور تھا کہ وہ حضرت غالب کے استعمال میں رہ چکا ہے - اور بوریا آتش جیسی بزرگ ہستی کے زمانے سے چلا آرہا تھا - معلوم نہیں کہاں تک اس روایت کی تصدیق ہو سکتی ہے - بہر حال آپ کو یہ دونوں چیزیں حد درجہ عزیز تھیں اور ہر نئے مکان میں پہلے ہی دونوں چیزیں رونق افروز ہوتی تھیں - ہمارے ماموں صاحب اپنی تصنیفات کے عام پسند نہ ہونے کا الزام اپنی لائبریری کے سر پر تھوپتے تھے - مگر یہ کبھی نہ سمجھے کہ یہ خود اپنے دماغ کا قصور

ہے۔ آپ کو یہ بھی خبط تھا کہ مشہور مصنفین کے جائے سکونت کی تلاش رہا کرتی تھی۔

اُن کا نام آپ کے سامنے لینا فضول ہے۔ آپ انہیں نام سے کبھی نہ پہچان سکیں گے۔ اُن کی تصنیفات سے لوگ عام طور پر واقف تک نہیں ہیں۔ بلکہ میں تو یوں کہونگا۔ وہ اس قابل ہی نہیں ہیں کہ کوئی بھلا آدمی اُن کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھے۔

"انہوں نے ہر علم و فن کی کتابوں کو پڑھا اور ہر موضوع پر ہرزہ سرائی کی۔ مگر کوئی اُن کی کسی ایک کتاب کا نام بھی نہیں جانتا"

"اکثر وہ لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا کرتے، قوم کو کس چیز کی سب سے زیادہ حاجت ہے؟ پھر خود ہی کہتے۔ ایک رہبر کی۔ ایک ایسے پیشوا کی جو اُسے پستیوں سے نکال دے۔ آجکل قوم میں شیرازہ بندی نہیں ہے۔ نفاق و افتراق کے زہریلے اثرات پھیل رہے ہیں۔ کبھی وہ مجھے مخاطب کر کے کہتے۔ احمد! تم جانتے ہو ہماری قوم اِس بدتر حالت میں کیوں ہے۔ صرف اسوجہ سے کہ لوگ عالموں کی قدر نہیں کرتے۔ مصنفوں کی وقعت ذرہ برابر نہیں ہے۔ در بدر ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں۔ قوم اُنہیں پاگل اور دیوانہ سمجھتی ہے۔ اُن کی نصیحتوں پر عمل کرنا تو درکنار اُن کو سننے تک کی روادار نہیں ہے۔ لیکن احمد! اگر قوم آنکھیں کھولے۔ اپنے بہی خواہوں کو پہچانے۔ تو میں گو مصنفین کا خاکپا ہوں مگر اتنا دعوےٰ رکھتا ہوں کہ قوم کو اِس گمراہی اور ذلت سے نکال کر سیدھے رستے پر ضرور لگا دوں گا۔ اُسے ایسی جگہ پر پہنچا دونگا جہاں کوئی اِس کا ہمسر نہ ہوگا۔ چین آرام سے زندگی بسر ہوگی۔ ہر طرف مال و دولت کی فراوانی ہوگی۔ دودھ اور شہد کی نہریں جاری ہونگی"

"ہمارے ماموں اِس قسم کی باتیں ہر وقت کیا کرتے تھے۔ اُنہیں ہردم قوم اور اُسکی اصلاح کی فکر رہا کرتی۔ اُن کی خواہش تھی کہ مولانا حالی کی طرح وہ بھی کوئی مسدس لکھ کر نام پیدا کریں"

میری ماں ہفتے میں اکثر ایک دو بار مجھے نہلا دُھلا کر ماموں صاحب کے پاس لے جایا کرتیں اور میں بھی اُن کی باتوں میں بظاہر دلچسپی لیا کرتا۔ چپ تمیز سے بیٹھا رہتا۔ چوں نہ کرتا۔ اُن کا یہ حال ہوتا کہ دنیا بھر کے قصے دُہرایا کرتے جن میں مجھے مطلق دلچسپی نہ ہوتی۔ مگر ماں کے حکم کے خلاف بھی نہیں کر سکتا تھا۔

رفتہ رفتہ میں تنہا جانے لگا۔ مجھے خیال پیدا ہو چلا تھا کہ شاید ترکہ اسی طرح سے ملجائے۔ میں نے دیکھا ماموں صاحب کے پاس کوئی متنفس نہ پھٹکتا تھا۔ ان کی عادت تھی کہ ہر اُس شخص کو مبارکباد کا خط ضرور لکھتے جو دنیا میں مشہور ہو جاتا۔ اُسے اپنی تصنیف کردہ کتابوں کے پلندے کے پلندے بھیجا کرتے اور اُسے مدعو کیا کرتے کہ وہ آکر اُن سے قوم کی موجودہ تباہی کے بارے میں تبادلۂ خیالات کرے۔ لیکن آنا تو درکنار بہت لوگوں نے جواب تک نہ دیا۔

ماموں صاحب کے کمرے میں داخل ہوتے ہی ایسا معلوم ہوتا۔ کہ کسی مطبع میں جا پہنچے ہیں۔ ہر طرف سامان منتشر نظر آتا۔ مکان کی نشست گاہ میں خطوط کے ڈھیر ملتے۔ یہ خطوط نظام حیدر آباد بیگم بھوپال۔ نواب رام پور اور ایسے ہی بڑے بڑے لوگوں کے نام ہوتے۔ نشستگاہ کے بعد والے کمرہ میں ماموں صاحب خود ہوتے تھے مگر اِس ہیئت کذائی سے کہ کمرے میں چاروں کتابیں بکھری پڑی ہیں۔ فرش پر پھٹے اور مڑے تڑے ہوئے ردّی کاغذات کا ڈھیر ہے۔ لکھتے لکھتے کاغذ نوچ ڈالنا اور گولی بنا کر پھینکدینا مصنفوں کی عادت ہوتی ہے جو لیاقت کے محدود ہونے کی شہادت ہے۔ تپائی۔ میز۔ ہر جگہ بسکٹوں کے آدھے کھائے ہوئے ٹکڑے اور چائے کی خالی پیالیاں بے ترتیبی سے رکھی ہیں۔ وہیں کسی کونے میں آپ کو ماموں صاحب نظر آتے کہ تہبند باندھے ہوئے کسی پرانی کتاب کی ورق گردانی کر رہے ہیں۔ قلم کان میں اٹکا ہوا ہے۔ اور ہاتھ میں پنسل ہے۔ جس کے جگہ جگہ نشان لگاتے جاتے ہیں۔ پاس ہی قلم تراش بھی کھلا رکھا ہے کہ بوقت ضرورت پنسل کو بنا لیا جائے۔

مجھے دیکھتے ہی کہنے لگتے۔ احمد! ذرا ٹھہرو۔ ارے ایک ذرا۔ بہت ٹھیک۔ بالکل درست۔ بھئی کیا بات سوجھی ہے۔

ارے میاں احمد تم دیکھتے ہو ہمارا ملک ابھی کتنے ابتدائی مراحل سے گزر رہا ہے۔ اُس کو بڑی بڑی دشوار گزار گھاٹیوں سے گزرنا ہے۔

ہاں تو ہمارے ماموں کی باتیں ہمیشہ ایسی ہی ہوا کرتیں۔ اور مجھے دیکھتے ہی وہ قوم اور ملک کا تذکرہ کرنے لگتے۔ وہ صرف باتیں ہی نہیں کرتے بلکہ مجھے اپنی کتابیں بھی دیا کرتے۔ کیسی کتابیں؟ ایک ایک اُن میں سے چھ چھ سو صفحات کی ہوتی۔ معاذ اللہ۔ کتابوں کے نام بھی خوب ہوتے:۔

"مادرِ وطن کی پکار، طلسم تعصب، قومی قربانیاں، وغیرہ وغیرہ

نام تو اتنے زبردست اور پُر اثر۔ مطلب کچھ بھی نہیں۔

آخری ملاقات سے قبل انہوں نے مجھے ایک کتاب دی۔ وہ اُس وقت بیمار تھے اور ظاہری حالت اچھی نہیں تھی۔ میں ایسی باتوں کی تاک میں رہا کرتا تھا۔ اِس لئے ان کیفیات کا مجھے خوب اندازہ ہے۔ ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے اور وہ زندگی سے ناامید ہوچکے تھے۔

کتاب دیتے وقت فرمانے لگے ’احمد اقسی القلب۔ گراں گوش قوم کو میرا یہ آخری پیام ہے۔ یہ کہتے کہتے اُن کے زرد رخساروں پر موتی جیسے سفید آنسوؤں کا تار بندھ گیا۔ واقعی اب سے

سب ٹھاٹ پڑا رہ جائیگا جب لاد چلیگا بنجارا

کے مصداق آخری وقت قریب تھا۔ پچاس ساٹھ تصنیفات کا ذخیرہ ردّی سے زیادہ وقعت نہ رکھتا تھا۔

ماموں صاحب گویا ہوئے ’احمد۔ مجھے خیال ہوتا ہے ....

کہ ...... کہتے کہتے خاموش ہوگئے۔ اُن کی سسکیوں سے میں بھی متاثر ہوا۔ آج یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے ناامیدی کی جھلک اُن میں دیکھی۔ کچھ لمحے غور کرنے کے بعد پھر کہنے لگے۔ ” احمد میں نے سخت حماقت کی۔ تمام عمر فضول برباد کردی۔ آہ۔ خدائے برتر علیم و دانا ہے۔ وہی دلوں کے راز جانتا ہے۔ میں نے خودنمائی یا خودپسندی کے لحاظ سے ہرگز ایسا نہیں کیا تھا۔ میرا خیال .... تھا ......‘

اِس کے آگے وہ اور کچھ نہیں کہہ سکے۔ جملہ ناتمام رہ گیا۔ کتاب مجھے دیدی۔ اور چہرہ کو ہاتھوں سے چھپاکر سرد آہیں بھرتے رہے۔ میں نے دیکھا اُن کے ہاتھ پاؤں میں رعشہ تھا۔ تھوڑی دیر بعد اُن کی آنکھیں پھر بدستور چمکنے لگیں (مجھے اُن کی ایک ایک حرکت خوب یاد ہے۔ کیونکہ گھر پہنچکر والدہ کے سامنے اُن کے ہر ایکٹ کو دہرانا پڑا تھا) اُنھوں نے کتاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ’اسے لیجاؤ اور پڑھنا‘۔ یہ میری سب سے آخری تصنیف ہے۔ میں نے اپنی تمام جایداد تمہارے نام کردی ہے۔ خدا کرے تم اِس کا جائز استعمال کرو۔ اِس کے بعد اُن کا سانس پھول گیا اور وہ زور زور سے کھانسنے لگے۔

مجھے خوب یاد ہے۔ کہ کیسے میں گھر پہنچا۔ اور جب دوبارہ ماموں صاحب کے پاس گیا تو وہ کس طرح بستر پر لیٹے ہوئے تھے۔ اُنکا سانس زور سے چل رہا تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سکرات کا عالم ہے۔ مگر مجھے دیکھتے ہی اُن کے سر پر کتاب کا بھوت سوار ہوگیا۔ بمشکل تمام آہستہ سے کہا۔ کیا کتاب پڑھی تھی۔

اُن کے خوش کرنے کو میں نے کان کے پاس جاکر کہا: تمام رات اُسی کو پڑھتا رہا۔ اُن کے چہرہ پر خوشی کی لہر دوڑگئی۔ میں نے چاہا کچھ اور کہوں مگر دیکھتا کیا ہوں کہ اُن کی حالت ابتر ہوچلی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے منکا ڈھل گیا اور انھوں نے آنکھیں بند کرلیں۔ لیکن چہرہ پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ جسے نشان فیروزمندی سمجھنا چاہئے۔

ہمارے ماموں صاحب کا خاتمہ اِس طرح سے ہوا۔ اُن کا جنازہ ہم لوگوں نے بڑی شان سے اٹھایا۔ خیرات میں اپنی سب پونجی ہم نے لٹادی۔

اب وصیت نامہ کی تلاش ہوئی۔ پہلے تو ذرا شانِ بے اعتنائی سے اِدھر اُدھر ڈھونڈا کئے مگر جب صبح سے شام ہوگئی تو ذرا بے چینی شروع ہوئی۔ کرسیاں اُلٹ ڈالیں۔ میزوں کے خانے نکال ڈالے۔ حتّٰی کہ دیواروں تک کو ٹھونک بجاکر دیکھ لیا مگر اُس کا پتہ نہ چلنا تھا نہ چلا۔ ہر وقت مخالفین کے پہنچنے کا ڈر لگا ہوا تھا۔ مختار صاحب سے دریافت کیا تو انہوں نے بھی وصیت نامہ کی موجودگی کی تصدیق کی کہ ایک مہینہ ہوا لکھا گیا تھا۔ سفید کاغذ پر تھا۔ مضمون بہت مختصر تھا......

...... مگر ہم کو کوئی وصیت نامہ نہیں ملا۔ والدہ نے گھر سر پر اٹھا لیا۔ بیچارے مُردے کی روح بھی قبر میں لرز گئی ہوگی۔

ایک بار ماموں صاحب سے اور والدہ صاحبہ سے کچھ جھگڑا ہوگیا تھا۔ اُس زمانہ میں انہوں نے ایک وصیت نامہ اُسے” یہاں سے لیجاؤ“ والے لڑکے کے حق میں لکھا تھا۔ وہ اُس وقت کام آیا۔ اور کل جائیداد اُس اوباش کو مل گئی ....“

مرزا یہاں پہنچکر خاموش ہوگئے

میں نے کہنا شروع کیا ” شاید آپ ....“

مرزا نے مجھے روکتے ہوئے کہا ” ذرا توقف کیجئے۔ ذرا توقف کیجے۔ آج صبح ایک عجیب بات ہوئی جو سب سے بڑھکر ہے۔ اُسے بھی سن لیجئے۔ ہاں تو جایداد اُس لڑکے کو مل ہی گئی۔ وہ بالغ تھا۔ اِس لئے قبضہ دلا دیا گیا اور اُس نے اُسے تباہ کرنا شروع کردیا۔ جوُا۔ شراب اور عیاشی خاص مشاغل تھے۔ جب میں اِن باتوں کا خیال کرتا ہوں۔ میرا خون اونٹنے لگتا ہے۔ اُس نے بہت جلد تمام جائیداد کو ٹھکانے لگادیا۔ ایک پھوٹی کوڑی تک نہ رکھی۔ اب تین سال سے مجھے اُس کا کچھ حال معلوم نہیں ہے۔

” مجھ پر اِس عرصے میں بڑا سخت وقت گزرا۔ میری ساری میلب

ماموں کے انتقال سے وابستہ تھیں جس کا یہ حشر ہوا۔ آپ سے کیا پردہ۔ سچ عرض کرتا ہوں۔ میں آجکل کوڑی کوڑی کو محتاج ہوں۔ سارا سرمایہ ماموں کی موت میں لٹا دیا۔ اب رکھا کیا ہے۔

ہاں تو آج صبح اُن کتابوں کے ڈھیر کی طرف میرا خیال گیا جو برسوں سے ایک کونے میں پڑی تھیں اور جن کا کوئی پرسان حال نہ تھا خیال ہوا شاید بنیا ہی ان کی کچھ قیمت لگا دے اور نی الحال آٹے دال کا سہارا ہو جائے۔ اگرچہ میں نے عہد کیا تھا کہ اُنہیں میں اپنے سے جُدا نہیں کرونگا۔ مگر اس وقت کچھ ایسا جنوں سوار ہوا کہ کتابوں کو دیکھتے ہی میں نے زور سے ایک ٹھوکر ان کو لگائی۔ کمرے میں ہر طرف کتابیں بوٹ کی ٹھوکر سے منتشر ہو گئیں۔ ایک ذرا اوپر کو اُچھلی اور اس کے اندر سے .... آپ سمجھتے ہیں کیا نکلا؟ جناب وہی وصیت نامہ جسے ماموں صاحب مرحوم نے اپنی اس آخری کتاب میں رکھدیا تھا۔ جو انہوں نے مجھے اپنے بستر مرگ پر دی تھی۔

مرزا نے اپنا ہاتھ سینے پر باندھتے ہوئے اور اپنے سر کو ذرا جنبش دیکر پُرملال لہجے میں کہا "میں نے کتاب کھولنا تو درکنار اس کے ورق بھی نہیں تراشے تھے۔" پھر چھت کی طرف دیکھکر زہرخند سے کہا "کیا خوب جگہ وصیت نامہ کے لئے تجویز کی تھی۔ سبحان اللہ۔

مرزا نے ہاتھ سے مکھی مارتے ہوئے کہا "دیکھا آپ نے۔ اسکو فنا فی التصنیف ہونا کہتے ہیں۔ بیچارے نے میرے ساتھ کوئی چالاکی نہیں کی تھی۔ وہ غریب یہی سمجھتا تھا کہ میں اس کی کتابوں کو ذوق و شوق سے پڑھتا ہوں۔ لیکن اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ایک شخص دوسروں کے طبائع کو کہاں تک سمجھ سکتا ہے ؎

ہرکس بخیال خویش خبطے دارد

(ایچ، جی، ویلس)

شمشیر صمدی

اسیرِ جدائی

ہو اگر طاقت پرواز میسر مجھ کو! — شوق لے جائے اُڑا کر ترے در پر مجھ کو!
تیلیاں سخت قفس کی ہیں نہیں چلتا زور — ورنہ تو "چاند" ہے اور میں ترا دیوانہ "چکور"
کچھ زمانے سے ہے پیارے مری تقدیر جدا — کہیں صیاد سے ہوتا بھی ہے نخچیر جدا
قسمتِ عاشقِ مجبور ہے قسمت میری — حسرتِ اُلفتِ مغموم ہے حسرت میری
آنکھ ہی میں جو شکستہ ہو وہ آنسو ہوں میں — قید ہو جو گلِ پژمردہ میں وہ بُو ہوں میں؛
آہ! آزاد ہو جلنے کے لئے پروانہ — اور اس میں بھی ہو مجبور ترا دیوانہ؛
مگر اے دوست! یہ ضبطِ غمِ فرقت کب تک — یعنی میں قیدئی زندانِ مصیبت کب تک

ایک دن قیدِ حوادث سے رہا ہونا ہے
ترے در تک مری قسمت کو رسا ہونا ہے

روش صدیقی

"دوست"

(دوست آں باشد کہ گیرد دستِ دوست)

کوئی سات آٹھ سال کا ایک لڑکا عدالت کے سامنے پیش تھا۔ پھٹے پرانے کپڑے تھے۔ نہ سر پر ٹوپی تھی نہ پاؤں میں جوتا۔ ہاتھوں میں ہتھکڑی تھی۔ لیکن چہرے سے کسی قسم کا خوف وہراس ظاہر نہ ہوتا تھا۔ پولیس نے قلچہ چرانے کے جرم میں اس کا چالان کر دیا تھا اس نے عدالت میں یہ بیان لکھوایا:-

"میرا نام جمال ہے۔ میرا باپ مر چکا ہے۔ اس کا نام عبداللہ تھا۔ میری ماں زندہ ہے۔ اس نے دوسری شادی کر لی ہے میرا سوتیلا باپ مجھے پیٹتا ہے۔ اور گھر میں نہیں رہنے دیتا۔ میں دو دن سے بھوکا تھا جب بھوک سے عاجز آ گیا تو قلچہ فروش کی دکان سے ایک قلچہ اٹھا لیا۔ میرے پاس پیسے نہیں تھے اس لئے قلچہ فروش نے مجھے پکڑ کر پولیس کے حوالے کر دیا۔ ماں کے سوا میرا اور کوئی رشتہ دار نہیں۔ میں اپنے گھر واپس نہیں جانا چاہتا۔ کیونکہ وہاں مجھے پیٹا جاتا ہے"

چونکہ ملزم کی نیک چلنی کی ضمانت دینے والا کوئی نہیں تھا عدالت نے اسے جیل بھیج دیا۔

جمال ایک مدت تک جیل میں رہا۔ یہاں اس نے نجاری کا کام سیکھا۔ لیکن وہ بھی برائے نام۔ آخر جب وہ جیل سے نکلا تو اب سوچنے لگا کہ کہاں جائے اور کیا کرے۔ کوڑی پاس نہ تھی کام کے لئے اوزار وغیرہ کہاں سے خریدتا۔ دن بھر بازاروں میں ادھر ادھر گھومتا رہا۔ جب رات ہوئی تو کسی دکان کے تختے پر پڑ رہا۔ اگلا روز بھی یونہی گزر گیا۔ بھوک نے سخت پریشان کر رکھا تھا معاً اسے خیال آیا کہ لوگ ان محتاجوں کو جو مسجدوں میں جا بیٹھتے ہیں عموماً روٹی کھلا دیتے ہیں چنانچہ اسی امید پر جمال بھی ایک مسجد میں گیا۔ مغرب کی نماز ہو رہی تھی۔ نمازیوں کے جوتے اِدھر اُدھر پڑے ہوئے تھے۔ وہ انہیں اٹھا اٹھا کر ایک قطار میں رکھنے لگا۔ اچانک ایک چھوکرے نے شور مچایا "پکڑو۔ چور جوتیاں لے چلا"

اس خوف سے کہ کہیں لوگ سچ مچ سے چور سمجھ کر پکڑ ہی نہ لیں۔ وہ مسجد سے نکل بھاگا۔ لیکن تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ لوگوں نے اسے لپک کر پکڑ لیا۔ اور اگلے روز جوتیاں چرانے کے جرم میں پولیس نے اس کا چالان کر دیا۔ عدالت سے اسے ایک سال کی سزا ہوئی۔

جُوں توں کر کے یہ سال بھی گزرا۔ اور وہ جیل سے نکل کر پھر شہر میں آموجود ہوا۔ اور پھر بازاروں میں پریشان حال پھرنے لگا۔ آخر ایک نانبائی کی دوکان پر جا کر کہا۔

"میں بھوکا ہوں نام اللہ ایک روٹی دلا دو"

نانبائی بولا۔

"چل ہٹا کٹا ہو کر بھیک مانگتے شرم بھی نہیں آتی"

جمال "کہو تو برتن صاف کر دوں۔ لکڑیاں پھاڑ دوں"

نانبائی - "چل دور ہو۔ ہٹ ایک طرف راستہ چھوڑ گاہک کا"

جمال مایوس ہو کر چلا گیا۔ چوک میں پہنچا تو ایک جگہ لکڑیوں کی دوکان تھی۔ اس امید میں کہ شاید کوئی کام مل جائے ایک طرف بیٹھ گیا تھوڑی دیر بعد ایک سپاہی نے آکر لکڑیاں خریدیں۔ جمال بولا

"کہو تو میں اٹھا کر لے چلوں"

"اٹھا لو"

جمال نے لکڑیاں اٹھا لیں اور سپاہی کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ جب سپاہی گھر پہنچا تو جمال نے مزدوری مانگی۔

سپاہی "کیسی مزدوری؟"

جمال - "کیوں لکڑیاں اٹھا کر نہیں لایا"

"لیکن میں نے کب کہا تھا۔ تم تو اپنی مرضی سے آئے جاؤ چلتے پھرتے نظر آؤ"

جمال - "یہ اچھی رہی" اور پھر "دو چار پیسے ہی دیدو۔ بھوکا ہوں روٹی کھا لوں گا"

سپاہی - "دور ہو بدذات کہیں کا"

جمال - "دیکھو گالی مت دو"

بھلا سپاہی ایسی گستاخی کی تاب کب لا سکتا تھا۔ غصہ سے اس زور سے جمال کے تھپڑ مارا کہ غریب کے منہ سے خون بہنے

لگا - دونوں میں ہاتھا پائی تک نوبت پہنچی سپاہی اسے کھینچتا ہوا چوکی لے آیا - پولیس نے بدمعاش سمجھکر چالان کر دیا اور عدالت نے تیسرے جُرم کی پاداش میں پانچ سال قید کا حکم سنایا ۔

یہ عرصہ بھی جُوں توں کر کے کٹا۔ لیکن اب جب وہ جیل سے نکلا تو روٹی کمانے کے کئی ایک ڈھب سیکھ چکا تھا۔ جیب کاٹنا - جوا کھیلنا - نقب لگانا۔ قفل توڑنا - یہ سب کرتب اُس نے اندر ہی سیکھ لئے تھے ۔ آج بھی جب وہ رہا ہو کر نکلا تو پاس پھوٹی کوڑی نہ تھی۔ لیکن ایک مقراض تھی جو وہ کسی نہ کسی طرح اندر سے لے آیا تھا - شہر میں آ کر وہ چوک میں اِدھر اُدھر پھرنے لگا۔ آج نانبائی کی دکان پر پلاؤ اور قورمہ پیٹ بھر کر کھانے کے بعد بھی اُس کے پاس چار پانچ روپے تھے ۔ اگلا دن چڑھتے ہی وہ پھر بازار میں آموجود ہوا - لیکن ابھی اس نے پہلے شخص کی جیب پر ہاتھ ڈالا ہی تھا کہ ایک سپاہی نے اسے دیکھ لیا اور جھٹ گرفتار کر لیا - اب چوتھی بار اسے دس سال کی سزا ہوئی ۔

جمآل کو جیل میں آئے اب ساتواں سال تھا۔ لیکن اب جیل کی زندگی کے دن کچھ اس بیتابی سے نہ گزرتے تھے جیسے پہلے گزرا کرتے تھے ۔ وہ اب بھی دل میں سوچا کرتا تھا کہ جیل سے نکلکر کیا کریگا - وہ کبھی اس بات پر بھی پچھتایا کرتا تھا کہ اس نے چوری کا پیشہ کیوں اختیار کیا - شاید کوئی کام مل ہی جاتا - ساتھ ہی اسے لوگوں پر بھی غصہ آتا کہ خلقت کیوں اتنی سنگدل ہو گئی ہے - کہ بھائی بھائی کی مدد سے گریز کرتا ہے - کبھی وہ عدالتوں کو کوستا اور کہتا :-

"کون کہتا ہے کہ دنیا میں انصاف ہے - کبھی کسی نے میری بات پر غور نہ کیا - بھوک کی شدت سے بیتاب ہو کر صرف ایک قلچہ چرانے کے جرم میں بچپن ہی میں جیل دیکھنا نصیب ہوا - کاش حاکم اتنا تو خیال کرتا کہ ایک بچے کے لئے بھوک کسقدر ناقابل برداشت چیز ہے - پھر مَیں نے لوگوں کو قسمیں کھا کھا کر یقین دلانا چاہا کہ میں مسجد میں جوتے چرانے کیلئے نہیں آیا تھا - لیکن لوگوں نے میری قسموں کا اعتبار نہ کیا - ایک نمازی کے چھوکرے کی بات تسلیم کر لی گئی - .... اور پھر اس پاجی سپاہی سے تو کسی نے اتنا بھی نہ پوچھا کہ تم لکڑیاں جو اٹھوا کر لائے تو پیسے کیوں نہ دئے - لیکن مجھے ایک سپاہی سے ہاتھا پائی کے جرم میں سزا ملگئی ....

کاش مجھے آرام سے زندگی بسر کرنے کا ایک ہی موقع مل جاتا؟"

جیل کے محافظوں کے ظالمانہ سلوک سے تنگ آ کر ایک روز قیدیوں نے شورش کر دی اور لگے سپاہیوں کو مارنے - شام کا وقت تھا قیدی جیل کا دروازہ توڑنے کی کوشش کر رہے تھے ۔ اور آخر ایک سخت جدوجہد کے بعد دروازہ توڑنے میں کامیاب ہو گئے - لیکن جونہی دروازے سے باہر نکلے سپاہیوں نے باڑ ماری - بہت سے گرے - لیکن چند ایک باہر نکلنے میں کامیاب ہو گئے - انہی میں جمآل بھی تھا - دروازہ کی طرف آنے سے پیشتر وہ باورچی خانہ سے باورچی کے کپڑوں کی گٹھڑی اٹھا لایا تھا - جیل سے باہر نکلتے ہی وہ ایک کھیت میں جا چھپا - اور جیل کے کپڑے اتار کر ایک اجلا جوڑا پہن لیا - باقی سب کپڑے وہیں چھوڑ دئے اور صبح ہونے سے پیشتر بہت دور نکل گیا - دن بھر کھیتوں میں چھپا رہتا اور رات کو چلتا - جب بھوک لگتی تو کچی پکی ترکاریاں کھا کر پیٹ بھر لیتا - اسی طرح سفر کرتے کرتے وہ ایک شہر میں آنکلا - ابھی شہر میں قدم رکھا ہی تھا کہ اذان کی آواز اس کے کان میں پڑی - وہی جمآل جس نے آجتک خدا کی درگاہ میں سر نہ جھکایا تھا اذان کی آواز سنکر کھڑا ہو گیا - اور جب اذان ہو چکی تو مسجد میں آیا اور وضو کر کے ... نمازیوں کی سب سے پچھلی صف میں سر جھکا کر جا بیٹھا -

آج جمعہ تھا - کچھ دیر بعد خطبہ شروع ہوا - جمال بھی غور سے سننے لگا - ایک مقام پر امام نے کہا -

"اور جنت کے دروازے نیکوں کے لئے ہر وقت کھلے رہتے ہیں ...... لوگو! نیکی کا راستہ اختیار کرو - وہ لوگ جو گناہ کر کے توبہ کرتے ہیں - اور نادم ہوتے ہیں - اللہ اُن کے گناہ معاف کر دیتا ہے .... جو لوگ اللہ پر بھروسہ کرتے ہیں - گناہ سے ڈرتے ہیں - صابر اور قانع رہتے ہیں - وہ کبھی پریشان نہیں ہوتے ۔"

جب خطبہ ہو چکا تو جمآل نے بھی "جو نیت امام کی سو میری" کے مصداق کے مطابق نماز تو پڑھ لی لیکن اب اس کے کانوں میں امام کے امید افزا الفاظ گونج رہے تھے -

"جو لوگ اللہ پر بھروسہ کرتے ہیں - گناہ سے ڈرتے ہیں صابر اور قانع رہتے ہیں وہ کبھی پریشان نہیں ہوتے۔"

یہ وہ الفاظ تھے جو جمآل نے آج پہلی بار سنے تھے اور جو کیف اور اطمینان اِن الفاظ سے اُسے حاصل ہو رہا تھا اُس کا دل ہی کچھ خوب

جانتا تھا۔ اس نے آج دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ اب جو ہو سو ہو۔ نیک بننے کی ضرور کوشش کرونگا۔ نماز ختم ہو چکی تھی۔ لوگ مسجد سے نکل رہے تھے۔ مسجد میں ایک جگہ کوڑا کرکٹ پڑا تھا۔ جمال کی جو نظر پڑی تو سب سے پہلے کوڑا کرکٹ اُٹھا کر باہر پھینکدیا اور پھر کوئیں سے پانی کے ڈول نکال نکال کر مسجد کا صحن دھونے لگا۔ اس کار خیر میں ایک اور نوجوان نے بھی اُس کا ہاتھ بٹایا جب یہ کام ہو چکا تو وہ نوجوان بولا۔

"کہاں کے رہنے والے ہو؟"

"بے وطن ہوں"

"کیا کام کرتے ہو۔"

"اللہ مالک ہے کوئی کام مل ہی جائیگا۔"

"یہاں کب سے آئے ہو؟"

"آج ہی آیا ہوں"

"آخر کچھ کام کاج جانتے بھی تو ہو گے۔"

"کچھ بُری بھلی نجاری جانتا ہوں۔"

"اوزار کہاں ہیں؟"

جمال مسکرا کر بولا۔

"جب اللہ کچھ دیگا تو اوزار بھی لے لونگا"

نوجوان ۔ سنو! میں معمار ہوں۔ میں بھی یہاں مسافر ہوں۔ جہاں میں کام کرتا ہوں تمہیں بھی وہاں کچھ کام مل جائے گا۔ ہاں تمہارا نام کیا ہے"

جمال ۔ میرا نام جمال ہے۔ لیکن تم مجھے کل ملو گے کہاں؟"

نوجوان ۔ "میں سرائے میں رہتا ہوں۔ میرے ساتھ آجاؤ۔"

جمال ۔ "چلو۔ لیکن تم نے اپنا نام تو مجھے تبلایا ہی نہیں۔"

نوجوان ۔ میرا نام فضل ہے"

جمال اور فضل کی ملاقات جو مسجد میں ہوئی تھی۔ ایسی مبارک ثابت ہوئی کہ دونوں ایک دوسرے کے غمگسار دوست بن گئے۔ اور دوستی بھی ایسی کہ باید و شاید۔ دونوں کھاتے تھے اور ملکر کھاتے تھے ایک روز جمال نے فضل سے ہنسکر کہا۔

"ایک بات پوچھوں۔ بُرا تو نہ مانو گے؟"

فضل ۔ "تم پوچھ تو دیکھو۔"

جمال ۔ تم اُداس اُداس کیوں رہتے ہو۔"

فضل ۔ "کوئی بُری بات نہیں۔ کوئی بُری بات ہو تو بتاؤں۔

جمال ۔ "سچ سچ بتاؤ جھوٹ سے کیا فایدہ"

فضل ۔ بات یہ ہے کہ مجھے ایک لڑکی سے محبت ہو گئی ہے۔

جمال ۔ "لیکن وہ ہے کون؟"

فضل ۔ "اس کا باپ چوکیداری کرتا ہے۔"

جمال ۔ ہنسکر بولا۔

"مجھ سے ذکر تک بھی نہیں کیا"

"تم سے شرم آتی تھی۔"

"شادی کیوں نہیں کر لیتے۔"

"کیا کروں کچھ بن نہیں پڑتا"

"کیا؟ جمال نے پوچھا۔ "لڑکی نہیں مانتی"

"وہ تو مانتی ہے" فضل بولا "کون جانے اُس کا باپ کیا کہے"

"اگر لڑکی مانتی ہے تو پھر کون سی مشکل ہے۔ تم اس کے باپ سے پوچھ تو دیکھو۔

شہر میں موسمی بخار کی شکایت تھی۔ کئی روز سے جمال کو بھی بخار آتا تھا۔ پہلے تو وہ کام پر جاتا رہا۔ لیکن جب طبیعت زیادہ بگڑی تو پھر کام پر جانا چھوڑ دیا۔ پانچ دس روپے جو بچا رکھے تھے وہ سب صرف ہو گئے۔ لیکن جب تک سکت رہی خیراتی ہسپتال سے جاکر دوائی لے آتا۔ جب بہت لاچار ہوا تو ایک روز فضل سے کہا۔

"میری حالت اچھی نہیں۔ مجھے خیراتی ہسپتال میں داخل کروا دو۔"

فضل ۔ "یہ کیوں؟ یہاں کیوں نہ رہو"

جمال ایک دو بار اِدھر اُدھر سر ہلا کر بولا۔

"میرے پاس کوڑی بھی نہیں"

فضل ۔ "نہ سہی۔ پھر کیا؟"

"دوا کہاں سے آئیگی ...... کھاؤں گا کیا"

فضل ۔ "چلو بس اب چپ رہو تم۔ خدا کی قسم مجھے اگر معلوم ہوتا کہ تم اسقدر بیمار ہو تو تم کو کبھی ہسپتال نہ جانے دیتا لیکن تم تو ہمیشہ مجھ سے اپنی حالت چھپاتے ہی رہے"

جمال ۔ "نہیں فضل! نہیں"

فضل ۔ "نہیں رہنے بھی دو...... وہ دوست ہی کیسا جو مصیبت میں کام نہ آئے؟"

جمال کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

جمالؔ ایک عرصہ بیمار رہا۔ اور فضلؔ نے اس محبت سے علاج بھی کیا اور خدمت بھی کی۔ کہ دیکھنے والے بھی عش عش کر اٹھے۔ جب جمالؔ پھر کام پر جانے لگا تو دل میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ دوست کے احسان سے کیسے سبکدوش ہو۔

سرائے میں جس کوٹھڑی میں فضلؔ اور جمالؔ رہتے تھے۔ اس کے ساتھ کی کوٹھڑی میں ایک رنگساز رہتا تھا۔ جمال تو اکثر لوگوں سے الگ تھلگ ہی رہا کرتا لیکن فضلؔ کبھی کبھی اس رنگساز کے پاس بھی جا بیٹھتا۔ ایک روز جو جمال کام سے واپس آیا تو رنگساز اپنی کوٹھڑی میں سرائے کے مالک سے بہت غصہ سے باتیں کر رہا تھا۔ جمالؔ دیوار کے ساتھ لگ کر سننے لگا۔ رنگ ساز کہہ رہا تھا۔

"تم نے ہر قسم کے لچے شُہدے یہاں رکھے ہیں۔"

"ہوا کیا؟ سرائے والا بولا۔" آخر کچھ میں بھی تو سنوں؟"

رنگساز۔ "کل میں مزدوری کے دس دس کے دو نوٹ لایا تھا۔ آج دونوں نوٹ گم ہیں۔ میرے روپے دلوادو۔ ورنہ میں پولیس میں جاکر رپورٹ کر دونگا۔"

سرائے والے نے پوچھا۔ "تمہارا کسی پر شک بھی ہے؟"

"شک؟ ہے کیوں نہیں۔ میں نے فضل کے سامنے اپنے صندوق میں رکھے تھے۔"

سرائے والا۔ "لیکن تمہارے صندوق کا تالا بھی نہیں ٹوٹا ہوا۔"

رنگساز۔ "مجھے تالا وَالا ٹوٹنے سے مطلب نہیں۔ میرے دونوں نوٹ گم ہیں۔ دونوں نوٹوں پر نیلے رنگ کے داغ تھے میں پہچان سکتا ہوں۔..... کچھ کرنا ہے تو کرو۔ ورنہ میں پولیس کو بلاتا ہوں۔"

سرائے والا۔ "تو پھر تم چاہتے کیا ہو؟"

رنگ ساز۔ "یہی کہ پہلے اس فضل کی تلاشی لی جائے۔"

سرائے والا اور رنگ ساز دونوں کوٹھڑی سے نکلے اور جمالؔ بھی دیوار سے ہٹکر اپنی کوٹھڑی میں جا بیٹھا۔

سرائے والے نے جمالؔ سے کہا۔ "سنو جمال!" یہ تمہارے دس کے بیس روپے کسی نے چرالئے ہیں۔ اسے فضل پر شک ہے۔ فضل کا صندوق کونسا ہے؟"

جمالؔ نے اشارے سے بتلا دیا۔ جب قفل توڑ کر فضل کا صندوق کھولا گیا تو کپڑوں کی ایک تہ میں دس دس روپے کے دو نوٹ مل گئے۔ ان دونوں پر نیلے رنگ کے دھبّے تھے۔ رنگ ساز خوشی سے بولا:۔

"دیکھو میں سچ کہتا تھا نا..... لو دیکھ لو۔ دونوں پر نیلے رنگ کے داغ ہیں یا نہیں۔"

اتنے میں فضل بھی آگیا۔ سرائے والا بولا:۔

"کیوں بھئی یہ کیا بات ہے۔ ہم تو تم کو شریف آدمی سمجھتے تھے" فضل نے ندامت سے سر جھکا لیا۔ جمالؔ اسوقت تک خاموش تھا۔ وہ دل میں سوچ رہا تھا کہ فضل کو ایسی کیا ضرورت کہ اس نے روپے چرالئے۔ جب سرائے والا اور رنگ ساز ایک دو آدمیوں کے ساتھ فضل کو پولیس کی چوکی کی طرف لے چلے تو جمال بھی ساتھ ہولیا۔ کوتوالی پہنچکر فضلؔ کو پولیس کی حراست میں ایک طرف بٹھلا دیا گیا۔ جمال بھی اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ اب اس نے اپنے دوست کی آبرو بچانے اور اس کے احسان کا معاوضہ دینے کا دل میں پختہ ارادہ کر لیا تھا۔ اسے فضلؔ کی جوانی پر ترس آرہا تھا۔ اور وہ سمجھتا تھا کہ اگر اسے ایک بار سزا مل گئی تو پھر اس کی تمام زندگی برباد ہو جائیگی۔

دونوں دوست خاموش بیٹھے تھے۔ سرائے والا اور رنگ ساز داروغہ جی سے باتیں کر رہے تھے۔ جمالؔ نے فضل سے پوچھا۔

"یہ تم نے کیا غضب کیا؟"

فضلؔ نے اپنے دوست کی طرف دیکھا اور ایک آہ بھر کر کہا۔

"لڑکی کا باپ روپے مانگتا تھا........"

جمالؔ بات کاٹ کر بولا۔

"سمجھ گیا۔ لو آج سے توبہ کرو۔ کہ آئندہ کبھی ایسا کام نہیں کرو گے........ اگر تم سے پوچھا جائے کہ تم نے روپے چرائے تو اپنی لاعلمی ظاہر کرنا۔ خبردار بھولنا نہیں........ سنتے ہو۔ میرے صندوق میں جو روپے ہیں انہیں کام میں لاؤ۔"

اتنے میں داروغہ نے بیان لکھنے کے لئے فضل کو اندر بلایا۔ جمال بھی ساتھ ہی اندر چلا گیا۔ اور پیشتر اس کے کہ فضلؔ کچھ کہے وہ بولا:۔

"یہ شخص بے گناہ ہے۔ اسے چھوڑ دو۔ روپے میں نے چرائے تھے۔"

داروغہ۔ "تم نے چرائے تھے........ تو پھر دوسرے کے صندوق میں کیسے چلے گئے؟"

جمال۔ "میں نے خود رکھدیئے تھے........ مجھے پکڑ لو میں مفرور قیدی ہوں........ میں چار بار قید ہو چکا ہوں۔ آخری

آہ ثروت آرا

اردو زبان کے گرامی قدر افسانہ نگار سید افضل علی ایم ۔ اے جو مرحوم رسالہ مخزن کے دورِ کمولت میں اپنی قابلِ رشک انشا پردازی کے جوہر دکھا چکے ہیں اپنی جوانا مرگ بیوی ثروت آرا کی وفات پر مظاہرۂ رنج والم کے طور پر ایک منظوم نوحہ ادبی دنیا کو ارسال فرما رہے ہیں۔

مرحومہ ثروت آرا ، مکرمہ "ندر سجاد" کی چھوٹی بہن تھیں ۔ ذہانت و فطانت کی نعمت کے ساتھ قدرت نے اُنہیں بلند ادبی ذوق بھی عطا فرمایا تھا۔ گذشتہ سال سید افضل علی نے "بیوی کی مسلسل علالت" کے سبب اپنے "احباب کے اصرار پر دوسری شادی کر لی تھی ۔ غیورِ محبت ثروت آرا اس صدمے کو برداشت نہ کر سکی ۔ اور پچھلے دنوں دل کی حرکت بند ہو جانے سے اُس کی زندگی کا خاتمہ ہو گیا ۔ ؎

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن — خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

پیری میں زندگی کا سہارا نہیں رہا — تم کیا گئیں کہ کوئی ہمارا نہیں رہا
جب تم نہیں تو کس کو دکھائیں جگر کے داغ — کس سے کہیں کہ زیست کا چارا نہیں رہا
تم کیا خفا ہوئیں کہ زمانہ بدل گیا — یکسر کسی میں خلق و مدارا نہیں رہا
تھا التفاتِ خویش و اقارب ترے طفیل — اب دوستوں میں ذکر ہمارا نہیں رہا
باجی شریکِ درد تھیں تم مجھ سی سرگراں — وہ کیا جئیں گی ایک بھی پیارا نہیں رہا
انعامِ اشک بار نوازش جگر فگار — سجاد کو بھی صبر کا یارا نہیں رہا
ہے آج سوگوار تہوّر علی بھی ! آہ — جینا اُسے بھی اپنا گوارا نہیں رہا

"ثروت" تم آہ ! نذرِ نہنگِ اجل ہوئیں ! — اب اپنے بحرِ غم کا کنارا نہیں رہا
آماجگاہِ ناوکِ بیدادِ غم ہے آہ — یہ دل کہ جس میں جلوہ تمہارا نہیں رہا

افضل علی

ثروت آرا کا جواب

عالمِ ارواح سے

کچھ دوستوں میں رسمِ مروت نہیں رہی — چاہت نہیں رہی وہ محبت نہیں رہی
پھر زندگی سے آدمی بیزار کیوں نہ ہو — جب زندگی میں کوئی حلاوت نہیں رہی
آرام سے ہوں گوشۂ مرقد میں محوِ خواب — اب مجھکو تم سے کوئی شکایت نہیں رہی
جو ہے رفیقِ عیش وہ دیکھے "جگر کے داغ" — وہ چارہ گر ہے پاس جو ثروت نہیں رہی
تم جس کے شکوہ ہائے محبت سے تھے خفا — ہو مژدہ وہ ہلاکِ شکایت نہیں رہی
کھایا تمام عمر فریبِ وفائے دوست — آخر کھلا کہ مجھ سے محبت نہیں رہی
اس مرگِ تلخ کام پہ ہو زندگی نثار — مجھ سے تمہارے دل میں کدورت نہیں رہی

"افضلِ جہاں" جہان سے بیزار ہے کہ اب
افضل علی کو اُس کی ضرورت نہیں رہی

؎۱ ثروت آرا کا لقب ؎۲ ندر سجاد ؎۳ سید حیدر یلدرم بی ۔ اے

دُنیائے ادَب

ہندوستانی تعلیم کا معیار اور تعلیم کی اصلی غرض

مسٹر فچ (مشہور مغربی ماہرِ تعلیمات) کا خیال ہے کہ تعلیم کا اصل مقصد یہ ہے کہ "متعلم کی خوابیدہ صلاحیت کا اِس طور پر احیاء کیا جائے کہ اُس کی آئندہ زندگی اُس کی بیدار صلاحیت سے منتفع ہو سکے اور اُس کو یہ معلوم ہو جائے کہ اُس کو زندگی کیونکر بسر کرنی ہے۔"

اِس سے زیادہ بہتر مقصدِ تعلیم کی توضیح محال ہے۔ اگر کوئی نظامِ تعلیم ایسا ہے جو اِن مقاصد میں ناکامیاب ہے تو وہ اس متبرک نام کا مستحق نہیں۔ تعلیم کی حالت بالکل قلعی کی سی ہے جس سے اصلی جوہر روشن ہو جاتا ہے۔ ہر انسان میں آپ کوئی نہ کوئی روشن پہلو ضرور دیکھیں گے یہی وہ جوہر ہے جس کا احیاء تعلیم کا مقصد اصلی ہونا چاہیئے۔

اِس صورت کو ملحوظ رکھ کر دو امور غور طلب ہیں۔

(۱) یہ کہ بچوں کی ابتدائی زندگی میں یہ جوہر تھوڑی سی تعلیم وتدریس کے بعد دریافت ہوتا ہے۔ اِس لئے ابتدا ہی سے آپ کسی ایسی تعلیم کو اُس سے مخصوص نہیں کر سکتے جو اُس کے جوہرِ خوابیدہ کے عین مطابق ہو۔ ابتداءً تعلیم ضرور کسی قدر عام ہوگی اور پھر اس کے بعد اُس دریافت کے مواقع حاصل ہونگے۔ آبائی ماحول و گرد وپیش کبھی بھی نظر انداز نہیں کئے جا سکتے اِس لئے کہ بچوں میں غیر محسوس طریقہ پر اُس پیشہ کی مناسبت کے اثرات پیدا ہو جاتے ہیں جن کو وہ ہوش سنبھلتے ہی اپنے اردگرد دیکھتا ہے۔ ایک بنیئے کا بچہ جس دن سے ہوش سنبھالتا ہے اُسی دن سے وہ اپنے ہر چہار طرف حساب وکتاب، ناپ تول تجارتی اشیاء کے نرخ اور اُن کے طریقِ فروخت کے تذکرے سُنتا ہے اور دیکھتا ہے یہ گرد وپیش اُس کی ذہنیت پر غیر معمولی اثر ڈالتے ہیں اور وہ بڑا ہو کر اسی طرح سوچتا ہے اور سمجھتا ہے۔

(۲) بااینہمہ آپ کبھی اُن مستثنیات[1] کو (جو متعدد ہیں) نظر انداز نہیں کر سکتے۔ جب ایک "ولی" کے گھر شیطان یا شیطان کے گھر "ولی" پیدا ہوتا ہے۔ ان صورتوں میں بھی استاد کا فرض ہے کہ وہ بچہ کے "جوہرِ خوابیدہ" کو دریافت کرے اور اُسی کے مطابق تعلیم دے۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ ایسے بچے جو آبائی مذاق وپیشہ سے علیحدہ شوق وذوق رکھتے ہیں اُن کی ذہنیت سطحِ عامہ سے بالاتر ہوتی ہے۔ اِسی کو انگریزی زبان میں جینیس کہتے ہیں۔ ایسے بچوں کی تعلیم اگر اِن کے مذاق کے مطابق دی جاتی ہے تو وہ غیر معمولی انسان بنجاتے ہیں۔ اور دنیا میں کارِ نمایاں انجام دیتے ہیں۔ ایسی حالت میں اگر آپ ان کو نظر انداز کر دیں گے تو اس سے قوم وملک کو نقصان پہنچ جانے کا اندیشہ ہے۔ اس لئے کہ ایسا ایک بچہ اسی گرد وپیش کے سو بچوں کے برابر ہوتا ہے۔

غالباً یہ امر کسی توضیح کا محتاج نہیں کہ تعلیم صلاحیت کے عین مطابق ہونی چاہیئے۔ تعلیم وصلاحیت کا اختلاف تعلیم کو بیکار اور صلاحیت کو برباد کرتا ہے۔ آج ہندوستان کی موجودہ بیکاری کا راز صرف یہی تعلیم وصلاحیت کا اختلاف ہے۔ مَیں نے صدہا ایسے نفوس دیکھے ہیں جو وکالت میں صرف اس لئے ناکامیاب ہیں کہ اُن کی صلاحیتِ فطری کسی دوسرے پیشہ سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔ موجودہ نسل میں اِس اختلاف کے تین اسباب ہیں۔

(۱) موجودہ تعلیم یافتہ نسل کے ولی ووالد عموماً انگریزی نصاب تعلیم سے بالکل ناواقف تھے۔ اُن کے نزدیک لڑکے کا انگریزی مدرسہ میں پڑھنا ہی کافی تھا۔ مضامین کا انتخاب بھی بچوں کی سہولت پسند طبیعت ہی پر منحصر ہوتا۔ نہ ان کی تعلیم کا کوئی نگراں تھا اور نہ سرپرست۔ گویا اُن کا تعلیمی دور بالکل غیر ارادی طور پر ختم ہوا جس میں بجز کتاب رٹنے یا امتحان پاس کرنے کے اور کچھ نہ تھا۔

(۲) دوسرا سبب غیر ملکی حکومت کی غیر مفید پالیسی تھی جس نے ہندوستان میں تعلیم کی ترویج صرف اس لئے ضروری سمجھی تھی کہ ادارۂ حکومت میں ایسے ماتحتوں کی ضرورت تھی جو قلیل تنخواہ پر حکومت کی مشینری چلا سکیں۔

(۳) تیسرا سبب ہندوستان کی خود غلامانہ ذہنیت تھی جس نے مغرب کی ہر سوغات پر لبیک کہا اور کبھی اس پر غور کرنے کی ضرورت نہ سمجھی کہ آیا یہ "نئی شراب ہماری پرانی بوتلوں" میں رکھی بھی جا سکتی ہے یا نہیں۔ اس غفلت کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے ادبیات وفنون

[1] عام قاعدے سے الگ۔

غنا ہو گئے اور اب اگر ہم نے کبھی ترقی کی سعی تو اس کی بنیاد مشرقی تہذیب و تمدن نہیں بلکہ مغربی نمائش پرستی اور مادیت ہوگی وہ ترقی ہماری ترقی نہ ہوگی بلکہ مغربی ترقی ہوگی۔ ہم کو اپنی شکست کا مغرب کی فتح کے سامنے اعتراف کرنا پڑیگا۔

جیسا میں عرض کر چکا ہوں کہ تعلیم کا مقصد متعلم کو طریقۂ زندگی کی تلقین ہے۔ اگر آپ ہر دارالعلوم سے ہر سال ایک سو بی گریجویٹ لیتے نکالیں جو کتابی معلومات میں یکہ وتنہا ہوں لیکن جن کی علمیت اُن کی روزمرہ زندگی کے لئے کوئی مفید نتیجہ نہ برآمد کر سکے تو میں یہ سمجھوں گا کہ آپ نے اسی تعداد میں "سو بُز اخفش" دنیا میں چھوڑ دئے جو نہ صرف مفید نہیں ہیں اور جنہوں نے اپنی زندگی و دولت مفت برباد کر دی بلکہ وہ قوم و ملک کے لئے مضر ہیں۔ ہربرٹ اسپنسر (دنیا کا مایۂ ناز ماہر تعلیمات) کا خیال ہے کہ۔

"یہ سوال کہ ہم کو کس طرح زندگی بسر کرنا چاہئے۔ سب سے زیادہ اہم ہے۔ نہ صرف مادی لحاظ سے بلکہ ہر لحاظ سے وہ بڑا کلیہ جس میں تمام جزوی مسائل داخل ہیں۔ وہ یہی ہے کہ اخلاق کو کُل مواقع اور حالات کی مناسبت سے تربیت دی جائے۔ ہم اپنے جسم سے کس طرح سلوک کریں اپنے معاملات کو کس طرح انجام دیں اور خاندان کی پرورش کس طرح کریں۔ ایک ملکی باشندہ کی حیثیت سے ہم پر کون سے فرائض عاید ہوتے ہیں۔ اور ہم اُن کو کیونکر انجام دیں۔ ہم شادمانی کے اُن ذرائع سے کیونکر فائدہ اٹھائیں جو فطرت نے ہمارے لئے مہیا کئے ہیں اور ہم اپنی قابلیتوں کو کس طرح صاف کریں کہ اُن سے ہم کو اور نیز دوسروں کو اعلیٰ فوائد پہنچیں۔ الغرض کامل زندگی کس طرح حاصل کریں۔ جبکہ ان اصول زندگی کا سیکھنا ہمارے لئے اہم اور ضروری ہے تو اس لئے یہی وہ سب سے اہم امر ہے جو تعلیم سے حاصل ہونا چاہئے۔ تعلیم کا فرض یہ ہے کہ ہم کو کامل زندگی کیلئے تیار کرے۔ کسی نصاب تعلیم کے جانچنے کا صرف ایک ہی معقول طریقہ ہے کہ اُس میں اِس امر کو پیش نظر رکھا جائے کہ اُس سے مقاصد مذکورہ بالا کہاں تک پورے ہوتے ہیں"۔

اب آپ اس معیار کو پیش نظر رکھ کر ذرا ہندوستان کے موجودہ نصاب تعلیم کو ملاحظہ فرمائیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ہمارے نوجوان تعلیم یافتہ کہاں تک اس پر پورے اُترتے ہیں۔ میرا تو خیال ہے کہ اس تعلیم سے اِن کا جاہل بہتر تھا۔ بقول حالی ؎

نہ پڑھتے تو سو طرح کھاتے کماتے
یہ کھوئے گئے اور تعلیم پا کے

ہماری تعلیم (اگر وہ تعلیم کہی جا سکتی ہے) مقاصد تعلیم سے بالکل معرّا و مبرّا ہے۔ نہ ہمیں اخلاق کی تعلیم دی جاتی ہے۔ نہ ہم کو یہ بتایا جاتا ہے کہ آپ جسم سے کس طرح سلوک کریں؟ نہ ہم کو اس کی خبر ہے کہ اپنے خاندان کی پرورش کس طرح کریں۔ نہ ہمیں یہ آتا ہے کہ بطور ایک رعایا ہمارے فرائض کیا ہیں۔ غرض ہم ایک "پڑھے لکھے جاہل" ہیں جس کا علم کتابی معلومات تک محدود ہے۔

بطور مثال آپ ایک ساتویں درجہ کے لڑکے کو لے لیں جس کی عمر تخمیناً ۱۳ سال کی ہے (سابق قانون کے مطابق ۱۶ سال سے کم عمر کا لڑکا انٹرنس کے امتحان میں شرکت سے ممنوع تھا) آپ اب ملاحظہ فرمائیں کہ اس تیرہ سالہ بچہ کو کون کون سے مضامین پڑھنے ہوتے ہیں۔

(۱) انگریزی (الف) زباندانی (ب) قواعد (ج) ترجمہ (د) غیر مقبنہ کتب
(۲) حساب (الف) اقلیدس (ب) ہندسہ (ج) الجبرا۔
(۳) جغرافیہ (الف) سیاسی۔
(۴) تواریخ
(۵) ہندی
(۶) اردو۔
(۷) فارسی یا سائنس (الف) فزکس (ب) کمسٹری یا ڈرائنگ۔

انگریزی کی شقوں کو اگر آپ علیحدہ مبحث نہ بھی تسلیم کریں تب بھی بقیہ جو مباحث کی تقسیم ہیں اُن کو تسلیم کرنا ہوگا۔ اس طرح کم و بیش ایک ۱۳ سالہ لڑکے کو ۱۱ مضامین پڑھنے پڑتے ہیں۔ پھر اگر اس کو "کندۂ ناتراش" نہ کہا جائے تو تعجب ہے۔

دوسرا نقص اس نصاب تعلیم کا جس سے اغراض تعلیم فوت ہوتے ہیں یہ ہے کہ مباحث کی کثرت، دریافت، احیاء جوہر کی مانع ہوتی ہے۔ مسٹر رچ کا خیال ہے کہ تعلیم کا اصل مقصد طلبا کی استعداد اور اُن کے جوہر کی کامل شگفتگی ہے۔ مگر یہاں بجائے شگفتگی کے استعداد و جوہر کی پژمردگی ہے۔

اِس تعلیم کا صحت پر جو اثر پڑ سکتا ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔

علاوہ بریں جو طریقۂ امتحان کا رکھا گیا ہے وہ دراصل امتحانِ قابلیت نہیں ہے بلکہ ابتلار و آزمایش ہے۔

ثانوی و اعلیٰ تعلیم کی عمومیت نے بھی ملک کو سخت نقصان پہنچایا چونکہ آج کل تعلیم کا اصل مقصد حصول ملازمت ہے اور اسکا اصل معیار سعی و سفارش اس لئے کسبِ صلاحیت و قابلیت کی طرف کسی کو توجہ نہیں ہوتی۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایسے لوگ بھی ثانوی مدارس اور دار العلوم سے امتحانات میں کامیاب ہو کر نکلتے ہیں جن کی قابلیت صرف کتابوں تک محدود رہتی ہے۔ آج کل زمانہ کسی ایک فن میں کمال پیدا کرنے کا ہے لیکن یہاں غرض تکمیل فن نہیں بلکہ تکمیل نصاب ہے پھر ایسی صورت میں کمال کیونکر پیدا ہو سکتا ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ آپ اپنا نصاب تمام تر مغربی اصول پر مرتب کیں۔ مگر ہاں یہ ضرور کہوں گا کہ خُذ ما صفا ودَع ما کدر، مغرب میں ابتدائی تعلیم لازمی ہے لیکن ہندوستان کی طرح ابتدائی تعلیم کے اوقات گنتی اور پہاڑوں میں بیکار صرف نہیں کئے جاتے بلکہ یہ ابتدائی دور صرف اس لئے معین کیا گیا ہے کہ اس زمانہ میں استاد لڑکے کے صحیح جوہر کا پتہ چلائے۔

ہندوستان میں بدترین اساتذہ (جنکو میانجی، یا منشی جی کہئے) ابتدائی مدارس کے لئے مقرر ہوتے ہیں۔ مغرب میں حالت بالکل اس کے خلاف ہے۔ بچوں کی تعلیم کے لئے صرف وہی اساتذہ مقرر کئے جاتے ہیں جو طفولیت کی عالم ذہنیت کے مطالعہ میں کافی وقت صرف کر چکے ہیں۔ اور جو جانتے ہیں کہ بچوں کے لئے کیا شے سبق آموز ہو سکتی ہے۔ یہاں لغو ولاطائل کتابیں صرف سازشوں کی بنا پر نصاب تعلیم میں داخل کر لی جاتی ہیں۔ مگر مغرب کا جو حال ہے آپ اُس کا صرف اس واقعہ سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ ۱۹۱۸ء میں لندن یونیورسٹی نے ایک کمیشن کا تقرر صرف اس لئے منظور کیا تھا کہ وہ سارے ملک کا دورہ کر کے بچوں سے دریافت کرے کہ وہ کس طرح کی نظمیں پسند کرتے ہیں۔ جب کمیشن کی رپورٹ شائع ہوئی تب نصابِ تعلیم میں ایک کتاب داخل ہوئی۔

میرا خیال ہے (اور اس میرے دعوے کے مؤید مغرب کے متعدد ماہرانِ تعلیم ہیں) کہ ابتدائی تعلیم کا دور مشکل ترین دور ہے اور اس کے لئے قابل ترین اساتذہ درکار ہیں۔ ایک مسن و معمر شخص سے یہ اخذ کر لینا نہایت آسان ہے کہ اس کا رجحانِ طبیعت کس طرف ہے اور وہ زندگی کے کس شعبہ کو بہت مرغوب سمجھتا ہے لیکن ایک ناسمجھ بچہ سے اخذ کرنا بہت دشوار ہے۔

استاد کا کام صرف اخذِ جوہر ہی نہیں ہے بلکہ "تربیت جوہر" بھی ہے۔ ہندوستان کے ہزارہا ہونہار بچے صرف اس لئے بڑے ہو کر ناکامیاب زندگی بسر کرتے ہیں کہ بچپن میں کسی نے اُن کے صحیح جوہر کا پتہ نہیں چلایا اور اگر چلایا بھی تو کوئی اُس کی تربیت کے لئے آمادہ نہ ہوا۔ ہندوستان میں پیشہ کا انتخاب صلاحیت و قابلیت پر مطلق موقوف نہیں ہوتا۔ کوئی غیر ارادۃً آبائی پیشہ اختیار کرتا ہے۔ کوئی مجبوراً۔ کوئی ملازمت کرتا ہے۔ کسی کی سہولت پسند طبیعت محض آرام طلب پیشوں کی طرف راغب ہوتی ہے۔ غرض یہ ایسی ابتدائی غلطی ہے جس سے ہندوستان کی کثیر آبادی تباہ و برباد ہے۔

تقریباً تمام مغربی ممالک میں ابتدائی تعلیم لازمی و جبریہ ہے اس کے بعد ثانوی مدارس میں صرف وہی طلبہ جاتے ہیں جن کی صلاحیت اس امر کی اجازت دیتی ہے۔ پرشیا (جرمنی) میں ثانوی تعلیم بھی جبریہ ہے لیکن وہی طلبا، ثانوی تعلیم حاصل کر سکتے ہیں جن کو سنڈیکیٹ اس قابل پاتی ہے۔ بیمار، غبی، مجہول العقل ثانوی تعلیم کے حصول سے ممنوع ہیں۔ اب ثانوی تعلیم جب ختم ہوئی تو پھر ایک انتخاب عمل میں آتا ہے۔ ہر شخص اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کر سکتا۔ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے خاص شوق علم ضروری ہے۔ اس پابندی کا ایک نہایت مفید نتیجہ یہ ہے کہ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے بعد جو طلباء نکلتے ہیں وہ اپنے فن میں کامل و ماہر ہوتے ہیں۔

جتنے مختلف مضامین کی تعلیم ہندوستان میں ہوتی ہے وہ مغرب میں ممکن نہیں۔ بسا اوقات ایسی پابندیاں بھی عاید کر دی گئی ہیں کہ ایک یا دو مضمون سے زیادہ طالب العلم نہیں لے سکتا۔ ایک طرف تو اس پابندی سے طلبا کو نامناسب مشقت ~~نہیں~~ اٹھانی نہیں پڑتی اور دوسری طرف ان کو تکمیل فن میں بیحد سہولت ہوتی ہے۔

ہماری غلامانہ ذہنیت صرف اسی تعلیم کو مفید سمجھتی ہے جس سے سرکاری ملازمت مل سکے لیکن مغرب میں چونکہ یہ معیار نہیں ہے اس لئے ہر شخص ہر فن کو بطور فن حاصل کرتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ مغرب میں ہر فن کے قدر داں ہیں۔ خواہ وہ معمولی لہو ولعب ہو یا اعلیٰ تعلیمی صیغہ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کامل الفن اپنی معاش کی طرف سے مطمئن ہو جاتا ہے۔

تلخیص ماسبق سے آپ پر یہ واضح ہو جائیگا کہ تعلیم کا مقصد احیاء و تربیت جوہر ہے اور اگر کوئی تعلیم ان مقاصد سے معرا ہے تو پھر وہ تعلیم نہیں ہے۔

(ریاست)

انگریزی

تہور کی غلطی

یَں نے یہ سنا کہ تہور نے غلطی سے کونین کی جگہ مارفیا کھالیا ہے تو مجھے تعجب ہوا۔ وہ میڈیکل کالج کا طالب علم تھا۔ یہ غلطی اس سے کس طرح سرزد ہوئی؟

بہر حال میں اس کے گھر پہنچا۔ وہ بیہوش تھا۔ ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ اس نے خدا جانے کیا کچھ پلایا۔ آدھ گھنٹے کے بعد تہور کو ہوش آیا۔ ڈاکٹر صاحب کا حکم تھا کہ اسے جگائے رکھو۔ اگر سو گیا تو پھر فیصلہ ہے یہ کہکر ڈاکٹر صاحب تو اپنی فیس لے کر رخصت ہوئے۔ میں نے اپنا کام شروع کیا۔

تہور میری طرف نیم وا آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔

میں نے کہنا شروع کیا۔

"سنو تہور۔ تم بال بال بچے۔ تم کیسے طالب علم ہو کہ کونین اور مارفیا میں امتیاز نہیں کر سکے"۔

تہور نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"افوہ! ایسا معلوم ہوتا ہے گویا میرے کانوں کے پاس شہد کی مکھیاں بھنبھنا رہی ہیں۔ مجھے سونے دو"۔

اور وہ سو گیا

میں نے سوچا۔ یہ تو بُری بات ہوئی۔ اس کو جگانے کی کیا تدبیر اختیار کی جائے۔ میں نے اُسے جھنجوڑا۔ وہ جاگ اُٹھا۔

افیون کا ست۔ ایک خواب آور دوا جو زیادہ تعداد میں خطرناک ثابت ہوتی ہے۔

میں نے بلند آواز میں کہا۔ "جاگو"

لیکن ابھی یہ لفظ میرے منہ ہی میں تھا کہ تہور پھر سو گیا۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ میں اس کے جسم کو جھنجوڑ کر اسے نہیں جگا سکتا۔ کوئی ایسی بات کرنی چاہیئے جو اس کے ذہن کو متاثر کرے۔ میں نے سوچنا شروع کیا۔ ایسی بات کیا ہو۔ آخر ایک بات سمجھ میں آگئی۔ تہور کے دل میں صنفِ نازک کی بہت عزت تھی۔ اگر کوئی دوست اُسے چھیڑنے کے لئے یہ کہدیتا کہ "تم صنفِ نازک کا احترام نہیں کرتے ان کے جذبات کو مجروح کر دیتے ہو" تو وہ لڑنے مرنے کے لئے تیار ہو جاتا۔

میں نے ایک فرضی قصہ گھڑا۔ ایکبار پھر اُسے جھنجوڑا۔ وہ جاگ پڑا۔ میں نے حقارت سے کہا "سنو تہور میں تمہارا دوست تھا۔ لیکن آج یہ معلوم ہوا ہے کہ تم اپنی دولت کے نشے میں صنفِ نازک کا احترام کرنا فراموش کر چکے ہو۔ جس دن سے تمہیں دولت ملی ہے اُس دن سے تم نے اپنی غریب منگیتر سے شادی کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ میں تمہیں نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھتا ہوں۔ تہور کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ اُس نے کمزور آواز میں کہا۔

"مجھے ذرا اُٹھ لینے دو۔ تمہاری ہڈیاں توڑ دونگا"۔

میں نے کہا "تم کیا ہڈیاں توڑو گے۔ مجھ سے بچے رہنا۔ کہیں صنفِ نازک کی ہمدردی کے جذبے سے متاثر ہو کر تمہارا لہو نہ پی جاؤں"۔

تہور نے بستر سے اُٹھنے کی ناکام کوشش کی۔ میں نے اُسے دھکیل کر پھر چارپائی پر گرا دیا۔

اُس نے کہا "تم میرے دوست تھے۔ لیکن آج سے دشمن ہو۔ یہ یاد رکھو میں اس توہین کا بدلہ لونگا"۔

اس طرح میں پندرہ بیس منٹ اُسے تنگ کرتا رہا۔ اس کے بعد وہ سو گیا۔ اب اُس کی نبض ٹھیک چل رہی تھی۔ پسینہ آ رہا تھا۔ جب وہ سو کر اُٹھا۔ تو اُس نے میری طرف ایک عجیب نظر سے دیکھا۔ پھر بولا۔

"میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے مجھے اپنے فرائض کا احساس کرایا۔ میں آج ہی اپنے گاؤں جاتا ہوں تاکہ اپنی منگیتر سے نکاح کر لوں"۔

حیرت سے میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

میں نے جو قصہ گھڑا تھا۔ وہ سچ نکلا۔ واقعی تہور نے اپنی غریب منگیتر سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

(ماخوذ)

از مہری

جاپانی

جاپانی شاعری کے چند نمونے

بہار کے دنوں میں تالاب اور جھیلیں پانی سے لبریز ہو جاتے ہیں۔ اور موسم گرما چاروں طرف پہاڑ کی عجیب چوٹیوں سے اپنے بادل آویزاں کر دیتا ہے۔ خزاں میں چاند اپنی روشن ترین کرنیں نچھاور کرتا ہے۔ لیکن سردیوں میں صرف ایک سبز شے نظر آتی ہے اور وہ صنوبر ہے۔

جب بہار باغ کے ہر درخت کو معطّر کر دے تو میں اپنے گلدستے کے لئے کسی ایک پھول کا انتخاب کس طرح کروں؟

اگر ہم غیر ملکی لوگوں کو دور۔ دھندلے کناروں پر۔ کو نیو کی فصل گل کی خوبصورت صبح کا منظر دکھا سکتے۔ اس طرح کہ تاباں کی خوشبو کو معطر کر رہی ہو۔ تو یقیناً وہ بھی اس حسین سرزمین کے لئے بیقرار ہو جاتے۔

اطالوی

آرزو

اگر آپ دن بھر انسانوں کی گفتگو سُنتے رہیں تو آپ پر روشن ہو جائیگا کہ اس دنیا میں ہر شخص کسی ایسی بات کی آرزو اپنے دل میں چھپائے ہوئے ہے جس کا حصول اُس کے لئے ناممکن ہے۔ ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ نہ پوری ہونے والی آرزوئیں غیر مفید ہیں۔ مضحک ہیں۔ لیکن پھر ہر شخص اس قسم کی آرزوؤں کا شکار ہو جاتا ہے۔ قارون کی دولت۔ چنگیز کی طاقت۔ سرکشیا کا حسن حاصل کرنے کی خواہش ہر دل میں موجود ہوتی ہے۔ میں اس بات کے متعلق کچھ نہیں کہنا چاہتا کہ ناممکن آرزوؤں کی طرف مائل ہونا ذہن انسانی کے تنزل کی نشانی ہے۔ لیکن میں اپنے دوستوں کو یہ مشورہ ضرور دونگا۔ کہ تخیل کی اس آوارگی کا زیادہ دیر تک شکار نہ ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو شخص اس پروازِ تخیل کا دلدادہ ہے۔ اور جو اپنے خیالات کی روانی کو نہیں روک سکتا وہ شخص اُس قوتِ عمل کے ایک بڑے حصے سے محروم ہو جائیگا جو پیکارِ حیات میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے۔

جرمنی

ظرافت اور ابتذال

عام طور پر ادب کو مبتذل عناصر سے پاک رکھا جاتا ہے اور جس مصنف کی تحریروں میں اس قسم کے عناصر پائے جائیں جن میں ابتذال کا رنگ جھلکتا ہو اُسے بدذوق کہنے میں تامل نہیں کیا جاتا۔ لیکن ظریفانہ تحریروں میں عناصر کے استعمال کی اجازت ہے۔ مشاہدے میں آیا ہے کہ خوش اطوار۔ مہذب۔ خوش ذوق حضرات بھی اکثر فطرت کے قبیح لیکن بگڑے ہوئے مرقعوں پر ہنستے ہیں۔ اس کے علاوہ خوش ذوق اور خوش اطوار اور معمولی لوگوں کے رویے میں جو اختلاف ہوتا ہے اُس کا اظہار بھی لبعض اوقات ہنسی کا موجب ہوتا ہے۔ پھر اکثر ڈراموں اور ناولوں میں واقعہ نگاری کو مدِ نظر رکھتے ہوئے بدذوق اشخاص کی گفتگو کو اصلی رنگ میں پیش کرنا پڑتا ہے۔ اس واقعہ نگاری کو بدذوقی نہیں کہا جا سکتا۔ ارسٹوفینس کے بہت سے ڈرامے اس قسم کے مناظر سے بھرے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مجھ کو "تتبع مضحک" (Parody) میں لطف آتا ہے

ناروے

پریوں کی کہانیاں

نقادوں نے "پریوں کی کہانیوں" کی بڑی بڑی قسمیں مندرجہ ذیل قرار دی ہیں:-

"شعری" "اخلاقی" - "ظریفانہ" - "متصوفانہ" بعض کہانیاں ایسی ہوتی ہیں جن میں مندرجہ بالا قسموں کا مجموعہ سمجھا جاتا ہے۔ بعض کہانیاں ایک ملک سے دوسرے ملک میں پہنچ کر غیر ملک کا لباس پہن لیتی ہیں۔ لیکن ناروے کی وہ کہانیاں جنہیں "منظری" کہا جاتا ہے۔ اپنی نوعیت نہیں بدلتیں۔ ناروے میں اس قسم کی کہانیاں عام ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ یہاں کی کہانیوں میں ایسے فطرتی مناظر کا ذکر آتا ہے جو ناروے سے خاص ہیں۔ اور اس طرح فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ کہانیاں "ناروے" کے مصنفین کی طبعزاد ہیں یا دوسرے ملکوں سے آئی ہیں۔

سنڈنگ کی ایک تصویر میں ایک لڑکے کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ وہ دہشت زدگی کے عالم میں ایک تاریک اور سنسان جنگل میں سے بھاگ رہا ہے۔ جنگل کے سایوں۔ ہوا کی سنسناہٹ۔ خاموشی۔ درخت کی جڑوں نے کسی بلا یا مافوق الفطرت وجود کی صورت اختیار کر لی ہے جو لڑکے کو اپنے چنگل میں دبوچنا چاہتا ہے۔

یہ "منظر" خاص ناروے کی منظری کہانیوں کا "منظر" ہے۔

(ناروے) جوہن بوجر

روسی

ادب

تمام ادبی تخلیقات۔ نثر سے متعلق ہوں یا شعر سے۔ اُن احساسات اور تخیلات میں غرق ہوتی ہیں جن میں بنی نوع انسان مشترک طور پر حصہ دار ہیں۔

پیدائش کے راز کو حل کرنے کے بعد ہم موت کے راز میں غرق ہو جاتے ہیں۔ ہم کو ایک عظیم الشان مقام پر پھینک دیا گیا ہے۔ ہم اس مقام کو "کائنات" کہتے ہیں۔ لیکن ہمیں اس عجیب شے کے متعلق کوئی صحیح علم نہیں۔ ہماری تنہائی بے مثال ہے۔ اس خوفناک تنہائی کا مکمل احساس بہت کم لوگوں کو ہوتا ہے۔ لیکن یہ احساس کسی نہ کسی صورت میں ہر شخص کے دل میں موجود رہتا ہے۔ اس احساس کا اظہار اور اس کے پیدا کردہ اندوہ کا بیان بھی ادب کا ایک موضوع ہے۔ انگلستان کا بائرن۔ اطالیہ کا لیونارڈ و ادبی انتہائی کے شاکی ہیں۔

(میکسیم گورکی)

پشتو

غرض مندی

اگر تو دوسروں سے کچھ غرض نہ رکھے تو کوئی تجھ سے غرض نہ رکھیگا۔ جس شخص کو دریا سے کچھ غرض نہیں اُسکی کشتی نہیں ڈوبتی۔ تنہائی پسند خلوت میں آرام سے ہے۔ شہرت پسندوں کو غرض نے رسوا کیا ہے۔ دنیا بے وقوفوں کی بستی ہے۔ عقلمند کو دنیا سے کوئی غرض نہیں۔ رحمان میں دردِ محبت میں بیقرار ہونے پر بھی اسطرح خاموش ہوں کہ مجھے دوا سے کوئی غرض نہیں۔

(دیوان رحمان) غفار دانیالوی

فارسی

شجاعت

ہمارے علما کی تعلیم ہے کہ جو شخص خطرے کے وقت لڑائی کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ اس کی حماقت کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ یا تو وہ اپنے دشمن کو مغلوب کر لیتا ہے۔ اور اُسے مار ڈالتا ہے۔ یا دشمن اُسے موت کے گھاٹ اُتار دیتا ہے۔ اگر وہ اپنے دشمن کو جامِ موت پلاتا ہے تو سمجھ لینا چاہئے کہ اُس کے ذمے بیگناہ کا خون ہے اور اس قتل کی سزا اُسے ضرور ملیگی۔ اگر اُس کا دشمن غالب ہوا تو اس کیلئے دوزخ کا دروازہ کھلا ہے۔ اِن حالات میں یہ کہاں کی دانائی ہے۔ کہ آدمی ایسا کام کرے جس کا نتیجہ ناکامی اور عذاب ہو!

عبید زاکانی

سنسکرت

اقوالِ صائبہ

گنہگار یہ سمجھ کر گناہ کرتا ہے کہ وہ واقعات سے مجبور ہے۔

دانا لوگ جوئے کو۔ عورتوں کی محبت کو شراب کو خطرناک تصور کرتے ہیں۔ لیکن دیکھا جاتا ہے کہ یہی لوگ اِن چیزوں کے دلدادہ بھی ہوتے ہیں۔

مرد ہو یا عورت۔ جوان ہو یا بوڑھا۔ وقت سب کے ساتھ یکساں سلوک کرتا ہے۔

آدمی کو بڑھاپے یا موت سے کوئی شے نہیں بچا سکتی۔ دوا مقدس کتابیں۔ جادو۔ سب بیکار ثابت ہوتا ہے۔

کوئی کسی کا نہیں۔ ہم جو اپنے رشتہ داروں سے ملتے ہیں۔ تو ہماری مثال ان مسافروں کی سی ہے جو چوراہے پر ملیں۔

یوگوسلیویا

انسانی زندگی کا انجام

انسانی کشمکش کا انجام موت ہے۔ قبر میں دنیا کے تمام افکار محو ہو جاتے ہیں۔ ہماری رُوح کے کمزور جہاز کے لئے ایک اور بیکراں سمندر پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ سمندر ایک پُر اسرار شے ہے جسے فانی آدمیوں کی آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں۔ گہوارے سے لیکر گور تک انسان بہت کم حقیقتوں کا ادراک کر سکتا ہے۔ اور موت کے بعد کے واقعات کا تو تصور بھی نہیں کر سکتا۔ جب ہم موت کے بعد کے واقعات سے بحث کرتے ہیں تو ہماری گفتگو بچوں کی بے معنی بکواس سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔

قبر کا کتبہ ہمارے نقوشِ قدم میں سے آخری نقش ہے۔ ذرا قبر کو کھود دو۔ اور دیکھو۔ وہ ذہانت۔ وہ قوتِ استدلال کہاں گئی؟

یہ چیزیں قبر میں نہیں ہیں!
وہ حسن۔ دولت۔ شہرت کہاں گئی!

یہ چیزیں بھی قبر میں نہیں ہیں۔
یہ چیزیں اس طرح محو ہو گئیں جس طرح رات کی خاموشی میں اُلو کی چیخ غائب ہو جاتی ہے۔ ہوا کی طرح۔ دھوئیں کی طرح۔

(ولیسوک)

ہندوستانی لڑکوں اور لڑکیوں کا باتصویر ہفتہ وار رسالہ

پریم

علامہ تاجور اور پروفیسر چرنجی لال ایم اے دہلوی کی ایڈیٹری میں شائع ہوتا ہے اس اخبار کی امتیازی خصوصیات جنپر اسوقت تک یہ رسالہ کاربند رہا ہے حسب ذیل ہیں

(۱) نہایت سادہ سلیس اور ایسی عام فہم زبان استعمال کی جاتی ہے کہ چھوٹے چھوٹے بچوں کی سمجھ میں آسکے (۲) بچوں کی زبان میں بچوں کیلئے ایسی کہانیوں کا سلسلہ جن کے ذریعہ شہری زندگی کے ہر شعبے کے متعلق ہر قسم کی معلومات کا ذخیرہ غیر محسوس طور پر اُن کے دماغ میں منتقل کیا جاسکے (۳) پریم سبھا کے عنوان کے تحت ہم جماعتوں کی پرمذاق باہمی گفتگو کے ذریعے بچوں کو مضمون نویسی وخطوط نویسی۔ اُردو کی تذکیر وتانیث اُردو الفاظ کی املا کی درستی۔ ضروری گرام۔ ادب اخلاق تاریخ وجغرافیہ۔ سائنس۔ بڑے چھوٹے اور برابر والوں سے گفتگو کے آداب کی ایسے دلچسپ طریقے سے تعلیم دینا کہ بچے محسوس بھی نہ کریں کہ ہم کوئی سبق پڑھ رہے ہیں۔ (۴) موجودہ کورسوں نے بچوں کے جذبہ ظرافت (ہیومرس نیچر) کو مٹا دیا ہے۔ اس جذبہ کو ایسی نتیجہ خیز اور پرمذاق کہانیوں کے ذریعے بچوں میں پیدا کرنا جو شریفانہ مذاق کی حد سے باہر نہ ہوں (۵) ایسے پرمعلومات اور دل لبھانے والے مضامین شائع کرنا جو بچوں میں اُردو ادب کیلئے پیاس پیدا کریں۔ (۶) آسان آسان اور ایسی رس بھری زبان میں چھوٹی چھوٹی نظمیں چھاپنا جو بچوں کیلئے سبق آموز ہونے کے علاوہ دماغی تفریح کا باعث ہوں (۷) بچوں میں مذہبی رواداری اور مذاہب و رہنمایان پیشواؤں کی عزت کے پاکیزہ جذبات پیدا کرنا (۸) اخبار جس محنت اور غور کے ساتھ ترتیب دیا جاتا ہے۔ اس کا اندازہ اس سے ہوسکیگا کہ ہر فقرے کو بہت سے فقروں سے انتخاب کرکے جانچ تول کر مضمون درج کیا جاتا ہے۔ ایڈیٹر کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ اخبار کے تمام مضامین کے ہر فقرے کے متعلق یہ بتاسکتا ہے کہ یہ فقرہ کیوں درج کیا گیا۔ اور اس کے بجائے کوئی فقرہ کیوں نہ استعمال کیا گیا۔ (۹) اس اخبار کو جس نوعیت سے ترتیب دیا جاتا ہے اس کے متعلق ہماری رائے ہے کہ متوسط ذہانت کا ایک بچہ سال بھر بغور پڑھکر اُردو معلومات میں انٹرنیس کے طالب علم کی برابری کرسکیگا۔

ذیل میں اس کے متعلق بہت سی رایوں میں سے چند رایوں کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے

اخبار ٹریبون لاہور۔ پریم لڑکوں اور لڑکیوں کا ہفتہ وار باتصویر رسالہ ہے، جو مشہور اُردو شاعر مولانا تاجور نجیب آبادی کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔ سٹاف میں مولانا موصوف کے علاوہ لالہ چرنجی لال ایم اے دہلوی آنریری ایڈیٹر کا اسم گرامی قابل ذکر ہے۔ لکھائی، چھپائی دیدہ زیب۔ طرز ادا صاف زبان سادہ جسے ہر اُردو خواں بآسانی سمجھ سکتا ہے۔ مضامین آسان دلچسپ اور بچوں کے لئے ہر طرح سے موزوں وسبق آموز ہیں رسالہ کی قابل ذکر امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ ہر قسم کے فرقہ وارانہ مضامین سے پاک ہے۔ اسکا واحد مقصد یہ ہے کہ بچوں میں اخوت وہمدردی کے پاکیزہ ترین جذبات پیدا کئے جائیں۔ ٹریبون ۲۴ جنوری ۱۹۲۶ء

جناب ڈاکٹر شیخ محمد اقبال ایم اے پی ایچ ڈی۔ بچوں کا یہ ہفتہ وار باتصویر رسالہ مولانا تاجور نجیب آبادی کے زیر ادارت شائع ہوتا ہے۔ اس کے جاری کرنے سے فاضل ایڈیٹر کا مقصد یہ ہے کہ ہندو مسلم بچوں کے دلوں میں ابتدا عمر سے ہی باہمی اتحاد اور الفت کا بیج بو دیا جائے۔ کسی کو یہ کہنے میں تامل نہ ہوگا کہ یہ مقصد نہایت قابل عزت ہے، مولانا تاجور زبان اُردو کے مشہور ادیب اور نقاد ہیں اور مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ انکی نگرانی میں جو مضامین چھاپے جائینگے وہ ضرور بلحاظ لفظی اور معنوی خوبیوں کی اعلیٰ معیار کے ہونگے

خان بہادر میر ناصر علی خانصاحب ایڈیٹر صلائے عام دہلی۔ یہ رسالہ پریم بظاہر تو بچوں کیلئے سمجھا جاتا ہے مگر میں بوڑھا بھی اسے جی لگا کر پڑھتا ہوں۔ شاید اس وجہ سے کہ مزاج میں بوڑھا اور بچہ ایک سمجھا جاتا ہے رسالہ پریم کے اہتمام چھپائی اور کاغذ کی تعریف تو بیکار ہے ان خوبیوں کا جواب مشکل ہے۔ مگر اسکے مضامین کی خوبی بھی لاجواب ہے جنکو پڑھکر بچے تو بچے جوان اور بڈھے بھی خوش

حضرت خواجہ حسن نظامی کے روزنامچے سے۔ بچے اور عورتیں اس کو نہایت شوق سے پڑھتے ہیں اور اس کے آنے کی راہ دیکھا کرتے ہیں۔ بہت ہی خوبصورت اور رنگین باتصویر رسالہ ہے کہ اس کے ایڈیٹر طبع انسانی کے فلسفہ کو خوب سمجھتے ہیں۔

خان بہادر شیخ نور الٰہی صاحب ایم اے آئی ای ایس ڈویژنل انسپکٹر مدارس لاہور ڈویژن۔ میری رائے میں رسالہ پریم ہندوستانی بچوں کیلئے بہت مفید دلچسپ اور کارآمد ہے۔ خصوصاً اس کا یہ پہلو کہ مختلف قوموں کے بچوں کو رواداری اور محبت کی تعلیم دیتا ہے۔

مولوی احمد عبداللہ خاں صاحب ارشد نے مرکنٹائل پریس ریلوے روڈ لاہور میں چھپکر دفتر ادبی دنیا کشمیر بلڈنگ میکلوروڈ لاہور سے شائع کیا۔

۷۸۶

رجسٹرڈ...... ایل نمبر ۲۴۸۲

فہرست مضامین

جلد ۴ — بابت ماہ نومبر سنہ ۱۹۳۰ء — نمبر ۵

تصاویر :- (سہ رنگی) وادئ کانگڑہ - (۲) محوِ خیال - (۳) رفتۂ خواب - (۴) سید حسن برنی بی - اے - ایل ایل بی - (۵) آنریبل ملک فیروز خاں نون (۶) آنریبل ڈاکٹر گوکل چند نارنگ - (۷) غالب -

حال وقال

ادبی دنیا کے غیر مقامی اسٹاف کے متعلق جو اعلان کیا گیا تھا اُسے پڑھکر ملک کے بہت سے مشہور اہلِ قلم نے اپنی خدمات پیش کی ہیں۔ ابھی کچھ ناموں کا انتخاب باقی ہے۔ جن حضرات کے متعلق فیصلہ ہو چکا ہے اُن کے اسمائے گرامی شایع کئے جاتے ہیں،۔

سیّد حسن برنی۔

ملک کے مشہور گراں پایہ مصنف سیّد حسن برنی۔ بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی ایڈووکیٹ کا نام محتاجِ تعارف نہیں۔ اُن کی بے نظیر تالیف "البیرونی" انجمن ترقی اردو کی چند مفید ترین مطبوعات میں سے ہے۔ البیرونی کو جنہوں نے مبصرانہ نگاہ سے پڑھا ہے وہ حسن برنی کی مورخانہ تحقیق و تدقیق کی داد دے سکتے ہیں۔

ادبی دنیا اپنی اِس خوش طالعی پر جتنا بھی فخر کرے بجا ہے۔ کہ سیّد حسن برنی جیسا منتخب انشا پرداز، مایۂ ناز مصنف اور سحر طراز ادیب اِس کے عملۂ ادارت میں شامل ہے۔

سیّد صاحب موصوف نے ایک خاص پروگرام مرتب فرمالیا ہے آئندہ اُن کے تنقیدی تاریخی اور علمی مقالات ادبی دنیا میں مسلسل شایع ہوا کریں گے۔ ہم سیّد صاحب موصوف کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ کہ اُنہوں نے اپنی گوناگوں مصروفیتوں کے باوجود اپنی خدمات کا کوئی معاوضہ لینا منظور نہیں فرمایا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ شاید اُنھوں نے ہماری ضروریات کو عریاں شکل میں دیکھ لیا ہے۔

مسٹر کنھیالال۔ ایم۔ اے۔

مشہور اردو رسالہ چاند کے ایڈیٹر مسٹر کنھیالال صاحب ایم اے ایل ایل بی ایڈووکیٹ الہ آباد نے ادبی دنیا کے حصّہ "دنیائے ادب" کے لئے مختلف زبانوں سے ترجمہ اور اقتباس کا کام اپنے ذمہ لیا ہے۔

صاحب موصوف کے مفید مضامین کی زبان اردو کی بجائے ہندوستانی ہوتی ہے۔ یعنی مروجہ حجازی اردو کے بدلے وہ عام فہم سلیس، اور سادہ زبان میں مضمون نگاری کرتے ہیں۔ اور یہی ادبی دنیا کا مقصدِ اشاعت ہے۔ آپ نے بھی اپنی خدمات بلامعاوضہ پیش کی ہیں۔

مولٰینا سجاد میرٹھی۔

مولوی فاضل پنجاب یونیورسٹی۔ فاضل دیوبند۔ کے عربی ادب سے مترجمہ مضامین ادبی دنیا میں اکثر شائع ہوتے رہتے ہیں۔ آئندہ وہ غیر مقامی عملۂ ادارۃ کے رُکن کی حیثیت سے ادبی دنیا کے لئے مستقل طور پر مصر و بیروت کے مجلۃ الہلال۔ المقتطف، الزہرا۔ الکلیۃ اور دیگر معیاری رسالوں سے بلند تر ین مضامین کا ترجمہ کیا کریں گے۔

حضرت خواجہ حسن نظامی کا ایک بلند پایہ مضمون موصول ہو چکا ہے آئندہ آپ کے بیش بہا مضامین مسلسل شائع ہوا کریں گے۔

خواجہ صاحب کا اندازِ تحریر اپنی شگفتگی، دل آویزی اور حسن آفرینی کے اعتبار سے نقاد کے تجزیے سے بالاتر ہے۔ اُن کے الفاظ اور معانی میں ایسا موزوں رابطہ ہے کہ فنِ تنقید زعم ہمہ دانی کے باوجود اُن کے دارِ بزم فن کے سامنے عاجز نظر آتا ہے۔ عموماً اہلِ قلم ایفائے عہد کو وہ اہمیت نہیں دیتے جو مذہب میں اُسے حاصل ہے لیکن خواجہ صاحب کے متعلق ہم اپنے ناظرین کو یہ اطمینان دلا سکتے ہیں۔ کہ اُن کے وعدے ایفا ہونگے۔ ایک مذہبی رہنما ہونے کی حیثیت سے ہم بجا طور پر اُن سے یہ توقع کر سکتے ہیں۔

اِس اشاعت میں آنریبل ڈاکٹر گوکل چند نارنگ اور آنریبل ملک فیروز خاں نون کی تصاویر شائع ہو رہی ہیں۔

نئے انتخاب کے بعد حکومت خود اختیاری کا قلمدانِ وزارت ڈاکٹر صاحب موصوف کے سپرد کیا گیا ہے۔ ملک صاحب موصوف وزیرِ تعلیم مقرر ہوئے ہیں۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ اِس سے بہتر انتخاب نہ ہو سکتا تھا۔

ڈاکٹر صاحب اپنی قانون دانی۔ تدبّر اور قوتِ بیان کے لئے مشہور ہیں۔ اِن کی ذات سے ملک کی بہت سی توقعات وابستہ ہیں۔

ہم ڈاکٹر صاحب موصوف کے انتخاب پر اِس لئے بھی زیادہ مسرور ہیں کہ وہ ایک قابلقدر اردو شاعر ہیں۔ شاید یہ بات عام طور پر اہلِ علم و ادب کو معلوم نہ ہو۔

ملک صاحب موصوف اپنے سیاسی تجربے۔ گزشتہ کامیاب وزارت اور اپنی فراست و بیدار مغزی کے باعث ہر دلعزیزی حاصل کر چکے ہیں۔

آنریبل سر جوگندر سنگھ وزیر زراعت انگریزی کے مشہور انشا پرداز ہیں۔

زراعتی محکمے میں اِن کے دیرینہ کامیاب تجربے۔ اِن کی شہرت، اِن کی مسلمہ قابلیت نے اِن کو اِس معراجِ سیاسی پر پہنچا دیا۔ کہ وزارت کے اعزاز کے لئے اُن کا کوئی حریف نہیں ہوا۔

چند مفید تجاویز۔

ادبی دنیا کو زیادہ سے زیادہ مفید، دلچسپ اور شاندار بنانے کا خیال ہمیں آٹھ پہر گھیرے رہتا ہے۔ آئے دن نت نئی تدبیریں سوچتے ہیں۔ اور مقدور بھر اُن پر عمل کرتے ہیں۔ گزشتہ ڈیڑھ سال میں ایک دن بلکہ ایک لمحہ بھی ایسا نہیں آیا جب ہم نے ادبی دنیا کو ہر حیثیت سے مکمل اور آراستگی و پیراستگی سے بے نیاز سمجھا ہو۔

اِس اشاعت سے ہم نے "تنقیدِ شعری" کے لئے ایک صفحہ وقف کر دیا ہے۔ اِس کا مقصد یہ ہے کہ ملک کے نوجوانوں میں صحیح ذوقِ شعر پیدا کیا جائے اور اُن کو اِس بات سے آشنا کیا جائے کہ آرٹسٹ اپنی تخلیقات کو کیسے نادر معانی سے لبریز کر دیتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ عام طور پر نوجوان شعر کو "تفریحِ خیال" کرتے ہیں۔ اُن کو یہ خیال ہی نہیں آتا کہ اچھے شعر کے الفاظ و تراکیب اپنی خیال آفرینی کے اعتبار سے بے نظیر ہوتے ہیں۔ اِن میں یہ قوت ہوتی ہے کہ پڑھنے والے کے دل میں ایک سلسلۂ خیال پیدا کر دیں۔ کوشش کی جائیگی کہ اِس صفحے میں فن کے اُن تمام نکات کا لحاظ رکھا جائے جو شعر سے مخصوص ہیں۔ اور خالص جمالیاتی نقطۂ نظر سے تنقید کی جائے۔ اِس سلسلے میں ہم نے پہلے غالب کا ایک شعر انتخاب کیا ہے۔ ہم اپنے ناظرین سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اِس سلسلے میں ہماری مدد کریں۔ بلند پایہ شعر ارسال کریں۔ اگر وہ ہمارے معیار پر پورے اُترے تو صفحۂ جمیل پر شائع کئے جائیں گے۔ اور دوسرے صفحے پر اُن کی تنقید و تفسیر شائع کی جائیگی۔

ہم نے محسوس کیا ہے کہ اردو میں کثرت سے غلط الفاظ اور تراکیب رائج ہو گئی ہیں۔ اردو انشا پردازوں کا ایک گروہ ایسا بھی ہے جو عربی اور فارسی سے ناواقفِ محض ہونے کے باوجود اپنی تحریروں میں کثرت سے عربی اور فارسی الفاظ و تراکیب کا استعمال کرتا ہے۔ اُس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بعض الفاظ بے محل استعمال ہو جاتے ہیں۔ اِس کے علاوہ عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ الفاظ کا غلط تلفظ عام ہوتا جا رہا ہے۔ ہم کوشش کرینگے کہ وقتاً فوقتاً ایسے الفاظ کی تشریح کرتے رہیں۔ تاکہ اردو خواں حضرات معمولی غلطیوں اور فروگذاشتوں سے محفوظ رہیں۔

ہم مسرت سے اِس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ افسانوں اور ڈراموں کے متعلق ادبی دنیا جس مقصدِ اعلیٰ کو منتہائے نظر بنائے ہوئے تھا وہ پورا ہوتا نظر آرہا ہے۔ اربابِ علم و فن نے غور کیا ہوگا کہ ادبی دنیا میں ایسے افسانے جن کا مرکزی جذبہ ہوس یا محبت کا تاریک پہلو ہو شائع نہیں ہوتے۔ اِس قسم کے افسانوں کی اشاعت سے بھی پرہیز کیا جاتا ہے۔ جن میں کوئی عنصر مخربِ اخلاق ہو۔ ہم خوب سمجھتے ہیں۔ کہ ادب کا مقصد تخلیقِ حسن ہے۔ اور کوئی ادبی تحریر خالص اخلاقی نقطۂ نظر سے نہیں جانچی جا سکتی۔ اکثر ادب میں تضاد و توازن کی خاطر . . . . . . زندگی کے تاریک اور گناہ آلود پہلو بھی دکھائے جاتے ہیں۔ لیکن اُن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ نیکی اور حسن کو زیادہ درخشاں رنگوں میں پیش کیا جائے۔

سب کچھ سہی لیکن ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ "صنعت محض صنعت کی خاطر" کا نظریہ صحیح ہے۔ ادب تفسیر و تصویرِ حیات ہے۔ اور نمودِ حیات کی طرح اپنے مظاہر میں لامحدود۔ مگر زندگی اعلیٰ ترین اخلاق کے اصول پر قائم ہے۔ اور جو ادیب اخلاق کے اصول سے بے پروائی برتیگا وہ گویا زندگی سے بے پروائی برتنے کا مرتکب ہوگا۔ اِس اعتبار سے اُس کا ادب کسی طرح "ادبِ عالیہ" نہیں کہلا سکتا۔ اِس بات کو مدِ نظر رکھتے

ہوئے ہم صرف وہ افسانے شائع کرتے ہیں جو ہر طرح ہمارے معیار پر پورے اُتریں۔ آج سے پانچ چھ ماہ پہلے ہمارے ناظرین شکایت کرتے تھے کہ ہمارے افسانے روکھے پھیکے ہوتے ہیں۔ لیکن اب اس قسم کے خطوط آرہے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ عام طور پر ذوقِ ادب شگفتہ ہوتا جارہا ہے۔ اور مذاقِ سلیم نکھر رہا ہے۔ ادبی دنیا کے وہی خریدار جو افسانوں کو خشک کہتے تھے اب اُن کی تعریف کرتے ہیں۔

ہم خوش ہیں کہ ہم نے افسانوں کے متعلق ذوقِ عام کو بلند کرنے میں کچھ مفید کام انجام دیا ہے۔

ادبی دنیا کی نظمیں بھی ایک خاص معیار کو مدِ نظر رکھکر فکر کی جاتی ہیں اہلِ علم کی رائے میں ان نظموں کی شان نرالی ہوتی ہے۔ حیات افروز۔ رنگ آفریں اور بلند پایہ نظمیں شائع کرنا ادبی دنیا کی خصوصیت ہے۔

"عمر خیام اور اُس کا عہد" دو تین قسطوں کی اشاعت کے بعد تکمیل تک پہنچ جائیگا۔ اور کتابی صورت میں شائع کیا جائیگا۔ اہلِ نظر نے اس مضمون کے متعلق حوصلہ افزا خطوط ارسال فرمائے ہیں۔

بنگال سے مولینا حبیب اللہ کا نوازش نامہ موصول ہوا ہے جس میں اُنہوں نے اِس مضمون کو بنگالی میں ترجمہ کرنے کی اجازت طلب کی ہے۔ اِس قدردانی کے لئے ہم اُن کے ممنون ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ابھی تک اردو میں فنِ تنقید کے شاہکار بہت کم ہیں۔ اِس بات کی ضرورت شدّت سے محسوس کی جارہی ہے کہ مشہور شعرا کے کلام پر انگریزی اصول کی روشنی میں مفصل اور تعمیری تنقید کی جائے۔ تاکہ عام اردو خواں حضرات میں صحیح ذوقِ تنقید پیدا ہو اور وہ خود اچھا شعر پڑھکر اپنے دل میں یہ طے کرسکیں کہ شعر میں کیا بات تھی جو اُن کے دل کو گرما گئی۔

فلسفۂ قدیم و جدید پر جو سلسلۂ مضامین پروفیسر یوسف سلیم نے شروع کیا ہے۔ اُسے اربابِ بصیرت نے بہت پسند فرمایا ہے۔ ہم پروفیسر صاحب موصوف کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انہوں نے اندازِ بیان ایسا شگفتہ اختیار کیا ہے۔ کہ دلچسپی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔

اس ایک مضمون کی بنا پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ادبی دنیا خالص علمی رسالوں سے کسی طرح پیچھے نہیں ہے۔

آجکل سرگودھا میں راولپنڈی ڈویژن کی تعلیمی کانفرنس کا اجلاس ہو رہا ہے۔ ڈویژن کے تمام ہیڈ ماسٹر۔ ڈسٹرکٹ انسپکٹران مدارس اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ مدارس اور تعلیمی معاملات میں دلچسپی لینے والے حضرات شریک ہیں۔ اجلاس میں تعلیم کے متعلق بیش بہا تجاویز منظور کی گئیں۔ اس کے علاوہ طریقِ تعلیم اور نظامِ کار کے متعلق مفید مباحثے ہوئے۔

مقامِ مسرت ہے کہ عام پبلک نے بھی اِس مفید کام میں بڑھ چڑھکر حصّہ لیا۔ ہندوستان میں جہاں عام طور پر تعلیم کا فقدان ہے عام لوگوں کا تعلیمی معاملات میں دلچسپی لینا ظاہر کر رہا ہے کہ ملک کی حالت سُدھر رہی ہے

مولینا تاجور کو بھی دعوتِ شرکت دی گئی تھی۔ آپ نے ایک مضمون "دیسی زبانیں اور محکمۂ تعلیم" پڑھا جو بہت پسند کیا گیا۔

جو مفید اور بیش بہا مضامین کانفرنس میں پڑھے گئے ہیں ہم اُن کے حاصل کرنے کا انتظام کر رہے ہیں۔ اور امید ہے کہ وقتاً فوقتاً اُنہیں شائع کرتے رہینگے۔

ملک محمد الدین صاحب اڈیٹر صوفی نے ہمیں اطلاع دی ہے کہ اُنہوں نے لاہور میں اپنے روشن دماغ فرزند ملک محمد اسلم ایم۔ اے کی زیرِ نگرانی ایک اردو اکیڈیمی قائم کی ہے جس کا مقصد اردو کی بلند پایہ کتابوں کی اشاعت ہوگا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اِس قسم کے اداروں کے قیام سے ادب کو بہت فائدہ پہنچتا ہے۔ اور دست بدعا ہیں کہ ملک صاحب کی مساعی مشکور ہوں۔

اپنے مضمون نگاروں کی خدمت میں ہم پھر عرض کرتے ہیں کہ مضمون کاغذ کے صرف ایک صفحے پر لکھا کریں۔ بعض حضرات اپنا مضمون واپس منگوانے کیلئے خط لکھتے ہیں تو مضمون کا نام لکھنا بھول جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں اڈیٹر کو بہت پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ خط میں مضمون کا نام ضرور ہونا چاہیئے۔

ادارہ

آئینۂ عالم

ایک قدیم کھوپری

جزیرہ سن نکولاس کے جنگل میں، جو ریاستہائے متحدہ امریکہ کے مغربی ساحل کے قریب واقع ہے، حال ہی میں ایک انسانی کھوپری دستیاب ہوئی ہے جس کی داہنی کنپٹی میں تیر کی نوک ہنوز پیوست ہے، یہ کھوپری نہایت پُرانی ہے۔ غالباً طوفانِ نوح سے پہلے کی ہے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ کے وحشیوں میں نہایت قدیم زمانہ سے تیر اندازی کا فن موجود ہے۔

تصویرِ گویا

شعرا کو پہلے زمانہ میں یہ دقت محسوس ہوتی تھی کہ قاصد حالِ دل حسبِ دلخواہ نہیں بیان کر سکتا تھا۔ برلن کے کاریگروں نے ایسا فونوگراف ریکارڈ بنایا ہے جو فوٹوگراف بھی ہے۔ جس شخص کی تصویر لیجائے اُس کی آواز بھی فوٹو پر نقش یا ثبت ہو سکتی ہے۔ اِس طرح آپ اگر کسی دوست کو کوئی پیغام پہنچانا چاہیں تو اپنا فوٹو ریکارڈ بھیجدیجئے۔ آپ کا دوست پہلے آپ کے فوٹو سے مسرور ہوگا۔ پھر اُس کو باجہ کی گردش کناں پلیٹ پر رکھدیگا تو تصویر زبانِ حال سے خود "حالِ دل" بیان کرنے لگیگی۔ غالباً اِس ایجاد سے رسم و راہ کی دنیا میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوجائیگا۔

نیا دُمدار ستارہ

جس طرح ہندوستان "بے فکروں" کے لئے مشہور ہے اُسی طرح امریکہ اصحابِ غور و فکر کے لئے۔ حال ہی میں وہاں کے مشہور شہر اوہیو کے ایک نوجوان نے جو دن کو فیکٹری میں کام کرتا ہے اور رات کو ستاروں کی چال سے دل بہلاتا ہے۔ نیا دُمدار ستارہ دریافت کیا ہے۔ جو ابھی تک بڑے بڑے ہیئت دانوں کی نگاہِ دوربین سے پوشیدہ تھا۔ ہارورڈ یونیورسٹی نے اِس نوجوان کو ایک عمدہ دُوربین تحفہ میں دی ہے تاکہ وہ اپنی تحقیقات کا دائرہ وسیع کر سکے۔ اُس نے ابھی تک شادی نہیں کی ہے اور جو کچھ پس انداز کرتا ہے وہ کتابوں کی خریداری میں صرف کر دیتا ہے۔ اُس کے والدین اوہیو کے قریب ایک گاؤں میں کاشتکاری کرتے ہیں۔ اِسی جگہ اُس نے ایک چھوٹی سی رصدگاہ اپنے خرچ پر بنوائی ہے۔ کیا عجب ہے آگے چل کر یہ نوجوان گلیلیو کا ہمسر ہو جائے!

فطرت میں شوقِ خودکشی

فطرت کا طریق کار عموماً یہی دیکھنے میں آتا ہے کہ وہ حیوانات کو بقائے حیات کی طرف مائل کرتی ہے۔ چنانچہ ہر ذی رُوح میں اپنی جان بچانے کا جذبہ فطری طور پر موجود ہے۔ لیکن جہاں دیگر امور میں استثنا پایا جاتا ہے۔ وہاں اِس اٹل اور عالمگیر اصول میں بھی یہ رنگ نظر آرہا ہے۔ جزیرہ نمائے اسکینڈے نیویا کا لیمنگ (اود بلاؤ کی قسم کا ایک جانور جو چوہے سے بڑا ہوتا ہے) اور نیوزی لینڈ کی ٹام کاڈ (مچھلی کی ایک قسم) یہ دونوں حیوان خودکشی پر تُلے ہوئے ہیں۔ اوّل الذکر جانور، ملک ناروے میں بکثرت ہوتا ہے اور جب اُن کی تعداد لاکھوں تک پہنچ جاتی ہے تو براہِ راست سمندر کی طرف کوچ کر دیتے ہیں، راہ میں جو شے سامنے آتی ہے اُسے کھاتے ہوئے یا کم از کم خراب کرتے ہوئے بڑھتے چلے جاتے ہیں یہاں تک کہ زمین ختم ہو جاتی ہے۔ اور سمندر کی لہروں سے بغلگیر ہو جاتے ہیں۔ آخر الذکر کی کیفیت یہ ہے کہ جب اُن کی تعداد بے اندازہ ہو جاتی ہے تو موجوں کے ساتھ خود بخود کنارے پر آکر تھوڑی دور تک خشکی میں لوٹتی چلی جاتی ہیں۔ بچے اور بوڑھے لاکھوں کی تعداد میں اٹھا کر بازاروں میں لاتے ہیں اور اِن مردہ مچھلیوں کو سکوں کی شکل میں تبدیل کر لیتے ہیں۔

ایشیائی عورتوں میں بیداری کا احساس

ایشیائی عورتوں کی ایک انجمن قائم کی گئی ہے۔ جس کے مقاصد حسبِ ذیل ہیں۔

(الف) مشرقی تمدن کے عناصر مشترک ہونے کی حیثیت سے تمام ایشیائی عورتوں میں اتحاد کا احساس پیدا کرنا۔

(ب) مشرقی تمدن وتہذیب کے مفید عناصر کا جائزہ لینا - اُن کے تحفظ و بقا کی کوشش (سادگی - فلسفہ - آرٹ - عظمتِ مادری کا احساس - روحانی بیداری -
(ج) مشرقی تہذیب وتمدن کے مضر عناصر اور نقائص کو رفع کرنے کی کوشش کرنا - (بیماری، بچوں کی موت - شادی بیاہ کے رسوم ورواج -
(د) مغربی تہذیب کے اُن عناصر کا انتخاب جو مشرق کے لئے مفید ثابت ہو سکتے ہیں - (تعلیم - لباس - آنے جانے کی آزادی،
(س) تبادلۂ خیالات سے ایک دوسرے کی تقویت کی کوشش کرنا -
(ش) دنیا میں امن قائم کرنے کی کوشش کرنا -

ان مقاصد کو پڑھکر اندازہ ہو سکتا ہے کہ انجمن کا منتہائے نظر کیا ہے - ہم سمجھتے ہیں - کہ انجمن ایشیا کی تاریخ تمدن میں ایک نئے باب کا اضافہ کریگی -

ایشیا کی عورتوں میں قوتِ عمل واحساسِ اتحاد کا پیدا ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ ایشیائی تہذیب کے دن اچھے آگئے -

ایشیا تمدن وتہذیب کا گہوارہ ہے - تمام مذاہب کے بانیوں نے اسی سرزمین میں جنم لیا - اور اسی اعتبار سے آج تک اس مادیت میں بھی اپنی روحانیت کے لئے مشہور ہے - مقامِ مسرت ہے کہ اس خطہ کی عورتوں کے دل میں یہ احساس پیدا ہوگیا ہے کہ وہ اپنی روایاتِ تمدن کے تحفظ کی طرف متوجہ ہوں - اس میں کوئی شک نہیں کہ سائنس کے انکشافات نے معلوماتِ عامہ میں حیرت انگیز اضافے کئے ہیں - دنیا جانتی ہے کہ سائنس کی قوت اندھی ہے -
بے پرواہ ہے کہ اس سے انسان کی تخریب کا کام لیا جاتا ہے یا تعمیر کا - جہاں سائنس نے ہمارے لئے ترقی کی سیکڑوں شاہراہیں کھول دیں وہاں نفرت اور جنگ کی تاریخ میں بھی خونیں اور آتشیں بابوں کا اضافہ کر دیا - ہلاکت آفریں، آلاتِ جنگ - بم گیس - طیارے - تمام سائنس کی ایجادات ہیں - جو خدائے تعالیٰ کی تخلیق کو مٹا دینے کے لئے جلا دینے کے لئے، کچل دینے کے لئے، عالمِ وجود میں آئیں ہیں -

ایشیا کی عورتوں نے عصرِ حاضرہ کی اس خصوصیت کا احساس کرکے اپنا ایک مقصد "عالمگیر امن کے قیام کی کوشش کرنا" بھی مقرر کیا ہے -

ہم دست بدعا ہیں کہ ان کی کوششیں بارآور ہوں اور یورپ کے مدبرین کی طرح ان کے دعوے اور عمل میں کوئی تفاوت نہ ہو -

دنیا میں سب سے بڑا مکان

نیویارک میں آجکل ایک عمارت، تماشا گاہِ مردوزن بنی ہوئی ہے - جو سطحِ زمین سے ۱۱۷۶ فیٹ بلند ہے - ۱۲۱ ایکڑ زمین پر پھیلی ہوئی ہے - اُس میں ہر روز ۱۸۷۵۰۰۰ گیلن پانی اور ۲۰۰۰۰ کیلوواٹ بجلی روزانہ خرچ ہوتی ہے - اُس مکان میں پولس بھی ہے - شفاخانہ بھی، ڈاک خانہ بھی ہے اور بنک بھی - اسکول بھی ہے اور لائبریری بھی - ہوٹل بھی ہے - قہوہ خانہ بھی ٹینس کورٹ بھی ہے - اور حوض بھی - مختصر یہ کہ جملہ ضروریات زندگی کے لئے اس مکان کے باشندوں کو باہر جانے کی ضرورت نہیں ہے -

موسم میں حسب مرضی تبدیلی

جس طرح بٹن دبانے سے کمرے میں روشنی ہوجاتی ہے اُسی طرح اب امریکہ میں ایک خاص قسم کا بجلی کا پنکھا ایجاد ہوا ہے جس کی بدولت کمرے میں مئی جون اور دسمبر دونوں موسموں کا لطف اُٹھایا جا سکتا ہے - اگر گرم ہوا کا بٹن دبایا جائے تو کمرہ گرم ہو جائیگا - اور اگر سرد ہوا کا بٹن دبایا جائے تو سرد ہو جائیگا - جب کمرے کی ہوا حسب مرضی گرم یا سرد ہو جائے تو پنکھا بند کر دو -

دنیا میں سرد ترین جگہ

نیوجرسی واقع ملک امریکہ کے قریب ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جس کا نام ایلیز بتھ ہے - اگر آپ نیوجرسی سے ایلیز بتھ جائیں تو راستے میں آپ کو ایک جگہ برف کا ایک عظیم الشان انبار جمع ملیگا یہ گودام دنیا میں سرد ترین مقام ہے - یہاں کا ٹمپریچر درجۂ صفر سے بھی ۱۰۹ درجے نیچے ہے - یہاں کی سردی کا اندازہ اس بات سے بھی ہو سکتا ہے کہ قطبِ شمالی کا ریچھ بھی جو تمام حیوانات میں سب سے زیادہ سردی پسند ہے، یہاں نہیں رہ سکتا - اگر ذرا دیر توقف کرے تو کام تمام ہو جائے -

منطقۂ شمالی کے راز

آجکل سائنس کی دنیا میں منطقۂ بارد شمالی کے راز دریافت کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ باہمت اور حوصلہ مند اشخاص اس بات کی ٹوہ میں ہیں کہ کوئی ایسی تدبیر دریافت ہو کہ گرین لینڈ کی برفانی سطح کے راز معلوم ہو جائیں۔ ناظرین کو معلوم ہوگا کہ گرین لینڈ کی سرزمین قریب قریب تمام کی تمام برف سے ڈھکی ہوئی ہے۔ اس برف کی گہرائی کی دریافت نہیں ہو سکی۔ اس سطح برفانی کے متعلق یہ سوالات بہت اہم ہیں کہ آیا وہاں ہوائی جہاز اتر سکتا ہے یا نہیں۔ انسان وہاں زندہ رہ سکتا ہے یا نہیں۔ کیونکہ انہیں سوالوں کے تسلی بخش جوابات پر مہمات کی کامیابی اور ناکامیابی کا دارومدار ہے۔ پھر تماشا یہ ہے کہ ان باتوں کا صحیح جواب دریافت کرنے سے پہلے یہ معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ وہاں کی آب و ہوا کی کیا کیفیت ہے اور ہواؤں کا رخ کس طرف ہے۔ اس کے علاوہ چونکہ برفانی سطح کو عبور کرنا ناممکن ہے اس لیئے ہر مہم کے اراکین اس سطح کے کنارے پر کیمپ لگانے کے لئے مجبور ہونگے۔ جرمن اور انگلستان کے اولوالعزم سائنس دان یہ دریافت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ پرواز کے راستے کون کون سے ہیں۔

انگریزوں کی مہم ایک نوجوان کی سرکردگی میں کام کر رہی ہے۔ اراکین بھی نوجوان ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ارباب علم اس اراکین کی نوجوانی کو مہم کے لئے خطرناک تصور کرتے ہیں۔ لیکن ان پر ایسی باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ وہ خاموشی سے اپنا کام کئے جاتے ہیں۔ اس مہم کے اراکین نے اپنا مرکز انگما سالیک کو بنایا ہے۔ ایک پارٹی ساحل سے دو سو میل تک برفانی سطح پر سفر کر چکی ہے۔ مہم کے ساتھ ایک جہاز بھی ہے جو ساحل مقامات کے تحقیق میں مفید ثابت ہوتا ہے۔

جرمن مہم مشہور و معروف سائنس دان پروفیسر الفریڈ ویگنر کی قیادت میں ہے۔

صاحب موصوف اس سے پہلے گرین لینڈ میں کام کر چکے ہیں ان کے ساتھ بیسن اور مشہور سائنس دان ہیں جن کو اپنے فن میں بین الاقوامی شہرت حاصل ہے۔ اس مہم کے مقاصد میں سطح برفانی کی گہرائی کا انکشاف بھی شامل ہے۔ دونوں مہموں کے اراکین تعاون باہمی سے ایک دوسرے کو تقویت پہنچاتے ہیں۔

جب نوجوانی کی آتش طبعی اور بڑھاپے کی تجربہ کاری مل جائے تو کامیابی یقینی ہو جاتی ہے۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ۱۹۳۹ میں جب منطقۂ شمالی کے راز دریافت کرنے کی بین الاقوامی کوشش کی جائیگی اس وقت ان دونوں مہموں کے نتائج

ایک اور عالمگیر جنگ کا اعلان

جس دن سے ۱۹۱۹ کی مہیب اور ہولناک جنگ ختم ہوئی ہے۔ اس دن سے یورپ کے لئے معاشرتی اقتصادی اور تجارتی مشکلات کا ایک نیا باب کھل گیا ہے۔ ہر ملک کے ماہر اس بات کی کوشش کر رہے ہیں کہ کسی طرح حالات سدھر جائیں۔ اس موضوع پر بے شمار کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ جنگ عظیم کا رد عمل عمل سے بھی زیادہ خوفناک ثابت ہوا۔ اس سلسلے میں پروفیسر گلبرٹ مرے اور مسٹر برنز نے پیشین گوئی کی ہے کہ عنقریب ایک اور عالمگیر جنگ ہوگی سائنس کے مہلک حربوں سے کام لیکر انسان ایک بار پھر جانوں کے ساتھ کھیلیگا۔

پروفیسر برنز نے تو وقت کا تعین بھی کر دیا ہے۔ ان کے خیال میں یہ جنگ ۱۹۴۰ - ۱۹۳۵ کے درمیان واقع ہوگی۔

پروفیسر گلبرٹ مرے کا ارشاد ہے:۔

آجکل ہم اتحاد کے ذریعے ایک اور مہیب جنگ کی بنیاد رکھ رہے ہیں۔ آئندہ جنگ میں فریقین کا تعین ان قرضوں کے ذریعے ہوگا۔ جو مختلف ممالک ایک دوسرے کو دے رہے ہیں۔"

مسولینی اور امن

میجر ای ڈبلیو پالسن سے ملاقات کے دوران میں اٹلی کے مطلق العنان حاکم مسولینی نے جسے بعض یورپی اقوام "جنگ کا دیوتا" کہتی ہے۔ صاحب موصوف کو اطمینان دلایا کہ اٹلی جنگ کی تیاریوں میں مصروف نہیں ہے۔

آپ نے ارشاد فرمایا:۔ "اندرونی ترقی اور قوم کی بہتری کے لئے امن اشد ضروری ہے۔ اگرچہ اس کی جغرافیائی حالت ایسی ہے کہ اسے ہر وقت اپنی مدافعت کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ ہم آسٹروی قوم سے بھی جو ہمارے سخت دشمن ہیں مضبوط تعلقات رکھتے ہیں۔ ہمارے الحاقات مٹ گئے ہیں

تقریب

شادی شدہ عورتیں۔ چارلس لیمب کے ایک بلند پایہ مضمون کا ترجمہ ہے۔ چارلس لیمب لطافتِ انداز و نفاستِ تحریر کے لئے مشہور ہے۔ ظرافت کے ہلکے ہلکے چھینٹے معاشرتی مسائل کے متعلق طنز اور نپے تُلے فقرے اِس کے انداز میں حُسن کا ایسا اثر پیدا کرتے ہیں جس کی نظیر نہیں مِل سکتی۔

"شادی" ایک ایسا موضوع ہے جس کے متعلق بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے۔ لیکن جو کچھ لیمب نے لکھا ہے۔ اِس سے زیادہ شگفتہ اور دلچسپ تحریر کوئی اِس موضوع پر نہ ہو سکتی تھی۔

راہب:۔ او ہنری کے ایک افسانے کا ترجمہ ہے۔ او ہنری دورِ حاضرہ کا سب سے بڑا افسانہ نگار تسلیم کیا جاتا ہے۔ اِس کی افسانہ نویسی کی یہ خصوصیت بغایت نادر ہے کہ وہ معمولی واقعات سے ایسے غیر معمولی نتائج اخذ کرتا ہے کہ پڑھنے والا حیران بھی ہوتا ہے اور مسرور بھی۔

راہب کا لطف اُس کے غیر متوقع انجام میں پنہاں ہے اور ہم اُس کے متعلق کچھ تفصیل سے لکھ کر پڑھنے والوں کے لطف کو ضائع کرنا نہیں چاہتے۔

ننھا سوداگر:۔ ایک مطالعۂ نفسی ہے جس میں کردار نگاری اپنے معراجِ کمال پر پہنچی ہوئی نظر آتی ہے۔ افسانہ آدھ گھنٹے میں اختتام تک پہنچ جاتا ہے۔ اور اِس مختصر سی مدت میں مصنف نے بچّوں کے جذبات و احساسات کی ایک بلیغ تشریح کر دی ہے۔

جرمن یونیورسٹیوں کا نظامِ تعلیم:۔ نہایت کار آمد مضمون ہے اور کاوش سے لکھا گیا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ مضمون نگار حضرات اور بحیثیل افسانے اور ڈرامے لکھنے کی بجائے اِس قسم کی علمی موضوعات کی طرف متوجہ ہوں۔

مدیرِ مخزن سے کوئی اقبال جا کے میرا پیام کہدے
جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں اُنہیں مذاقِ سخن نہیں ہے

صحت:۔ کے متعلق صرف اتنا کہدینا کافی ہے کہ یہ ایک طنز ہے جس میں شہریوں کے اندازِ معاشرت کے نقائص دکھائے گئے ہیں۔

پہلا جنتی۔ مختصر ہے لیکن اِس میں ڈرامیائی کشمکش کے تمام عناصر موجود ہیں۔ نعمان کا کردار کسقدر دلچسپ ہے مصنف نے قصداً موضوع کی سنجیدگی اور اہمیت کو کم کرنے کے لئے نعمان کے کردار میں ظرافت کے پہلو شامل کر دئے ہیں۔ اُس کا فقرہ "ایک روپیہ دلواؤ" ڈرامے کے ختم ہونے کے بعد کانوں میں گونجتا رہتا ہے۔

ایکٹر کی وصیت:۔ فاضل افسانہ نگار نے جس حسین انداز میں انسانی تخیل کی فریب کاری کی تصویر کھینچی ہے اُس کی بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

وادیٔ کانگڑہ:۔ یہ پُر بہار وادی جس کا ایک منظر اس اشاعت میں شائع کیا جارہا ہے۔ ہندوستان کے حسین ترین مقامات میں سے ایک ہے۔ افسوس ہے کہ ہندوستان کے امرا اپنے جنت نشاں وطن کی رنگیں اور عطر آگیں فضا کو چھوڑ کر سوئٹزرلینڈ اور اٹلی کے مناظر میں صحت کے جویا ہوتے ہیں۔ یہ وادی تو اسقدر دلفریب ہے کہ اگر ایک بار انسان دیکھ لے تو مرتے دم تک آنکھوں سے اِس کی تصویر اور دماغ سے اِس کا تاثر محو نہ ہو۔ ملک کو نارتھ ویسٹرن ریلوے کا شکر گزار ہونا چاہیئے کہ اسی کی بدولت آج اِس ارضی جنت کے دروازے کھُل گئے ہیں۔ ہم ناچیز انسانوں کو بھی پریوں کی اِس آرامگاہ میں داخل ہونے کی اجازت مِل گئی ہے۔

ایک پُربہار وادی

(از حضرت عابد)

یہ وہ زمیں ہے کہ ذرّہ ذرّہ نشاط سے مُسکرا رہا ہے یہ وہ زمیں ہے کہ پتّہ پتّہ بہار کے گیت گا رہا ہے
پہاڑ پر ابر جلوہ گر ہے جو بیل بوٹے بنا رہا ہے ترنّم آبجو کی لرزش سے رُوح کو وجد آ رہا ہے
یہ منظرِ زرنگار نورِ بہار سے جگمگا رہا ہے

بہار رنگیں نشاط رنگیں نسیمِ نازک خرام رقصاں قدم قدم سبزہ زارِ جنّت روش روش ہے ارم بداماں
کہ ساغرِ سبز سے مے آتشیں کے انوار ہیں درخشاں فضائے گلشن کی وسعتوں میں چراغِ لالہ ہوا فروزاں
دماغ ڈوبا ہے مستیوں میں نظر پہ نشہ سا چھا رہا ہے

یہاں کے رنگِ خزاں سے شاداب ہو نشاطِ بہار یارب یہاں کے پھولوں کی جلوہ کاری پہ چاندنی ہو نثار یارب
یہاں کی تابانیوں کے ہوں مہر و ماہ آئینہ دار یارب یہاں محبّت کے دلربا زمزمے ہیں سحر کار یارب
یہ منظرِ جانفزا تری دلکشی کے جلوے دکھا رہا ہے

عابدؔ

عمر خیام اور اُس کا عہد

خیام کی صنّاعی

(گذشتہ سے پیوستہ)

جذبہ کہتا ہے:-

ساقی قدحے کہ سوز دا غم نزود
تا روغن بادہ در چراغم نزود
بوئے کہ چوں غنچہ دردماغم زدے ست
مغزم بشگافتی۔ از دماغم نزود

خیام نے زندگی کو چراغ کہا ہے جن حضرات نے مرقع چغتائی میں "چراغ عمر" کی تصویر دیکھی ہے وہ تصور کر سکتے ہیں کہ زندگی کی تشبیہ چراغ سے کتنی واضح ہے۔ ہوا کا خفیف سے خفیف جھونکا۔ مینہ کا چھوٹے سے چھوٹا قطرہ۔ چراغ کو گل کرنے کے لئے کافی ہے۔ اسی طرح انسانی زندگی سیکڑوں حوادث کے درمیان قائم ہے۔ اس چراغ کے لئے خیام شراب کو "روغن" قرار دیتا ہے۔ جس طرح روغن چراغ کی فروزانی کے لئے ضروری ہے اسی طرح خیام کے نزدیک زندگی کے لئے "تابش بادہ" ضروری ہے۔

دوسرا شعر اس کیفیت کا مظہر ہے کہ شراب اُس کی زندگی کا ایک جزو بن گئی ہے۔ مومن نے کیا خوب کہا ہے ؎

درد ہے جاں کے عوض ہر رگ و پے میں ساری
چارہ گر ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہوگا

اِس سے پہلے کہا جا چکا ہے۔ کہ "شراب" خیام کے لئے دنیا کی تمام مسرتوں کا خزانہ ہے۔ یہ نام اُس کے منہ سے اِس جوش سے نکلتا ہے کہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ایک جگہ کہتا ہے ؎

مائیم خریدارِ مئے کہنہ و نو — وانگاہ فروشندۂ عالم بدو جو
پرسی کہ پس از مرگ کجا خواہی رفت — مے پیش من آر و ہر کجا خواہی رو

زندگی اور اُس کے متعلقہ مسائل سے بے نیازی اِس سے زیادہ کیا ہوگی کہ ایک شخص خیام کو حکیم عمر خیال کر کے اُس سے مسائل حیات کے سلجھانے کی درخواست کر رہا ہے۔ اور وہ دوزخ و جنت کے افسانوں کو ایک جنبش سے مسترد کر کے کہہ دیتا ہے کہ

مے پیش من آر و ہر کجا خواہی رو

خواجہ حافظ کے "بادہ و ساغر" میں بھی ایک کیف ہے۔ لیکن پروفیسر نکلسن کے لطیف قول کے مطابق صوفی شعرا کا کلام ہمیشہ ذومعنی ہوتا ہے۔ اِس اعتبار سے خواجہ صاحب کے اشعار کی جذباتی قیمت بہت گھٹ جاتی ہے۔ خیام کے اشعار کے متعلق کبھی یہ سوال پیدا نہیں ہوا کہ کہیں یہ شراب شراب معرفت تو نہیں۔

ذیل میں ہم اس کی کچھ رباعیات درج کرتے ہیں۔ جن سے اندازہ ہو سکیگا کہ اس کی خمریات میں "جذبہ" کس جوش سے کار فرما ہے ؎

ساقی نظرے کہ دل خوش اندوہِ من تست
جاں شاد ز خوشہ چینیِ خرمنِ تست
ناگفتہ دلت ضمیر ما مے داند
جام جم عاشقاں دلِ روشنِ تست

ساقی قدحے کہ شمع دل در نگرفت
تا آتشِ مے زندگی از سر نگرفت
آہ! از مئے لعلت کہ بریں بادہ ناب
ہر کسے کہ لبے نہاد لب بر نگرفت

آخری مصرعے میں اشتیاق اور سرمستی کی جو عجیب کیفیت پنہاں ہے وہ ارباب ذوق پر روشن ہے ؎

ساقی غمِ من بلند آوازہ شدست | سرمستیٔ من برون زاندازہ شداست
باموئے سفید سرخوشم کز خطِ تو | پیرانہ سرم بہارِ دل تازہ شداست

ساقی نظرے کہ دل زاندیشہ تہی ست | شیراں ہمہ رفتہ اند سرِ شیشہ تہی ست
ہر شب کہ حباب کف نزدے شیشہ بچرخ | امروز کہ دورِ مالود شیشہ تہی ست

اے ساقی ازاں مے کہ دل و دین منست | پُرکن قدحے کہ جانِ شیریں منست
گرنیست شراب خوردن آئینِ شما | معشوقہ بجام خوردن آئینِ من ست

ساقی گل و سبزہ بس طربناک شداست | دریاب کہ ہفتۂ دگر خاک شداست
مے نوش و گلے بچیں کہ تا درنگری | گل خاک شداست سبزہ خاشاک شداست

انداز کی صفاتِ تخیلی

ہم کئی بار اِس حقیقت کی طرف اشارہ کر چکے ہیں۔ کہ خیال یا جذبہ کسی تصنیف کو "ادب" کے دائرے میں نہیں لا سکتا۔ ادبی تخلیق کے لئے ضروری ہے کہ تخیل۔ تصوّر اور جذبے پر اپنا عمل کرے۔ اس عمل کا نتیجہ "صنعت" کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ الفاظ کا جامہ پہننے سے پہلے تصورِ صنّاع کے ذہن میں ایک تخیلی جامے میں ملبوس ہو جاتا ہے۔ وہ تصویر جسے صنّاع قرطاس پر منتقل کرنا چاہتا ہے۔ پہلے اس کے ذہن میں کھینچی جاتی ہے۔ تخیل کی تعریف نہیں کی جا سکتی یہ شے اپنے مظاہر اور اپنے اعمال میں اسقدر پُراسرار طریقے سے کام کرتی ہے کہ اس کی کوئی جامع اور مانع تعریف ہو ہی نہیں سکتی۔ یہی وہ شے ہے جو تصاویر اور موسیقی کی تخلیق کرتی ہے۔ اور اِس طرح حسِ بصارت و سماعت کو متاثر کرتی ہے۔ فنِ مصوری میں تخیل کا عمل اِس طرح ہوتا ہے کہ آنکھیں لطف اندوزِ حسن ہوتی ہیں۔ اور موسیقی میں اِس طرح کہ "نغمے" فردوسِ گوش بن جاتے ہیں، ادب اِن دونوں حسّوں کو متاثر کرتا ہے۔ گویا یہ وہ شرابِ دوآتشہ ہے جس میں "موسیقی" اور "مصوری" کے عناصر مل گئے ہیں۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ادب میں قوتِ تخیل اپنا عمل صرف سماعت و بصارت تک محدود رکھتی ہے۔ لیکن غور کرنے پر معلوم ہوگا کہ ہمارے دوسرے حواس بھی ادبی تخلیقات کے عملِ تخیل سے متاثر ہوتے ہیں۔

ماہر ادیب اپنے زورِ قلم سے ہمارے مشام کو خوشبو و معطر فواکہات سے ایک روحِ تازہ بخشتا ہے۔ عنبر آفریں ہوائیں دل کو سیلابِ مسرت میں غرق کر دیتی ہے۔ یعنی وہ تمام احساسات جو قوتِ شامہ اور قوتِ ذائقہ سے خاص ہیں پیدا ہو جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تاثر "حقیقی" نہیں بلکہ تخیلی ہے۔

اب یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ تخیل کا لفظی مظہر کیا ہے؟۔ قوتِ تخیل الفاظ سے کس طرح ظاہر ہوتی ہے؟

اِس کا جواب یہ ہے کہ عملِ تخیل کا اظہار الفاظ میں تین طریقوں پر ہوتا ہے:۔

(الف) قوتِ تخیل کے زیرِ اثر صنّاع تشبیہات و استعارات۔ صنایع و بدایعِ لفظی و معنوی سے کام لیتا ہے۔ اور اپنے موضوع کو زیادہ صاف اور روشن رنگ میں پیش کرتا ہے۔

(ب) اظہارِ خیال کے لئے صنّاع ایسے الفاظ کا انتخاب کرتا ہے جن کو اپنے معانی سے صوتی تعلق ہوتا ہے۔ اور اس طرح قاری کو بعینہٖ وہی اصوات سنائی دیتی ہیں جو مصنف کے ذہن میں تھیں۔

(ج) مصنف ایک ناقابلِ اتباع صنّاعی چابکدستی سے کام لیکر قاری کے ذہن میں ایک سلسلۂ خیال پیدا کر دیتا ہے۔ یہ خیال آفرینی قوتِ تخلیق کا ایک راز ہے جو صرف جوہرِ قابل کو معلوم ہے۔ مصنف ایسے الفاظ کا استعمال کرتا ہے جو قانونِ ائتلافِ افکار کے ماتحت۔ اپنی دلالتہائے التزامی کے باعث۔ اپنے تعلقاتِ صوتی کی وجہ سے یا ہماری ذہنی کیفیات کی بنا پر ایسے معانی پیدا کرتے ہیں جو الفاظ سے بالاتر ہیں۔ یعنی مصنف اُن باتوں کی طرف اشارہ کرتا ہے جن کو وہ بیان نہیں کر سکتا۔ وہ کچھ کہہ جاتا ہے جو الفاظ کے جامے میں نہیں سماتا وہ ایک لفظ میں ایسا گنجینۂ معانی نہاں کر دیتا ہے جو اس کے لغوی معانی سے کہیں زیادہ لطیف اور اثر آفریں ہوتا ہے۔ جس طرح بعض اوقات کسی پھول کو دیکھ کر کسی معطر شے کو سونگھ کر انسان پچھلے واقعات کی یاد میں کھو جاتا ہے۔ اسی طرح بعض اوقات صنّاع اپنے الفاظ کے ذریعے قاری کے ذہن میں ایک سلسلۂ خیال پیدا کر دیتا ہے۔ انداز کی اس صفت سے تصویر زیادہ روشن اور رنگیں نظر آتی ہے۔ دنیائے حواس میں کسی شے سے اِس قوت کو تشبیہ نہیں دی جا سکتی۔

تشبیہات و استعارات

مندرجۂ بالا سطور سے واضح ہو گیا ہوگا۔ کہ تشبیہ اور استعارہ

آرائشِ کلام کے لئے استعمال نہیں کئے جاتے بلکہ موضوع کے کسی پہلو کو زیادہ واضح اور روشن کرنے کے لئے برتے جاتے ہیں۔ "آرائشِ کلام" سے مراد یہ ہے کہ رخسار کو گل اور زُلف کو ناگن کہکر محض ظاہری گرمیٔ سخن پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ورنہ عارض محبوب کو کوئی معمولی پھول سے تشبیہ دیکر اس کا کوئی ایسا پہلو واضح نہیں کیا گیا جس پر دیکھنے والوں کی نظر نہ پڑتی تھی۔

تشبیہ اور استعارہ کا مقصد یہ ہے کہ جو حقیقت کسی طرح ادا نہیں ہوسکتی اُس کو ادا کیا جائے۔ جو مضامین شبلی کے الفاظ میں سبک نازک اور لطیف ہوتے ہیں وہ معمولی الفاظ کا جامہ نہیں پہن سکتے۔ اُن کی لطافت اس قسم کی ہوتی ہے کہ الفاظ کے ساتھ مس کرنے سے بلبلوں کی طرح ٹوٹ جاتے ہیں۔ ایسے لطیف مضامین کو ادا کرنے کے لئے صرف تشبیہات و استعارات موزوں ہو سکتے ہیں۔

پھر صرف یہی نہیں۔ بعض ایسی ذہنی کیفیات ہیں جن کو صرف تشبیہ اور استعارے سے سمجھایا جاسکتا ہے۔ نازک خیالی ان کیفیات کی طرف اشارہ کرنے کے لئے تشبیہ و استعارہ کے چراغ سے نور مستعار لیتی ہے اور فضائے تخیل کو منور کر دیتی ہے۔

نگاہ مے رسد از نغمۂ دل افروزے
بہ معنیٔ کہ بر و جامۂ سخن تنگ است

ہماری زبان میں جو الفاظ اب کوئی حیثیت نہیں رکھتے لیکن دراصل اپنے اندر ایک جہانِ معانی لئے ہوئے ہیں۔ اُن کے مطالعے سے معلوم ہوگا کہ اُن حقائق کو ادا کرنے کے لئے جن کے مختلف پہلو معمولی الفاظ میں نہیں سما سکتے۔ استعارے اور تشبیہات کسقدر موزوں ثابت ہوتے ہیں۔

ایک مصنف رقمطراز ہے:۔

زبان نازک خیالی منتج ہے۔ یا یوں کہو۔ کہ اگر ہمیں کسی قوم کی شاعری سے پوری واقفیت حاصل کرنی منظور ہو۔ تو ہمیں صرف اُس کے اشعار یا نظم کی رنگینی میں رنگی ہوئی روایات ہی کو نہیں دیکھنا چاہیئے۔ بلکہ ہمیں بہت سے الفاظ بھی ملیں گے جو فرداً فرداً نازک خیالی کے پرورش یافتہ اور دلفریب نقش و نگار سے آراستہ ہیں۔ بلکہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اُن میں نظم کا عطر کھینچ کر بھر دیا گیا ہے۔ کسی لفظ مذکور میں عالمِ ذہنی اور عالمِ اجسام کی کسی بڑی مشابہت اور مناسبت باہمی کا نقشہ کھچا ہوا ہے۔ عالمِ اجسام کی رنگ آمیزی کی مدد سے عالمِ ذہن کی تصویریں صاف اور روشن۔ اور قیام و دوام کی صورت میں نظر آتی ہیں۔ ممکن ہے۔ کہ اب تصویریں مبتذل۔ بے حیثیت۔ اور معمولی سی دکھائی دینے لگی ہوں۔ اور شاید انہی الفاظ کی بدولت جو ہر ایک آدمی کے اثاثہ میں داخل ہوگئے ہیں۔ ایسی معلوم ہورہی ہوں لیکن جس شخص نے پہلے اس مشابہت کو تاڑا۔ اور اُس کے اظہار کے لئے ایک نیا لفظ ایجاد کیا تھا۔ یا کسی پرانے لفظ کو جو پہلے اپنے لغوی معنوں میں ہی استعمال ہوتا تھا۔ اصلاحی اور استعاری معنے دیئے۔ وہ بزرگ ہر طرح سے سخن آفریں کے لقب کا مستحق ہے اور اُس کی نازک خیالی اور سخنوری بیشک اس قابل ہے کہ اُسے سحر بیانوں کے زمرے میں شمار کیا جائے۔

مثلاً جس بندۂ خدا نے کسی کے برباد ہو جانے کا خیال اوّل ہی اوّل ظاہر کیا تھا۔ ضرور ہے کہ اُس نے بہت دفعہ آندھی اور ہوا کو خس و خاشاک اُٹھاتے دیکھا ہوگا۔ اُس نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ یہ خس و خاشاک تنکا تنکا ایک دوسرے سے جُدا۔ کوئی کہیں۔ کوئی کہیں۔ اپنے اصل مقام سے کوسوں دُور۔ طوفانِ باد کے جھونکوں سے اُڑتے پھرتے ہیں۔ اور پھر ان کی جمعیت کا حاصل ہونا ناممکن ہو جاتا ہے۔ ان کا قرار مشکل اور ان کا نام و نشان مفقود ہو جاتا ہے۔ خس و خاشاک کی اس بیچارگی اور آوارگی کو اُس نے ایک مصیبت زدہ انسان کی حالت سے مقابلہ کیا۔ اور کچھ فرق نہ پایا۔ اُس کی نازک خیال طبیعت نے فوراً اس نامراد و کمبخت انسان کی حالت بیچارگی کو بھی بربادی کے لفظ سے تعبیر کیا۔

بخت کے متعلق بھی بیدار و خوابیدہ کے الفاظ پہلے استعمال کرنے والے ذہن نے جاگتے اور سوتے انسان و حیوان کی حالتوں پر غور کرکے یہ الفاظ بخت پر چسپاں کئے ہیں۔ جاگتے کی ہوشیاری۔ جلبِ منفعت۔ و دفعِ مضرت میں چابکدستی۔ اپنی حفاظت اپنی زندگی کے سامان مہیا کرنے کی فکر اور طاقت۔ سوتے کی بیکسی۔ کس مپرسی۔

بیچارگی اور ہو بہو موت کی سی صورت ۔ شاعرانہ مذاق کیلئے کافی دماغی مثالیں خوش طالعی اور شومئی بخت کی ہیں۔

اوپر ہم نے یہ بھی ذکر کیا تھا۔ کہ الفاظ اکثر اخلاقی حقائق کے شاہد ہوتے ہیں۔ اللہ جلشانہٗ نے الفاظ پر ایسی مُہرِ صداقت لگائی ہوئی ہے کہ انسان اتنے حقائق سے آگاہ نہیں جتنے وہ زبان سے شب و روز نکالتا ہے ۔ وہ بڑے بڑے زبردست اصول بیان کرتا ہے ۔ جو بعض اوقات اِس کے اپنے برخلاف بھی ہوتے ہیں ۔ اور جن کو وہ معمولی رواج سوسائٹی سمجھ کر رائج کرتا رہتا ہے ۔ خود دنیا کا لفظ ہی ہمیں بتا رہا ہے۔ کہ اس کے ساتھ دل لگانا جائز نہیں ۔ اِس کی اصلیت بعض کے نزدیک "دنی" کمینہ ہے ۔ اور اِس لئے اِس سے امیدِ وفا رکھنا فضول ۔ اور اگر اِس کے ساتھ اور اِس کی چیزوں کے ساتھ موانست پیدا کرتے ہیں ۔ تو اِس سے بڑھکر ہماری کیا حماقت ہو سکتی ہے ۔ ہم اِسے کمینہ جانتے ہیں ۔ اور دن رات اِسے اِس نام سے پکارتے ہیں ۔ اور یہ بھی ہمیں تجربہ سے معلوم ہے ۔ کہ کمینوں سے تعلق اچھا نتیجہ پیدا نہیں کرتا ۔ تو پھر اِس سے محبت کا خواہاں ہونا اور نباہ کی امید رکھنا نادانی ہے ۔ تعیش عیش و کامرانی کے معنوں میں مستعمل ہے ۔ مگر اصل لغت میں کم معاش ہونا ہے ۔ اور اس برتے پر ہم اپنی کامرانی پر نازاں ہیں ۔ ہمارے عیش و عشرت دراصل سوائے مل بیٹھنے اور اوقات بسری کے اور کچھ بھی نہیں ۔ زندگانی کا زمانہ اور اپنے گھر میں بال بچوں میں بیٹھ کر ہی گزارنا عیش و عشرت ہے ۔ اور اس سے زیادہ ہیچ اور فضولیات ۔ فضولیات جو انسان کی بے تمیزی نے ضروریاتِ زندگی کے ساتھ ملا کر اپنی اخلاقی حالت کو کئی درجے نیچے گرا دیا ہے ۔ اور اس کا نام عیش و عشرت رکھ دیا ہے ۔ عیش و عشرت کے سامان مہیا کرنے میں جو انسان نے غلطی کھائی ہے ۔ اس کی زیادہ وجہ ماہیت و حقیقت دنیا و مافیہا کو بھول جانا ہے ۔ عیش و عشرت کے سامان مہیا کرنے میں میخانہ کی طرف اس کی تگ و دو ہوتی ہے اور یہ نہیں جانتا کہ عیش و عشرت کہاں ۔ یہ تو بربادی ۔ اور ویرانی کی طرف دوڑ اجا رہا ہے ۔ میخانہ کا نام ہی اسے حقیقتِ حال سے آگاہ کر رہا ہے ۔ مگر مستی ہے کہ کچھ نہیں سوجھتا ۔ خرابات ۔ مے اور میخواروں کی جولانگاہ ۔ حقیقتِ میخواری کا اظہار کس انداز سے کر رہا ہے خرابات ۔ میخانہ کا مرادف ہے ۔ اور وہاں سوائے خرابات ۔ بربادی اور ویرانی کے کچھ بھی نہیں ۔ مے خواری ۔ خرابات سے ہی شروع ہوتی ہے اور اِس کا انجام بھی خرابات ہی ہے ۔ اِس کی ابتدا بربادی انتہا ویرانی ہے ۔

اپنے دل میں ہم چاہے کچھ ہی سمجھیں اور اپنی طرف سے چاہے خوشی کے سامان مہیا کرنے میں سعی کریں ۔ اور انہیں عیش ۔ زندگی کے جزو قرار دیں ۔ مگر ہماری اپنی زبان زبان جو ہمارے ایسے سامان پر مُہرِ صداقت لگانے سے نہیں رُکی ۔ ایک زبردست ناصح ہے اور ہمیں ڈنکے کی چوٹ بتا رہی ہے کہ حقیقی خوشی یہاں کسی ایسے سامان سے میسّر نہیں ہو سکتی ۔ یہ سامان تو ویرانی اور بربادی کے ہیں ۔ اگر مسرّت ۔ خوشی درکار ہے تو وہ یقیناً اُس دنیا سے ۔ خرابات سے ۔ کہیں پرے ہے ۔ جہاں ہم روحانی سیر کے بغیر نہیں پہنچ سکتے +

مندرجہ بالا اقتباسات سے معلوم ہوگا کہ تشبیہ اور استعارے کا حسین استعمال اچھے صنّاع کی خصوصیت ہے ۔ استعارے اور تشبیہ سے معانی کا ایک دفترِ بے پایاں مختصر الفاظ میں بند کر دیا جاتا ہے ۔ جس بات کی تفصیل کے لئے صفحات کے صفحات درکار ہوتے وہ ایک حسین تشبیہ ایک جمیل استعارے کے ذریعے بوجہ احسن ادا ہو جاتی ہے ۔

خیام کے استعارات اور تشبیہات حقائق کو روشن کرتے ہیں ۔ موضوع کے مختلف پہلوؤں کو واضح کرتے ہیں ۔ لطیف مضامین کو الفاظ کا جامہ پہناتے ہیں ۔ اُن معانی کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو کسی اور طرح ادا نہ کئے جا سکتے تھے ۔ ذہنی کیفیات کی تشریح کرتے ہیں ۔ مطالب و مفہوم کو صحیح رنگ میں پیش کرتے ہیں ۔

کہتا ہے ؎

آنہا کہ محیطِ فضل و آداب شدند   در کشفِ علوم شمعِ اصحاب شدند
رہ زین شبِ تاریک نبردند برون   گفتند فسانہ و در خواب شدند

مُعمّۂ کائنات خیام کا محبوب موضوع ہے ۔ اس ضمن میں وہ

یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ جو لوگ اس معمے کو حل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں وہ بے سود ہے۔ جانِ عالم کے چہرے کو نقاب کچھ اس طرح چھپائے ہوئے ہے کہ اس کو دور کیا ہی نہیں جاسکتا۔ حیات و کائنات کے رموز کے انکشاف کے متعلق جو نظریے قائم کئے جاتے ہیں تمام باطل ہیں۔ ان کی حیثیت افسانوں سے زیادہ نہیں۔ دنیا کو "شبِ تاریک" سے استعارہ کرکے خیام نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اس تاریکی میں جو لوگ راہ ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ آخر گر ہی گئے "گفتند فسانہ" اس حقیقت کا مظہر ہے کہ اسرارِ حیات کے متعلق جو نظریے پیش کئے گئے ہیں افسانوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ "درخواب شدند" سے مراد وہ گہری غفلت اور سرمستی ہے جو انسان پر طاری رہتی ہے۔

ما لعبتکانیم و فلک لعبت باز
از روئے حقیقتی و نہ از روئے مجاز
بازیچہ ہمے کنیم بر نطع وجود
رفتیم بصندوقِ عدم یک یک باز

انسان کی تمام تدابیر باطل ہیں۔ وہ سوچتا ہے یہ ہوگا وہ ہوگا اپنے لئے آرزوؤں کا ایک محل تیار کرتا ہے۔ اس کو شمعِ تخیل سے منور کرتا ہے۔ در و دیوار کو اپنے خونِ تمنا سے رنگیں کرتا ہے۔ اور پھر تقدیر اس تاش کے گھر کو اس کھلونے کو اس شیش محل کو اپنی ایک خفیف سی ٹھوکر سے برباد کر دیتی ہے۔

ویرانی ہی ویرانی مایوسی ہی مایوسی
اس بےکسی کے عالم میں انسان کچھ نہیں کرسکتا۔

مندرجہ بالا رباعی اسی حقیقت کی آئینہ دار ہے۔ انسان کی بےکسی کی اس سے بہتر تصویر کیا ہوسکتی ہے کہ اُسے لعبت کہا جائے پتلی! اب تک وہ "اسکے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنا ہوا ہے۔" ذاتی رائے اور ذاتی ارادے کے فقدان کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

جس طرح لعبت باز گڑیوں کو حسبِ مطلب نچانے کے بعد اپنے پٹارے میں بند کر دیتا ہے۔ اسی طرح لعبت بازِ فلک انسان کو دنیا میں کھلا کر پھر صندوقِ عدم میں بند کر دیتا ہے۔

آہ انسان۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں اپنی مرضی سے کر رہا ہوں اور ادھر حقیقت یہ ہے کہ لعبت بازِ فلک اُسے انگلیوں پر نچاتا ہے۔ اور پھر جب انسان اپنے لئے اس کھیل کے دوران میں قصرِ عشرت تعمیر کرلیتا ہے تو اس لعبت کو فنا کر دیتا ہے۔ اور قصرِ عشرت کی بلند دیواریں اپنے سکینوں کا مرثیہ پڑھنے کے لئے باقی رہ جاتی ہیں۔

با سرو قدے تازہ تر از خرمنِ گل
از دست مدہ جامِ مے و دامنِ گل
زاں پیش کہ ناگہ شود از گرگِ اجل
پیراہنِ عمرِ تو چوں پیراہنِ گل

اس رباعی میں موت کی تشبیہ گرگ سے اور پیراہنِ عمر کی تشبیہ پیراہنِ گل سے تعریف سے بے نیاز ہے۔

ایں چرخِ فلک کہ مادرو حیرانیم
فانوسِ خیال از و مثالے دانیم
خورشید چراغ دان و عالم فانوس
ما چوں صوریم کا ندرو حیرانیم

انسان کے محدود علم کی طرف اس سے پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے اس کے علاوہ تقدیر کے اٹل۔ احکامات کے مقابلے میں انسان کی تدبیر کی رسوائی اس کی بےبسی اور بےکسی کی مظہر ہے۔ مندرجۂ بالا رباعی میں خیام نے انسان کی "چارہ فرمائیوں" کی ناکامی اور اس کی حیرانی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ انسان کی تشبیہ فانوسِ خیال کی تصویروں سے اسقدر کامل ہے کہ تعریف نہیں ہوسکتی۔ عین اسی طرح جس طرح تصویریں لبِ شکایت نہیں کھول سکتیں۔ انسان بھی "سرگردانی" کے مسلسل حملوں سے پائمال ہوکر کچھ نہیں کرسکتا۔

صبح است دمے برمے گل رنگ زنیم
ویں شیشۂ نام و ننگ بر سنگ زنیم
دست از املِ درازِ خود باز کشیم
در زلفِ دراز و دامنِ چنگ زنیم

خیام "ننگ و ناموس" کے خیال کو فراموش کرنا چاہتا ہے اور اس آرزو کا اظہار اس طرح کرتا ہے کہ "آؤ اس شیشۂ ناموس کو پتھر پر دے ماریں۔ ایک نازک اور لطیف شیشے کو پتھر پر دے مارنے کا جو نتیجہ ہوگا وہ ظاہر ہے۔ ریزہ ریزہ ہو جائیگا۔ اور اس طرح کہ پھر اس کا جوڑنا محال ہو جائیگا۔

ساقی نظرے کہ ہمدمِ غم مائیم
محروم ز خورشید چو شبنم مائیم

ہر چند کہ عالمے ست محروم زتو
محروم ترین خلقِ عالم مائیم

مہرِ عالمتاب رگِ کائنات میں خونِ حیات پیدا کرتا ہے۔ اس کے گوناگوں اعمال سے لالہ و گل کی رنگ آفرینیاں وجود میں آتی ہیں۔ اس کی تابش سے ایشیائی شعرا کے عقیدے کے مطابق جواہر پیدا ہوتے ہیں۔ غرضیکہ آفتاب کائنات کا روشن ترین عنصر ہے۔

خیام نے اپنی محرومی کو شبنم کی محرومی سے تشبیہ دی ہے۔ خورشید سے آفتابِ حقیقت مراد لیا ہے۔ اس سے پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ خیام کو کائنات کے مرکزی مسائل کے متعلق شک ہے۔ اس شک کو رفع کرنے کے لئے حقیقت کا آفتاب درخشاں ہونا چاہئے۔ لیکن خیام اس سے محروم ہے۔ حقیقت اُسے نہیں ملتی۔ اُس کی محرومی اس خورشید سے اسی طرح کی ہے جس طرح شبنم کی۔ "خورشید اور شبنم" کا اجتماع ناممکن ہے۔ محرومی کی اس سے بہتر مثال نہ ہو سکتی تھی کہ آفتاب کے ہوتے ہوئے شبنم کا وجود قائم ہی نہیں رہ سکتا۔ غالب کہتا ہے۔

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

انتقالِ اصوات ہم کہہ چکے ہیں کہ قوتِ تخیل اپنے پُراسرار فن سے کام لیکر ایسے الفاظ کا انتخاب کرتی ہے جن کی صوت اپنے معانی سے ایک خاص تعلق رکھتی ہے اور اس طرح وہ اصوات جو مصنف کے ذہن میں تھیں قاری کو سنائی دیتی ہیں۔ یعنی بعض[1] "الفاظ گنجینۂ معانی ہونے کے علاوہ کسی نہ کسی آواز کی صدائے بازگشت بھی ہوتے ہیں۔ اس طرح الفاظ آواز کے بھی قائم مقام ہیں۔ ایسے لفظوں میں ایک خاص بات یہ ہوتی ہے۔ کہ وہ اصطلاح و اشتقاق سے مبرا ہوتے ہیں نہ اُن کا مادہ کسی مصدر سے نکالا جا سکتا ہے۔ البتہ قواعدِ زبان میں وہ صنایع و بدایع کی ایک قسم ہو سکتے ہیں جس کو ہم تجنیسِ صوت کہیں گے۔"

خیام کے کلام میں اس تجنیسِ صوت کی کئی مثالیں پائی جاتی ہیں۔

مے در کفِ من نہ و برآور غلغل
بانعرۂ عندلیب و صوتِ بُلبل
بے نغمہ اگر رواں بُدے مَے خوردن
مَے در سرِ شیشہ نا کردے قُل قُل

[1] ادبی دنیا۔ ستمبر سنہ ۱۹۳۰ء۔ "نغمۂ خاموش"

برخیز و بیا کہ چنگ بر چنگ زنیم
مے نوش کنیم و نام بر ننگ زنیم
سجادہ بیک پیالۂ مے بفروشیم
وین شیشۂ زہد بر سرِ سنگ زنیم

آن قصر کہ بر چرخ ہمی زد پہلو
بر درگہ او شہان نہادندے رُو
دیدیم کہ بر کنگرۂ اش فاختۂ
بنشستہ ہمی گفت کہ "کوکو۔ کوکو"

مندرجۂ بالا رباعیات میں غلغل کا تعلق شور سے۔ نعرہ کا بلند آواز سے۔ قلقل کا صراحی کی غٹ غٹ سے۔ چنگ کا نغمہ ساز سے۔ جو صوتی اور معنوی تعلق ہے وہ ظاہر ہے۔

خیال آفرینی خیام کے اشعار سلسلہ جنبانِ خیال ہیں یعنی اِن کو پڑھکر انسان اپنے ذہن میں حسین و جمیل امکانات اور تاثرات کا ایک سلسلہ قایم کر سکتا ہے اور خود ایسے معانی تخلیق کر سکتا ہے جو اشعار کے الفاظ سے پیدا نہیں ہوتے۔

من ہیچ ندانم کہ مرا آنکہ سرشت
از اہلِ بہشت کرد یا دوزخِ زشت
جامے و بُتے و بربطے بر لبِ کشت
این ہر سہ مرا نقد و ترا نسیہ بہشت

جامے و بُتے و بربطے بر لبِ کشت اپنے اندر ایک جہانِ حسن و رنگ و بو لئے ہوئے ہے۔ "جام" اور شرابِ خوشگوار کی ارغوانی موجیں، حسین و جمیل ساقی

لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ

مہوش و دلربا، جسکے خرامِ ناز سے آواز پیدا نہیں ہوتی۔ سبک رو لطیف۔ "بُتے" نگارِ دل افروز۔ اور صرف اِس لفظ میں وہ تمام اندازہائے حسن پنہاں ہیں جو ذہن میں آ سکتے ہیں۔ بُت کی تعریف کر کے خیام نے اپنے معانی کو   اور اپنے تصورِ حسن کو محدود و مقید نہیں کیا۔ اپنے اپنے تصور و تخیل کی مطابقت میں پڑھنے والے "بُت" کا تصور کر سکتے ہیں۔ گیسوؤں کی وہ کونسی آرائش ہے آنکھوں کی وہ کونسی مستی ہے۔ عشوہ و غمزہ کی وہ کونسی شوخی ہے۔ انداز کی وہ کونسی دل آویزی ہے جو "بُت" کے لفظ میں پنہاں نہیں۔ بربطے بر لبِ کشت۔ یعنی

سرو سبز و شیشۂ مے جوئبار و نغمہ ہے
"بربطے بر لبِ کشت"

ساقی۔ نگار۔ شراب۔ جوئبار۔ ان عناصر کے مجموعے سے جو اثر مترتب ہوتا ہے اور جس نظارے کا خیال آتا ہے وہ کسقدر حسین ہے اور اپنے امکانات کے اعتبار سے کتنا لامحدود ہے۔

عابد

ٹیگور سے

ہمارے مشرقی جذبات کی رنگیں زباں تُو ہے
ہماری ایشیائی سادگی کا ترجماں تُو ہے
حسیں افکار میں روحانیت کا رنگ بھرتا ہے
مبلّغ ہے قلم کے زور سے تبلیغ کرتا ہے
ٹپکتی ہے مئے پاکیزگی تیرے خیالوں سے
فضا بھرتی ہے آہیں تیرے ہلکے ہلکے نالوں سے
الٰہی زمزموں سے رُوح کو بہلا رہا ہے تُو
کچھ اِس انداز سے میٹھے سُروں میں گا رہا ہے تُو
کہ تجھ پر ایشیائی شاعری انجم لٹاتی ہے
حسیں فطرت ترے اسرار میں کھوئی سی جاتی ہے
سراپا محو ہے تو حُسنِ رنگیں کی اداؤں میں
چھپی بیٹھی ہے تیری شخصیت تیری نواؤں میں
دیا ہے جاودانی رنگ سوز و ساز کو تُو نے
مجسّم کر دیا ہے عشق کی آواز کو تُو نے
سکوتِ شب میں تُو نے چھیڑ رکھا ہے رباب اپنا
بیاں کرتا ہے گا کر حُسن سے رنگین خواب اپنا

(الہٰیات کے)

فاخر

ایکٹر کی وصیّت

ہنری یارک کتب خانہ میں بیٹھا ہوا اپنی طویل زندگی پر خاموش تبصرہ کر رہا تھا۔ وہ مُسکرایا۔ ہاں۔ ۸۷ سال کی عمر میں اِسے سود و زیاں کی دنیا کے ساتھ کوئی وجہِ شکایت نہ تھی۔ وہ ۵۵ سال تک اسٹیج کا بادشاہ رہا۔ زمانہ اُس کے آرٹ کا قائل ہو چکا تھا۔ وہ ہمیشہ ہیرو کا پارٹ کیا کرتا تھا۔ اور بادشاہ کا پارٹ تو گویا اسی کے لئے مخصوص تھا۔ اس کے دوست ازراہِ ظرافت اسے کنگ یارک یا ڈیوک آف یارک کہا کرتے تھے۔ یہ لقب اِسے بہت پسند تھا۔ ایکٹری کو خیرباد کہنے کے باوجود وہ اپنا شاہی زرّین جُبّہ پہنے ہوئے تھا۔ اور اب اس مہتم بالشان کتب خانہ میں اس کا انداز اُس بوڑھے تاجدار کی طرح تھا۔ جو نصف صدی تک کامیاب اور مرعوب کُن حکومت کرنے کے بعد اپنی وسیع سلطنت اپنے بچّوں کے مابین تقسیم کرنا چاہتا ہے۔ حیاتِ مُستعار کو آخری الوداع کہنے سے پیشتر اُس کا ارادہ تھا کہ وہ اپنی ملکیت کے متعلق باضابطہ وصیت کر لے۔

اُس نے باوقار متانت کے ساتھ پَر کا قلم اُٹھایا۔ میز پر موی کاغذ کے چند تختے پڑے تھے وہ لکھنے کو تھا۔ کہ اُس کی گذشتہ زندگی کے بوقلموں واقعات متحرک تصاویر کی طرح اُس کی چشمِ تخیّل کے سامنے پھر گئے۔ اُس کے حریف اور نکتہ چین اپنی کم ظرفی کا ثبوت دیتے ہوئے دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ ایک نقاد تو خصوصیت سے آخری دم تک مخالف رہا۔ اُس نے ایک رات یارک کے "کام" پر تبصرہ کے دوران میں یہ فقرہ لکھا تھا۔ کہ "کل رات ہنری یارک نے کنگ میئر کا پارٹ کیا۔ لیکن اُس بڈھے تاجدار کی عمیق تلخ کامیوں کا حقِ ترجمانی ادا نہ کر سکا۔" اور اُس کے قلم نے یہاں تک حرکت کی تھی کہ ملک الموت نے اُس کی لوحِ زندگی پر خطِ تنسیخ کھینچ دیا۔

اِس واقعہ کی یاد سے یارک کی مُسکراہٹ ایک ہلکی سی افسردگی کے ساتھ آمیز ہو گئی۔ دراصل اِن لوگوں میں یارک کے فن کو سمجھنے کی صلاحیت ہی نہ تھی۔ اُن کے دل کا نہیں بلکہ دماغ کا قصور تھا۔ یارک نے زندگی کی آخری منزل پر شاہانہ عفو سے کام لے کر اپنے تمام دشمنوں کو معاف کر دیا۔ اُس نے قلم کو دوبارہ سیاہی سے تر کیا۔ اور لکھنا شروع کیا۔

"میں بہ سلامتی ہوش و حواس یہ وصیت کرتا ہوں۔ کہ میں وکٹر تھیٹر کو جو سٹریٹ نمبر ۱۵ نیویارک شہر کے جنوب مشرقی کونے میں واقع ہے۔ اور جس کا طول ۱۸۴ فٹ اور عرض ایک سو فٹ ہے۔ اور جسکی عمارتی حیثیت میرے قانونی مشیر باقاعدہ طور پر واضح کر دیں گے۔ مسٹر فریڈرک وائٹ کے سپرد کرتا ہوں جو ...."

ہنری یارک کا قلم یکایک رُک گیا۔ کیا روزا کا نام وصیت میں درج کرنا خلافِ مصلحت تو نہ ہوگا۔ اس نے ایک لمحہ بھر سوچنے کے بعد اِس فقرہ کو ختم کر دیا۔

"روزا وائٹ کا پوتا ہے۔"

ہاں۔ مسٹر فریڈرک وائٹ یارک کا نہیں بلکہ مس روزا وائٹ کا پوتا تھا۔ اور بس یہی ایک شخص اُس عورت کا رشتہ دار باقی تھا۔ جس سے یارک نے ایک مرتبہ عہدِ شباب میں محبّت کی تھی۔ اور جس کی یاد بہار و خزاں کے اتنے دور گزرنے پر بھی اُس کے دل میں ابھی تک تازہ تھی۔ خود روزا نے بھی اُس کے ساتھ ایک مرتبہ اظہارِ محبت کیا۔ کوئی وجہ نہیں کہ وکٹر تھیٹر اِس عورت کے پوتے کو نہ دیا جائے۔

آہ روزا وائٹ! حُسن و عشق کے صدہا واقعات اِس نام میں مضمر تھے۔ یارک کی اُس کے ساتھ آخری ملاقات اِسی وکٹر تھیٹر میں ہوتی تھی۔ ہاں۔ کون سا سال تھا۔ غالباً ۱۸۸۰ء کے موسم خزاں میں۔ یقین نہیں آتا۔ کہ اس واقعہ کو ایک رُبع صدی گزر چکا ہے۔ ابھی کل کی بات ہے۔ کہ یارک نے ہملٹ کا پارٹ کیا تھا حاضرین نے اُسے بار بار خراجِ تحسین ادا کیا کھیل ختم ہونے پر وہ اسٹیج کے پچھلے دروازہ سے باہر جانے کو تھا۔ کہ روزا نے اُس کے قریب

آکر کہا۔ "یارک۔ آج تو تم نے کمال کر دیا! ایک طویل جدائی کے بعد یہ غیر متوقع ملاقات یارک کے لئے سراسر سرمایۂ عیش تھی۔ اُس نے موقع غنیمت پاکر کہا۔

"روزا مجھے معاف کر دو۔ کیا واقعی ہمارا رشتۂ محبت ہمیشہ کے لئے ٹوٹ چکا ہے۔ کیا میرے لئے اب کوئی امید باقی نہیں رہی؟"

یارک اتنی مدت کے بعد اپنے تخیل میں صاف دیکھ رہا تھا۔ کہ روزا نے اپنے چہرہ پر ایک دنیائے تبسم سمیٹتے ہوئے جواب دیا۔

"نہیں ہنری نہیں۔ (اس کی آنکھوں میں اپنی بڑی بڑی معنی خیز آنکھیں ڈال کر) لیکن ہم دوست کی حیثیت میں مل سکتے ہیں۔"

یارک نے اُس بارگاہِ حسن میں سر جھکا کر پھر کہا۔

"مجھے معلوم ہے کہ قصور میرا تھا۔ لیکن خدا کے لئے مجھے ایک اور موقع دو۔"

روزا نے کسی قدر مصنوعی متانت سے جواب دیا۔ کہ "ہنری اب تو ہمارا معاملہ طے ہو چکا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

ہنری یارک اس واقعہ کو کیونکر بھلا سکتا تھا۔ کہ روزا محض اُس کے فن کی داد دینے کے لئے نہیں آئی تھی۔ بلکہ اُس ملاقات میں اُسے یہ بتلانا مقصود تھا۔ کہ مسٹر وائٹ سے میری شادی ہونے والی ہے۔

ہنری یارک کا قلم جذباتِ قلبی کے ہیجان سے لرزنے لگا۔ اُس نے قلم کو میز پر رکھدیا۔ اور اس ملاقات کے آخری منظر کی یاد اُسکے دل میں تازہ ہو گئی؛۔

"تھیٹر خالی ہو چکا تھا۔ ہم دونو اُس کے سایۂ دیوار میں کھڑے تھے۔ میرا ارادہ تھا کہ میں روزا کو حاصل کرنے کی ایک آخری سرتوڑ کوشش کروں۔ وہیں دوزانو ہو کر اُس کا دامن پکڑ لوں۔ اور با چشمِ گریاں محبت میں ڈوبی ہوئی سوز و گداز سے لبریز ایک ایسی تقریر کروں کہ اُسے یارائے صبر نہ رہے اور وہ بے اختیار سسکیاں بھرتی ہوئی میرے ساتھ نئے سرے سے پیمانِ محبت استوار کرے لیکن اُس کی شادی کی خبر سنکر میری طاقتِ گویائی مسلوب ہو گئی۔ میں دیر تک اُس کی طرف دیکھا کیا پھر ہم دونو عالمِ سکوت میں ایک دوسرے سے رخصت ہو گئے۔"

موی کاغذ پر الفاظ خشک ہو چکے تھے۔ اس کے باوجود اُس نے جاذب سے کام لیا۔ اور پھر پَر کے قلم کو سیاہی میں ڈبو کر اُسے ایک جھٹکا دینے کے بعد لکھا؛۔

"میرا وہ مکان جو آرٹ پیلیس کے نام سے مشہور ہے اور ۲۳ سٹریٹ نیویارک میں واقع ہے۔ اور جس کی عمارتی حیثیت میرے قانونی مشیر باقاعدہ طور پر واضح کر دیں گے۔ میں اسے معہ سازوسامان اور جملہ تصاویر کے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مسٹر فریڈرک وائٹ کے سپرد کرتا ہوں جو روزا وائٹ کا پوتا ہے"؛

ہنری یارک کے قلم میں از سرِ نو حرکتِ اضطراری[1] پیدا ہوئی۔

حسن و عشق کی ہیجان پرور داستان مسلسل اُس کے تخیل کے فلم پر رونما ہو گئی۔ اُسے یاد آگیا کہ میں روزا سے پہلی مرتبہ کب کہاں اور کیونکر ملا تھا؟ اُسکی کمپنی اُن دنوں شکاگو میں تھی۔ کونسا کھیل جاری تھا؟ ہاں "آخری ملاقات"۔ اس زمانے میں بھی یارک ایک باکمال ایکٹر کی حیثیت میں بہت مشہور ہو چکا تھا۔ اس کھیل کے بعد اُس کی شہرت نصف النہار[2] پر پہنچ گئی۔

اُس نے ہیرو کے پارٹ میں عاشقِ ناکام کی خونابہ فشانیوں کا حق اس سوز و گداز سے ادا کیا کہ سامعین اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے۔ تھیٹر میں کوئی آنکھ نہ تھی جو آنسو سے تر نہ ہوئی ہو۔ دوسرے یا شاید تیسرے روز کا ذکر ہے۔ کہ یارک شہر سے باہر جھیل کا نظارہ دیکھنے کے لئے گیا۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ یارک ایک ٹیلے پر کھڑا تھا۔ پانی کی نیلگوں موجیں حدِ نگاہ تک رقص کر رہی تھیں۔ بارش ہونے لگی۔ سخت بارش۔ یارک واپس آنے کو تھا۔ کہ یکا یک ایک قہقہے کی آواز اُس کے کانوں میں پڑی۔ وہ رُک گیا۔ ایک لڑکی اُس کی طرف دوڑی آرہی تھی۔ ہوا کے تند جھونکوں سے اس کے بال سنہری پردے کی طرح ہوا میں لہرا رہے تھے۔ ہاں سنہری پردے کی طرح۔ وہ یارک کے قریب آکر کھڑی ہو گئی۔ اُس نے جھیل کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے ایک اور قہقہہ لگایا جو قدرت کے طوفانی منظر پر ایک حسین و جمیل تبصرہ[3] تھا۔ اُنہوں نے ٹیلے پر سے دیکھا۔ کہ ایک حبشی ماہی گیر اپنا جال پانی سے نکال رہا ہے۔ اور دوسرا اپنا جال نکال چکا ہے۔ اس دوسرے ماہی گیر نے اوپر

---

۱ پُر اضطراب۔ ۲ حدِ کمال۔ ۳ ریویو۔

آنکھ اٹھائی۔ اِن دونو کو ٹیلے پر دیکھا۔ اور ہنسا۔ ماں ہنسا۔ پارک کو اُس کے چمکتے ہوئے دانت صاف نظر آرہے تھے۔ پارک اور وہ لڑکی واپس آ گئے۔ اِس رومانی انگیز ملاقات کا نتیجہ پیہم ملاقاتیں، ضیافتیں، رقابتیں، غلط فہمیاں اور .... جدائی۔

روزا ایک پادری کی لڑکی تھی۔ اور جب پارک شادی کے لئے اُس کے باپ کی اجازت حاصل کرنے کی خاطر اُن کے مکان پر گیا۔ تو وہ اپنے ڈرائنگ روم میں تھا۔ انگیٹھی روشن تھی۔ باپ کو ایک دن پہلے اُن کی محبت کا علم ہو چکا تھا۔ وہ اٹھا اور خشمگیں انداز میں بولا۔

"میں اپنی لڑکی کو تھیئٹر کے دوزخ میں نہیں جھونک سکتا۔ ایک ایکٹر۔ او خدا! میری لڑکی اور ایکٹر سے شادی کرے۔ او میرے خدا!"

روزا نے قہقہہ لگایا جس نے پادری کے طوفانی احتجاج پر ایک تازیانے کا کام دیا۔ پارک کو ایک اور بات یاد آئی۔ اور وہ یہ کہ روزا کی ماں پارک کی طرفدار تھی۔ خدا اُس کی روح کو شگفتہ رکھے۔

یہ ملاقات اُس کی زندگی میں ایک تاریخی حیثیت رکھتی تھی۔ اُسے یہاں تک یاد تھا۔ کہ اس کمرے میں انگیٹھی کے اوپر طاق پر ایک خوشنما کھلونا جہاز پڑا تھا۔ وہ ابھی تھیئٹر تک نہ پہنچا تھا۔ کہ رستے میں اُسے روزا مل گئی۔ روزا کی زندگی قہقہہ و شادمانی کا ایک تلاطم پیہم تھی۔ پارک نے اپنے آخری لمحوں میں روزا کی بے وفائی کو اپنی بدقسمتی پر محمول کیا۔ اُس نے بہت جلد پارک کے رقیب وائٹ سے شادی کر لی۔ لیکن دنیا کا یہی دستور ہے۔ پارک نے پھر قلم اُٹھایا اور لکھنا شروع کیا۔

"کرسٹل ہوٹل جو ریلوے اسٹیشن کو جاتے ہوئے براڈوے اسٹریٹ کے دائیں طرف واقع ہے اور جس کی آمدنی ایک ملین ڈالر سالانہ ہے۔ نیز وہ باغ جو اُس ہوٹل سے متصل واقع ہے میں اُسے مسٹر فریڈرک وائٹ کے سپرد کرتا ہوں۔ جو روزا وائٹ کا پوتا ہے۔"

پارک کا ہاتھ تھرتھرانے لگا۔ اُس کے دماغ میں خیالات کا ایک نیا چکر پیدا ہوا۔ پارک کو روزا کی موت کے چوتھے دن بعد اُس کے خاوند مسٹر وائٹ سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ وہ ایک ہوٹل میں کھانا کھا رہے تھے۔ پارک کی خاموشی میں جذبۂ رقابت کار فرما تھا۔ کھانا ختم ہونے پر ہلکی شراب کی باری آئی۔ وائٹ نے اپنے گلاس کو ایک چمچے سے ضرب لگاتے ہوئے پوچھا۔

"آپ کی کمپنی کتنے روز ٹھہرے گی؟"

جامِ شراب اور چمچہ! پارک کو اپنے رقیب کی یہ حرکت پسند نہ آئی۔ اُس نے سوچا کہ آخر روزا کے لئے اِس میں کونسی بات موجبِ کشش تھی۔ کہ اُس پر فریفتہ ہو گئی۔ لیکن نہیں۔ روزا کا اُس کی محبت میں گرفتار ہونا اِس امر کا بدیہی ثبوت ہے کہ اِس میں کوئی خاص خوبی ضرور ہے۔

غرضیکہ بڈھے ایکٹر کے دماغ میں گذشتہ ساٹھ ستر سال کے واقعات ایک اُلجھے ہوئے ناقابلِ تشخیص سلسلے میں چکر کاٹ رہے تھے۔ ابھی اُسے اپنی وصیت کا آخری حصہ لکھنا باقی تھا۔ روزا وائٹ کے پوتے کے علاوہ کوئی اور شخص یا انجمن تو نہیں جو امداد کی مستحق ہو۔ پارک کے پاس ابھی ایک اور چیز تھی۔ جس کے بالمقابل وہ اپنی ساری جائداد کو بالکل ہیچ سمجھتا تھا۔ وہ ایک خط تھا۔ تاریخی خط جو نیویارک ٹائمز کے چیف ایڈیٹر نے ایک مرتبہ اُسے لکھا تھا۔

پارک نے یہ خط جیب سے نکالا اور پڑھنا شروع کیا۔

نیویارک ٹائمز مورخہ ۱۲ مارچ ۱۸۹۶ء

مائی ڈیئر ہیری۔

میں مدت سے آپ کا پارٹ دیکھنے کا متمنی تھا۔ کل رات آپ نے شہنشاہ اگسٹس کا پارٹ اِس خوبی سے ادا کیا۔ کہ میں اُسے دیکھنے کے بعد آپ کو زمانۂ حاضر کا سب سے بڑا آرٹسٹ کہہ سکتا ہوں۔ آپ کے فن میں جدت ہے۔ جذبات کی تصویر آرائی میں آپ کا ملکہ ایک ماہرِ خصوصی کی حیثیت رکھتا ہے۔ مجھے کھیل کے خاتمے پر ایک دوست نے بتایا۔ کہ بعض نقاد آپ پر نکتہ چینی کرتے ہیں۔ ایسے لوگ یقیناً آرٹ کے اصول سے قطعاً ناآشنا ہونگے۔ یا اُن کی جرح و نقد کسی ذاتی کاوش یا جذبۂ حسد پر مبنی ہے۔ میں نے ٹائمز کے نقاد کو خاص ہدایت کر دی ہے کہ وہ آئندہ آپ کے اعجاز نما فن کو خصوصیت سے ملحوظِ خاطر رکھے۔

۱؎ سعادت۔ داستانِ درد۔ ۲؎ پروٹسٹ۔ ۱؎ کھلا۔ ۲؎ دریافت۔ ۳؎ آرزومند۔

میں ہوں آپ کا صادق

میکائیل ڈائینا

ایڈیٹر ٹائمز

ہنری پارک نے یہ خط پڑھا۔ اور پھر بآوازِ بلند کہا۔ "میرے آرٹ کا شاہد۔ میری زندگی کا سب سے گرانقدر سرمایہ"! میں اسے یقیناً مسٹر فریڈرک کے حوالے نہیں کر سکتا۔ کیا میں اُسے امریکہ کی مجلسِ مصنفین کے حوالے نہ کر دوں کہ وہ اِسے فروخت کر ڈالیں۔ اور اس کے عوض جو چند لاکھ ڈالر وصول ہوں۔ وہ معذور الخدمت[1] اور مفلوک الحال ایکٹروں کے امدادی سرمائے میں شامل کر دئے جائیں۔ نہیں نہیں۔ یہ خط آرٹ سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔ میں اِسے اپنی آخری آرام گاہ میں اپنے سینے کے ساتھ رکھونگا۔ اُس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ اس کا سارا جسم لرزنے لگا۔ اُس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ زندگی کی آخری کشمکش میں اُس نے اپنا خط سینے سے لگانے کی کوشش کی۔ لیکن تماشہ گاہِ ہستی میں اُس کا پارٹ ختم ہو چکا تھا لوگوں نے اُس کی موت کی خبر سُنی اور کہا۔ افسوس وہ نامور اور یکتا ایکٹر ساری عمر افلاس زدہ رہا۔ زندگی کے آخری ایام میں وہ پاگل ہو گیا تھا۔ اور اُس عظیم الشان مکان میں رہتا تھا۔ جو امریکہ کے امیر ایکٹروں کی مجلس نے اپنے مفلوک الحال معاصرین کے لئے بنا رکھا ہے۔ یہاں وہ شاہی لباس میں ملبوس اپنے آپکو بے شمار روپیہ اور تھیٹروں اور ہوٹلوں کا مالک سمجھتا تھا۔ یہ وصیت بھی اِسی سرابِ[2] نما تخیل کا نتیجہ تھی۔ اُس کا سرمایۂ حیات دراصل وہ ایک خط تھا جو ٹائمز کے ایڈیٹر نے ازراہِ قدردانی اُس کے نام لکھا تھا۔

غیر معروف جرنلسٹ

---

[1] اپاہج۔ اور از کار رفتہ لوگ

[2] سراب نما تخیل۔ ایسا خوش نما تخیل جو کچھ اصلیت نہ رکھتا ہو۔

بہار کی شگفتگی

فضا کی ساری دلکشی تبسموں میں کھو گئی
بہار کی شگفتگی نظر میں جذب ہو گئی

تمام تر تجلیاں
حریم دل میں ضو فشاں

تاثراتِ رنگ و بو
فروغِ کیفِ آرزو!

فروغِ کیفِ آرزو تاثراتِ رنگ و بو!

(۲)

ہزارہا لطافتیں ادائے التفات میں
بھری ہوئی ہیں نزہتیں تمام کائنات میں

نسیم عطر بیز ہے
شباب جلوہ ریز ہے

چمن بھی ہے شراب بھی
اُٹھا لے ہاں رباب بھی

اُٹھا لے ہاں رباب بھی چمن بھی ہے شراب بھی

منظور سروش (بھوپالی)

دمشق کی موجودہ حالت

"جب عرب فرمانرواؤں نے دمشق اور اُس کے مضافات کی سیر کی تو اُن میں سے ہر ایک کے مُنہ سے بے اختیار یہی نکلا کہ "دمشق تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے زمرد میں نیلم نصب کر دیا ہو" کچھ عرصہ کے بعد یہ قول ضرب المثل ہو کر رہ گیا۔ ظاہر ہے کہ اس قول میں صداقت ضرور مضمر ہوگی۔ جن سیاحوں نے دمشق کی سیر کی ہے وہ اس مقولے کی صحت و صداقت پر مہرِ تصدیق ثبت کرتے ہیں۔

دمشق کی ساری زیبائش اور خوبصورتی کا انحصار اُس نہر پر ہے جو اُس کے گرداگرد بہتی ہے۔ جب آپ شہر میں داخل ہونگے تو سب سے پہلے اسی نہر کا پُل عبور کرنا پڑیگا۔ شہر کے اندر بھی ہر سڑک اور گلی کوچے میں اس بڑی نہر کی شاخیں مارپیچاں کی طرح بل کھاتی ہوئی چلی گئی ہیں۔ اُن کی بدولت، موسم میں اعتدال بھی پیدا ہوگیا ہے اور شہر کے اندر جسقدر افتادہ زمین ہے، سب انار، نارنگی، انگور، ناسپاتی، سیب اور کھجور کے باغیچوں میں تبدیل ہوگئی ہے۔ کیسے خوش قسمت ہیں وہ لوگ جنہوں نے اِن باغیچوں میں اپنی رہائش کے لئے خس و خاشاک سے پاک چھوٹے چھوٹے بنگلے بنوا رکھے ہیں جب آپ شہر کے وسط میں پہنچیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ جونپور کی طرح دمشق بھی اس نہر یا مصنوعی دریا کے دائیں بائیں آباد ہے یہ نہر شہر کے وسط میں سے گزرتی ہے۔ اور اِس کے کنارے قدیم زمانہ کی صدہا عالیشان عمارات زبانِ حال سے اپنے بنانے والوں کی عظمت کی گواہی دے رہی ہیں اِس نہر سے ہزاروں چھوٹی چھوٹی نہریں نکلی ہیں اور شہر کے تمام مکانات کے سامنے سے گزرتی ہیں تاکہ باشندوں کو ہر وقت تازے پانی کا آرام رہے۔ تمام بڑے بڑے مکانات میں فوارے لگے ہوئے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی حوضیں بنی ہوئی ہیں، اُن کے گرداگرد نارنگی کے پودے لگے ہوئے ہیں۔ گویا دمشق میں نہروں کا جال بچھا ہوا ہے۔

اگر کسی ہوائی جہاز پر چڑھ کر شہر پر طائرانہ نگاہ ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ دمشق ایک عظیم الشان باغ ہے یا ایک عظیم الشان باغ میں ایک شہر بسا ہوا ہے۔ یہ حالت آج سے نہیں بلکہ جب سے دمشق آباد ہے اسی وقت سے قائم ہے۔ ہر مسجد، ہر مدرسہ، ہر صومعہ، ہر مکتبہ ہر کوچہ، ہر بازار، ہر محل اور ہر جھونپڑا، غرضیکہ جو چیز ہے باغ کے اندر ہی بنی ہوئی ہے۔ وہیں شہر بھی ختم ہو جاتا ہے۔ اِس کے معنی صاف ظاہر ہیں کہ دمشق کا وجود اِس نہر ہی کے سہارے قائم ہے۔

عام طور پر مسلّم ہے کہ دمشق دنیا میں سب سے پرانا شہر ہے۔ یعنی بنارس اور پیکن سے بھی زیادہ قدیم ہے۔ مسیح سے ڈھائی تین ہزار سال پہلے کی تاریخوں میں اِس شہر کا ذکر موجود ہے۔ ممکن ہے بنارس یا پیکن اِس سے بھی زیادہ پُرانا ہو، لیکن اِن شہروں کی قدامت تاریخی طور پر ثبت نہیں ہوسکتی۔ اِس شہر پر بارہا مختلف بادشاہوں نے حملے کئے۔ باشندوں کو قتل کیا، اور شہر کو اُجاڑا، لیکن تھوڑے دنوں کے بعد پھر اصلی حالت پر آگیا۔ وجہ یہ ہے کہ یہ شہر مصر، یونان، عراق۔ اور عرب اِن چار ملکوں کے درمیان میں واقع ہوا ہے اور ہمیشہ سے تجارت، صنعت اور حرفت کا مرکز رہا ہے اور یہاں کا بازار اِن تمام ملکوں کے سوداگروں اور سیاحوں کا ملجا اور ماوا رہا ہے۔ قدیم زمانے میں فوجی ساز و سامان اِسی شہر سے تمام ممالک میں جاتا تھا۔ یہاں کی تلوار اور خنجر تمام دنیا میں مشہور ہے۔ علاوہ بریں، اگر کوئی شخص مصر سے عراق کو جائے تو راستہ میں یہی ایک شہر ایسا ہے جہاں مسافروں کو ہر قسم کی چیزیں دستیاب ہوسکتی ہیں۔ اِن وجوہ کی بنا پر دمشق قدیم الایام سے، دنیائے قدیم کے لئے جاذبِ توجہ رہا ہے۔

آجکل، اگرچہ بہت سے نئے شہر دنیا میں ترقی پذیر ہیں لیکن دمشق کی عظمت اور دلکشی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ ہندوستان سے یورپ جانے کا آسان اور نزدیک کا راستہ یہ ہے کہ کراچی سے بصرہ تک جہاز ہیں بصرہ سے دمشق تک موٹر ہیں، دمشق سے ریلوے ٹرین آپ کو تیار ملیگی، قسطنطنیہ ہوتے ہوئے یورپ کے جس ملک میں جی چاہے، جا سکتے ہیں،

دمشق کی صنعت و حرفت بھی آجکل ترقی پذیر ہے۔ پیتل اور لوہے، ہاتھی دانت اور جواہرات کی بنی ہوئی چیزیں، بکثرت لندن اور نیویارک، قاہرہ اور کلکتہ کے بازاروں میں بھیجی جاتی ہیں، اور قدردان نہایت شوق سے اُن کو خرید کر، اپنے کمروں کو سجاتے ہیں۔

یہاں کا میوہ بھی خشک وتر دونوں صورتوں میں، مختلف ممالک کو بھیجا جاتا ہے۔ اگرچہ دمشق میں مشرقیت کافی طور پر نمایاں ہے لیکن مغربیت کا اثر بھی آہستہ آہستہ پھیلتا جاتا ہے۔ دکانوں کی آرائش، لباس، وضع قطع، اور معاشرت اِن سب باتوں میں یورپین تمدن کی جھلک نمودار ہو رہی ہے۔

دمشق کا قدیم بازار جسے "صراطِ مستقیم" کہتے ہیں، آج بھی قدیمی شان وشوکت کے ساتھ قائم ہے۔ یہ بازار شہر کو دو برابر حصّوں میں تقسیم کر دیتا ہے یعنی اُسی قدر لمبا ہے جسقدر دمشق حضرت مسیح کا مشہور شیدائی اور مسیحیت کا پُرجوش مبلغ سینٹ پال بھی اسی بازار میں چل پھر کر لوگوں کو دینِ مسیحی کی طرف بلایا کرتا تھا اور وہ مشہور کھڑکی بھی ابھی تک محفوظ ہے جس میں سے سینٹ پال نے رات کے وقت، ایک ٹوکری میں بیٹھ کر راہِ فرار اختیار کی تھی۔

آجکل دمشق پر فرانسیسی حکومت ہے۔ حکومت نے شہر کی تمدنی علمی اور اقتصادی حالت کو بہتر بنانے کی بہت کچھ کوشش کی ہے جس کی تفصیل کا یہ موقعہ نہیں لیکن دیسی صنعت کو فروغ دینے کے لئے جو ذرائع اختیار کئے ہیں اُس کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اِن سرگرمیوں کا مرکز "فرنچ انسٹیٹیوٹ آف دمشق" کے نام سے موسوم ہے۔ لیکن دراصل یہ کوئی فرنچ انسٹیٹیوٹ نہیں بلکہ اسلامی آرٹ اور آثارِ قدیمہ کا انسٹیٹیوٹ ہے۔ اِس انسٹیٹیوٹ یا انجمن کی بنیاد فرنچ جنرل گوراڈ نے ۱۹۲۲ء میں ڈالی تھی جو اِس زمانہ میں، ملکِ شام کا ہائی کمشنر (ناظم اعلیٰ) تھا، اور اس کا دفتر اسعد پاشا العظیم سابق والیٔ شام کے محل میں واقع ہے جو ۱۷۴۹ء میں تعمیر ہوا تھا۔ یہ محل ایک نہایت عالی شان عمارت ہے۔ اِس کے اندرونی کمروں میں نہایت اعلیٰ درجہ کی گلکاری اور پچی کاری کے نمونے موجود ہیں۔ لیکن حکومت کی عدم توجہی کی بنا پر بعض حصّے بوسیدہ ہو گئے تھے۔ اِس لئے بہت اچھا ہوا کہ فرنچ حکومت کی توجہ اِس عمارت کی طرف مبذول ہو گئی۔ جنرل مذکور نے بصرف زرِ کثیر تمام عمارت کی مرمت اور اصلاح کرا دی اور یقین ہے کہ یہ عمارت اب زمانہ کی دستبرد سے محفوظ رہیگی۔

فرنچ انسٹیٹیوٹ، تھوڑے عرصہ میں آثارِ قدیمہ اور مشرقی آرٹ دونوں کی مشہور درسگاہ، اور دار المطالعہ بنجائیگا۔ کیونکہ آٹھ نو سال کے قلیل عرصہ میں ہی اِس کی شہرت دور و نزدیک پھیل گئی ہے۔

اور آج اِس انسٹیٹیوٹ میں، اٹلی اور فرانس تک کے طلبا، تحصیلِ فنون میں مشغول نظر آتے ہیں۔ اس مرکز میں اسلامی تاریخ کے پڑھانے کا بھی خاص انتظام ہے۔ ایک عظیم الشان کتب خانہ اور عجائب خانہ بھی اِس مقصد کی تکمیل کے لئے مہیا کیا گیا ہے۔ اِس عجائب خانہ میں سامرہ۔ فسطاط۔ انطاکیہ۔ حمانیہ اور دیگر مقامات سے دستیاب شدہ نادر الوجود اشیاء فراہم کی گئی ہیں۔ قدیم یونانی اور رومی مصوری، بت تراشی اور تحریروں کے نمونے اور مسلمان بادشاہوں کے سونے چاندی کے سکّے۔ خلفائے بنو امیہ کے فرامین اور شاہی دستاویزیں، قدیم اسلحہ کے نمونے، قدیم عربوں کے اصنام یہ چیزیں اس عجائب خانہ کی اہمیت کا باعث ہیں۔

اِن امور کی بناء پر یہ قیاس کرنا بیجا نہیں ہے کہ اگر فرنچ حکومت کی توجہ اسی طرح اِس درسگاہ کی طرف مبذول رہی تو بیس تیس سال کے بعد یہ انسٹیٹیوٹ، یورپ کے محققین اور طلبائے اسلامیات وغیرہ کے لئے ایک نعمتِ بے بہا بنجائیگا۔ پس ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ قدیم شہر جس کا نام بہت سے شاہی خاندانوں کے ساتھ وابستہ رہا ہے۔ نئی حکومت کے ماتحت اپنی سابقہ عظمت کو برقرار رکھ سکیگا اور کوئی تعجب نہیں اگر اُس کا مستقبل اُس کے ماضی سے بھی زیادہ شاندار ثابت ہو۔

(ہندوستان ریو) مہتاب رائے

غزل

(از حضرت جگر مرادآبادی)

اب میری نگاہوں سے ہر جلوہ گریزاں ہے نظّارے کو کیا کہئے منظر ہی پریشاں ہے
اِک حُسن کا دریا ہے، اِک نور کا طوفاں ہے اِس پیکرِ خاکی میں یہ کون خراماں ہے
پھر عشقِ جنوں پیشہ یوں سلسلہ جنباں ہے راہیں بھی گریزاں ہیں منزل بھی گریزاں ہے
اِک سازِ محبّت ہی کُل عالمِ امکاں ہے تو چھیڑ تو دے ظالم ہر تار رگِ جاں ہے
آغاز سے آخر تک دل بیخود و حیراں ہے جب عشق نگہباں تھا اب حُسن نگہباں ہے
مجھکو مرے عصیاں سے کیا خاک ڈرائیگا زاہد وہی زاہد جو رحمت سے گریزاں ہے
تو رازِ محبّت کو سمجھا ہی نہیں ورنہ، پابندیٔ انساں ہی آزادیٔ انساں ہے
عالم میں یہ کب طاقت ہستی کی یہ کیا قدرت تو خود جو خراماں ہے سایہ بھی خراماں ہے
صدقے ترے ہونٹوں کے رنگینی و رعنائی اِک موجِ تبسّم میں کل رازِ گلستاں ہے
اِک شاہدِ بیتابی، اِک پیکرِ محجوبی! ہر درد میں شامل ہے ہر سانس میں پنہاں ہے

ہر جلوے سے مستغنی ہر حُسن سے بیگانہ
اِک وحدتِ کامل ہے اب کفر نہ ایماں ہے

جگر (مرادآبادی)

شادی شدہ عورتیں

ایک مجرد آدمی کی حیثیت سے میں نے اپنے وقت کا بیشتر حصہ شادی شدہ لوگوں کی خامیوں اور کمزوریوں کو جمع کرنے میں صرف کیا ہے۔ کہ اِس طرح اپنے آپ کو اُن مسرتوں سے محروم رہ جانے پر تسلی دے سکوں۔ جن کو کہا جاتا ہے کہ میں نے ناکتخدا[1] رہ کر کھو دیا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ میاں بیوی کے باہمی جھگڑوں نے مجھ پر کچھ زیادہ اثر ڈالا ہے۔ یا میرے اُن غیر اجتماعی عزایم کو راسخ کرنے میں کچھ حصہ لیا ہے۔ جن کو میں مدت سے معقول وجوہ کی بنا پر اختیار کر چکا ہوں۔ بلکہ شادی شدہ لوگوں کے مکانوں میں جہاں میں اکثر جاتا رہتا ہوں جس چیز سے مجھے فی الحقیقت تکلیف ہوتی ہے وہ ایک بالکل مختلف نوعیت کی غلطی ہے یعنی یہ لوگ آپس میں ضرورت سے زیادہ اُلفت کرتے ہیں۔

نہیں "ضرورت سے زیادہ الفت" بھی نہیں۔ اِس سے میرا مفہوم واضح نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ مجھے اِس سے تکلیف بھی کیوں ہو؟ ایک دوسرے کے ساتھ رہکر مکمل عشرت حاصل کرنے کی غرض سے اِن لوگوں کا اپنے آپ کو ساری دنیا سے الگ کر لینا ہی اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو باقی سارے عالم پر ترجیح دیتے ہیں مگر مجھے شکایت اِس بات کی ہے کہ یہ لوگ "ترجیح و پسندیدگی" کے اس جذبے کو اسقدر بے محل عُریانی کے ساتھ ظاہر کرتے ہیں۔ خصوصاً ہم مجردوں کے منہ پر تو اِس کو اتنی تلخی اور گستاخی کے ساتھ کھینچ مارتے ہیں کہ آپ اِن لوگوں کی محبت میں یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ کہ آپ کے ساتھ اس قسم کی کوئی "ترجیح و پسندیدگی" وابستہ نہیں ہے۔

بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ اگر انہیں مُضمر[2] رکھا جائے یا مسلمات[3] میں شامل کر دیا جائے۔ تو اُن سے کسی قسم کا رنج نہیں پہنچتا لیکن ظاہر کر دینے کے بعد اُنہی میں سے اذیت کے بہت سے پہلو نکل آتے ہیں۔ مثلاً اگر کوئی شخص کسی سادہ لباس اور غیر دلکش صورت رکھنے والی لڑکی سے واقف ہو اور اس سے مل کر کسی دن وہ گفتگو کی ابتدا اِس جملے سے کرے کہ "خاتون! چونکہ آپ نہ اسقدر مالدار ہیں نہ اسقدر حسین کہ میرے لائق ہوں۔ اِس لئے میں آپ سے شادی کرنے کے لئے تیار نہیں" تو آپ اُس کو اِس بیہودگی کی بنا پر سرزنش کا سزاوار سمجھیں گے۔

یہ بالکل ظاہر ہے کہ اگر قرب اور موقعہ ملنے کے بعد بھی اُس شخص نے اُس لڑکی سے شادی کی درخواست نہیں کی تھی تو اِس کا مطلب صرف یہی ہو سکتا ہے کہ وہ شادی پسند نہ کرتا تھا۔ اور وہ دونوں اِس حقیقت سے اِسقدر اچھی طرح واقف تھے جیسا کہ لفظوں میں صاف صاف کہدیا گیا ہو۔ مگر کوئی ذی ہوش لڑکی محض اِس بات کے ایک حقیقت ہونے کو وجہ جنگ قرار نہیں دے سکتی۔ پھر بالکل اِسی شخص کی طرح کسی شادی شدہ خاتون کو بھی یہ حق نہیں ہے۔ کہ وہ لفظوں سے۔ یا لفظوں سے زیادہ معنی خیز نظروں سے مجھے یہ بتائے کہ میں وُہ خوش قسمت انسان نہیں ہوں جس پر خاتون کی نظرِ انتخاب پڑی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ میں نہیں ہوں اور یہ میرے لئے کافی ہے۔ بار بار کی یاد دہانی بھلی نہیں معلوم ہوتی۔

کسی شخص کی طرف سے علم یا دولت کی نمائش بھی کافی جگر سوز ثابت ہو سکتی ہے۔ مگر پھر اِس نمائش کا مفید پہلو اس کی مکافات کر دیتا ہے۔ مثلاً وہی علم جس کے اظہار سے مقصد میری توہین ہو۔ میری قابلیت میں اضافہ کرتا ہے۔ اِسی طرح ایک دولتمند آدمی کے محلوں اور تصویروں پر، اُس کے باغوں اور چمنوں پر، مجھے ایک حقِ تعرف ملجاتا ہے۔ مگر ازدواجی[1] مسرتوں کی نمائش سے جو دُکھ پہنچتا ہے اُس کی مکافات کسی طرح نہیں کیجا سکتی۔ یہ نمائش ایک خالص ہتک ہے۔ جس کی حد ہے نہ انتہا۔

شادی اپنے بہترین عنوان کے لحاظ سے اک وحدتِ ملک ہے اور بس۔ پھر وہ بھی بے انتہا رشک انگیز قسم کی۔ تقریباً سب ہوشیار مالکوں کا یہ دستور ہے کہ وہ اپنی قیمتی ملک کو اپنے ہمسایوں کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھتے ہیں کہ مبادا وہ کم نصیب لوگ، اُن کے حقِ ملک پر شبہ اور اعتراض کر کے اُن کی حالت کو نازک بنا دیں۔ مگر یہ شادی شدہ

---

[1] ناکتخدا۔ کنوارا۔ [2] مضمر۔ پوشیدہ۔ [3] مانی ہوئی۔

[1] شادی کی خوشیوں۔

لوگ اپنی وحدتِ ملک کے ناپسندیدہ حقوق کا اشتہار نہایت بےشرمی سے تمام دنیا میں دیتے پھرتے ہیں۔

مجھے دنیا کی کوئی چیز اِسقدر تنفر انگیز نہیں معلوم ہوتی جتنا کہ وہ سرور و انبساط، وہ خود اطمینانی، وہ سکون جو ایک نئے بیاہے ہوئے جوڑے کے چہروں پر چمکتا ہے خصوصاً خاتون کے چہرے پر۔ یہ آپ کو بتاتا ہے کہ خاتون کی قسمت اِس دنیا میں متعین ہو چکی اور یہ کہ اب آپ اُس کو پانے کی امیدوں سے ہاتھ دھو لیجئے، یہ سچ ہے۔ خود مجھے بھی کوئی امید نہیں ہے۔ اور شاید خواہش بھی نہیں، مگر جیسا کہ میں ابھی کہہ چکا ہوں، یہ اُن صداقتوں میں سے ہے جو مسلّمات میں شامل ہونی چاہئیں نہ کہ قابلِ بحث چیزوں میں۔

اِن عورتوں کی خود بینیاں اور خود پسندیاں یقیناً زیادہ رنج دہ ہوتیں اگر وہ اتنی غیر معقول اور نادان نہ ہوتیں۔ یہ عورتیں ہم بےبیاہے ہوئے لوگوں سے پوری واقفیت نہ رکھتے ہوئے بھی اسقدر ہمہ دانی کا ادعا کرتی ہیں کہ العظمۃ للہ[1]۔ ہم اِس بات کو تسلیم کرنے کے لئے تیار ہیں کہ یہ عورتیں اپنے ہم مشربوں کے طلسمی احوال سے ہمارے مقابلے میں زیادہ واقف ہیں۔ ہم کو اُن کے ساتھ زیادہ آزادی کے ساتھ ملنے کے مواقع بھی میسّر نہیں ہیں۔ مگر اِن کی سرکشی دیکھئے کہ اپنی حدود پر قانع نہ رہ کر ہر جگہ ہر مسئلہ میں خود کو مستند سمجھتی ہیں۔ اگر اِن کی موجودگی میں کوئی مجرد آدمی کسی معمولی سے معمولی مضمون پر یہ خیال کرتے ہوئے کہ وہ اظہارِ رائے کا حق رکھتا ہے۔ لب کشائی کی جرأت کرے تو فوراً اُس کی زبان بندی کر دیجاتی ہے یہ کہکر کہ وہ اہلیت نہیں رکھتا۔ میرے شناساؤں میں سے ایک نوجوان خاتون نے جس کی شادی کو لطف یہ ہے کہ کچھ زیادہ دن بھی نہیں ہوئے بمشکل سے اِس تبدیلِ حالت پر پندرہ روز کا عرصہ گزرا ہوگا، خود مجھے مچھلیوں کی پرورش اور فروختگی کے بہترین طریقوں پر گفتگو کرتے ہوئے، ایکدن بطرزِ استہزا[2] یہ سوال قائم کر دینے کی ہمت کر لی کہ آخر میں ایک دیرینہ ناکتخدا ہوتے ہوئے خواہ مخواہ کیوں ایسے معاملات میں دخل اندازی کی ہمت کیا کرتا ہوں؟۔

اب تک جو کچھ میں نے کہا ہے وہ شیخیوں اور تکبروں کے مقابلے میں قطعاً ہیچ ہے۔ جو یہ لوگ صاحبِ اولاد ہو جانے پر اپنے آپ میں شامل کر لیتے ہیں۔ ہزار مرتبہ کوشش کی مگر اتبک میں یہ سمجھنے سے عاجز ہوں کہ آخر بچے والا ہونا کیا فخر و ناز کی بات ہے۔ خدا کے لئے مجھے بتاؤ کہ اِن بچوں میں کونسی قدرت ہے۔ بازاروں اور تنگ و تاریک گلیوں میں اِن کے غول کے غول پھرتے ہیں۔ غریب سے غریب شخص کے پاس یہ نعمت بکثرت ہوتی ہے۔ بہت ہی کم شادیاں ایسی ہوتی ہیں جن میں یہ سودا نہ ملتا ہو۔ کتنے ہی بچے آوارہ ہو جاتے ہیں اور والدین کی خوش امیدیوں پر پانی پھیر دیتے ہیں۔ بُری راہوں کو اختیار کر کے افلاس کی مصیبتوں میں گرفتار ہوتے ہیں۔ ذلت اور بدنامی سہتے ہیں اور پھانسی پر چڑھتے ہیں۔ مجھے بتاؤ کہ اِس میں کیا قدرت ہے جو وجہ غرور بن سکے؟ ہاں، اگر بچے چھوٹے چھوٹے عنقا ہوتے جو سال میں صرف ایک ہی پیدا ہوتا ہے۔ تو شاید کوئی عذر مل سکتا مگر اسقدر عام ہوتے ہوئے ــ!

میں اُس ہتک آمیز تعرّض کی طرف توجہ نہیں دلاتا جو یہ شادی شدہ خواتین بچوں کی مائیں ہو جانے پر اپنے شوہروں کے مقابلے میں برتتی ہیں۔ وہ جانیں اُن کا کام۔ مگر میں یہ سمجھ سکتا کہ آخر ہم لوگوں سے جو بہرحال اُن کے پیدائشی محکوم نہیں ہیں۔ کیوں اِس بات کی توقع کیجا سکتی ہے کہ اُن کے لئے نذریں فراہم کر کے پیشکش کریں۔ اِس خراج یا ٹیکس کی وجہ؟" نوعمر بچے ایسے ہیں جیسے دیو کے ہاتھ میں تیر۔ خوش قسمت ہے وہ انسان جس کا ترکش اِن تیروں سے پُر ہو"ـــ عورتوں کی مذہبی تعلیم کے لئے وضع کی ہوئی کتابوں میں یہ جملہ موجود ہے اور میں اس سے متفق ہوں۔ مگر اِن تیروں سے بھرے ہوئے ترکشوں کو ہم پر کیوں خالی کیا جاتا ہے؟ بچے تیر ہیں اور ضرور ہیں مگر ہمیں چھیدنے اور زخمی کرنے کے لئے تو نہیں ہیں۔ میں نے اکثر دیکھا ہے کہ اِن تیروں کا پھل دو شاخہ ہوتا ہے اور دو کانٹوں میں سے کسی ایک کا پیوست ہو جانا یقینی ہے مثلاً اگر آپ کسی ایسے مکان میں جائیں جو بچوں سے بھرا ہوا ہو اور اپنے تخیّل میں مستغرق ہونے کی وجہ سے اُن کی طرف دھیان نہ کریں یا اُن کی محبّت آمیز باتیں سُنی اَن سُنی کر دیں۔ تو آپ کے متعلق فی الفور یہ فیصلہ صادر کر دیا جائیگا۔ آپ ایک سخت دل، غم پسند اور بچّوں سے نفرت کرنے والے آدمی ہیں۔ اِس کے خلاف اگر آپ اُن سے غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کریں۔ اگر اُن کی پیاری اور بھولی باتوں سے مسحور ہو کر اُن کے ساتھ کھیلنے کا تہیّہ کریں تو یقین کر لیجئے کہ کسی نہ کسی عنوان سے اُن بچوں کو کمرے سے باہر بھیجد یا جائیگا۔ یا یہ کہا جائیگا کہ وہ بہت شور و غل کرتے

---

[1] خدا کی پناہ۔ [2] مذاق اڑانا۔

ہیں ۔ یا یہ بتایا جائیگا کہ مسٹر غیر معلوم بچّوں کو پسند نہیں کرتے ۔ وہی ہیں نے کہا نا؟ تیر کا ایک نہ ایک کا نٹا ضرور آپ کے گلے میں ترازو[۱] ہوگا ۔

میں اِن خواتین کے رشک وحسد سے درگزر کرسکتا ہوں ۔ اور اُن کے بچّوں کے ساتھ کھیلنے سے بھی باز رہ سکتا ہوں ۔ اگر اِس سے اُن کو کچھ دکھ پہنچتا ہے ۔ مگر اِس چیز کو یقیناً نامعقول سمجھتا ہوں کہ اُن سے محبت کرنے پر مجبور کیا جاؤں جب کہ کوئی موقعہ بھی نہ ہو ۔ مثلاً آٹھ ، نو یا دس آدمیوں کے پورے خاندان سے بلا تفریق وامتیاز محبت کرنا اور سارے بچّوں سے پیار رکھنا صرف اِس لئے کہ بچّے ہوتے ہی کچھ دلکش ہیں ۔ ایک لغو بات ہے ۔

مجھے یہ کہاوت معلوم ہے کہ "مجھے چاہو اور میرے کتے کو بھی" اگرچہ یہ کہاوت ہمیشہ یکساں طور پر قابلِ عمل نہیں ہوتی خصوصاً اگر کتے کو آپ کے ستانے کے لئے یا کھیل میں آپ کی طرف بھونک کر لپکنے کے لئے قصداً اُکسا دیا جائے ، تاہم میں کوشش سے کسی نہ کسی طرح اِس بات میں کامیاب ہوسکتا ہوں کہ ایک کتے یا کتے سے کمتر غیر جاندار چیز سے (مثلاً یادگار ، انگوٹھی ، گھڑی ، وہ درخت یا وہ جگہ جہاں آخری مرتبہ ملاقات ہوئی تھی ۔) محبت کرنے لگوں اِس لئے کہ مجھے اپنے دوست سے محبت ہے اور ہر وہ چیز جو اُس کی یاد دلائے مجھے عزیز ہے مگر شرط یہ ہے کہ وہ چیز اپنی فطرت کے اعتبار سے سادہ ہو ۔ یعنی میرا تخیل جو رنگ بھی اِس میں بھرنا چاہے وہ اُس کو قبول کرلے ۔ لیکن بچّوں کی خود اپنی ایک مخصوص طبیعت ہوتی ہے ، اُن کا اپنا ایک قدرتی اور مستقل وجود ہوتا ہے ۔ وہ بذاتِ خود یا دلچسپ ہوتے ہیں یا غیر دلچسپ ۔ اُن کی صفات کے لحاظ سے اُن سے یا محبت کیجاسکتی ہے یا نفرت ۔ ایک بچّے کی فطرت اِس سے کہیں زیادہ سنجیدہ ہوتی کہ اُس کو کسی دوسری ذات کا محض لاحقہ[۲] قرار دیا جائے ۔ اور اُس کی محبت کو دوسرے کی محبت کی فرع ۔ میرے نزدیک اِن بچّوں کی بڑے آدمیوں کی طرح اپنی اپنی جُداگانہ شخصیت ہوتی ہے ۔

مگر آپ کہینگے کہ کم سنی یقیناً ایک دلکش چیز ہے ۔ بچپن کے نازک و شاداب سالوں میں کوئی ایسی چیز ہے جو ہمارے لئے اپنے میں جذبِ پنہاں رکھتی ہے ۔ آپ درست کہتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ بچّوں کے ساتھ میں نرمی برتتا ہوں ۔ مجھے معلوم ہے کہ ایک پیارا بچّہ فطرت کی عزیز ترین چیز ہے ۔ میں اُن کا بھی استشنا نہیں کرتا جو اِن بچوں کی وجہِ پیدائش ہیں ۔ مگر جسقدر کسی چیز کی قسم زیادہ عمدہ ہوتی جاتی ہے اُسیقدر زیادہ یہ ضروری ہوتا جاتا ہے کہ وہ چیز اپنی قسم میں سے بھی بہترین ہو ۔ مثلاً جنگل کے خودرو پھول اپنی خوبیوں کے اعتبار سے ایک دوسرے سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہوتے ۔ اِس لئے اُن کے انتخاب میں زیادہ ور دوسری کی ضرورت بھی نہیں ہے ۔ مگر گلاب چونکہ اپنی نزاکت اور خوشبو کے اعتبار سے بہترین پھول ہے ۔ اِس لئے اِس کو چھانٹنے میں بہت باریک نظری سے کام لیا جاتا ہے ۔ اور یوں بھی عورتوں اور بچّوں کے متعلق میرا معیار بہت بلند رہا ہے ۔

مگر یہ بھی بدترین مصیبت نہیں ہے ۔ مجرد آدمی کو اِس سے زیادہ کے لئے بھی تیار رہنا چاہئے ۔ مثلاً اگر آپ اُن شادی شدہ خواتین سے کافی بے تکلف نہ ہوجائیں تو وہ آپ کی بے توجہی کی شکایت کرتی ہیں ۔ اِس شکایت سے نپٹنے کے لئے ملاقاتیں کرنی پڑتی ہیں ۔ تعلقات پیدا کرنے ہوتے ہیں ۔ لیکن اگر بدقسمتی سے اُن کا شوہر کوئی ایسا شخص ہو جس سے آپ شادی سے قبل دوستانہ مراسم رکھ چکے ہوں ۔ یعنی اگر آپ بیوی کی طرف سے نہ آئے ہوں ۔ اگر خاتون کی جماعت کے ساتھ آپ نے گھر میں قدم نہ رکھا ہو بلکہ شادی کے گمان وخیال سے بھی بہت قبل اُن کے خاوند سے آپ کے مخلصانہ اور آزادانہ روابط[۳] رہے ہوں تو پھر آپ ہوشیار رہئے ۔ آپ کی حیثیت خطرے میں ہے ۔ بارہ مہینے پورے ہونے سے قبل ہی آپ دیکھیں گے کہ آپ کے دوست کا سلوک رفتہ رفتہ سرد مہری میں بدل رہا ہے اور انجام کار وہ وقت آجائیگا جب آپ کا دوست آپ سے قطع تعلق کرنے کے لئے بہانے تلاش کرنے لگیگا ۔ میں کسی ایسے دوست کی وفاداری پر اعتماد نہیں کرسکتا ۔ جسکی دوستی کی ابتدا اُس کی شادی کے زمانے سے بعد نہ ہوئی ہو ۔

خاص خاص حدود کے اندر تو شاید یہ خواتین اِس قسم کی بیباکیاں روا بھی کردیں ۔ مگر یہ چیز وہ کبھی برداشت نہیں کرسکتیں کہ وہ شخص جو اب اُن کا خاوند ہے اور پہلے کچھ بھی نہ تھا ۔ اِس بات کی جرأت کرے کہ اُن سے مشورہ لئے بغیر کسی شخص سے عہدِ دوستی و وفاداری باندھ لے ۔ پھر اِس مسئلے میں وہ اِس چیز پر بھی غور کرنا ضروری خیال

۱؎ پیوست ہوگا ۔ چبھ جائیگا ۔ ۲؎ لاحقہ ۔ ضمیمہ ۔ دُم چھلا

۳؎ روابط ۔ تعلقات ۔

نہیں کرتیں کہ خود اُن کی اور اُن کے شوہروں کی شناسائی سے کسقدر قبل یہ عہد مکمل ہوا تھا۔ ہر ایک طویل دوستی، ہر ایک پرانی محبّت اور بے تکلفی کو اُن کے نزدیک اُن کے حضور پیش ہونا چاہئیے۔ تاکہ وہ اُس پر اپنی مُہرِ تصدیق ورضامندی ثبت کر دیں۔ جیسے کوئی نیا حکمران شاہزادہ تمام اُن پرانے سکّوں کو جو اس کے عہدِ حکومت اور غالباً آثارِ ولادت سے بھی پہلے رائج تھے جمع کرنے کا فرمان شائع کرتا ہے کہ اپنی سلطنت کی نئی مُہر اُن پر لگوا دے۔ پھر آپ خود تصور فرما سکتے ہیں کہ میرے جیسے زنگ خوردہ پُرانے سِکّوں کا اِن نئی ٹکسالوں میں کیا حشر ہوتا ہوگا۔

ایسے دوستوں کی توہین کرنے اور اُن کو اپنے شوہروں کے اعتبار و اعتماد سے محروم کرنے کے لئے یہ خواتیں جو طریقے اختیار کرتی ہیں۔ اُن کی انتہا نہیں۔ ایک طریقہ "تضحیک" کا ہے۔ یعنی جو کچھ بھی آپ کہیں اُس پر یہ خواتین اِس طرح حیرت سے ہنستی ہیں گویا آپ عجائبُ المخلوقات میں سے ہیں۔ اور بیحد انوکھی اور نرالی باتیں کرتے ہیں۔ اِس مقصد کے لئے جس تعجب آمیز انداز سے وہ آپ کو تکتی ہیں۔ اُس کا دفعیہ نہیں ہوسکتا۔ یہ عمل جاری رہتا ہے حتیٰ کہ آپ کا ذہنی دوست جو آپ کی اصابت رائے کا کبھی معتقد تھا اور اسی وجہ سے آپ کی ضمنی اور غیر اہم لغزشوں سے چشم پوشی کر لیا کرتا تھا۔ اب شک کرنے لگتا ہے کہ کہیں واقعی آپ کوئی جھکّی پسند انسان تو نہیں ہے۔ جس کے ساتھ ایام ناکتخدائی میں روابط رکھنا تو کافی لطف انگیز ہوسکتا ہے لیکن خواتین کے سامنے ایسے شخص کو پیش کرنا ہرگز مناسب نہیں۔ یہی طریقہ ہے جو میرے خلاف اکثر و بیشتر برتا جاتا ہے!

دوسرا طریقہ "مبالغے" یا طعن کا ہوتا ہے۔ یعنی اگر وہ یہ دیکھیں کہ اُن کا شوہر آپ سے خاص وابستگی رکھتا ہے۔ اور جس جذبۂ احترام پر اُس کی بنیاد ہے اُس کا ہلانا سہل نہیں ہے تو پھر وہ ایک غیر معتدل مبالغے کے ساتھ آپ کے ہر لفظ کی داد وتحسین دینے پر اُتر آتی ہیں یہانتک کہ آپ کا عزیز دوست، جو خوب جانتا ہے۔ کہ سب اُسی کی قدر افزائی کے لئے کیا جا رہا ہے۔ احسان مندی کے بار سے خستہ ہوکر، جو اسقدر اخلاص کا حق واجب ہے، اپنی گرمجوشیاں کم کرتے کرتے معمولی دوست کی سطح تک اُتر آتا ہے۔ اِس مناسب ومعتدل حدِ محبّت کے پیدا ہوتے ہی خود خاتون بھی بغیر کسی قسم کی اذیت یا کوفت کے، خود بھی اپنے شوہر کے ساتھ آملتی ہیں۔

اُنہی بے تعداد طریقوں میں سے تیسرا طریقہ "غلط فہمی" کا ہے۔ وہ ایک معصوم سادگی کے ساتھ یہ سمجھنے میں ہمیشہ غلطی کرتی ہیں۔ کہ آخر وہ خاص چیز کیا تھی جس نے اوّل اوّل اُن کے خاوند کو آپ کے ساتھ دوستی کرنے پر مجبور کیا تھا۔ فرض کیجئے کہ آپ کی اخلاقی پاکیزگی، اور کیریکٹر کی قوت نے اگر دوستی کی یہ زنجیر بنائی تھی جس کے توڑنے کے خاتون درپے ہیں تو پھر وہ آپ کی گفتگو میں زورِ اظہار کی کمی محسوس کرکے اپنے شوہر سے سوال قایم کرینگی "پیارے! تم نے تو کہا تھا کہ تمہارے دوست نہایت شگفتہ طبع اور خوش گفتار آدمی ہیں"؟ اور اگر اِس کے برعکس آپ کی گفتگو کی دلربائیوں نے آپ کے دوست کو موہ لیا تھا اور اسی وجہ سے وہ آپ کی اخلاقی کمزوریوں پر چشم پوشی کرتا تھا، تو پھر خاتون کسی ایسی ہی کمزوری کو گرفت کرکے اپنے خاوند سے دریافت کرینگی "پیارے تم تو کہتے تھے کہ تمہارے دوست بہت نیک خداترس آدمی ہیں"۔ میں نے جب ایک خاتون کو ملامت کرتے ہوئے اُس سے یہ پوچھا کہ آخر وہ کیوں میرے ساتھ اِس بے احترامی اور بے اعتنائی کا برتاؤ کرتی ہے۔ جس کا میں سزاوار نہیں تو اُس نے جواب دیا کہ "شادی سے پہلے میرے خاوند نے جیسا آپ کا حلیہ بیان کیا تھا اُس کو سُن کر تو میں آپ سے ملنے کی بہت شائق تھی۔ مگر آپ کو دیکھ کر بہت مایوسی ہوئی۔ اپنے شوہر کے بیان کے مطابق تو میں یہ سمجھتی تھی کہ آپ ایک دراز قامت، حسین صورت، فوجی وضع کے انسان ہونگے۔ لیکن حقیقت اِس کے بالکل برعکس نکلی"۔ خاتون نے چونکہ اظہار مافی الضمیر[1] میں بہت صفائی سے کام لیا تھا۔ اِس لئے میں نے لحاظ کیا ورنہ پوچھتا کہ جب خود اُن کے خاوند میں اِن خوبیوں میں سے کوئی چیز بھی نہیں پائی جاتی تو انہیں کیا حق ہے کہ وہ اُس کے دوستوں کے متعلق ایسی توقعات قائم کریں؟ اِس لئے کہ میرے دوست کی حدودِ جسمی قریب قریب میری ہی جیسی ہیں۔ وہ اپنے بوٹ سمیت پانچ فٹ پانچ اِنچ ہیں میں اُن سے آدھ اِنچ زیادہ ہوں اور اُن کے چہرے اور بالوں سے بھی فوجی صفات اِتنی ہی دور ہیں جتنی مجھ سے۔

بہرحال یہ اُن عذابوں میں سے چند ہیں جن سے مجھے اِن شادی شدہ

---

[1] مافی الضمیر۔ دلی خیال۔

لوگوں کے مکانوں پر دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اُن سب کو ایک ایک کر کے گننا ایک لاحاصل کوشش ہوگی۔ اس لئے میں اُن کے ایک اور نامناسب طرزِ عمل پر منظرِ ڈالا کرلیں کرتا ہوں۔ خواتین بعض اوقات ہم لوگوں سے ایسا برتاؤ کرتی ہیں جیسے ہم اُن کے شوہر ہیں اور شوہر اُن سے اِس طرح پیش آتی ہیں جیسے کہ وہ "ہم" ہیں۔ میری مراد یہ ہے کہ ہم سے بے تکلفی برتتی ہیں۔ اور اُن سے رسمیت۔ مثلاً کل میری نے مجھے بہت رات گئے تک اپنے پاس رکھا اور اِس بات پر چڑچڑاتی ہیں کہ مسٹر نامعلوم[1] ابتک گھر نہیں آئے۔ اور مچھلیاں جو پکی تھیں سب خراب ہوگئیں۔ مگر انہوں نے اس جرأت اور اپنے لفظوں میں اس بدتہذیبی کو روا نہ رکھا کہ وہ اُن مچھلیوں کو ہاتھ تک لگانے کی مجرم ہوتیں لیکن اس طرح میری نے آدابِ خانہ داری کو بدل دیا۔ اس لئے کہ رسمیت صرف اس لئے ایجاد ہوئی ہے کہ اس کی مدد سے اُن بےچین کر نیوالے احساسات سے نجات حاصل کیجائے۔ جو انسان کے دل میں یہ دیکھکر پیدا ہوتے ہیں کہ وہ کسی شخص کی محبت کا اتنا مالک نہیں جتنا کوئی دوسرا۔ اس کا مُدعا صرف یہ ہوتا ہے کہ تہذیب اور شائستگی کو محبت اور بے تکلفی کا قائم مقام بنا کر ایک جھوٹا سکون حاصل کیا جائے۔

اپنے خاوند کا انتظار کرنے کی بجائے اگر فرض کیجئے کہ میری میرے انتظار میں کھانا لئے بیٹھی رہتیں اور اپنے خاوند کے کہنے کے باوجود بھی سونے نہ جاتیں تو یہ ایک بالکل مناسب اور موزوں بات ہوتی۔

میرے خیال میں معمولی حیا اور وضعداری کے علاوہ، اور کوئی ایسی "رسمیت" نہیں جسے بیویاں شوہروں کے ساتھ برتنے پر مجبور ہوں۔ اسی علت کی بنا پر میں اس بات کے خلاف بھی ناپسندیدگی کا اظہار کرتا ہوں کہ خود اپنے دسترخوان پر کوئی بیوی اپنے شوہر کے آگے اچھی اچھی چیزوں کی رکابیاں سرکاتی رہے اور میری ناکتخدا قوتِ ذائقہ کے لئے کم لذیذ کھانوں کی رکابیاں مناسب سمجھ کر میرے آگے پیش کرے! نہیں میں اس قسم کی جرأت کو معاف نہیں کر سکتا۔

اب ان شادی شدہ لوگوں کی شکائتیں کرتے کرتے تنگ آگیا ہوں۔ وہ اپنے کرداروں میں تبدیلی کریں ورنہ میں وعدہ کرتا ہوں کہ نام بنام ہر ایک کی برائیاں قلمبند کرونگا جس کو دیکھ کر مجرم لذت اُٹھیں گے۔

(چارلس لیمپ)

انیس احمد رشدی

[1] شوہر

اقوالِ مشاہیر

الفانسو دہم شاہ اسپین کا قول ہے۔ کہ "شادی اُسی صورت میں کامیاب ہوسکتی ہے جب خاوند بہرا ہو اور بی بی اندھی ہو۔"

آرک بشپ آف کولون نے ڈیوک آف الوا (ہسپانی جنرل) سے کہا تم اہلِ ہالینڈ پر حملہ آور کیوں نہیں ہوتے۔ تو اس نے جواب دیا۔ "ایک سپہ سالار کا مطمع نظر جنگ آزمائی نہیں ہوتا بلکہ کامیابی"

صحت

میں ایک ڈاکٹر سے ملا - ملتے ہی اُس نے پوچھا۔ "آپ کو شراب پیتے ہوئے کتنا عرصہ ہوا"

میں نے جواب دیا - "کافی عرصہ ہوگیا اب تو"

ڈاکٹر ایک نوجوان شخص تھا - اس کی عمر ۲۰ اور ۳۰ کے درمیان معلوم ہوتی تھی - یوں تو وہ عینک لگائے ہوئے تھا لیکن اُس کی صورت نپولین سے ملتی جُلتی معلوم ہوتی تھی۔ مجھے اُس سے اُنس سا ہوگیا -

اُس نے کہا: "دیکھئے میں آپ کو بتاتا ہوں کہ دورانِ خون پر شراب کا کیا اثر ہوتا ہے"

اب اُس کی صورت نپولین سے اور بھی مشابہ ہوگئی - میرا اُنس اور بھی بڑھ گیا۔ اُس نے میرا دایاں بازو ننگا کر دیا - اور مجھے وسکی کا ایک جام دیا - اس کے بعد اُس نے میرے بازو پہ کوئی طبی آلہ لگا دیا - نبض پر ہاتھ رکھا - ایک ربڑ کا بلب میرے بازو کے ساتھ لگا دیا - اُس میں ایک قسم کا تھرمامیٹر لگا ہوا تھا - پارہ اوپر سے نیچے - نیچے سے اوپر حرکت کرنے لگا - میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا - لیکن ڈاکٹر کہتا تھا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ پارہ ۲۳ یا شاید ۲۵ درجے چڑھ گیا ہے - اُس نے کہا "آپ نے دیکھا - دورانِ خون پر شراب کا کیا اثر ہوتا ہے؟"

میں نے کہا "حیرت انگیز - تعجب خیز! ازراہِ نوازش ایک جام اور عنایت کیجئے - اور میرے دوسرے بازو کے خون پر شراب کا اثر دیکھئے"

اُس نے کہا - "نہیں - نہیں - کافی ہے"

اُس نے میرا ہاتھ تھام لیا - میں نے سمجھا مجھے "خدا حافظ" کہنا چاہتا ہے - میرا خدا حافظ ہے - گویا اب میرا زندہ رہنا محال ہے - لیکن معلوم ہوا کہ وہ میری انگلی میں سوئی چبھو کر خون کا قطرہ نکالنا چاہتا تھا - خون کا قطرہ لیکر اُس نے غور سے دیکھا - پھر بولا "یہ ہیموگلوبن طریقۂ علاج ہے آپ کے خون کا رنگ خراب ہے - سرخ ذرات کی کمی ہے"

اِس کے بعد اُس نے میری چھاتی کو ٹھونک بجا کر دیکھنا شروع کیا - اِس کے بعد اُس نے اپنے چہرے پر سنجیدگی کی تمام علامات طاری کرلیں - اور کئی غیر معروف اور حیرت انگیز بیماریوں کا نام لیا - ان ناموں کے اخیر میں اکثر "ائیٹس" آتا تھا - میں نے فوراً اُسے ۳۲ روپے ادا کر دئے -

میں نے پوچھا "جن بیماریوں کا میں شکار ہوں - اُن میں سے کوئی لازماً مہلک تو نہیں ہے"

اُس نے دل جمعی سے جواب دیا "تمام کی تمام مہلک ہیں - لیکن اِن کی رفتار کو روکا جاسکتا ہے - اگر آپ تندہی سے علاج کریں اور پرہیز کریں تو شاید اسی نوّے سال تک زندہ رہیں"

میں نے ڈاکٹروں کے بلوں کا حساب کرنا شروع کیا -

ڈاکٹر نے کہا "سب سے پہلی بات جو ضروری ہے وہ یہ ہے کہ آپ کسی صحت بخش جگہ قیام کریں - اِس بات کی ضرورت ہے کہ آپ کا نظامِ عصبی .... اپنا کام کرنے لگے - تکان اور کسل کا اثر دور ہو جائے - میں خود آپ کے ساتھ چلونگا - اور آپ کے لئے کسی موزوں مقام کا انتخاب کرونگا"

چنانچہ ڈاکٹر مجھے ایک "صحت بخش مقام" .... پر لے گیا - وہاں پتھروں - لمبے لمبے درختوں اور برف کے سوا اور کچھ نظر ہی نہ آتا تھا "صحت بخش مقام" کے سپرنٹنڈنٹ نے مجھے یقین دلایا کہ اس کے ہسپتال میں کسی بیماری کا ذکر نہیں کیا جاتا - سب "مریض" ایک کھانے کے کمرے میں جمع ہوتے ہیں - جب میں پہلی بار کھانے کے کمرے میں گیا تو وہاں اور کئی مریض جمع تھے -

ڈاکٹر نے میرے لئے ناشتہ لانے کا حکم دیا -

"فاسفو گلیسریٹ آف لایم - اور نکس وامیکا کی چائے"

یہ بات سنتے ہی مریضوں نے شور مچا دیا "مالیخولیا کا مریض مالیخولیا کا مریض"

کئی مریضوں نے کہا "نہیں - کثرت شراب نوشی"

ڈاکٹر نے یہ حالت دیکھی تو دبے پاؤں کھسک گیا -

اس کے بعد ڈاکٹر کا نائب مجھے صحت بخش مقام کی "ورزش گاہ" کی طرف لے گیا۔ اس نے ایک معمر خاتون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"دیکھئے۔ یہ خاتون شمیم اختر ہے۔ "کلیم" کی مدیرہ تھی۔ اس نے ایک ناول لکھا تھا "محبت کیوں محبت کہلاتی ہے"۔ دماغ خراب ہوگیا۔ اب یہاں لکڑیاں چُن کر صحت کو حاصل کرنے کی کوشش کررہی ہے۔"

ایک طرف ایک ادھیڑ عمر کا آدمی اوندھے گھڑے پر پانی ڈال رہا تھا۔ میرے رہبر نے کہا "یہ شخص ایک لکھ پتی امیر ہے۔ جو تجارت کے پریشان کُن حالات کی وجہ سے اپنے حواس کو جواب دے بیٹھا ہے۔"

میں نے پہاڑی راستے سے نیچے اترنا شروع کیا۔ میرا رہبر چلّاتا رہا۔ حضرت کہاں چلے۔ اے حضرت۔ سنئے تو۔

میں نے سُنی اَن سُنی ایک کر دی اور یہ کہکر کہ "واپس جارہا ہوں" اپنا رستہ لیا۔ میں ایک ہوٹل میں جا ٹھہرا۔ میں نے کلرک سے کہا۔ "مجھے ایک ایسے کمرے کی ضرورت ہے جس میں تکان کم ہو جائے۔ میں چاہتا ہوں کہ شور و غل سے دُور رہ کر ذرا آرام کروں۔ تاکہ میرا نظامِ عصبی باصحت ہو جائے۔"

کلرک نے میری طرف عجیب نظروں سے دیکھا۔ پھر بولا۔ "بندہ پرور۔ کسی ڈاکٹر سے ملئے۔ ہوٹل میں ایسے کمرے کہاں۔"

اس واقعے کے ایک ہفتے کے بعد میں اپنے نپولین مثال ڈاکٹر سے ملا۔ اب مجھے اُس سے اُنس باقی نہ رہا تھا۔

اُس نے کہا "آپ کو چاہئے کہ سمندر کا سفر اختیار کریں اور کسی اچھے دوست کو ساتھ لے جائیں۔"

میں نے جواب دیا "سمندری پریاں ...."

اُس نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا "اچھا۔ اگر آپ سفر نہیں کرنا چاہتے تو کسی اور ڈاکٹر سے بھی مشورہ لیجئے۔"

میں نے ایک اور ڈاکٹر سے مشورہ لیا۔

اُس نے پوچھا "آپ کے سر میں درد رہتا ہے؟"

"نہیں"

"ابروؤں میں؟"

"نہیں"

"بائیں پنڈلی کے نیچے"

"نہیں"

"آنکھیں بند کرو۔"

میں نے آنکھیں بند کرلیں۔

"اب پیچھے کی طرف چھلانگ لگاؤ۔"

میں نے پیچھے کی طرف چھلانگ لگائی۔ میرا سر دروازے سے ٹکرایا۔ ڈاکٹر نے معافی مانگی۔ اور دروازہ بند کر دیا۔

"اپنے ناک کو بائیں ہاتھ کی چھنگلیا سے چھوؤ۔"

میں نے حکم کی تعمیل کی۔

ڈاکٹر کہنے لگا۔ "اب میری انگلی کی طرف دیکھو۔ اب اس تصویر کی طرف۔ انگلی کی طرف۔ تصویر کی طرف۔ انگلی کی طرف تصویر کی طرف"

میں نے پھر حکم کی تعمیل کی۔ ڈاکٹر نے کہا "اس طرح یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ تمہارا دماغ صحیح ہے یا نہیں۔"

میں نے دل میں سوچا یہ تو بہت آسان ترکیب ہے۔ ہاں اگر ڈاکٹر صاحب یہ کہتے۔ "خالی الذہن ہو کر اُس نقش رنگ کی طرح جو دیوار سے زاویہ قایمہ بنارہا ہے۔ ایک سیدھی نظر کرو۔ اور اب واپس بلکہ توجہ کو منعطف کرتے ہوئے میری انگلی پر نظر جماؤ" تو شاید مشکل پیش آتی۔

میں واپس ہوا۔ ڈاکٹر نے جو نسخہ دیا تھا وہ ایک دواساز کے پاس لے گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ نسخے کی قیمت پندرہ روپے ہوگی۔ میں نے نسخے میں سوراخ کرکے اُس میں دھاگا ڈالا اور گلے میں ڈال لیا۔ اصل بات یہ ہے کہ مجھے جادو کے ٹوٹکوں پر اعتماد ہے۔ میں نے سوچا نسخہ کو ٹوٹکا کیوں نہ بنائیں۔

غرض اسی طرح دن گزرتے گئے۔ یہ تو مجھے معلوم ہوگیا کہ میں بہت بیمار ہوں۔ کام کاج کرنے کے ناقابل۔ ہر ایک ڈاکٹر کی یہی رائے تھی۔ لیکن مشکل یہ آپڑی تھی کہ میری بیماری کا پتا نہ چلتا تھا۔ نہ کوئی علاج ہوسکتا تھا۔

آخر میں اپنے چچازاد بھائی کے پاس جا ٹھہرا وہ گاؤں میں رہتا تھا۔ کھلی ہوا۔ اچھا موسم۔ سادہ زندگی۔ رات کو سکون و آرام۔ دن کو ورزش۔ اس زندگی نے مجھ پر اثر کرنا شروع کیا۔ بھوک لگنے لگی۔ بھوک کھل گئی۔ خدا جانے کیا ہوگیا۔ اب مجھے خوف معلوم ہونے لگا۔ اگر یہی حالت رہی تو میں اچھا ہو جاؤنگا۔ پھر کیا ہوگا؟ یہ تو بڑی

مصیبت ہوئی! اب مجھے کافی تجربہ ہوگیا تھا۔ میں فوراً گاؤں کے ڈاکٹر کے پاس گیا۔ میں نے چھوٹتے ہی کہا "ڈاکٹر صاحب۔ مجھے مالیخولیا۔ دورانِ سر۔ متلی۔ بواسیر۔ ورمِ طحال۔ دردِ جگر۔ ضعفِ قلب۔ اور بدہضمی کی شکایت ہے۔ میں پرہیزی کھانا کھاؤنگا۔ ورزش کرونگا۔ کھلی ہوا میں رہونگا۔ خدا حافظ"

یہ کہہ کر میں رخصت ہوا۔ یکایک مجھے کچھ خیال آیا۔ میں نے دروازہ کھولا۔ ڈاکٹر ابھی تک اپنی جگہ پر بیٹھا تھا۔ میں نے کہا "میں ایک بات بھول گیا۔ اور وہ یہ کہ میں آرام و سکون کی زندگی بسر کرونگا"۔

اس کے بعد میرا جی ذرا خوش ہوگیا۔ یہ خیال دل میں جمانے کے بعد کہ میں واقعی بہت بیمار ہوں مجھے اتنی مسرت ہوئی کہ بیان سے باہر ہے۔ ایک مالیخولیا کے مریض کے لئے اس سے بدتر اور کیا حالت ہوسکتی ہے کہ وہ یہ خیال کرے کہ اس کی بیماری جاتی رہی ہے۔

لیکن اس کا بھی کوئی فایدہ نہ ہوا۔ کھلی ہوا میں رہنے سے اور باقاعدہ ورزش کرنے سے میری حالت بہت زیادہ سدھر گئی۔ اب پھر مجھے رنج ہونے لگا۔ اب کیا ہوگا؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں اچھا ہوتا چلا جا رہا ہوں۔ بہر نوع میں پھر گاؤں کے ڈاکٹر کے پاس گیا۔ اب میں نے اُسے غور سے دیکھا۔ وہ پنشن لے کر اپنے گاؤں میں آرہا تھا۔ اُس کے چہرے سے خوش مزاجی ہویدا تھی۔ میں نے خود ہی اُس کے سامنے اپنی چھاتی ٹھونکی۔ اپنی نبض تھامی۔ اور پیچھے کی طرف چھلانگیں لگائیں تاکہ وقت نہ ضائع ہو۔

ڈاکٹر نے میری طرف غور سے دیکھا۔ پھر بولا "بندہ پرور۔ آپ کی بیماری بہت سخت ہے۔ ممکن ہے آپ زندہ رہیں۔ لیکن بڑی دشواری پیش آئیگی"۔

میں نے کہا "ارشاد فرمایئے۔ میرا کیا علاج ہے! میں اپنی تمام دولت کو برباد کرنے کے لئے تیار ہوں بس علاج ہوجانا چاہیئے"۔

ڈاکٹر نے اپنا پائپ سلگایا۔ پھر بولا۔

"آپ کی بیماری بہت خطرناک ہے۔ دنیا میں صرف ایک ایسی چیز ہے جس سے آپ کا علاج ہوسکتا ہے"۔

میں نے اشتیاق سے پوچھا "وہ کیا ہے؟ میں زہر۔ سونا فاسفورس۔ نکس وامیکا۔ امونیا اور غذا جانے کیا کیا استعمال کرچکا ہوں۔ وہ کیا شے ہے؟"

ڈاکٹر نے جواب دیا۔ "اس گاؤں کے گرد و نواح میں جو پہاڑ دور تک پھیلے ہوئے ہیں اُن کے دامن میں کہیں ایک جڑی بوٹی اُگتی ہے۔ اگر وہ مِل جائے تو آپ کی شکائتیں رفع ہوسکتی ہیں"۔

میں نے کہا "میں تیار ہوں"۔

ڈاکٹر بولا "ہر روز شام کو میں آپ کے ساتھ چلونگا"۔

اس دن سے ہمارا معمول ہوگیا کہ اُس جڑی بوٹی کی تلاش میں مارے مارے پھرا کرتے۔ چلتے چلتے میرے پاؤں میں چھالے پڑ جاتے۔ بدن دُکھنے لگتا۔ لیکن ڈاکٹر کہتا "محنت سے کام ہوتا ہے۔ ہمت نہ ہارو"۔

چھ ماہ کے بعد میری تمام شکائتیں رفع ہوگئیں۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ وہ بوٹی کیا تھی۔ وہ بوٹی ورزش تھی۔ جس کے بغیر میرا دماغ خراب ہو رہا تھا۔

عابد

اقوالِ مشاہیر

جب سکندر نے دیوجانس کلبی (مشہور فلاسفر) سے کارنتھ میں ملاقات کی تو اُس کی گفتگو اور شانِ استغنا سے اس درجہ متاثر ہوا کہ بے اختیار کہہ اٹھا۔ "اگر میں سکندر نہ ہوتا تو دیوجانس بننا پسند کرتا"۔

جب وہ مشرقی فتوحات کے لئے مقدونیہ سے روانہ ہونے لگا تو اپنی ذاتی جایداد کی آمدنی اپنے دوستوں میں تقسیم کردی۔ ایک دوست نے پوچھا "تم نے اپنے لئے کیا رکھا؟" جواب دیا "اُمید"

"چاند"

رگِ احساس باطن چھیڑنے والی حسیں دُنیا
نظر افروز ہے کتنی تری نور آفریں دُنیا

زمیں تصویر بنجاتی ہے جب اک موجِ ساکن کی
نقابِ شب میں چھپ جاتی ہیں جب عنایاں وہ بھی

ہوا کی نرم رَو جس وقت عنبر بیز ہوتی ہے
تری نازک خرامی کتنی دل آویز ہوتی ہے

فضا کروٹ بدلتی ہے ستارے مسکراتے ہیں
ہوائیں رقص کرتی ہیں شگوفے گنگناتے ہیں

زمیں کا ذرہ ذرہ حُسن سے لبریز ہوتا ہے
دلوں میں اک گدازِ کیفیت انگیز ہوتا ہے

ترے صہبا بکف جلووں سے جب آنکھیں ملاتی ہیں
تو دریا کی سکوں آمادہ موجیں جھوم جاتی ہیں

کھلے میدان میں، فردوسِ نظر رنگینیاں تیری
نقاب اُٹھے، نظر آتی ہیں جب محوِ ضیا پاشی

تو ہر شے تیرے گرد و پیش جھک جاتی ہے سجدے میں
فضا میں نرم موسیقی کی ہوتی ہیں رواں موجیں

وہ پھر شیریں ترنم چھیڑتی ہے تیری رخشانی
ترے قدموں پہ رکھدیتی ہے دُنیا اپنی پیشانی

تجھے دیکھا ہے یُوں گرمِ تماشا بارہا میں نے
جبینِ شوق سے چُومے ہیں تیرے نقشِ پا میں نے

نیازِ عشق کے پہروں مجھے منظر دکھائے ہیں
ترے آگے پرستاری کے میں نے گیت گائے ہیں

شرابِ تند برقِ خرمنِ اجزائے ہستی ہے
حیاتِ نو مگر پاتا ہے میکش مستعار اس سے

تجھے [redacted] کہ جسکی زلف کے سائے میں پنہاں ہو
وہ کیفِ زندگانی جو مرے جینے کا ساماں ہو

وہ جس کے رُخ کی ادنٰی سی جھلک سرشار کرتی ہو
مرے خوابیدہ تر احساس کو بیدار کرتی ہو

تصور میں بھی جس کے مسکرانے کی ادا مجھ کو
وہ مئے ہے لالہ گوں برسوں جسے مخمور رکھا ہو

تجھے ہاں بھولنے والے تجھے میری خبر بھی ہے
مری صبر آزما ناشاد مانی پر نظر بھی ہے؟

نگاہِ ماہ پوری تابشوں سے جلوہ آرا ہے زمیں کی ظلمتوں میں چاندنی کا رقص برپا ہے
تو آ، دل میں دبی چنگاریوں کو آ کے بھڑکا دے گھڑی بھر کے لئے تاریکِ غم، آغوش چمکا دے

نہ ہو اے ماہ، بیدل، دیکھ کر ناشادماں مجھ کو کہاں سے لے گیا، میرا غمِ پنہاں کہاں مجھ کو
میں اُس دنیا کی فانی وسعتوں کا رہنے والا ہوں کشاکش پر ہے جسکی زندگی وہ موجِ دریا ہوں
مری ہستی ہے اک ترکیب اجزائے پریشاں کی ہوا کی رَو میں لرزاں ہیں بنائیں میرے ایواں کی

تجھے معلوم ہے، اے ماہ، رازِ ہستیٔ فانی؟ کہ ہے لبریز، کن آلام سے دنیائے انسانی
کبھی پائی ہے تیرے دل نے گرمی سرد آہوں سے؟ گزر تیرا ہوا ہے عشق کی پیچیدہ راہوں سے؟
لیا ہے جان دیکر، کیا کبھی درسِ وفا تو نے؟ سہی ہے "روزگارِ ناموافق" کی جفا تو نے؟

ملی ہے موت کی لذت تجھے بھی زندگانی میں؟ کبھی کھوئی ہے تُو نے قوتِ دل نوجوانی میں؟
کبھی تڑپی ہیں پیہم بجلیاں تیرے نشیمن پر؟ خزاں کی آندھیاں آتی رہی ہیں تیرے گلشن پر؟
بہے ہیں خون کے دریا تری شاداب وادی میں؟ ملی ہیں تجھ کو ماتم کی صدائیں سازِ شادی میں؟

تری دنیا میں بھی رہتے ہیں، یہ ہمت شکن چرچے؟ جبینِ زندگی سے پھوٹتے ہیں موت کے چشمے؟
رہا کرتا ہے کیا اے ماہ تیری سرزمیں پہ بھی؟ وقارِ آدمیت، صرفِ پندارِ خداوندی؟
وہاں بھی ہیں غم افزا کیا ترانے شادکامی کے؟ فلک پر بھی رواں چلتے ہیں، کیا سکے غلامی کے؟

فضائے نور میں بھی یہ دھندلکے پیش آتے ہیں؟ وہاں بھی نخلِ ہستی خونِ دل سے سینچے جاتے ہیں؟
پر افشاں ملتی ہیں آزادیاں دامِ اسیری میں؟ شبابِ زندگی دم توڑتا ہے قصرِ پیری میں؟
پتنگے موت کی تاریک وادی سے گزرتے ہیں؟ تری محفل میں بھی یوں شمع کے جلوے نکھرتے ہیں؟

نہیں۔ اے ماہ تو اِن کاوشوں سے آشنا کیوں ہو تری دنیا بے روشن اسقدر ظلمت فزا کیوں ہو؟
مگر اتنا بتا اے آسمانی جلوۂ کامل نظر آیا ہے تجھ کو بحرِ ہستی کا کہیں ساحل؟
یہاں بھی کیا کبھی عشرت جھلک اپنی دکھائے گی؟ بتا! کیا روحِ انسانی کبھی آرام پائے گی؟

[illegible]

راہب

ہڈسن[1] کا راہب[2] اپنے غار کے قریب ایک غیر معمولی جوش کی حالت میں ٹہل رہا تھا۔ یہ غار کیٹکل نامی پہاڑ کی (جس کا سلسلہ لبِ دریا تک پھیلا ہوا تھا) ایک شاخ کے سرے پر واقع تھا۔ اِردگرد کی تمام پہاڑیاں گھنے درختوں سے ڈھکی ہوئی تھیں جن میں بے شمار وحشی گلہریوں اور کٹھ پھوڑوں[3] نے اپنے مسکن بنا رکھے تھے جو ہر وقت موسمِ گرما کے ناپائدار جلووں کی بے ثباتی کا نوحہ کرتے رہتے تھے۔

پہاڑیوں کے سرسبز دامن اور لبِ دریا کی کف آلود جھاڑ کے درمیان گزرنے والی سڑک ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے سفید جالی کا ایک خراب پیوند۔ ایک نامعلوم سی پگڈنڈی کشادہ سڑک میں سے نکل کر پہاڑی گھاٹیوں پر چکر کھاتی ہوئی راہب کے غار کے منہ تک آکر ختم ہو گئی تھی۔ ندی کے بہاؤ کے رُخ ایک میل کے فاصلے پر "ویو پوائینٹ" نامی سرائے واقع تھی جو موسمِ گرما کے دلدادگان کی ایک سیر گاہ تھی۔ یہ لوگ اپنے برقی پنکھوں والے سرد کمرے چھوڑ کر یہاں آجاتے تھے کہ تپلی پتلی ٹانگوں والے ملاحوں کے بڑے بڑے شکاروں[4] میں بیٹھ کر آفتاب کی جھلستی ہوئی دھوپ کی سیر کریں اور فضا کو اپنے مسرت انگیز قہقہوں سے آباد کر دیں۔

اِس راہب کا حُلیہ حسبِ ذیل تھا:-

عمر چالیس کے لگ بھگ۔ سر پہ لمبے لمبے بال جو سروں پر آکر خم دار ہو گئے تھے۔ خوشنما آنکھیں۔ لمبوتری سفید داڑھی۔ اُن داڑھیوں سے ملتی ہوئی جنہیں کچھ سال پہلے خود ساختہ روحانی پیشواؤں نے جو سرزمینِ مغرب پر ٹڈیوں کی وبا کے بعد مسلط ہو گئے تھے۔ عوام میں رواج دیا تھا۔ عبا۔ یہ ٹاٹ کی قسم کی کوئی چیز معلوم ہوتی تھی جسے کاٹ کر ایک ایسے لباس کی شکل دی گئی تھی۔ کہ اگر لندن کا کوئی کاریگر درزی اس نوع کے لباس تیار کرتا تو اچھی خاصی جائیداد بنا لیتا۔

لمبی لمبی اُنگلیاں۔ سُتواں ناک اور طور و اطوار اُسے راہبوں کی اُس جماعت سے بالاتر ثابت کر رہے تھے جو پانی سے ڈرتے ہیں۔ اور اپنی نقدی غاروں کے اُن پوشیدہ مقامات میں جن کے اوپر سنگین دیواروں میں صلیب کے نشانات کھُدے ہوتے ہیں۔ سیپ کے ظروف میں چھپا رکھتے ہیں۔

یہ غار ہی راہب کا تمام گھر نہ تھا بلکہ گھر کا ایک حصہ تھا۔ گھر کیا تھا۔ سرکنڈوں کا ایک بھدا سا جھونپڑا جس کی دیواروں پہ مٹی کا پلستر کیا گیا تھا۔ چھت پہ تانبے کی تہہ چڑھی تھی جس سے اِس پہ دھول جمنے نہ پائی تھی۔ خاص مکان سے پتھر کی سلیں تپائیوں کا کام دیتی تھیں۔ چنار کے کھُردرے تختوں کا ایک بھدا سا بُک شیلف[5] تھا۔ لکڑی کا ایک ٹکڑا پتھر کے دو مستقیم ٹکڑوں پہ رکھا تھا۔ یہ اُس کی میز تھی۔ یہ فرنیچر اُس سامان کے بین بین تھا جو کبھی قدیم انگریزی گرجاؤں اور براڈوے کے اُن تہ خانوں میں دیکھنے میں آتا تھا جہاں گوشت کے پارچے رکھے جاتے تھے۔ وحشی جانوروں کی کچھ کھالیں دیوار سے آویزاں تھیں جنہیں راہب نے نیویارک میں خریدا تھا۔

جھونپڑے کا پچھواڑا غار سے ملا ہوا تھا۔ اِس جگہ راہب پتھر کی ایک بدنما انگیٹھی پہ کھانا تیار کرتا تھا۔ اُس نے ختم ہونے والے استقلال اور ایک دقیانوسی شیشے کی مدد سے سنگینی دیواروں میں جابجا قدرتی طاق کھود رکھے تھے۔ جن میں آٹا۔ گوشت۔ چربی۔ مٹی کا تیل۔ خمیر بنانے والا سفوف وغیرہ عام ضرورت کی چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔

اِس جگہ راہب نے دس سال گزارے تھے۔ "ویو پوائنٹ" نامی سرائے کے مسافروں کی گفتگو کا عام موضوع صرف اُسی کی شخصیت ہوتی تھی۔ نئے آنے والے مہمان "وادی کی پُراسرار صداؤں" کے بعد صرف اِسی موضوع[6] میں اظہارِ دلچسپی کرتے تھے۔ یہ راہب دور دور تک ایک روشن دماغ عالم کی

---

[1] ایک جگہ کا نام۔ [2] عیسائیوں کا تارک الدنیا فقیر۔ [3] ایک پرندے کا نام۔ [4] چھوٹی کشتی۔ [5] کتابیں رکھنے کا۔ [6] مدارِ گفتگو۔

حیثیت سے مشہور تھا۔ جس نے متلون المزاج حسن کی بیوفائی سے تنگ آ کر دنیا کو ترک کر دیا تھا۔ سرائے والوں کا معمول تھا کہ ہفتے کی رات کو اشیائے خورد و نوش کا ایک خوان پوشیدہ طور پر اُسے بھیجدیتے ہیں۔ وہ اپنے جھونپڑے سے زیادہ دور کہیں نہیں جاتا تھا۔ سرائے کے جو مہمان اُس کو ملنے آتے تھے اُس کی علمی معلومات، تدبر اور فلسفیانہ روشن دماغی سے متاثر ہو کر جاتے تھے۔ کہا کرتے تھے کہ "یہ ایک عجیب انسان ہے"

اس دفعہ گرمیوں میں سرائے مہمانوں سے کچھا کچھ بھری ہوئی تھی چنانچہ ہفتے کی رات کو اُس کے خوان میں عام خوراک کے علاوہ اور بھی چند لذیذ کھانے ہوتے تھے۔

آج بظاہر راہب کسی مہمان کے انتظار میں تھا۔ اُس نے نہایت خوش اسلوبی سے سر کے لمبے لمبے بال بنا کر ریش مقدس کو دو حصوں میں تقسیم کیا۔ اور جب منگین طاق پر رکھی ہوئی الارم گھڑی نے پانچ بجنے کا اعلان کیا تو اُس نے بھی اپنی عبا اٹھائی۔ اُسے احتیاط کے ساتھ برش سے صاف کیا پھر شاہ بلوط کا ایک عصا[1] سنبھالا اور آہستہ آہستہ باہر کو جاتے ہوئے جھونپڑے کے اردگرد کے جنگل میں غائب ہو گیا۔

اُسے زیادہ دیر تک انتظار نہیں کرنا پڑا۔ کیونکہ سامنے باریک پگڈنڈی پر جس کی سطح صنوبر کے کانٹوں کے فرش کی وجہ سے نا ملائم ہو رہی تھی۔ ٹرین ہوم[2] خاندان کی مشہور بہنوں میں سب سے چھوٹی لیکن سب سے زیادہ حسین "بیٹرکس" تھکے ہوئے قدم اُٹھائے چل رہی تھی۔ اُس کا لباس سر کی خوشنما ٹوپی سے لے کر کینوس کی گرگابی تک تمام آسمانی رنگ کا تھا۔ یہ رنگ اگر کہیں کہیں عشق پیچاں کی نوخیز کلی کے سائے کی مانند پھیکا تھا جو موسم بہار میں ہفتہ کے دن نور کے تڑکے چھوٹتی ہے تو کہیں کہیں شوخ بھی تھا۔ اُس رنگ سے مشابہ جو کبھی کبھی پیر کو صبح کے نو بجے ہمارے چہروں پر نظر آ جاتا ہے۔ جب دھوبن نے دُھلے ہوئے کپڑے لانے میں دیر کی ہو۔

بیٹرکس نے اپنی آسمانی رنگ کی چھتری پگڈنڈی کے ایک طرف صنوبر کے کانٹوں میں چھپا دی اور ایک سرد آہ کھینچی۔ ادھر راہب نے بھی اپنے ایک پاؤں کی ایڑی سے دوسرے پاؤں کے ٹخنے سے لپٹا ہوا گھاس کا تنکا علیحدہ کیا۔ یہ دیکھتے ہی حسینہ کا چہرہ نیلگوں ہو گیا۔ لیکن اُس کی زعفرانی آنکھوں کے حسن نے راہب کو بھی اسیر کمند نظر کر لیا۔

حسینہ۔ جس نے ابھی تک دم بھی نہ لیا تھا۔ اور جو پہاڑی کی چڑھائی سے ابھی تک ہانپ رہی تھی راہب سے مخاطب ہو کر ایک نرم و شیریں لیکن کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔

"راہب بننے میں بھی لطف ہے۔ دوشیزہ لڑکیاں پہاڑ کی گھاٹیاں عبور کر کے تم سے باتیں کرنے آتی ہیں"۔

راہب نے اپنے بازو سمیٹ لئے اور ایک درخت سے تکیہ لگا کر بیٹھ گیا۔ بیٹرکس نے پھر ایک سرد آہ بھری اور صنوبر کے کانٹوں سے اٹے ہوئے فرش پر اس طرح سمٹ کر بیٹھ گئی۔ جیسے کوئی نیلے پروں والا پرندہ گھونسلے میں بیٹھا ہوتا ہے۔ راہب نے بھی اپنے پاؤں ٹاٹ کی عبا سے باہر کھینچتے ہوئے اُس کی تقلید کی اور بولا۔

"نہیں بلکہ پہاڑ بننے میں مزا ہے۔ نیلے نیلے لباس والے فرشتے اوپر ہی اوپر اُڑ کر گزر جانے کی بجائے اُس کی سیر کے لئے رُک جاتے ہیں"۔

بیٹرکس نے گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے کہا۔

"امی کو درد کی شکایت تھی اس لئے وہ جلد ہی سو گئیں ورنہ شاید میں آج نہ آ سکتی۔ اُس موئی کالی دقیانوسی سرائے میں بلا کی گرمی پڑتی ہے لیکن ہمارے پاس اتنا پیسہ کہاں کہ دوسری جگہ جا سکیں"

راہب بولا۔

"کل رات میں اس بلند چٹان کی (جو ہمارے سروں کے اوپر واقع ہے) چوٹی پر چڑھا۔ سرائے کی تمام روشن بتیاں نظر آتی تھیں اور کبھی کبھی جب ہوا کا رخ موافق ہو جاتا تھا تو موسیقی کے ایک دو سُر بھی پہنچ جاتے تھے۔ اُس وقت میری تصور کی آنکھوں نے دیکھا کہ تم پھولوں کی خوشبو کے درمیان "جرمن ناچ" کی خواب آور موسیقی کے ساتھ اجنبیوں کے ساتھ خوبصورتی سے محو رقص ہو۔ خیال کرو اُس وقت میں نے اپنی تنہائی کو کتنا محسوس کیا ہو گا؟

مشہور "ٹرین ہم" خاندان کی بہنوں میں سب سے کم عمر لیکن سب سے زیادہ حسین بہن نے ایک سرد آہ بھری اور حسرت ناک

---

[1] لاٹھی۔ [2] ایک مشہور خاندان

لہجے میں کہا۔

"تمہارا قیاس غلط تھا۔ واقعی میں عزیزوں کے ساتھ خوبصورتی سے محوِ رقص تھی۔ امّی کی کہنیوں اور شانوں میں درد تھا۔ وہ کبھی کبھی اس عارضے میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ اور مجھے کوئی آدھ گھنٹہ اس بدبودار مرہم کی مالش کرنی پڑی۔ ٹھیک! تم اُسے اپنے خیال میں پھولوں کی خوشبو سمجھے ہو گے؟ تمہیں معلوم ہے کل شام شہر میں ہفتہ وار ناچ تھا جس میں مغربی گوشے کے کچھ لڑکے اور کئی دوسرے نوجوان بھی شریک ہوئے تھے مگر مجھے ابتک یاد ہے کہ امّی ایک کھلی ہوئی ہوادار کھڑکی کے بالمقابل تین گھنٹے بیٹھی رہیں جس کا نصف وقت تو ۸۵ درجۂ حرارت قلمبند کرنے میں اور باقی موسم سرما کے کپکپا دینے والے جھونکوں میں گزارنا پڑا۔ ذرا اس مکروہ حالت کا تصور کرو۔ کہ امّی کے شانے سوجے ہوئے ہیں۔ اور وہ درد کی ٹیس سے کراہ رہی ہیں۔ میں اُسے خواب گاہ تک پہنچانے جاتی ہوں اور اُس کی کہنیوں کی مالش کرتی ہوں۔ پھر تمہیں حیرت میں ڈالنے کے لئے یہی بات کافی ہے کہ امّی کے بازوؤں کی جسامت کئی ہی مکعب انچ ہے جس پر پٹی باندھنے کے لئے بھی وقت چاہئے۔ آہ میں خیال کرتی ہوں کہ راہب کہلانا کتنا باعثِ مسرت ہے۔ یہ عبا جو تم پہنے ہوئے ہو تمہارے جسم پر کتنی پھبتی ہے۔ کیا تم نے اسے خود تیار کیا ہے یا سرائے والوں نے بخشی ہے۔ آہ بوٹوں کی بجائے کھڑاویں پہننے سے روح کو کیسی پُر مسرت تسکین حاصل ہوتی ہوگی۔ ذرا سوچو ہمیں کتنی تکلیفیں برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ میری گرگابی کا سائز کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو مگر اُس سے میری ایڑیاں ہر وقت بھنچی ہوئی رہتی ہیں۔ آہ کیا عورتیں راہب نہیں بن سکتیں؟

یہ کہکر اُس نے ایک سرد آہ بھری اور پھر نرم لہجے میں بولی۔

میں نے تمہاری سرگزشتِ محبت بھی سُنی ہے۔ سرائے والوں نے اُسے کارڈوں کی پشت پر چھپوا رکھا ہے۔ مقدس راہب! کیا واقعی وہ بہت حسین و جمیل تھی؟

راہب نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

"ہوٹل کے بلوں کی پشت پر ادنہہ! مگر مجھے دنیا کی بک بک کی کیا پرواہ ہے۔ ہاں واقعی وہ اپنی مثال آپ تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ اُس جیسی دوسری حسین عورت صفحۂ ہستی پر موجود نہیں ہے۔ اِس لئے جب سے اُسے ترک کر دیا باقی ماندہ زندگی کو تنہا گزارنے کے لئے اِس پہاڑی پر چلا آیا۔ کہ عمرِ چند روزہ کو اُس کی یاد میں صرف کر دوں۔

مس ٹرین ہم بولی۔ واقعی یہ ایک شاندار ایثار ہے۔ میں خیال کرتی ہوں کہ راہب کی زندگی ایک معیاری زندگی ہوتی ہے۔ کوئی قرضخواہ تنگ کرنے نہیں آتا۔ کسی کی دعوت میں* میں بھی ایسی ہو جاؤں۔ مگر میرے ایسے کہاں نصیب؟ اگر میں نے اس موسم میں شادی نہ کی تو میرا اس بات پر سچا یقین ہے کہ امّی مجھے اِس بات کے لئے بے حد مجبور کرینگی۔ اِس لئے نہیں کہ میں دن بدن عمر میں زیادہ یا بدشکل ہوتی جا رہی ہوں۔ بلکہ اِس لئے کہ اب ہماری اتنی حیثیت نہیں رہی۔ کہ کوہستانی زندگی سے زیادہ دیر تک لطف اندوز ہو سکیں۔ مگر میں ذاتی طور پر شادی سے متنفر ہوں۔ ہاں اگر کرونگی بھی تو کسی ایسے شخص سے جسے میرا دِل انتخاب کریگا۔ یہی باعث ہے کہ میں راہب بننا چاہتی ہوں۔ سُنا ہے کہ راہب کبھی شادی نہیں کرتے۔ کیا یہ بات سچ ہے؟

راہب بولا۔ بہتوں نے شادی کر لی ہے۔ مگر اُس وقت جب اُنہیں کوئی دل پسند شے (بیوی) دستیاب ہو گئی تھی۔

سب سے چھوٹی لیکن سب سے زیادہ حسین دوشیزہ نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"لیکن بعض صرف اِس لئے بھی تو راہب ہو گئے ہیں کہ یہ دل پسند شے اُن سے کھوئی گئی تھی۔ کیا ایسے راہب اب موجود نہیں ہیں؟

راہب نے چڑ کر کہا۔

کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے یہ شے کھو دی ہے۔ عقل انسان کو پہاڑ کی کھوہ میں بھی حاصل ہو جاتی ہے اور ٹیلوں کی دنیا میں رہ کر بھی

مس ٹرین ہم نے کہا۔

بے شک اگر ٹیلے میں عقل پیدا کرنے کی صلاحیت موجود ہو۔ میرے گھر والے تو عقل میں بڑے ٹیلے ہی ہیں۔ ہم چار بہنیں ہیں۔ میرے سوا باقی سب بیاہ دی گئیں۔ سب روپے کے ساتھ بیاہ دی گئیں۔ امّی میری بہنوں پر کتنا فخر کرتی ہیں۔ وہ اُنہیں بڑے دنوں میں نہایت خوشنما آرٹ

* [illegible]

کیلنڈر بھیجتی رہتی ہیں۔ اب ——— صرف مَیں ہی رہ گئی ہوں مجھے تاکید کی گئی ہے کہ کسی قلاش پر نظر نہ ڈالوں ——— راہب نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "لیکن اگر"

حسین دوشیزہ بولی۔

لیکن مجھے معلوم ہے کہ راہبوں کے پاس بڑے بڑے بیش قیمت طلائی ظروف ہوتے ہیں۔ جنہیں وہ بلوط کے اونچے اونچے درختوں کی جڑوں کے قریب زمین میں چھپا رکھتے ہیں۔ مجھے سب معلوم ہے۔

راہب نے حسرت آمیز لہجے میں کہا۔

"مگر میرے پاس نہیں ہیں"

مس ٹرین ہم بولی

مجھے اس کا افسوس ہے۔ اب تک مَیں یہی سمجھتی تھی کہ کوئی راہب اس دولت سے محروم نہیں ہوتا۔ ہاں یاد آیا اب مجھے گھر واپس جانا چاہیئے۔

حقیقت میں وہ نہایت حسین اور خوش رو تھی۔

راہب بولا۔ حسین لیڈی:—

اُس نے کہا۔ میرا اصلی نام بیٹریکس ٹرین ہوم ہے۔ لیکن بعض لوگ مجھے ٹریکس بھی کہتے ہیں۔ تم سرائے میں مجھ سے ملنے ضرور آنا۔

راہب نے جواب دیا۔ مَیں دس سال سے کبھی اپنے غار سے سو قدم کے فاصلے پر نہیں گیا۔

لیکن اُس نے دوبارہ کہا۔

"تم مجھ سے وہاں ضرور ملو۔ جمعرات کے علاوہ کسی روز شام کو"

راہب ایک نحیف انداز میں مُسکرا دیا۔

حسین دوشیزہ نے اپنے زرد آسمانی رنگ کے سائے کی تہوں کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ اچھا لو خدا حافظ! میں تمہارا انتظار کرونگی لیکن یاد رہے جمعرات کی شام کو نہیں۔

لطف ہوتا اگر سرائے کے آئندہ چھپنے والے کارڈوں کی پشت پر راہب کے متعلق جو عبارت ہے اُس میں مندرجہ ذیل سطور کا اضافہ کر دیا جاتا۔

"اپنی دس سال سے بھی زیادہ تنہا زندگی کے دوران میں صرف ایکبار پہاڑ پر رہنے والے راہب نے اپنے مشہور غار کو چھوڑا۔ صرف ایک بار۔ جب ٹرین ہم خاندان کی بہنوں میں سب سے چھوٹی اور سب سے حسین بیٹرکس کے ساحرانہ حسن کی کشش نے اُسے نیچے سرائے تک جانے پر مجبور کر دیا تھا۔"

راہب جھونپڑے میں واپس گیا تو دروازے کے باہر بوب بنکلے کھڑا تھا۔ یہ اُس کا قدیمی دوست تھا اور اُس وقت کا ساتھی جب اُس نے دُنیا کو ترک بھی نہ کیا تھا۔ بنکلے دلدادگانِ موسم گرما کی طرح مختلف الالوان لباس میں ملبوس تھا۔ کروڑپتی بنکلے جس کا چہرہ بھدا سا۔ لیکن بالکل صاف اور استقلال و دور اندیشی کی تصویرِ مجسّم تھا۔ اُس کی انگلیاں ہیرے کی انگوٹھیوں سے مزین تھیں۔ جیب میں بیش قیمت زنجیر سے آویزاں ایک گھڑی تھی۔ بنکلے عمر میں راہب سے دو سال بڑا تھا لیکن بُشرے سے پانچ سال چھوٹا معلوم ہوتا تھا۔ راہب کو دیکھتے ہی چلا اُٹھا۔

تم اِن مونچھوں اور اِس لمبی عبا کے باوجود ابھی تک وہی ہیمپٹ ایلینس (راہب کا نام) ہو۔ مَیں نے سرائے میں ہوٹل کے بل کی پشت پر تمہاری بابت پڑھا تھا۔ سرائے والوں نے تمہاری سرگزشت کھن کے اشتہار اور "ہم کوٹوں اور چھتریوں کے ذمہ دار نہیں ہیں" کے بین السطور[1] شائع کر رکھی ہے۔

راہب نے کہا۔

تم بھی بعینہٖ وہی ہو۔ اندر چلے آؤ اور یہاں آکر بیٹھ جاؤ۔ اُس چونے کے پتھر کی چٹان پر کیونکہ اس کی سطح عام پتھروں سے زیادہ نرم ہے۔

بنکلے بولا۔

پیر مرد! میں ابھی تک تمہارے متعلق حیرت میں ہوں۔ یہ بات تو میری بھی سمجھ میں آتی ہے کہ تم ایک عورت کو دس سال تک ترک کر سکتے ہو لیکن یہ نہیں سمجھ سکتا کہ دس سال ایک عورت کی خاطر کس طرح برباد کیئے جا سکتے ہو۔ مَیں خوب جانتا ہوں۔ کہ تم نے ایسا کیوں کیا۔ اِن حالات میں عام طور پر ہر شخص کا طرزِ عمل یہی ہوتا ہے۔ ایڈتھ کار[2] ——— اس نے تمہارے علاوہ اور پانچ چھ نیازمندوں کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا۔ لیکن ان میں سے

[1] سطروں کے بیچ میں۔ [2] راہب کی بیوفا محبوبہ کا نام۔

صرف ایک تمہیں نے غار کی رہائش اختیار کی۔ باقیوں نے شراب۔ سیاسیات اور اسی نوع کے دیگر مشغلوں میں علاجِ دردِ دل تلاش کر لیا۔ مگر ہمپ سچ کہنا کیا ایڈتھ کار دنیا کی حسین ترین عورت نہ تھی؟ بلند خیال، بلند نسب، مغرور جو اپنے اصولوں کو زندگی کی منعمات کے حصول کے لئے استعمال کرتی تھی۔

راہب بولا۔

"میں نے جب سے دنیوی تعلقات کو ترک کیا ہے۔ اُس کے متعلق پھر کوئی بات نہیں سُنی۔"

بنکلے نے کہا۔

"اُس نے مجھ سے شادی کر لی تھی۔"

راہب جھونپڑے کی چوبی دیوار سے تکیہ لگا کر بیٹھ گیا اور حالتِ بیتابی میں پاؤں کی ایڑیوں کو فرش پر رگڑنے لگا۔

بنکلے بولا۔

"میں خوب سمجھتا ہوں کہ تم نے اسے کتنا محسوس کیا ہے۔ مگر خیال کرو اگر وہ مجھ سے شادی نہ کر لیتی تو اور کیا کرتی۔ اُس کی چار بہنیں تھیں۔ ماں تھی اور وہ بڈھا (باپ تھا) جس نے (جیسا کہ تمہیں بھی اُس کا علم ہے) اپنا تمام سرمایہ بیلونوں کے بیوپار میں لگا دیا تھا۔ لیکن اُن کی مالی حالت سُدھرنے کے بجائے ہر روز بد سے بدتر ہی ہوتی گئی۔ ہاں تو تمہاری طرح میں بھی ایڈتھ کے لچھنوں سے واقف تھا لیکن پھر بھی میں نے اُس سے شادی کر لی۔ اُس وقت میری حیثیت دس لاکھ کی ہوگی۔ جسے میں نے اِس وقت تک پچاس ساٹھ لاکھ تک پہنچا دیا ہے۔ ایڈتھ مجھ سے زیادہ میری دولت کی خواہاں تھی۔ وہ ہر وقت چابیوں کے گچھے کی حفاظت میں مشغول رہتی تھی۔ جس وقت تم نے گلہری کی طرح غار کو اپنا مسکن بنایا اُس کے دو ماہ بعد ہم دونوں میاں بیوی بن گئے تھے۔ اُس وقت تو میں بھی اِس غلط فہمی میں مبتلا تھا کہ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔

"لیکن اب ـــــ"

راہب نے پوچھا۔

اب ہم پہلے سے بھی زیادہ ایک دوسرے کے خیر خواہ اور دوست ہیں۔ دو سال کا عرصہ ہوا کہ اُس نے مجھ سے طلاق نامہ حاصل کر لیا۔ سبب وہی کہ ہمارا نباہ مشکل تھا۔ میں نے کوئی استغاثہ دائر کرنا بھی مناسب نہیں سمجھا۔

بنکلے۔ اچھا اچھا۔ اچھا تو ہمپ[1] واقعی تم نے یہ مضحکہ انگیز گھروندا سا خوب کھود رکھا ہے۔ تم ہمیشہ ناول کے ہیرو کی طرح دشوار پسند رہے ہو۔ تم نے خیال کیا ہوگا کہ اِس طرح تم ایڈتھ کو اپنی جانب دوبارہ مائل کرنے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔ ممکن ہے تمہیں اِس میں کچھ کامیابی بھی حاصل ہوئی ہو لیکن میرے دوست میرے خیال میں یہ غار پسندی اور بڑی بڑی مونچھیں اِس مہم کو سر نہیں کر سکتیں۔ اُسے تو صرف روپیہ ہی جیت سکتا ہے۔ اچھا تو تمہیں دیانتداری سے کہو کہ کیا اپنے متعلق تمہارا یہ خیال نہیں ہے۔ کہ تم اب تک بیوقوف بنے رہے ہو؟

راہب اپنی گھنی داڑھی کی آڑ میں مسکرا دیا۔ وہ طبعاً اِس سے پہلے بھی اور اب بھی متمول لیکن خام طبع بنکلے سے اتنا بلند واقع ہوا تھا کہ اُس کی غیر متین گفتگو بھی اُس کے غصّے کو متحرک نہ کر سکتی تھی۔ مزید براں تنہا مطالعہ اور مشقِ افکار نے اُسے دنیا کی عام غرور پسندی سے بالاتر کر دیا تھا۔ یہ مختصر سا دامنِ کوہ اُس کے نزدیک اولیمپس[2] سے کم نہ تھا جس کے اوپر والے کنارے سے وہ بجلیوں کے تیروں کو وادی میں بسنے والے انسانوں پر برستے ہوئے دیکھتا تھا۔ تو پھر کیا یہ دس سال جنہیں اُس نے ترکِ لذات افکار، معیار پرستی اور دنیائے دُنی کی زندہ تحقیر میں صرف کیا تھا۔ محض بیکار گئے تھے۔ نہیں۔ کیونکہ سب سے کم عمر لیکن سب سے حسین۔ ایڈتھ سے بھی حسین۔ اِس سے بھی کئی گنا حسین۔ دوشیزہ ذہن کی پستیوں سے اِس کے پاس پہاڑ پر پہنچ گئی تھی۔ چنانچہ یہی وہ خیال تھا جس کے دماغ میں آتے ہی وہ اپنی داڑھی کی آڑ میں مُسکرا دیا۔

جب یہ جھونپڑا بنکلے کی موجودگی کے داغ سے پاک ہو گیا اور سب سے پہلا دُھندلا ستارہ صنوبر کے درختوں پر نمودار ہوا۔ تو راہب نے طاق میں سے خمیر بنانے والے سفوف کا ڈبہ اُٹھایا۔ وہ ابھی تک اپنی داڑھی کی آڑ میں مسکرا رہا تھا۔

دروازے میں خفیف سی سرسراہٹ ہوئی۔ ایڈتھ[3] کار اپنے بے پایاں حسن دلربایانہ شان اور اُن تمام ایرانہ شوکتوں کے ساتھ

[1] راہب کا نام۔ [2] دیوتاؤں کی بہشت۔ [3] راہب کی مطلقہ بیوی

د جسے اُس نے پچھلے دس سال میں حاصل کیا تھا، دہلیز میں کھڑی تھی۔

وہ زیادہ باتیں کرنے کی عادی نہ تھی۔ اُس نے راہب کی طرف اپنی بڑی بڑی متفکر سیاہ آنکھوں سے دیکھا۔ راہب بھی تصویرِ حیرت بنا کھڑا تھا۔

آخر ایڈیتھ نے طلسمِ سکوت توڑتے ہوئے ایک ہلکے اور صاف لہجے میں کہا۔

میں سرائے میں قیام پذیر ہوں۔ وہاں میں نے تمہارے حالات سنے تو دل نے کہا کہ ایک بار ضرور ملنا چاہئے۔ میں تم سے معافی کی خواستگار ہوں۔ میں نے اپنی مسرت روپے کے ساتھ فروخت کر دی۔ کیونکہ مجھے دوسروں کی معاش کی فکر بھی تھی (آہ مگر اس سے میری برأت ثابت نہیں ہوتی) سرائے والوں نے مجھ سے یہ بھی ذکر کیا کہ تم نے صرف میری خاطر دس سال قربان کر دئے ہیں۔ ہیمنڈ[1]! میں اُس وقت اندھی تھی اور یہ نہ دیکھ سکتی تھی کہ دنیا کی تمام دولت ایک وفادار دل کے مقابلے میں بالکل بے حیثیت شے ہے۔ اگر ——— آہ لیکن شاید اب تیر کمان سے نکل چکا ہے۔

اُس کا یہ بیان گویا ایک محبت کرنے والی عورت کے غرور میں چھپی ہوئی ایک درخواست تھی۔ مگر راہب نے ایک ہلکے سے نقاب کی آڑ میں سے یہ بات نہایت آسانی سے معلوم کر لی کہ اُس کی بیوی اُس کے ساتھ دوبارہ رہنے کی خواہشمند ہے۔ بشرطیکہ وہ خود اِس امر کو پسند کرے۔ اُس نے ایک سنہری تاج جیت لیا ہے۔ بشرطیکہ وہ اُسے پہننا قبول کرے۔ اس کے دس سال کی مستقل المزاجی اور وفاداری کا انعام اُس کے پاس پہنچنے کو بیتاب ہے۔ بشرطیکہ وہ اُس کے استقبال کو اپنا ہاتھ پھیلائے۔ "جادۂ قدیم"[2] کی مرتعش[3] روشنی لمحہ بھر کے لئے اُس پر چمکی اور پھر یکے بعد دیگرے اُس نے عزم و غصے کی اُن مردانہ حسّیات کو جو محبت کے ٹھکرائے جانے پر پیدا ہوتی ہیں اور اُن جذباتِ نفرت کو جن کا باعث ایک عورت کا دوبارہ محبت کی بھیک طلب کرنا ہے محسوس کیا۔ لیکن سب سے آخر ٹرین ہم خاندان کی بہنوں میں سب سے خوبصورت بہن کی زرد

آسمانی رنگ کی خیالی تصویر نے اُس کے دماغ کی آنکھوں کو منوّر کر کے اُسے پھر مستحکم[1] کر دیا۔ چنانچہ وہ سفوف کے خمیر بنانے والے ڈبے کو سینے کے ساتھ دباتے ہوئے ایک عمیق لہجے میں بولا۔

"اب وقت گزر چکا ہے۔"

ایڈیتھ نیچے جانے والی پگڈنڈی پر آہستہ آہستہ بیس گز چل کر ایک بار پھر مُڑی اور اُس نے مُڑ کر راہب کو دیکھا۔ لیکن اب راہب نے برتن کے ڈھکنے کو گھمانا[2] شروع کر دیا تھا۔ وہ اُس کی بڑی بڑی پُرحسرت آنکھوں کو جو شام کے دُھندلکے میں چمک رہی تھیں۔ خوب دیکھ سکتا تھا۔ لیکن اپنے چوبی دروازے پر غیر متاثر حالت میں کھڑا رہا۔ حتےٰ کہ اُس نے کوئی اشارہ بھی نہ کیا۔

جیسے ہی جمعرات کی شام کو چاند افق پر نمودار ہوا۔ راہب پر دنیا کی دیوانگی مُسلط ہونے لگی۔

سرائے میں بلینڈر پر "کاسینو"[3] گایا جا رہا تھا۔ موسیقی کی کچھ اُڑتی ہوئی تانیں جو پریوں کے ناقوس سے بھی زیادہ نازک و لطیف تھیں۔ کبھی کبھی اِس بلندی تک بھی پہنچ جاتی تھیں۔ رات نے ٹڈسن[4] کو ایک غیر محدود سمندر کی طرح وسیع کر دیا تھا۔ سامنے ساحل پر چلنے والوں کی روشنی دُھندلی نظر آتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ چراغ وہ نہیں جن کی روشنی میں چلنے والی گاڑیاں ٹھوس سڑکوں پر قطعِ مسافت کرتی ہیں۔ بلکہ کچھ چمکتے ہوئے ستارے ہیں جنہیں زمین سے کروڑوں میل کے فاصلے پر دُور۔ افق کی پستی کے دامن میں جڑ دیا گیا ہے۔ سرائے کے سامنے جگنوؤں کی جگمگاہٹ سے پانی میں چراغاں کا عالم ہو رہا تھا۔ یا کچھ دخانی کشتیاں تھیں۔ جن میں گیس اور تیل کی بدبو موجود تھی۔ ایک وقت تھا کہ راہب اِن چیزوں سے مانوس رہ چکا تھا۔ وہ سرخ و سفید دھاریوں والے شامیانے کے سائے میں حسن کے ساتھ کھیل چکا تھا۔ لیکن اب وہ دس سال سے چھچھوری دنیا کی صدائے[5] بازگشت کی طرف سے تقریباً بہرا بنا رہا تھا۔ مگر آج کی رات اُس کے کان دنیا کی پُرمسرت

۱؎ راہب کا نام۔ ۲؎ کسی عقیدے کی جانب اشارہ ہے۔ ۳؎ کانپتی ہوئی۔

۱؎ مضبوط۔ ۲؎ خمیر بنانے کے لئے۔ ۳؎ ایک گیت۔ ۴؎ اُس جگہ کا نام۔ ۵؎ صدائے بازگشت۔ وہ آواز جو کسی ویرانے جنگل۔ یا کنوئیں میں آواز دینے سے پیدا ہوتی ہے۔

آوازوں کے لئے کھُل چکے تھے۔

بینڈ میں سے والٹز[1] ہاں والٹز کی سُریلی تانیں نکل رہی تھیں۔ وہ کتنا احمق تھا کہ اُس نے ارادۃً ایک ایسی ہستی کے لئے جس نے اُسے دُنیا کی ناپائدار مسرتوں کی خاطر ترک کر دیا تھا۔ تقویم[2] حیات میں سے اپنی زندگی کے دس سال پھاڑ ڈالے تھے۔ "ٹم۔ ٹی ٹم۔ ٹم۔ ٹی۔ ٹم ٹی" آہا! والٹز کس طرح جاری تھا۔ لیکن یہ سال ضائع نہیں ہوئے۔ کیا اُسے دنیا کا ایک قیمتی موتی اور روشن ستارہ —— خاندان کی سب سے کم عمر لیکن سب سے حسین بہن —— تھی؟ مگر اُس نے تو تاکید کی تھی۔ کہ جمعرات کی شام کو نہ آنا۔ ممکن ہے وہ اُس وقت والٹز کی دلکش تانوں کے ساتھ ساتھ شہر کے نوجوانوں میں سے کسی ایک کے ساتھ آہستہ آہستہ لطیف انداز سے محوِ رقص ہیں۔ اور وہ بے نصیب شخص جس نے اُس کی خوشنما آنکھوں میں اُن اشیا کا مطالعہ کیا ہے جو اُس کی زندگی کے کھوئے ہوئے دس سالوں کی تلافی کے لئے کافی ہے۔ اپنے غار میں وحشی درندے کی طرح منہ بنائے پڑا رہے۔ جہنم میں جائے یہ قید[3]۔ میں وہاں ضرور جاؤنگا۔

اُس نے اپنی "مارکس اوریلیس[4]" کی کتاب زمین پر ٹپک دی۔ ٹاٹ کی عبا جسم سے علیحدہ کر دی اور غار کے ایک کونے سے ایک ٹرنک جو خاک میں اٹ رہا تھا کھینچ کر باہر نکالا اور مشکل سے اُس کے ڈھکنے کو دور کیا۔

وہاں موم بتیوں کی کمی نہ تھی۔ چنانچہ چشم زدن میں غار کی تاریکی روشنی سے مبدّل ہوگئی۔ کپڑے جو دس سال پہلے کے فیشن کے مطابق کاٹے گئے تھے۔ قینچیاں۔ اُسترے۔ ٹوپیاں۔ جوتے۔ اُس کا تمام لباس اور تمام چیزیں جسے اُس نے پہلے ترک کر دیا تھا۔ اُنہیں اُن کی پُرسکون خلوت گاہ سے نہایت بیدردی سے باہر نکالا گیا۔ جو اُس وقت ایک درد انگیز بے ترتیبی کی حالت میں فرش پر بکھری پڑی تھیں۔

قینچی کے دونوں پروں نے اُس کی داڑھی کے بالوں کو اتنا ہلکا کر دیا کہ کُند اُسترے اُس پر اپنے فرائض کو تھوڑا بہت سر انجام دینے لگے۔ راہب اپنے بال خود نہ کاٹ سکتا تھا۔ چنانچہ اُس نے اُنہیں شانہ کر کے بُرش سے اوپر چڑھا لیا۔ انسانی ہمدردی ہمیں اِس امر کی اجازت نہیں دیتی کہ ہم کہ ہم ایک ایسے شخص کی جو سوسائٹی اور اُس کے لوازمات سے اتنی مدت بے تعلق رہا ہو۔ دلی حسرتوں اور جفاکشیوں کے ساتھ اظہارِ ہمدردی نہ کریں۔

آخر کار راہب غار کے اندرونی گوشے میں گیا۔ وہاں اُس نے زمین کی نرم مٹی کو لوہے کے ایک بڑے چمچے سے کھودنا شروع کر دیا۔ کھُدے ہوئے گڑھے میں سے ٹین کا ایک ڈبہ اور ڈبے میں سے تین ہزار ڈالر کے نوٹ باہر نکالے جو ایک ریشمی کپڑے میں دھاگے سے مضبوط بندھے ہوئے تھے۔ اِس بات سے تو اب تمہیں بھی یقین آگیا ہوگا۔ کہ وہ صحیح معنوں میں راہب تھا۔

اب وہ ڈِگیں بھرتا ہوا پہاڑ کے دامن سے نیچے اُتر رہا ہے۔ اِس حالت میں آپ اُس پر ایک چھچلتی ہوئی نگاہ ڈالیں۔ ایک لمبا سلوٹیں پڑا ہوا سیاہ رنگ کا فراک کوٹ جو ٹخنوں تک پہنچ رہا ہے۔ بلغم کے رنگ سے ملتا ہوا سفید پاجامہ درزی کے لوہے سے ناآشنا۔ پیازی رنگ کی قمیص۔ سفید اور سخت کالر۔ کالر کے ساتھ ایک چمکدار نیلے پروں والی تیتری یا ٹائی بٹن والے موزے۔ اِن سب کے معائنہ کے بعد دس سال کی طویل مدت کا بھی خیال کریں۔ تنکوں کی تنگ کنارے والی ٹوپی (جس پر ایک فیتہ تھا) کے اندر سے اُس کی لمبی لمبی جٹائیں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ مختصر یہ کہ ایک ایسا لباس کہ چاہے آپ دیکھنے میں کتنے ہی مشاق کیوں نہ ہوں۔ پہلی نظر میں اُسے کبھی نہ پہچان سکتے اور یہی سمجھتے کہ کوئی شخص شہزادہ "ہیملٹ" کا پارٹ ادا کرنے جا رہا ہے۔ اور اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کبھی نہ کہہ سکتے کہ یہ ایک راہب ہے جس نے ایک عورت کی محبّت کی خاطر اور اس طرح ایک دوسری عورت کی محبت جیتنے کے لئے دس سال ایک غار میں بسر کئے ہیں۔

ناچ گھر کی عمارت دریا کے پانی پر چھائی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ جس کے اندر چمکدار بتیاں اور بجلی کے کہرآلود قمقمے نور کی ہلکی ہلکی بارش کر رہے تھے۔ سرائے کے سینکڑوں عورت۔ مرد اندر سے باہر اور باہر سے اندر اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ یہ عمارت اس پگڈنڈی کے (جس سے راہب نیچے اُترا تھا) بائیں جانب

---

[1] ایک گیت۔ [2] تقویم جنتری۔ [3] بیٹر کس کا یہ حکم کہ جمعرات کی شام کو نہ آنا۔ [4] ایک رومن شہنشاہ جس کے اخلاقی اقوال مشہور ہیں۔

واقع تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہاں کوئی جشن ہو رہا ہے۔ کیونکہ اُس کی کھڑکیاں روشنی سے معمور تھیں۔ موسیقی کا دریا لہریں مار رہا تھا۔

ایک سیاہ فام حبشی سفید جاکٹ پہنے ہوئے ناچ گھر کے آہنی دروازے میں سے (جس کے دو رویہ سنگین ستون تھے اور ستونوں میں آہنی شمعدان بنے ہوئے تھے) باہر نکلا۔

راہب نے اُس سے پوچھا۔

"اِس وقت یہاں کیا ہو رہا ہے۔"

حبشی ملازم بولا۔

"حضور جمعرات کی شام کا معمولی ناچ"

"اور ساتھ والے بڑے کمرے میں؟"

"یہاں ایک دعوت ہے۔"

پھر راہب نے نظریں اُوپر اُٹھا کر پہاڑ کی سرائے کو دیکھا جہاں سے موسیقی کی ایک مسرت آفریں لے گویا اُن پر اچانک برس پڑی تھی۔

راہب نے پوچھا۔

"اور وہاں شاید یہ "مینڈلسن" گایا جا رہا ہے۔

"ہاں تو وہاں کیا ہو رہا ہے؟"

حبشی بولا۔

"اوپر سرائے میں — ایک شادی کی رسم ادا ہو رہی ہے۔"

کس کی شادی؟

مالدار بنکلے کی شادی یہاں کی ایک حسین نازنین مس ٹرین ہوم کے ساتھ۔

فاخر ہریانوی بی اے

غزل

عشق کی کشمکش نے کام کیا ؛ قصۂ زندگی تمام کیا ؛
وہ تماشے کو دیکھتے ہی رہے مرنے والے نے اپنا کام کیا
اُف رے ذوقِ طلب کی آگاہی کہیں سجدہ کہیں قیام کیا
ہر قدم پر ہے جلوۂ نیرنگ تم نے نیرنگیوں کو عام کیا
فرصتِ زندگی عجب شے تھی کیوں خرابِ خیالِ خام کیا
تھا تجسس ترا نماز میں بھی کبھی سجدہ کبھی سلام کیا

مرگِ جوہر پہ کوئی کیوں روئے
کونسا اُس نے ایسا کام کیا

جوہر

جرمن یونیورسٹیوں کا نظامِ تعلیم

اگر میں واعظی کا پیشہ چھوڑنے پر مجبور کیا جاؤں تو میں معلمی کو اختیار کروں گا (لوتھر)

کچھ عرصہ ہوا ایک انگریز مصنف نے علوم کے اُن ماہرین وفنون کی فہرست مرتب کی تھی جن کو آج تک نوبل پرائز مل چکا ہے - اور اُن اعداد سے مختلف قوموں کے قوائے ذہنی (ذہنی طاقتوں) کا اندازہ کر کے وہ اِس نتیجے پر پہنچا کہ آٹھ جرمنوں کے مقابل میں تین انگریزوں اور ایک امریکن کو انعام ملا ہے - انعامات معتبر تحقیقات کے بعد اُن لوگوں کو عطا کئے جاتے ہیں جنہوں نے علم کیمیا طبعیات میں کوئی ایجاد یا علمی تجسس وتلاش سے انسانی معلومات میں کوئی قابل قدر اضافہ کیا ہو یا میدان ادب میں کوئی ایسا شاہکار پیدا کیا ہو جس پر نسل انسانی فخر کر سکے یا دنیا کے امن وامان کے لئے کوئی بیش بہا خدمات انجام دی ہوں - انعامات کی اہمیت اور وقعت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اگرچہ ڈاکٹر نوبل نے اُن انعامات کے لئے اس صدی کے شروع سالوں میں ہی سرمایہ وقف کر دیا تھا مگر اب تک صرف ایک ہندوستانی کو ادبی انعام ملا ہے - اس کا سہرا بنگال کے سر اور بنگالی ادب کے لئے یہ امر باعثِ ناز ہے -

دراصل حق بات یہ ہے کہ باوجود اقتصادی[۱] انحطاط جنگ عظیم کے صدمات اور تاوان جنگ کے جرمنی نے جس ہمت سے علمی تحقیقات کے معیار کو بلند رکھا ہے - یہ اس کے لئے قابلِ اطمینان ہی نہیں بلکہ باعثِ فخر ہے - آج معاشیات - کیمیا - طبعیات - نباتیات - علم رنگ سازی وغیرہ میں جرمنی یورپ کی تمام قوموں سے پیش پیش ہے - اس کا ادنیٰ سا ثبوت یہ ہے کہ لندن یونیورسٹی کے قوانین کے مطابق تمام سائنس کے طلبہ کو جرمن زبان لازماً پڑھنی پڑتی ہے - تاکہ وہ جدید جرمن رسالوں اور کتابوں سے پورا استفادہ[۲] حاصل کر کے اپنے مضامین کی تکمیل کر سکیں -

ہندوستان کا نظامِ تعلیم انگریزی طرزِ تعلیم کا ایک دھندلا سا خاکہ ہے - اہلِ ملک کو کبھی یہ موقعہ ملا ہی نہیں کہ آزادیٔ رائے سے کام لیکر نظامِ تعلیمی کی کوئی اصلاح کر سکیں اُدھر حکومت نے وہی طرزِ تعلیم رائج کر دیا جس سے وہ آشنا تھے - بلکہ ایک قابل ماہرِ تعلیم کا تو یہ مقولہ ہے کہ جو اصولِ تعلیم ولایت میں اس سال بے کار اور فرسودہ قرار پائے جاتے ہیں وہی اگلے سال ہندوستان میں رائج کر دئے جاتے ہیں - انہیں غلطیوں کا نتیجہ ہندوستان آج بھگت رہا ہے - انگریزی طرزِ تعلیم کی پیروی کرنے کا نتیجہ زیادہ نقصان دہ اس وجہ سے بھی ہوا کہ خود انگریزی میں فنِ تعلیم میں جدت طرازی یا اصلاح نہیں ہوئی بلکہ اُن کی روش اس بارے میں مجددانہ[۳] نہیں بلکہ مقلدانہ[۴] رہی ہے -

۱۹۱۹ء کی اصلاحات میں خوش قسمتی سے تعلیم کو وزیر تعلیم کے سپرد کیا گیا ہے جو اپنے پالیسی کے واسطے کونسل کے سامنے جواب دہ ہے اور قوم کے نمایندے جو ضروری اصلاح یا تجدید طرزِ تعلیم میں کرنا چاہیں ہو سکتی ہے - اِن حالات میں ڈاکٹر ضیاءالدین احمد کی نئی کتاب "نظامہائے تعلیم" بہی خواہانِ قوم کے لئے عموماً اور اُن ممبرانِ کونسل کے لئے جو تعلیم اور احیائے[۵] علوم کو ملکی ترقی کا ایک ضروری عنصر سمجھتے ہیں - شمعِ ہدایات کا کام دیگی - اس کتاب میں قابل مصنف نے انگریزی - المانی[۶] - فرانسیسی اور ہندوستانی نظامہائے تعلیم پر ایک مبسوط اور مکمل بحث کر کے آخر میں ہندوستانی نظام تعلیم کا دوسرے ملکوں کی طرزِ تعلیم سے موازنہ کیا ہے اور ہندوستانی نظام تعلیم پر ایک ماہرِ تعلیم کی نظر سے تنقید کی ہے - اور اس تجربہ کی مدد سے جو انہوں نے معری انگریزی اور جرمن درسگاہوں میں تعلیم حاصل کر کے اور فرانسیسی اور اطالوی درسگاہوں کے عینی[۷] مشاہدہ سے حاصل کیا ہے - ہندوستانی طریقِ تعلیم کے نقائص کو دور کرنے کے لئے تجاویز پیش کی ہیں -

---

۱ روزی کمانے کے طریقوں اور وسیلوں کی کمی -
۲ استفادہ کرنا - فائدہ اٹھانا -

۳ اپنی عقل سے ایجاد کر کے - ۴ دوسروں کی پیروی کر کے -
۵ زندہ رکھنا - ۶ المانی - جرمن - ۷ عینی مشاہدہ - خود دیکھ کر -

یہ مضمون بھی اسی کتاب سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے اور بیشتر اعداد وشمار اسی میں سے لئے گئے ہیں۔

جرمنی میں اسکولوں کا آغاز ازمنۂ وسطےٰ سے ہوا اور ۱۳۴۸ء میں پریگ یونیورسٹی۔ پیرس یونیورسٹی کے نمونہ پر قائم کی گئی۔ جرمنی کے نظامِ تعلیم کی بنیاد کو لوتھر نے مستحکم[1] کیا اور کومینیس۔ پستالزی اور فروبل اسی عمارت کو ثریا[2] تک اٹھا لے گئے۔ لوتھر نے جبری تعلیم کی ترویج[3] کا زبردست پروپیگنڈا کیا اور آخر کار اُس کے نیک ارادوں میں خدا نے برکت دی اور ۱۶۱۹ء میں ریاست وائمر میں سب سے پہلے لازمی اور جبریہ تعلیم قرار پائی۔ اس کے بعد کومینیس (جس کا حلقۂ اثر تعلیمی دنیا میں اتنا ہی وسیع تھا جتنا لوتھر کا مذہبی دنیا میں) نے تو اپنی زندگی ہی درس[4] و تدریس کے لئے وقف کر دی۔ اس کو تو فنِ تعلیم کا پیغمبر کہنا چاہیئے اور اس کی کتاب گریٹ ڈائیڈکٹک کو اس کا آسمانی صحیفہ۔ لوتھر لاطینی زبان کا زبردست مؤیّد تھا مگر کومینیس پہلا شخص ہے جس نے لاطینی زبان کے خلاف سب سے پہلے علمِ بغاوت کھڑا کیا اور مادری زبان کو نصابِ تعلیم میں اس کا جائز حق دلانے کی کوشش کی۔ اسکولوں میں مادری زبان کا داخلہ ایک بیج تھا اس نظامِ تعلیم کا جو اب پھیلتے پھیلتے ایک شاندار درخت ہو گیا ہے۔ جس کی جڑیں کہیں تو بحرِ اوقیانوس کے اُس پار جا نکلی ہیں اور کہیں بحرِ ہند کی موجوں کا منہ چوم رہی ہیں۔

یہی وہ اصل الاصول[5] ہے جس کا اثر ہندوستانی نظامِ تعلیم میں بھی محسوس ہو رہا ہے۔ اور انگریزی جو زبردستی اردو کا حق غصب کر گئی تھی۔ تبدریج[6] جگہ خالی کر رہی ہے۔ ٹیگور کا قول ہے:۔

"اعلیٰ اور ارفع خیالات صرف مادری زبان میں ہی ادا ہو سکتے ہیں" اسی اصول پر کومینیس کاربند تھا۔

کومینس کے بعد قابل جرمن فلسفی ہربارٹ (Herbart) نے بہت کچھ فنِ تعلیم کی خدمت کی۔ اگرچہ عملاً تو وہ کچھ ایسا زیادہ کام نہ کر سکا۔ مگر وہ پہلا شخص تھا جس نے تعلیمی علم النفس پر ایک غائر نظر ڈالی۔ اور اُس کی گتھیوں کو سلجھا کر اُسے ایک منظم فن کی شکل میں مکمل کر دیا۔ اس کے بعد جرمنی میں وہ شخص پیدا ہوا جس نے تعلیمی نظریات[7] کو

[1] مضبوط اور پائیدار۔ [2] ستارے۔ [3] رائج کرنا۔ رواج دینا [4] تعلیم۔ [5] صحیح اور اصلی قانون۔ [6] بتدریج۔ آہستہ آہستہ [7] نظریات۔ نظریہ کی جمع۔ رائے۔ خیال۔ تھیوری۔

تہ و بالا کر دیا اور طریقِ تعلیم کو ایک نئی جِلا دے دی۔ وہ فروبل (Froebel) تھا۔ وہ بچوں کو اصلی معنوں میں نونہالانِ قوم اور اُستاد کو ایک باغبان سمجھتا تھا۔ اِسی سلسلہ میں اُس نے کنڈرگارٹن یا گلزارِ نونہال[1] کا تخیل دنیا کے سامنے پیش کیا اور صرف تخیل ہی نہیں بلکہ عملاً بھی اُس کے لئے گفٹس (Gifts) یا تحائف ایجاد کئے۔ جن سے بچہ کھیلتا ہے اور جن سے آہستہ آہستہ چیزوں کی خاصیتیں وزن۔ جسامت[2] وغیرہ کا انکشاف[3] ہوتا رہتا ہے۔ فروبل کا جسم مغربی ہی ہو مگر معلوم ہوتا ہے کہ اُس کا دماغ مشرقی تھا۔ نہیں تو مشرق سے دور افتادہ ملک میں ایک نوجوان کے دل میں وحدت الوجود[4] کے مسئلے کی اُلجھنوں کے کیا معنی ہیں۔ فروبل کے ہر تحفے کا ایک مادی اور دوسرا روحانی پہلو ہے۔ اس کا مقصد اِن تحائف[5] سے یہ نہیں کہ بچوں کے حسیات[6] نازک اور تیز ہو جائیں۔ اور مادی دنیا کے سربستہ راز اُن پر منکشف[7] ہو جائیں بلکہ اُس کا مقصد اِس سے برتر اور عالی تھا۔ اُس کا مقصد یہ تھا کہ یہ باغِ قدرت کے تازہ پھول (بچے) اُسی سانِ سرمدی[8] میں سرمست ہو جائیں جس میں وہ خود چُور تھا اور اپنا صحیح رشتہ اُس ذاتِ واحد سے جوڑیں جو منبع و مرجع[9] کل ہے۔ اگرچہ فروبل زندہ نہیں ہے اور اُس کی روحانیت کی بھی یورپ پوری قدر نہ کر سکا مگر اُس کے کنڈرگارٹن کو سب نے سر آنکھوں پر لیا۔ اور یہ اب اپنے مدارج[10] ارتقائی طے کرتا ہوا ایک مکمل فن کی شکل اختیار کر چکا ہے۔

جن لوگوں نے آج سے پندرہ سولہ سال پہلے تعلیم پائی۔ اُن کے دل میں اب تک ایک چھوٹے سے کمرے کی یاد ہوگی۔ جس میں ہر ایک لڑکے کے سامنے پلیٹ میں گندھی ہوئی چکنی مٹی رکھی ہوئی ہے۔ استاد سامنے کھڑا ہے۔ اور ہاتھ میں تھوڑی مٹی لئے ہوئے اچھے لہجے میں گاتا ہے۔ ع

تھوڑی سی مٹی لے کے چڑیا بنائیں گے ہم

[1] بچوں کی پھلواڑی۔ [2] بڑائی موٹائی۔ [3] معلوم ہونا۔ دریافت ہونا۔ [4] تصوف کا ایک مسئلہ ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے۔ کہ دنیا میں صرف ایک ہی ذات موجود ہے اور وہ خدا کی ذات ہے۔ [5] تحفہ کی جمع۔ [6] کسی بات کو محسوس کرنے اور معلوم کرنے کی قوتیں۔ [7] ظاہر۔ [8] ہمیشہ رہنے والی خدا کی ذات۔ [9] سب کا سرچشمہ اور سب کا آخری ٹھکانا۔ [10] ترقی کے درجے۔

پنجاب کی بدقسمتی سے جلد ہی یہ صوبہ کنڈر گارٹن کے استادوں کے فقدان[1] سے اس نعمتِ عظمےٰ سے محروم ہو گیا مگر جرمنی میں آج تمام ملک میں کنڈر گارٹن اسکولوں کا ایک جال پھیلا ہوا ہے اور ہر ایک جرمن بچے کے لئے کنڈر گارٹن اسکول کی حاضری لازمی قرار دی گئی ہے۔

یہ مختصراً اُس ملک کی تعلیم کی تاریخ ہے جو اب تک تعلیم کو ترقی دینے اور فنِ تعلیم میں جدت طرازی اور اختراع[2] کرنے میں اوروں سے کبھی پیچھے نہ رہا۔ اور اب بھی باوجود اقتصادی کمزوری اور قومی شیرازہ بکھرنے کے تعلیمی منازل[3] ہمت اور استقلال کے ساتھ تیزی سے طے کر رہا ہے۔

آج جرمنی میں ۴۹ یونیورسٹیاں ہیں جن میں ۱۱۳۰۶۵۷ طلبا ہیں اور کُل آبادی ۶۲ ½ ملین یا قریباً ۶ کروڑ ہے۔ اِدھر ہندوستان میں ۱۴ کروڑ آبادی کے لئے ۱۸ یونیورسٹیاں ہیں۔ تمام ریاستوں کی تعداد جو جمہوریت میں شامل ہیں ۲۶ ہے۔ اور محکمۂ تعلیم ہندوستان کی طرح سے ریاستوں ہی کو تفویض[4] کر دیا ہے۔ اور ہر ایک ریاست نے اپنی ضروریات کے مطابق نظامِ تعلیم میں لازمی ردوبدل کر لیا ہے۔

سر سی۔ وی رامن جب ولایت گئے تو سر رتھر فورڈ سے جامعۂ[5] کیمبرج میں ملے۔ وہاں سر سی۔ وی رامن کو دیکھ کر بیحد حیرت ہوئی کہ ڈاکٹر رتھر فورڈ کے شاگرد بیشتر اوقات کرکٹ یا ٹینس میں گزار دیتے ہیں اور صرف چند گھنٹے علمی تحقیقات میں صرف کرتے ہیں۔ اِس کے مقابلے میں جرمن طلبہ بیحد جفاکش اور محنت کے عادی ہوتے ہیں۔ یونیورسٹیوں میں موسم سرما میں صبح سات بجے سے رات کے نو بجے تک برابر کام جاری رہتا ہے۔

جنگ عظیم کے قبل جرمن قوم میں ایک ڈسپلن اور ضبط تھا جو اُن کا جزوِ زندگی بن گیا۔ یہی وہ تنظیم تھی جس نے عساکرِ[6] متحدہ کا چار سال تک جان توڑ مقابلہ کیا۔ اور اسی فوجی ضبط کی ادنےٰ مثال ہنڈن برگ لائن تھی۔ جنرل ہنڈن برگ کے عساکر سے زیادہ ضبط اور ڈسپلن کا نمونہ تمام یورپ پیش نہیں کر سکتا۔ دورانِ سفر میں ہر سپاہی کے لئے ٹرین کے وقت مقرر۔ گاڑی میں نشست کا نمبر معین۔ جس ہوٹل میں جا کر ٹھیرنا ہے اُس کا تعین۔ جس رستے سے گزرنا ہے اُس کا تعین۔ غرض کہ ہر سپاہی کا کھانا پینا سونا لیٹنا سب متعین تھا۔ گویا وہ ایک انسان نہ تھا جو اپنی قوتِ ارادی سے کام لیکر آزادانہ روش اختیار کر سکتا ہو بلکہ ایک مشین تھا جس کی کل اُس کے افسرِ بالا کے ہاتھ میں تھی۔

ایسے ضبط کو فوجی ڈسپلن کہا جاتا ہے۔ اور ماہرین تعلیم کی نظر میں ایسے ڈسپلن کی کوئی وقعت نہیں۔ تعلیم کا اصلی مقصد اور معلم کا فرض طلبہ کی قوتِ ارادی کو صحیح راستے پر ڈالنا ہے نہ کہ بیجا اور بے موقعہ دست اندازی سے اسکو سلب[1] کر دینا یہ ممکن ہے کہ اس وقت جبکہ بچہ اسکول میں ہے معلم اُس کے ہر غلط اقدام[2] کی تصحیح کر دے۔ مگر جب بچہ سنِ شعور کو پہنچا اور اُس نے دنیا میں قدم رکھا تو اُس وقت تک اگر اُس نے اپنی قوتِ ارادی۔ جذبات اور وجدانیات کو ایک صحیح سانچے میں نہیں ڈھال لیا تو اُسے ہر قدم پر لغزشیں اور ہر منزل پر ٹھوکریں کھانی ہونگی۔ اِسی وجہ سے معلم کا فرض ہے کہ طلبہ کی قوتِ ارادی کو ایک حد تک کام کرنے کی آزادی دیدے۔

جرمن قوم جو ضبط کی اتنی دلدادہ۔ اور آج سے نہیں ابدالآباد[3] سے۔ آپ لوتھر کے وعظ اُٹھا کر پڑھیں جن میں اُس نے گھریلو یا خانگی ضبط کی تلقین[4] کی ہوئی ہے۔ اور اس بات پر زور دیا ہے کہ کس طرح ہم گھروں میں ضبط قائم کر کے ملک اور قوم کی خدمت کر سکتے ہیں۔ مگر یہی قوم جب اپنے بچوں کو درسگاہوں میں بھیجتی ہے تو اُنہیں ہر طرح کھلے بندوں پھرنے کی اجازت دے دیتی ہے۔ کہ جہاں جی چاہے رہیں اور جہاں جی چاہے پڑھیں۔ اسی آزادی کا دلفریب نتیجہ یہ ہے کہ طلبہ ایک حقیقی شیدائیِ علم کی طرح ایک جامعہ سے دوسری اور دوسری سے تیسری میں منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ ایسی درسگاہ میں جا کر ٹک جاتے ہیں جہاں اُن کو اُن کے بلند ترین مطمحِ نظر[5] کے حصول میں سہولتیں بہم پہنچا سکے۔ دراصل یہی جامعتوں[6] کی یگانگت اور طرزِ تعلیم کی ہمہ گیری[7] ہے جس نے جرمن تمدن کو یورپ کے لئے طرۂ[8] امتیاز بنا دیا۔

ہندوستان میں ایک جامعہ سے دوسری میں منتقل ہونا حیرت

---

۱ کمی۔ ۲ ایجاد۔ ۳ منزلیں اور درجے۔ ۴ سپرد ۵ جامعہ یونیورسٹی۔ کُلیّۃ کالج۔ ۶ جمع عسکر۔ فوجیں عساکر متحدہ برطانیہ۔ اٹلی اور فرانس کی فوجیں۔

۱ چھین لینا۔ ۲ اقدام۔ آگے بڑھنا پیش قدمی کرنا۔ ۳ ہمیشہ ہمیشہ ۴ تعلیم۔ ۵ مقصد۔ ۶ یونیورسٹیوں۔ ۷ سب تک پہنچنا۔ ۸ مراد۔ باعثِ فخر۔

وشبہ کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے اور جو مشکلات ہندوستانی طالب علم کو یونیورسٹی بدلنے میں پیش آتی ہیں وہ ناگفتہ[1] بہ ہیں۔ اور اگر غور سے دیکھا جائے تو یہاں ایک جامعہ سے دوسری میں جانا بے مصرف سا بھی معلوم ہوتا ہے۔ جب ایک بے روح اور غیر دلچسپ یکسانیت ملک کی تمام درسگاہوں پر مسلط ہو رہی ہے تو طالبعلم کو کیا غرض ہے کہ اپنے خویش و اقارب گھر بار کو چھوڑ چھاڑ ایک جامعہ سے دوسری میں بھٹکتا پھرتا رہے۔ لارڈ ارون نے جامعہ دہلی کے جلسۂ تقسیم اسناد[2] میں جو تقریر کی تھی اُس کے الفاظ بھی اُنہیں مطالبات[3] کے مترادف[4] ہیں۔

"ہر ہندوستانی یونیورسٹی کو چاہیئے کہ کم سے کم ایک فن میں لازمی تعلیمی آسائشوں کو مہیا کرے تاکہ ملک کے تمام طلبہ اُس فن کی تکمیل وہاں کر سکیں۔ اِس طریق سے بمبئی فنِ تجارت یا مہندسی[5] میں۔ کلکتہ فنونِ لطیفہ[6] میں بہت کچھ ملک اور قوم کی خدمت کر سکتے ہیں۔ اور اُس امدادِ باہمی کا اعلیٰ نمونہ پیش کر سکتے ہیں۔ جو مغربی درسگاہوں میں پائی جاتی ہے"

اِنہیں الفاظ کا مصداق آج جرمن یونیورسٹیاں بنی ہوئی ہیں۔ اور آج کسی جرمن یونیورسٹی میں ایسا طالب علم اِکا دُکا ہی نکلیگا جس نے دو تین یونیورسٹیوں کے اساتذہ[7] کے سامنے زانوئے ادب طے نہ کیا ہو۔

ایک خاص نقص جس کو جرمن ماہرینِ تعلیم دور کرنے کی کوشش کر رہے ہیں یہ ہے کہ اُن نوواردوں کے لئے جو نئے نئے یونیورسٹی میں داخل ہوتے ہیں۔ ایسی ہدایات اور رہنمائی کا انتظام کیا جائے جس سے اُنہیں زندگی کی صحیح شاہراہ پر چلنے کی عادت پڑ جائے۔ جرمن یونیورسٹیوں میں فی الحال نہ تو کوئی مکمل جماعت بندی اور نہ مرتب لکچروں کا سلسلہ ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں ہونہار مگر ناتجربہ کار بچوں کا بھٹکتے پھرنا اور تضیع اوقات کرنا قوم کے مفاد کے لئے کتنا مضر ہے؟ آج جرمنی کے لئے یہ سوال اتنا ضروری نہیں کیونکہ وہاں تعلیم یافتہ طبقے میں بیکاری کی شکایت روز بروز بڑھ رہی ہے اِس سوال پر کبھی ٹھنڈے دل سے غور نہیں کیا گیا۔ ایک مرتبہ ناظم تعلیمات صوبۂ متحدہ نے بیکاری کمیٹی کے سامنے شہادت دیتے ہوئے ایک تجویز پیش کی تھی جو معقول اور قابلِ عمل معلوم ہوتی ہے۔

"تمام صوبے میں مختلف شہروں میں ایسے ادارے[1] کھولے جائیں جو والدین اور سرپرستوں کو مختلف علوم و فنون۔ سرکاری محکمہ جات۔ اور مغربی درسگاہوں۔ کی بابت صحیح معلومات بہم پہنچا سکیں۔ اور نوجوانوں کو پیشے کے انتخاب میں ایسا مشورہ دے سکیں جو پختہ کاری اور تجربکار نتیجہ ہو۔ اِن سب اداروں کا مرکز لکھنؤ میں ہو"

اِس تجویز کو پیش کئے ہوئے چند سال گزر گئے ہیں۔ مگر ہنوز اِس پر کوئی عمل درآمد نہیں کیا گیا۔ اور اِس کا نتیجہ یہ ہے کہ بے روزگاروں کے اعداد[2] ترقی پر ہیں۔ اور قوم کا وہ بیش قیمت سرمایہ یعنی اس کے نوجوان عنصر کا قیمتی وقت بے مصرف گزرتا جا رہا ہے۔

جامعہ میں معاشرتی زندگی:۔ انگریزی یونیورسٹیوں کی طرح جرمن درسگاہوں میں طلبہ کی رہایش[3] کی کوئی پابندیاں نہیں ہیں۔ دار الاقامہ کی رہایش لازمی نہیں اور طلبہ بالعموم[4] یونیورسٹی سے باہر ایسے گھروں میں رہتے ہیں جو کنبہ دار تو ہوتے ہیں مگر عسرت[5] یا کسی دوسری وجہ سے طلبہ کو رہایش اور کھانا مہیا کر دیتے ہیں۔ ایسے خاندانوں کی فہرست یونیورسٹی کے ایک افسر کے پاس جس کو پیڈل کہتے ہیں بنی ہوئی رہتی ہے۔ یہ افسر طلبہ کو مناسب جائے رہائش بہم پہنچانے میں مدد دیتا ہے۔ یہ سہولت انگریزی یونیورسٹیوں میں میسّر نہیں ہے۔ جامعہ میں کئی طرح کی انجمنیں ہوتی ہیں۔ ایک تو وہ جو مختلف مضامین کے نام سے موسوم ہیں:-

انجمنِ سائنس۔ انجمنِ ادب۔ انجمنِ تاریخ۔ دوسری صرف سوشیل انجمنیں۔

اِن انجمنوں کے اجلاس ہر ہفتے منعقد ہوتے ہیں۔ ایک ممبر کسی مضمون یا تقریر سے جلسے کا افتتاح[6] کرتا ہے۔ اس کے بعد لکھے ترنم سے کچھ گیت گائے جاتے ہیں اور یہ رائف کے لائحہ عمل[7] کا

---

[1] کہنے کے لائق نہیں۔ [2] ڈگریاں تقسیم کرنے کا سالانہ جلسہ۔ [3] مطلب کی جمع۔ [4] ہم معنیٰ ایک جیسے۔ [5] انجنیری۔ [6] شاعری موسیقی۔ تصویرکشی وغیرہ کے فن فنون لطیفہ کہلاتے ہیں۔ [7] اساتذہ۔ استادان

[1] ادارہ۔ انسٹی ٹیوشن۔ [2] گنتی۔ [3] رہائش "سکونت" میں کثرتِ استعمال سے صحیح ہوگیا ہے (ایڈیٹر)۔ [4] عام طور پر۔ [5] تنگدستی [6] آغاز ابتدا۔ [7] پروگرام

آغاز ہوتا ہے جس کا انجام جو کی شراب کے جام پر جام لنڈھانے پر ہوتا ہے۔ نغمہ و سرود کے بعد مزاحیہ تقریریں شروع ہوتی ہیں اور جلسہ صبح کے تین یا چار بجے تک رہتا ہے۔ اس کا بیشتر حصہ مے نوشی اور خوش گپیوں میں گذرتا ہے۔ تعجب خیز امر یہ ہے کہ بحث و مباحثہ کی انجمنیں اک سرے سے ناپید ہیں۔ یہی انجمنیں انگریزی درسگاہوں کا ایک ضروری جزو ہیں اور پارلیمنٹ کے بڑے بڑے مقرر بالعموم وہی لوگ ہوتے ہیں جو جامعہ آکسفورڈ یا کیمبرج میں یونین کے صدر یا معتمد[۲] رہ چکے ہیں۔

مگر اہل جرمنی کا رویہ اس بارے میں بالکل مختلف ہے۔ ایک دفعہ ایک پروفیسر نے جوں توں کر کے ایک انجمن مباحثہ منعقد کر ہی دی۔ اُس میں بڑے بڑے اساتذہ نے حصہ لیا۔ اور رات بھر بحث ہوتی رہی۔ ہر شخص منطقی دلائل سے اپنے نظریئے کو پیش کرتا تھا اس کے مخالفین اُس سے بڑھ چڑھ کر دلیلیں پیش کرتے۔ حتّٰے کہ وقت ختم ہوگیا اور مناظرہ کرنیوالے کسی منطقی نتیجہ پر نہ پہنچ سکے۔ اس پر اُن انجمنوں کو جامعہ کی معاشرتی زندگی سے بالکل خارج کردیا گیا۔ فی الحقیقت ہندوستان کے مذہبی مناظروں کے سلسلۂ لامتناہی[۳] سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ مباحثے میں بجائے تحقیق اور منصف مزاجی کے طرفین اپنی بات منوانے پر تُلے ہوتے ہیں اور بجائے منطق کے جذباتی پہلو زیادہ نمایاں ہوتا ہے پھر بھی ایک تعلیمی درسگاہ میں انجمن مباحثہ کی موجودگی اُن تمام قوتوں کو بھڑکاتی ہے جو آجکل کی جمہوریت کونسلوں اور مجلسوں میں قابل تحسین سمجھی جاتی ہیں اور اس ایک پہلو سے اُن کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔

خصوصیات:۔ جرمن کی درسگاہوں میں چند ایک خصوصیات ہیں جو دوسری جگہ اگرچہ بالکل مفقود نہیں مگر پھر بھی بہت کم درجے پر پائی جاتی ہیں۔ مثلاً پروفیسر کا لقب جرمنی میں ایک وقار اور شان رکھتا ہے اور اُس کی ادنےٰ مثال یہ ہے کہ پروفیسر لوگ کبھی کسی سرکاری منصب یا عہدہ کے لئے درخواست نہیں دیتے۔ یہ اُن کے لئے باعث ننگ ہے۔ عہدے اور ملازمتیں ہمیشہ پیش کی جاتی ہیں۔ تاکہ وہ انہیں شرفِ قبولیت بخشیں۔

[۱] فریقین۔ [۲] سیکرٹری۔ [۳] سلسلۂ لامتناہی: نہ ختم ہونے والا سلسلہ۔ [۴] کرگس۔

موجودہ وزیر تعلیم ہٹّا بیکر ہیں جو کسی زمانے میں عربی کے پروفیسر رہ چکے ہیں۔

خیر گرو کی سنگتی[۱] میں تو شاید جرمنی قدیم ہندوستان سے بازی نہ لے جاسکے۔ مگر اہل ملک کی جدتِ[۲] طبع نے ایک نئی بات نکالی جو کم از کم آجتک تعلیمی دنیا میں عدیم المثال[۳] ہے۔ اس کی دھندلی سی شکل ہمیں امریکن درسگاہوں میں نظر آتی ہے جہاں ہر طالب العلم اپنے زورِ بازو سے کما کر اپنے تعلیمی اخراجات کا کفیل[۴] ہو جاتا ہے۔ مگر جرمنی نے جو غریب طلبہ کی امداد کے لئے نئی تجویز نکالی ہے یہ وہی ہے جس کے ذریعہ سے ریفینین نے گذشتہ صدی میں غریب کسانوں کو قرض کے ناقابل برداشت بوجھ سے رہائی دلائی اور جو آجکل انجمن اتحادِ باہمی کے نام سے موسوم ہے۔ ان انجمنوں کے معرضِ[۵] وجود میں آنے کی وجہ جرمنی کا جنگ عظیم کے بعد اقتصادی انحطاط۔ مارک[۶] کی قیمت کا گھٹنا۔ ملک کی تجارتی اور صنعتی و حرفتی ترقی کی روک اور ادائیگی تاوانِ جنگ تھی۔ طلبہ نادار۔ گورنمنٹ غریب۔ اب مدد لیں تو کس سے لیں۔ اسی بیکسی کی حالت میں پہلی تعلیمی انجمن امداد باہمی کی بنیاد ڈریسڈن میں فروری سنہ ۱۹۲۱ء میں ڈالی گئی۔ یہ آج ایک بہت ہی شاندار تحریک بن گئی ہے۔ اور اس کے بیشمار فرائض کی ادائیگی کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ انجمن کی دکانیں طلبہ کی ہر ضروری اشیاء کو مفت بلکہ کم قیمت پر مہیا کرتی ہیں۔ مثلاً بوٹ ۷۵ فیصدی قیمت پر مل سکتے ہیں۔ غریب طلبہ کو کپڑے نصف ہی قیمت پر مل سکتے ہیں۔ ہوٹل میں کھانا ۱۰ فیصدی قیمت پر میسّر آجاتا ہے۔ طلبہ کو دوائیں بہم پہنچانا۔ غریب طالبعلموں کو موسم گرما کی چھٹیوں میں کسی کام پر لگوانا۔ قرض یا وظائف دینے انجمن کی مصروفیتوں میں سے چند ایک ہیں پانچ دارالاقامہ (بورڈنگ ہاؤس) انجمن نے حکومت کی مالی امداد سے بنوائے ہیں تاکہ طلبہ کی رہائش کا سوال بہ آسانی حل ہو جائے۔ مگر سب سے دلچسپ اور مفید خدمت جو انجمن کر رہی ہے۔ یہ ہے کہ پرانے طلبہ سے کتابیں لیکر نادار طلبہ کو بہم پہنچاتی اور ممبران کو ٹائپ مشین مہیا کرتی ہے۔ یہ مشینیں ممبر اپنے گھر لے جاتے ہیں۔ اور ٹائپ کا کام سیکھتے یا اجرت پہ کام کرتے ہیں۔

[۱] خدا کی عبادت۔ [۲] طبیعت کی اُپج۔ [۳] بے مثال۔ [۴] ذمہ دار۔ [۵] قائم ہونے۔ [۶] جرمن کا ایک سکہ۔

انجمن کی فراخدلی اور وسعت نظری میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا - اِس اعلیٰ تنظیم سے نہ صرف آج جرمنی فائدہ اٹھا رہا ہے بلکہ دیگر اقوام بھی اِس فیض سے محروم نہیں ہیں۔ گزشتہ سال انجمن نے ایک سو وظائف چینی طلبہ کے لئے مخصوص کیئے تھے اور تین وظیفے ہندوستانی طلبہ کے لئے۔ ہندوستانی وظائف کے اعلان سب اخبارات میں شائع ہوئے تھے - یہ وظائف میونخ یونیورسٹی کی طرف سے دئے گئے ہیں - اور مفت خوراک اور رہائش کی شکل میں دئے جاتے ہیں۔

تیسری بات یونیورسٹیوں اور صنعت و حرفت کا وہ مضبوط رشتہ ہے جس نے اِن دونوں کو یکجان و دو قالب بنا دیا ہے - اسی رابطے کے بیش قرار نتائج گراف زیپلن - رنگ سازی اور کیمیائی ادویات ہیں - اِسی برتے پر جرمنی نئی سے نئی ایجاد و اختراع کرتا ہے اور اسی پر بس نہیں کرتا بلکہ منڈی میں اپنے آپ کو اسے تجارتی طور پر کامیاب بناتا ہے - جرمنی میں ٹکنیکل ایجادوں کی کثرت کی وجہ یہ ہے کہ اوّل تو صنعت و حرفت کی تعلیم ہی لازمی اور جبریہ قرار دے دی گئی ہے - اس پر صنعتی کمپنیوں اور درسگاہوں کی امداد باہمی سونے پر سہاگے کا کام دے رہی ہے۔ یہی ایک بڑا سبق ہے جو اس ملک کے طریقِ تعلیم سے لیا جا سکتا ہے۔ اِس میں شک نہیں کہ ہندوستانی نظامِ تعلیم محض ادبی اور کتابوں کی اوراق گردانی تک محدود ہے - اہلِ حکومت جنہوں نے موجودہ طرزِ تعلیم کی بنیاد ڈالی - اہلِ دفتر پیدا کرنا چاہتے تھے جو کمپنی بہادر کے منشی خانے کے فرائض سر انجام دیں - وہ اپنے مقاصد میں بالکل کامیاب رہے مگر اس کے ساتھ ہی ہندوستان کی تعلیم پر نادانستہ طور پر وہ ضربِ کاری لگا گئے کہ اس سے پچاس سال تک دشوار معلوم ہوتا ہے۔

نظامِ تعلیم میں اصلاح کا سوال بیکاری کی روز افزوں ترقی سے روز بروز زیادہ اہم ہوتا جاتا ہے - جتنی بیکاری کی کمیٹیاں مختلف صوبجاتی کونسلوں مثلاً بنگال - مدراس - یو-پی - پنجاب وغیرہ نے اس مسئلہ کی تحقیقات کے لئے مقرر کی ہیں سب اس بات پر متفق ہیں کہ تعلیمِ صنعت و حرفت کی طرف بچوں کا رجحان طبع کرایا جائے۔ کمیٹیاں بنیں - اجلاس منعقد ہوئے - شہادتیں لی گئیں - مگر عملاً ہنوز روزِ اوّل والا معاملہ ہے - ابھی وقت ہے کہ رہنمایانِ قوم اِس مسئلے کی اہمیت کو سمجھ لیں - اور بجائے کبوتر کی طرح آنکھیں بند کرنے کے اِس خطرے کا مردانہ وار مقابلہ کریں -

---

غزل

گل و نسریں سے رنگیں تر ہے ذوقِ رنگ و بو میرا
نمو پاتا ہے خوں سے لالہ زارِ آرزو میرا

فروغِ ماہ کی رنگینیاں باطل ہیں اے ساقی!
شرابِ آتشیں سے جگمگاتا ہے سبو میرا

چمن زادوں کے نغمے گونج ہیں میری نواؤں کی
چمن کے ذرّے ذرّے سے جھلکتا ہے لہو میرا

پہنچتا ہے مجھے انوار گاہِ بزمِ انجم تک
نقابِ لالہ و گل میں نہیں چھپتا نمو میرا

وہ عالم ہے کہ گردِ راہ روشن ہے تجلی سے
کہاں لایا ہے عابدؔ مجھ کو ذوقِ جستجو میرا

زندگی

شمع سحر کے دل سے پوچھ۔ حسرتِ محفلِ حیات   نیزۂ غم سے چاک ہے سینۂ ساحلِ حیات
آہ! یہ بیکسی تری۔ رہروِ منزلِ حیات   توڑ گئی قدم ترے۔ قیدِ سلاسلِ حیات
ہے ابھی راہ میں لگی ظلمتِ شامِ زندگی

عشرتِ رنگ و بو کہاں گلکدۂ شباب میں   موجۂ آبجو کہاں چشمۂ آفتاب میں 〃
مستِ تصورِ نشاط۔ گم ہے کہاں کے خواب میں   جامِ ہوس کو دور پھینک زہر ہے اس شراب میں
سلسلۂ الم کو توڑ۔ دامنِ زندگی کو چھوڑ

گوشۂ خامشی میں بھی۔ غم سے نہ مل سکی نجات   عرصۂ زندگی رہا۔ موردِ صد حوادثات
دفترِ رنج و یاس ہے شرحِ کتابِ کائنات   موت کی نیند کے سوا۔ کیا ہے تلافئ حیات
قیدِ الم ہے زندگی۔ دوزخِ غم ہے زندگی

صبح ہے صبحِ نامراد۔ شام ہے شامِ غم فروز   روز ہے روزِ حشر خیز۔ شب ہے شبِ الم فروز
طرزِ فلک جفا طراز۔ دوزِ زمین ستم فروز   دشمنِ خواہشات ہے۔ زندگیٔ عدم فروز
آہ! اسیرِ زندگی۔ زخمیٔ تیرِ زندگی

شاکیٔ بادِ غم رہی۔ شمعِ حریمِ آرزو   محرمِ تیرگی رہی۔ چشمِ کلیمِ آرزو 〃
قلب میں تیر تار ہا نشترِ بیمِ آرزو   رُوح سے دور ہی رہی موجِ نسیمِ آرزو
بابِ اثر نہ مل سکا۔ غنچۂ دل نہ کھل سکا

نوکِ سنانِ یاس سے۔ زخمِ ہوس سیا تو کیا   تلخیٔ صبر کا پہاڑ۔ سر پہ اُٹھا لیا تو کیا 〃 〃
رُوح کی خواہشات پر جبر اگر کیا تو کیا   دوزخِ غم خرید کر۔ آہ! کوئی جیا تو کیا 〃 〃
سلسلۂ الم کو توڑ۔ دامنِ زندگی کو چھوڑ

روشؔ صدیقی

ننّھا سوداگر

ابھی اُس کی عمر ہی کیا تھی - یہ تو وہ زمانہ تھا جب معمولی سی کڑی بات اُس کے نازک دل کی گہرائیوں میں اُتر کر اِس درجہ بانغ ہوجاتی تھی کہ دم دلاسا مطلق کارآمد ثابت نہ ہوتا تھا - اُسے ابھی سے اسکول میں داخل کرادیا گیا - اُس کے دوسرے بھائی وہیں تعلیم پاتے تھے ۔

وہ ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتا تھا جس کی مالی حالت کچھ زیادہ طمانیت بخش نہ تھی، مگر تعلیم حاصل کرنا ضروری تھا - آمدنی کی کمی کی وجہ سے خواہ اُس کو ہزار طرح کی تکلیفات کا سامنا ہی کیوں نہ کرنا پڑے - مگر اپنے بھائی بہنوں کی طرح اُس کا مدرسہ جانا اور قدیم خاندانی روایات کو برقرار رکھنا ازبس ضروری تھا -

دو باتیں اُس کے دل سے کبھی محو نہیں ہوسکتی تھیں - ایک یہ کہ گھر میں روپیہ اسقدر کافی نہ تھا کہ خود وہ اور اُس کے بھائی بہن وقت پر کوئی ضروری کتاب خرید سکیں - دوسرے یہ کہ جبتک کپڑوں میں کثافت کی وجہ سے تعفن نہ پیدا ہو جائے اور وہ جگہ جگہ سے چاک ہوکر خود ہی زبانِ حال سے فریاد نہ کرنے لگیں اُن کا تن سے جدا ہونا دشوار تھا -

وہ دن اُس کی یاد سے کبھی نہیں مٹ سکتا جب وہ ایک ایسا کوٹ زیبِ بدن کرکے اسکول بھیجا گیا تھا جس میں اُس کی بڑی بہن کی چین اور بیل سے ٹکی ہوئی آستین لگی ہوئی تھی - اور پیر میں بھدی ایڑی کے زنانے جوتے تھے - اس سے کیا کہ وہ اُس وقت بالکل ہی بچہ تھا، اور مدرسہ میں لڑکوں کی تعداد بھی زیادہ نہ تھی - فرض کیجئے وہ بڑا ہوتا اور لڑکوں کی تعداد بھی کافی ہوتی، لیکن پھر بھی یہ باتیں اسی سہولت کے ساتھ عمل میں آسکتی تھیں - وہ محسوس کرتا کہ بعض لڑکے اُسکو اِس حالت میں دیکھ چکے ہیں -

حامد ہی کو لیجئے - ظہیر کی طرح کلائی مروڑ دینے کی اُس کو مطلق پروا نہ تھی بلکہ وہ اِس سے زیادہ تکلیف دہ اندازِ بیان سے واقف تھا - رنج کے معاملات جن کا اُس سے کچھ تعلق نہیں ہوتا تھا وہ اِس قدر کھود کھود کر دریافت کرتا تھا کہ پناہ بخدا - پھر یہ نہیں کہ ایک بات کا جواب پاکر خاموش ہوجائے - یہ اُس کی خصلت میں داخل نہ تھا، بلکہ بات میں بات نکالنا اُس کی عادت بن چکی تھی - وہ طرح طرح سے حرف حرف پر اُس کی زبان پکڑتا اور اُس کو زک پہنچانے کی کوشش کرتا تھا - حامد نے اُس کو کبھی سیدھی طرح مخاطب نہیں کیا ہمیشہ "تو" ہی سے بات کی - اُس کے لباس، کتاب، قلم دوات غرضیکہ ہر ایک چیز پر اعتراض کیا -

وہ ان تمام باتوں کا مجرم اپنے ماں باپ کو گردانتا تھا - جو اُس وقت اُس کو ایسی شرمناک زندگی بسر کرنے پر مجبور کر رہے تھے اپنے باپ اور پیاری ماں پر روپیہ کی کمی کا الزام اِس طرح رکھتے ہوئے اُس کا بھولا سا معصوم چہرہ شرم سے سرخ ہوگیا - اُس کو تکلیف ہوئی کہ کیوں ایسے گندے خیالات اُس کے دل میں پیدا ہوئے - مگر اِس کو کیا کیا جائے اُس کی موجودہ خستہ حالت اُسے مجبور کرتی تھی - کہ وہ اپنی .... خیالی باتوں پر قائم رہے -

اِس قسم کے خیالات جب اُس کے دماغ میں پیدا ہوتے تو وہ اپنی آنکھیں زور سے بھینچ لیا کرتا تھا تاکہ وہ کسی طرح نکل جائیں - لیکن اِس میں اُس کو کبھی کامیابی نہیں ہوئی یہی وجہ تھی کہ کبھی کبھی اُس کو حامد کی باتوں کا بھی یقین ہوجایا کرتا تھا، کہ وہ اُس کے متعلق جو یہ کہتا کہ "اُس کی زندگی چوہے سے بھی بدتر ہے - اور اُس کو چاہیئے کہ کسی تالاب میں ڈوب کر مرجائے" صحیح ہے -

اُس نے اکثر خودکشی کا ارادہ کیا، مگر ہر مرتبہ موت طرح طرح کی خونخوار صورتیں بنا بنا کر اُس کے سامنے آموجود ہوئی - اور ایسا معلوم ہوتا کہ گویا کوئی عقب سے ہاتھ پکڑ کر ایسا کرنے سے منع کرتا ہے - اُس کو ہر مرتبہ اپنی بزدلی کا احساس ہوتا اور اب وہ اپنے سے نفرت کرنے لگا تھا -

وہ اسکول سے واپس آرہا تھا آج خلافِ معمول اُس کے سبق کو جلد چھٹی مِل گئی تھی - وہ خوش تھا - چلتے چلتے اُس نے اپنی جیب کو ٹٹولا - اُسی جیب کو جس کے متعلق اُسے یقین تھا کہ اِس میں کوئی سوراخ نہیں ہے - کئی روز ہوئے اُس نے دو پیسے اِس میں ڈالے تھے - اُن

کا دل بیٹھ گیا۔ اُس پر ایک خوف ساطاری ہونا شروع ہوا جیب میں اتنا بڑا سوراخ موجود تھا کہ پیسے ڈالے چلے جاؤ اور پتہ نہ چلے۔ وہ رُک گیا۔ بدن تھر تھرا رہا تھا۔ چاہتا تھا کہ اسکول واپس جائے اور راستے میں پیسوں کو تلاش کرے۔ اِس ارادے سے وہ دو ایک قدم پیچھے ہٹا۔ لیکن اگر نہ ملے؟ .... اُس کا بڑا بھائی محمود ابھی مدرسہ ہی میں ہوگا، اُس کے پاس ایک آدھ آنہ ضرور نکل آئیگا۔ کاش وہ ایک ہی پیسہ دیدے۔ اِس پیسے کی مونگ پھلی شام کے ناشتے کے واسطے کافی ہوگی۔ مگر یہ محمود کے ساتھ بے انصافی ہے۔ ممکن ہے وہ یکے پر گھر جانا پسند کرے۔ دو تین پیسے صرف ایک ہی آدمی کا کرایہ ادا کر سکتے ہیں۔

مگر کیا یہ سچ ہے کہ اُس کے دونوں پیسے گر گئے؟ ایک امیدِ موہوم کے سہارے پر اُس نے دوبارہ نہایت احتیاط کے ساتھ اپنی جیبوں کی تلاشی لی۔ دنیا اُسکو پھر اپنی اصلی حالت پر نظر آنے لگی۔ دونوں پیسے جیب میں موجود تھے۔ یہی نہیں بلکہ اب اُسے وہ چونی بھی یاد آئی جو اُس نے اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر جمع کی تھی، اور حفاظت کے خیال سے اوپر کی جیب میں رکھ چھوڑی تھی۔

ایک چونی! سولہ پیسے پورے چار آنے!!! یہ یقیناً ایک کار آمد رقم تھی۔ مدرسے میں ایسے لڑکے بھی تھے جنہیں اسقدر رقم روزانہ خرچ کے لئے ملا کرتی تھی۔ نویں یا دسویں کلاس کے لڑکوں سے مطلب نہیں۔ خود اُس کے ہم جماعت روز اسقدر پیسے خرچ کر ڈالتے تھے۔

کلیم اللہ، جس کو بگاڑ کر لڑکوں نے "کلا" کر دیا تھا، اُس کے ساتھ پڑھتا تھا۔ وہ چوک کے ایک بڑے ہوٹل کے منیجر کا لڑکا تھا۔ اس کی جیب میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی کھانے کی مزیدار چیز ہوا کرتی تھی

اُس نے دو ایک مرتبہ کوشش بھی کی کہ کسی طرح کلیم سے دوستی پیدا کرے۔ مگر اُس نے التفات نہ کیا۔ کلیم سے دوستی پیدا کرنے کی ہر کوشش پر اُس کا ضمیر اُسے ملامت کرتا تھا۔ اِس لئے کہ اُس کا ارادہ طمع پر مبنی تھا کہ شاید کسی روز اُسے بھی ناشتے میں شریک ہونے کی دعوت دیجائے۔ اب وہ خوش تھا کہ اس "پیام محبت" کو یوں ٹھکرا دیا گیا۔

(۲)

وہ یہی سوچتا سوچتا چوک سے بہت آگے نکل آیا۔ سامنے کباڑیوں کی دوکانیں تھیں۔ اُس نے خیال کیا کہ کچھ دیر انہیں میں تلاش کیا جائے۔ اپنے والد سے کبھی سنا تھا کہ بانکی پور والے خدا بخش مرحوم کو اسی طرح ایک پنساری کی دوکان پر کتابوں کے ڈھیر میں سے چند نہایت بیش قیمت کتابیں جن میں قلمی نسخے بھی تھے، ہاتھ لگ گئی تھیں۔ کیا تعجب ہے کہ اُسے بھی کوئی قیمتی کتاب تلاش سے ملجائے۔ کیا اخبارات آئے دن اِس قسم کے قصّوں سے پُر نہیں ہوتے کہ کسی شخص نے کوئی کتاب نہایت معمولی قیمت پر خرید کرنے کے بعد اُسے فروخت کرکے اپنی زندگی بنائی ہو۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اُس کی سوئی ہوئی قسمت بھی اسیطرح نہ جاگ اُٹھے، اور اُس کو بھی گودڑی میں لعل نہ مل جائے۔

شہر کا یہ حصّہ "منڈی" کہلاتا تھا۔ ہر قسم کی چیزیں بکفایت فروخت ہوتی تھیں۔ ایک دوکان پر پھلوں کا انبار تھا تو سامنے مٹھائی والے کی دوکان تھی اور دوسری جانب ایک بسکٹ والا طرح طرح کے بسکٹ سامنے رکھے بیٹھا تھا۔ یہاں داخل ہوتے ہی اُس کا دماغ اُن تمام اشیاء کی خوشبوؤں سے مہک اُٹھا۔ وہ اپنے دل پر جبر کرکے ہر ایک کے سامنے سے گزر رہا تھا، مگر بسکٹ والے کی دوکان کا منظر کچھ اسقدر دلآویز تھا۔ کہ وہ اپنے دل میں پیسوں کا حساب کرنے پر مجبور ہوگیا۔ طرح طرح کے ہندوستانی اور ولایتی بسکٹوں کے ٹکڑے مختلف ڈھیروں میں لگے ہوئے تھے۔ سوچتے سوچتے، آخرکار اُس نے جیب سے اکنی نکالکر دوکاندار کے سامنے ڈالدی، اور دو تین ڈھیروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سب میں سے تھوڑا تھوڑا دینے کو کہا۔ دوکاندار نے سودا تول کر اُس کے حوالے کیا،

یہاں سے فارغ ہونے کے بعد وہ اُدھر روانہ ہوا جہاں "عقلمند اور خوش قسمت" انسانوں کے واسطے "خزانہائے بے بہا" جمع تھے۔ بھیڑ اسقدر زیادہ تھی کہ اس کو ذرا سا فاصلہ طے کرنے میں سخت دقت کا سامنا ہوا۔ مگر آخرکار وہ کسی نہ کسی طرح لوگوں کی ٹانگوں کے بیچ میں سے نکلتا ہوا کباڑیوں کی دوکانوں تک پہنچ ہی گیا۔ یہاں ایک دوکان پر ایک ادھیڑ عمر کا آدمی کتابوں کے ایک ڈھیر کے درمیان خونخوار بھیڑیے کے مانند بیٹھا ہوا تھا۔

طب، فقہ، اور فلسفہ کی کتابیں، اور پرانے پھٹے ہوئے ناول ہر چہار طرف ایک بے ترتیبی کے عالم میں پڑے ہوئے تھے مگر وہ اِن چیزوں کی قدر کرنے سے ہنوز قاصر تھا۔ اُس کی

نگاہیں صرف اسکولی کتابوں کی تلاش کرتی تھیں۔ ایک زحمت کا سامنا تھا۔ کوئی اور ہوتا تو ہمت ہار جاتا، مگر وہ حددرجہ ثابت قدمی کے ساتھ اپنے کام میں مصروف رہا۔ اور آخر اپنی محنت کا پھل حاصل کر کے چھوڑا۔ وہ اس علم اور فن کے "انبار" سے ایک کتاب لے کر برآمد ہوا۔ جغرافیہ کا نسخہ اُس کے نزدیک نہایت بیش قیمت تھا بجز اس کے کہ سرورق پر نہایت بھونڈے خط میں کتاب کے پہلے مالک کا نام تحریر تھا، اور کوئی بات ایسی نہ تھی جو اُس کے بالکل نئے ہونے پر دلالت نہ کرتی ہو۔ کتب فروش نے اُس کی قیمت ڈیڑھ آنہ بتائی۔ اور قبل اس کے کہ دوکاندار اپنے الفاظ سے پھر جانیکا قصد بھی کرے، قیمت اُس کے سامنے ڈال دی گئی۔ مگر اب اُس کے دل میں ایک خوف پیدا ہونا شروع ہوا کہ مبادا کتاب کے بیچ سے چند صفحات غائب ہوں۔ اُس کے ہاتھ کتاب کی ورق گردانی کے وقت کانپ رہے تھے، مگر یہ خوف بے بنیاد ثابت ہوا۔ کتاب ہر طرح سے مکمل تھی۔

وہ روانگی کا قصد کرتے ہوئے کتابوں پر ایک آخری نظر ڈال رہا تھا کہ اتفاقاً ایک گوشے میں چکرورتی کے "علم الحساب" پر نظر جا پڑی۔ وہ بے قرار ہو کر اُس کی طرف بڑھا۔ ڈیڑھ آنے پیسے اور دیکر کتاب بغل میں دبا چلتا ہوا کہ اگر زیادہ دیر کھڑا رہا تو بقیہ دو پیسے بھی کتاب والے کی نذر ہو جائیں گے۔

یکوں کے اڈے کے مقابل سے گزرتے ہوئے اُس کا دل ڈانواں ڈول ہو چلا تھا کہ بقیہ دو پیسے بھی صرف کر ڈالے، اور گھر آرام سے پہنچے۔ لیکن بالآخر یہ سوچکر کہ اگر ان خریدی ہوئی کتابوں کے فروخت کرنے کی کوئی صورت نہ نکل سکی تو وہ بالکل کھک ہو جائیگا، اُس نے یہ خیال ترک کر دیا۔

چوک پہنچکر جس دوکان میں وہ داخل ہوا اُس کا مالک ایک کریہہ المنظر (بدشکل) انسان تھا۔ اُس نے کتابوں کو دیکھنے کے واسطے اپنی عینک ناک کے بالکل آخری حصّہ پر رکھ لی اور نہایت بے پروائی کے ساتھ کتابوں کے سرورق کا ملاحظہ کیا۔ اُس کے چہرے کا انداز بد سے بدتر ہوتا جا رہا تھا۔ اور آخر کار بغیر کچھ کہے سُنے کتابیں واپس کر دیں۔ غریب کا دل بیٹھ گیا، اور وہ سوچنے لگا کہ غالباً یہ دونوں کسی کام کی نہ تھیں جبکہ "چکرورتی" تک دوکاندار کی توجہ اپنی طرف منعطف نہ کرا سکی۔

وہ سڑک پر، کتابوں کو سینے سے لگائے ہوئے پریشان کھڑا تھا۔ سامنے ایک دوسرے کتب فروش کی دوکان تھی، وہ اندر جانا چاہتا تھا۔ مگر یہ خیال کر کے رُک جاتا کہ شاید کتاب والے نے اُسے ہم پیشہ کی دوکان میں جاتے اور جوں کا توں واپس آتے دیکھا ہو، مگر پھر اُس نے ہمت سے کام لیا، اور ایک جست میں اندر داخل ہو گیا۔ ایک لالہ جی ٹاٹ کے ٹکڑے پر آلتی پالتی مارے اس شان سے بیٹھے تھے کہ گویا ایرانی قالین پر جلوہ فرما ہیں۔ گرمی کے سبب بدن پر بجز ایک میلی دھوتی کے، جو جگہ جگہ سے چاک نظر آتی تھی، اور کچھ نہ تھا۔ پیٹ کی جسامت، اُن کی عادات، اور چربی پیدا کرنے والی غذا کے استعمال کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ اس نووارد کو دیکھ کر اُنہوں نے اپنی نگاہ اوپر اٹھائی اور کتابوں کو لالچی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے لینے کو ہاتھ بڑھا دیا۔ ہر طرح سے بغور معائنہ کرنے کے بعد، لالہ جی نے ایک ہاتھ سے اپنا منڈا ہوا سر کھجلاتے ہوئے اور اُن چند بالوں کو جو حجام کی دستبرد سے بچا لئے گئے تھے دو انگلیوں سے مروڑتے ہوئے دونوں کتابوں کی قیمت بعینہٖ وہی تجویز کی جتنے کی وہ خریدی گئی تھیں۔ اُس وقت یہ ننھا سوداگر بالکل ہراساں نہ ہوا۔ اُس کو یہ معلوم ہو گیا کہ اس کی پسند بُری نہ تھی۔ کتابیں فروخت کیجا سکتی ہیں۔ زیادہ دام اس کو نہ ملیں، نہ سہی۔ وہ یہاں واپس آ کر اپنی خرچ کی ہوئی رقم پھر حاصل کر سکتا تھا۔

وہ سڑک پر نہایت احتیاط کے ساتھ ادھر اُدھر دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ تین آنے کی آواز اب تک اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے واسطے اُس کو یہ خیال پیدا ہو گیا کہ اِس سے زائد ان کی قیمت وصول ہونا دشوار ہے۔ مگر اُس کے دل نے گوارا نہ کیا کہ اس قدر زحمت اٹھانے کے بعد ان سے کچھ فائدہ حاصل نہ کیا جائے۔ اس کے علاوہ سامنے والے نکڑ پر ابھی حال ہی میں دو نوجوانوں نے ایک نئی دوکان کھولی تھی۔ سُنا جاتا تھا کہ بشرطِ پسند وہ ہر کتاب کو نصف قیمت پر خرید لیتے تھے۔ ممکن ہے اُس کو وہاں کامیابی ہو، اور اگر وہ ناکامیاب رہا تو تین آنے کہیں نہیں گئے۔

وہ دوکان پر پہنچا تو ایک بھیڑ لگی تھی۔ ہر طبقہ کے لوگوں کا اژدہام تھا۔ بعض اگر کتابیں فروخت کر رہے تھے تو چند خریدنے کی غرض سے کھڑے تھے۔ دونوں حصّہ دار باری باری سے ہر ایک شخص سے مخاطب ہو رہے تھے۔ آخر کار اُس کا نمبر بھی آیا

اُن میں سے ایک آدمی ننھّے سوداگر کی طرف متوجہ ہوا - اور آنے کی وجہ دریافت کی - جواب میں اُس نے دونوں کتابیں آگے بڑھا دیں - دوکان والے نے ایک سرسری نظر اُن پر ڈالی اور کہا - "چکروَرتی مجھ کو نہیں چاہیئے - اِس دوسری کتاب کی قیمت تین روپیہ ہے - میں ڈیڑھ میں خرید لونگا "

(۳)

وہ پھر باہر سڑک پر کھڑا تھا - ڈیڑھ روپیہ اُس کے کوٹ کی اوپر والی جیب میں بحفاظت موجود تھا - اور مکان صرف پانچ منٹ کے راستے پر - یہ سب اُس کی حکمت عملی کا نتیجہ تھا -

پہلے تو اُس نے یہ خیال کیا کہ دوبارہ "منڈی میں جاکر اپنی قسمت آزمائی کرے - مگر اب اُسے بھوک معلوم ہو رہی تھی - ساڑھے چار بج رہے تھے - اگر جلدی نہ کیگئی تو محمود اس سے قبل مکان پہنچ جائیگا - اور پھر اُس کو وقت کا سامنا ہوگا -

وہ اپنے خیالات میں غرق ہو رہا تھا کہ کاش یہ چوبیس آنے، چوبیس روپیہ ہوتے، کہ وہ اپنی ماں کے گلے میں باہیں ڈال کر اُس کو پیار کرتا - اور تمام روپیہ اُس کی گود میں ڈالدیتا - اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اُس وقت وہ کن الفاظ میں اس کو مخاطب کریگی - مگر اس میں شک نہیں کہ اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو جائینگی - اور وہ اس کو گود میں اٹھاکر گلے سے لگالیگی -

مگر یکایک اُس کے خیالات کا سلسلہ منقطع ہوگیا - اب اُس کے کاندھے پر کسی نے تحکمانہ انداز سے اپنا ہاتھ رکھدیا - یہ ظہیر تھا، جو اُس کو چاروں طرف گھما گھماکر سر سے پیر تک بغور دیکھ رہا تھا - غصّے کے آثار اُس کے چہرے سے نمودار تھے - اُس نے اپنا بدصورت چہرہ اُس کے منہ کے قریب لاکر کہا "حضرت! یہ آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟ اور اِس وقت!"

سوال اِس پیرایہ میں کیا گیا تھا گویا اُس کو کسی جگہ کچھ کرنے کا حق حاصل نہ تھا - اور ممکن ہے کہ اسکول کے باہر ظہیر سے دوچار ہو جانا اسکول کے قوانین کے خلاف ہو - وہ یہ سب باتیں دفعتاً بھول گیا - ظہیر کی انگلیاں اُس کی کمزور گردن میں گڑی جارہی تھیں اُسے غصّہ آرہا تھا کہ ظہیر کو اِس طرح سرِ راہ کسی کو پکڑ لینے اور فضول سوالات کی بوچھاڑ کرنے کا کیا حق حاصل ہے؟

"کیا بھوک میں زبان چبا گئے - جو نہیں بولتے ہو؟" یہ اُس کا دوسرا سوال تھا -

اُس نے مڑ کر دیکھا - سڑک اُس وقت فی الجملہ خالی تھی - جو کچھ راہ گیر تھے بھی اُن کو اُس کی مطلق پروا نہیں تھی کہ یہ کیا ہو رہا ہے - عرصہ ہوا جب وہ اِس بات کا تجربہ کر چکا تھا کہ دنیا کو مظلوم کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں ہوتی -

سڑک پر، اور اسکول میں مار کھانے میں کچھ زیادہ فرق نہ تھا - یہ ایسی سزائیں تھیں جن کی اپیل نہیں ہوسکتی تھی - اور کسی سوال کی گنجائش نہ تھی - "جس کی لاٹھی اُس کی بھینس" والا مضمون تھا -

یکایک اُس کے دماغ میں اپنی کامیابی کا خیال دوڑ گیا - اور اُس کے غصّہ میں اضافہ ہوگیا - کہ یہ بے عقل ایک کامیاب "سوداگر" کے ساتھ اِس قسم کا سلوک روا رکھ رہا تھا - خوف اُس کے دل سے دور ہوگیا - اُس نے مڑ کر ایک گھونسا ظہیر کی ناک پر رسید کیا - حملہ اِس قدر اچانک تھا کہ ظہیر کے مضبوط ہاتھ سے اُس کی گردن چھوٹ گئی - اور وہ اُس کے پنجہ سے نکل بھاگا - مگر تھوڑی دور چلکر اُس نے اپنی رفتار سست کردی - اور دیکھنے لگا کہ ابھی تعقب شروع ہوا یا نہیں -

ظہیر کو مار کر اُس نے مدرسے کے "پاک" قوانین کی خلاف ورزی کی تھی - اپنے سے بڑے پر ہاتھ اُٹھانے کا اُس کو حفاظتِ خود اختیاری میں بھی حق حاصل نہ تھا - اُس کو اپنے بھاگنے اور بزدلی کا اظہار کرنے پر شرم محسوس ہو رہی تھی - اِس لئے اُس نے اپنی رفتار سُست کردی - اور جوتے کے فیتے باندھنے کے بہانے عرصہ تک وہاں کھڑا رہا - آخر کار ظہیر اُس کے سر پر آگیا -

تیزی کے ساتھ وہ اُس کی گرفت سے نکل گیا - مگر بھاگا نہیں - اُس نے سامنے کھڑے ہوکر مقابلہ کیا - کچھ دیر کے واسطے ظہیر کا دماغ چکرا گیا - اُس کو تعجب تھا کہ اتنے سے ننّھے کو اُس پر ہاتھ اُٹھانے کی جرأت کیونکر ہوئی - اب اُس نے اپنی پوری طاقت سے اُسکو مارنا شروع کیا - چھوٹے لڑکے کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا - مگر اِس پر بھی اُس کے دماغ میں ایک خیال تھا - اور وہ ظہیر کو مارنے کا جس کی تعمیل اُس کے کمزور ہاتھ اب بخوبی نہ کرسکتے تھے -

اب وہ بالکل بے دم ہوچکا تھا - یہ تمام آدمی اُس کے گرد کیوں جمع تھے؟ سڑک پر معمولی شریر لڑکوں کی طرح لڑنا سخت حیا سوز تھا -

اُس نے اپنے رہے سہے حواس کو جمع کیا۔ کوئی ہمدرد انسان اُس کو ہاتھ پکڑ کر اُٹھا رہا تھا، اور رومال سے ہونٹوں پر لگا ہوا خون پونچھ رہا تھا۔ سامنے ظہیر ایک شریف صورت شخص کی گرفت میں کھڑا تھا۔ اُس کا چہرہ حد سے زیادہ زرد تھا۔ "تم کو شرم نہیں آتی کہ اپنے سے چھوٹے لڑکے کو اس طرح مار رہے ہو۔ جی میں تو آتا ہے کہ تم کو بھی اسی طرح درست کیا جائے"۔ یہ الفاظ جو اُس کو سنائی دئیے اور وہ اُٹھ بیٹھا۔

لوگوں نے ہمدردی کا اظہار کیا۔ ظہیر رہائی کی ہر ممکن کوشش کر رہا تھا، مگر وہ ایسے چنگل میں پھنسا کہ نکلنا دشوار تھا۔ تین برس سے وہ اسی طرح اپنے سے چھوٹوں کو زدوکوب کیا کرتا تھا، اور ہر شخص نے ہمیشہ اُس کا ساتھ دیا۔ مگر آج یہ نئی بات تھی کہ تمام آدمی اُس کے خلاف نظر آرہے تھے۔ اور اُس کے مقابلے میں ایک کمزور کی حمایت کی جارہی تھی۔ آخر کار اُس کو ایک دھکا دیکر نکال دیا گیا۔

کوئی شخص ہاتھ میں چند روپے دیتے ہوئے ملائمت کے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ "یہ روپے تمہاری نئی کتابیں خریدنے کے لئے ہیں۔ تمہاری کتابیں بالکل بیکار ہوگئی ہیں"۔

وہ فوراً بیہ انداز سے اُٹھا، اور چلنے کا ارادہ کیا۔ بھیڑ نے نکلنے کے لئے اُسکو جگہ دیدی۔ وہ بہت خوش معلوم ہوتا تھا۔ لیکن اُسکی آنکھیں آنسوؤں سے پُر تھیں۔ اور رو رہا تھا۔ وہ شرم سے پسینے پسینے ہو گیا تھا۔ ایک گوشے میں جاکر اُس نے آنسو پوچھنے چاہے، مگر وہ کسی طرح بند نہ ہوتے تھے۔

آخر ایسے روپیہ سے کسی کو کیا حاصل جب اُس کا نتیجہ رونے کی صورت میں نکلے۔ وہ بہت سوچتا تھا مگر وجہ سمجھ میں نہ آتی تھی کہ وہ کیوں رو رہا ہے۔ مینہ برس کر کھل جانے کے بعد جس طرح تمام کائنات میں ایک سکون پیدا ہوجاتا ہے۔ اسی طرح اُس نے بھی اپنے آپ کو مطمئن پایا۔ وہ ایک سبزی والے کی دوکان کے نزدیک کھڑا ہوا تھا۔ دو قدم آگے بڑھکر دوکاندار سے کہنے لگا "کیوں جی! آٹھ آنے کی تو بہت سی مٹھائی آتی ہوگی؟"

(ماخوذ)

حفیظ الرحمٰن

غزل

سُندر مُکھ ہے پریم ٹھکانا

میں نے سکھی جگ میں پہچانا ہے سُکھ ناشی لگن لگانا
دور سکھی ری نین ملانا سنگ پیا کے کبھی نہ جانا

سُندر مکھ ہے پریم ٹھکانا

ڈال میں جب تک پھول لگا ہے تازہ تازہ ہرا بھرا ہے
جب وہ کسی کے جی کو بھایا ڈال سے ٹوٹا ہاتھ میں آیا

ہاتھ کے لگتے ہی مُرجھایا

اپنے من میں ہر ہر گانا پریم بھجن سے جی بہلانا
سنگ پیا کے کبھی نہ جانا ہے سُکھ ناشی لگن لگانا

سُندر مکھ ہے پریم ٹھکانا

مقبول احمد پوری

پہلا جنتی

افرادِ مجلس

ہیوم .... قدیم یونان کا ایک فلسفی۔ عمر ساڑھے تین سو سال۔
کیٹی .... ہیوم کی بیوی
نینسی .... ہیوم کی ہفت سالہ لڑکی۔
ولسن .... ہیوم کا لڑکا۔
نعمان .... ہیوم کا بیوقوف شاگرد۔
چند دیگر شاگرد
عزرائیل .... رُوح قبض کرنے والا فرشتہ۔

وقت .... صبح آٹھ بجے
مقام .... ہیوم کے مطالعہ کا کمرہ

سین

ایک بڑی میز کے چاروں طرف چند کرسیاں بچھی ہوئی ہیں۔ میز کے ایک طرف کرۂ ارض اور مقیاس الساعت[1] رکھا ہے۔ دوسری طرف چند کتابیں رکھی ہیں۔ ہیوم درمیانی کرسی پر بیٹھا مطالعۂ کتب میں مشغول ہے۔

ہیوم۔ (کتاب کے اوراق پلٹتے ہوئے) سخت تعجب ہے! سمجھ میں نہیں آتا کہ اس معمولی سے فقرے کا مطلب شاگردوں کو کیا بتاؤں۔ کامل ایک ہفتہ غور وخوض کرتے گزر گیا۔ لیکن ہنوز روزِ اول ہے۔ کیا میں اپنے شاگردوں سے کہہ دوں کہ وہ ایک ایسا اسرار ہے جس تک ادراکِ انسانی کی رسائی نہیں؟ لیکن نہیں۔ یہ مناسب نہیں ہے۔ میں ایک مشہور فلسفی ہوں۔ مورخ ہوں۔ سائنسداں ہوں۔ میری دماغی اور ذہنی قابلیت کا سکہ لوگوں کے دلوں پر بیٹھ چکا ہے۔ اس طرح میرے دقار میں فرق آجائیگا۔

نعمان اندر داخل ہوتا ہے۔ اُس کے ایک ہاتھ میں ٹوپی ہے اور دوسرے میں قینچی۔

ہیوم۔ (اپنے خیال میں محو ہے) اگر یہ مناسب نہیں ہے تو کیا میں

---

[1] زمانۂ قدیم میں وقت معلوم کرنے کا ایک آلہ ہوتا تھا۔ جس کے نچلے حصہ میں پانی اور اوپر کے حصہ میں ایک مقررہ مقدار اناج کی ڈالدی جاتی تھی جس کا ایک دانہ خاص وقفہ سے ایک سوراخ کی راہ پانی میں گرتا جاتا تھا۔ تمام اناج ختم ہونے پر ایک گھنٹہ شمار ہوتا تھا۔

اصلی حقیقت اُن کے گوش گزار کردوں؟ کیا اُن سے صاف کہہ دوں کہ شہر بابل کی فصیل پر کھُدے ہوئے فقرے میں "عالم غیر فانی" سے مراد وہ مقام ہے جہاں ہم سب کو مرنے کے بعد جانا ہے۔ اور اُس عالم کے دو مختلف حصّے "جنّت" اور "دوزخ" کے نام سے موسوم ہیں۔ آسمانی مخلوق ملائکہ کہلاتی ہے۔ ہم سب کو پیدا کرنے والی ہستی کا نام خدا ہے؟

نعمان۔ آپ میری بات نہیں سنیں گے؟ مجھے ایک روپیہ کی سخت ضرورت ہے۔

ہیوم۔ (توجہ نہیں کرتا) لیکن یہ بھی ناممکن ہے مجھے کامیابی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ میں اپنے غیر فانی نظریے اور زبردست استدلال سے لوگوں کی عقلوں پر پردہ ڈال چکا ہوں۔ انہیں گمراہ کر چکا ہوں اپنے فلسفہ کی تعلیم سے سب کے یہ بات ذہن نشین کر چکا ہوں کہ خدا کوئی چیز نہیں ہے۔ وہ جنّت و دوزخ اور ملائکہ کے بھی منکر ہو چکے ہیں۔ اب بالکل متضاد بیان سُن کر وہ ضرور مجھ کو خبطی سمجھیں گے۔

نعمان۔ بہت دیر ہو گئی۔ (عاجزی سے) مجھے ایک روپیہ دیدو۔

ہیوم۔ بیوقوف نعمان جا۔ مجھے پریشان نہ کر۔

نعمان۔ تم مجھے بیوقوف تصوّر کرتے ہو۔ لیکن یاد رکھو۔ میری ہستی تمہارے لئے کارآمد ثابت ہوگی۔ لاؤ اسی بات پر ایک روپیہ دلواؤ۔

ہیوم۔ (ہنس کر) اچھّا تم روپیہ لیکر کیا کروگے؟

نعمان۔ میں اپنے ناشتے کے لئے تھوڑے سے آلو کچھ مچھلیاں اور چند تیتر خریدونگا اور ایک پتیلی بھی مول لونگا تاکہ وہ سب چیزیں پکا سکوں۔

ہیوم۔ تمہارے ہاتھ میں قینچی کیوں رہتی ہے۔

نعمان۔ میں نہیں بتاؤں گا۔ ورنہ تم اُن کو مار ڈالوگے۔ روپیہ دلواؤ۔

ہیوم۔ کن کو مار ڈالونگا؟

نعمان۔ میں نہیں بتاتا۔ مجھے روپیہ دو۔

ہیوم۔ دو روپیہ لے لو۔ دونوں باتیں بتادو۔

نعمان۔ نہیں صرف ایک روپیہ دیدو۔

ہیوم۔ اچھا چار روپیہ لے لو اور بتادو۔

نعمان۔ لاؤ۔ (روپے لیکر)۔ سنو۔ روزانہ رات کو ماہی گیر ساحل دریا پر جال ڈال دیتے ہیں۔ تاکہ رات کے سکون میں مچھلیاں جال میں پھنس جائیں لیکن خدا کے مقدس فرشتے رات کو زمین پر اُترتے ہیں۔ اور جب منہ دھونے کے لئے پانی میں ہاتھ ڈالتے ہیں تو وہ بھی مچھلیوں کے ساتھ قید ہو جاتے ہیں۔ ماہی گیروں کے جاگنے سے پہلے میں جال کی ڈوریاں کاٹ دیتا ہوں۔ اور فرشتے آزاد ہو کر آسمان کی طرف پرواز کر جاتے ہیں۔ چنانچہ اِس وقت بھی یہی کارِ خیر انجام دیکر آ رہا ہوں۔ اور آج تو فرشتوں کے سردار نے بہت پُر زور الفاظ میں میرا شکریہ ادا کیا تھا۔

ہیوم (قہقہہ لگا کر) بے وقوف آدمی۔

ایک فرشتہ اندر داخل ہوتا ہے تمام کمرہ منور ہو جاتا ہے۔

ہیوم۔ تم کون ہو؟

فرشتہ۔ میں ایک آسمانی فرشتہ ہوں۔ اور میرا نام عزرائیل ہے۔

ہیوم۔ تم کس مقصد سے آئے ہو؟۔

عزرائیل۔ تمہیں ایک پیغام دینے۔

ہیوم۔ کس کا پیغام؟ اور کیسا پیغام؟۔

عزرائیل۔ خدا کا پیغام۔ یعنی یہ کہ ایک گھنٹہ کے اندر اندر تمہاری روح تمہارے قالب سے نکل جائیگی۔

عزرائیل ایک مٹھی بھر اناج "مقیاس الساعت" میں ڈال دیتا ہے۔

عزرائیل۔ جب اناج کا آخری دانہ پانی میں ڈوب جائیگا تو تم مر جاؤ گے۔

ہیوم۔ لیکن یہ تو بتاؤ کہ میری رُوح کہاں جائیگی؟

عزرائیل۔ دوزخ کے سب سے زیادہ بھیانک اور تاریک حصّے میں۔

ہیوم۔ کس جُرم میں؟

عزرائیل۔ تمہارا جُرم یہ ہے کہ تم تین سو سال سے اس قسم کی تعلیم دیتے رہے ہو۔ جس سے تمام لوگ گمراہ ہو گئے ہیں۔ اور ہو رہے ہیں۔ آج دنیا میں ہر متنفس خدا کے وجود کا منکر ہے۔ تین سو سال سے کوئی شخص جنّت میں داخل نہیں ہوا۔

کوثر و تسنیم کے حوضوں پر کائی جم گئی ہے۔ کیونکہ اِن کو استعمال کرنے والا کوئی نہیں۔ درختوں میں پھل اور میوے لگتے ہیں لیکن سُوکھ کر جھڑ جاتے ہیں۔ اُنہیں کھانے والا کوئی نہیں۔ درخت کے آگے جنگلی پودے اور جھاڑیاں اُگ آئی ہیں۔ کواڑوں کی کنڈیاں وغیرہ زنگ آلود ہو گئیں ہیں۔ کیونکہ دروازے تین سو سال سے نہیں کھُلے۔ تمام فرشتے کاہل اور سُست ہو گئے ہیں اور اس وقت بھی بعض جمائیاں اور انگڑائیاں لے رہے ہیں۔ کیونکہ جنت میں کوئی شخص نہیں جس کی وہ خدمت کریں۔ لیکن اے فانی انسان! یاد رکھ کہ اِن تمام باتوں کے باوجود خدا کی خدائی میں کوئی فرق نہیں آسکتا۔

ہیوم۔ لیکن میں تو خدا کا منکر نہیں ہوں۔ میرا تو جنت و دوزخ اور ملائکہ پر بھی ایمان ہے۔

عزرائیل۔ یہ سب درست ہے لیکن دوسروں کو تم نے صراطِ مستقیم سے گمراہ کر دیا ہے۔

ہیوم۔ لیکن اگر میں صدقِ دل سے توبہ کروں تو کیا عذابِ الٰہی سے بچ جاؤں گا؟

عزرائیل۔ ہاں یہ ممکن ہے۔ خدا رحیم ہے۔ لیکن ایک شرط ہے۔

ہیوم۔ (چونک کر) ایک شرط!! جلد بتاؤ وہ شرط کیا ہے؟

(مقیاس الساعت کو گھورتے ہوئے) آہ! وقت گزرتا جا رہا ہے۔ جلدی کرو۔ جلدی شرط بیان کرو۔

عزرائیل۔ سنو! اگر تم توبہ کے ساتھ ساتھ تمام دنیا میں سے صرف ایک ایسا شخص تلاش کر لو جو خدا کے وجود کا صدقِ دل سے معتقد ہو تو تمہاری رُوح جنت میں جا سکتی ہے۔ ورنہ نہیں۔ اور یہ واضح رہے کہ یہ کلمات میرے نہیں ہیں بلکہ خدا کا ارشاد ہے وہ اپنے گنہگار بندوں کو بخشنے کے لئے ہر وقت تیار ہے۔ اور اگر تم نے ایسا آدمی تلاش کر لیا تو تم ہی وہ خوش نصیب شخص ہو گے جو حضرت آدم کے بعد "پہلا جنتی" کہلاؤ گے۔

نعمان کمرے سے باہر چلا جاتا ہے۔

ہیوم (مایوسی کے لہجہ میں) اچھا میں کوشش کروں گا۔

عزرائیل غائب ہو جاتا ہے۔

ہیوم۔ افسوس میں نے اپنے ہاتھوں اپنا نقصان کیا...... لیکن اس اظہارِ تاسف کی ضرورت نہیں۔ میرا وقت بہت قیمتی ہے

شاگرد میرے انتظار میں باہر کھڑے ہیں۔ اِن میں سے یقیناً کوئی نہ کوئی ایسا بھی ہو گا جو میرے دلائل کو اچھی طرح نہ سمجھا ہو۔ اور ابھی تک خدا کے وجود پر اعتبار رکھتا ہو۔

گھنٹی بجاتا ہے۔ شاگرد آجاتے ہیں۔ نعمان بھی اُن کے ساتھ ہے۔ سب بیٹھ جاتے ہیں۔

ہیوم خاموش کھڑا ہے۔

ایک شاگرد۔ معلوم ہوتا ہے۔ آج ہمارے استاد کی طبیعت خراب ہے۔ بہت پریشان معلوم ہوتے ہیں۔

نعمان۔ ہاں۔ مجھ کو پریشانی کی وجہ معلوم ہے۔

دوسرا شاگرد۔ اچھا بتاؤ۔

نعمان۔ ایک روپیہ دلواؤ۔

سب شاگرد ہنس پڑتے ہیں۔

ہیوم۔ (بہت زور کے لہجہ میں) خاموش!............ میرے عزیز طالبعلمو! کیا تم میں سے کوئی بتا سکتا ہے کہ خدا کون ہے۔

ایک شاگرد۔ خدا کوئی شے نہیں۔

دوسرا شاگرد۔ متقدمین کے خیال کے مطابق ایک مفروضہ ہستی جس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا۔

تیسرا شاگرد۔ لیکن ہمیں اِن باتوں پر یقین نہیں ہے

چوتھا شاگرد۔ اور نہ ہم یقین کر سکتے ہیں۔

ہیوم۔ اگر تم میں سے کوئی اُس کے وجود کا ذرا بھی معتقد ہے۔ تو اقرار کرے۔ میں ناراض نہیں بلکہ خوش ہوں گا۔

سب شاگرد۔ (یک زبان ہو کر) نہیں جناب ہرگز نہیں۔ اور ہم آپ کے شکر گزار ہیں کہ آپ نے اپنے علم سے ہمیں اِس قابل بنا دیا ہے۔ کہ آج دنیا کا کوئی عالم استدلال سے ہمارے اعتقادات نہیں بدل سکتا۔

ہیوم کے چہرے پر زردی چھا جاتی ہے کچھ دیر خاموش رہتا ہے۔ لیکن وقت کے ضائع ہونے کے خیال سے چونک پڑتا ہے۔

ہیوم۔ کیا تم میں سے کوئی اُس شخص کو بھی جانتا ہے جس سے گزشتہ ہفتہ میری بحث ہوئی تھی۔ خدا کے وجود کا مسئلہ ہی زیرِ بحث تھا۔ اور وہ شخص خدا کے وجود کا معتقد تھا۔ تم سمجھے۔

ایک شاگرد۔ ہاں۔ اُسے میں جانتا ہوں۔ لیکن اُس ہفتہ کی بحث

سے اُس کے عقاید بھی تبدیل گئے۔ اب وہ ہمارا ہی ہم خیال ہو گیا ہے۔

ہیوم (کچھ دیر خاموش رہ کر) افسوس عزیز طالبعلمو! مَیں نے تمام دنیا کو دھوکا دیا۔ اور تمہیں بھی ایک عرصہ سے گمراہ کر رکھا ہے۔ درحقیقت اِس دنیا کا اور اِس میں رہنے والی مخلوق کا پیدا کرنیوالا خدا ہی ہے۔ جو ہمارے مرنے کے بعد ہماری روحوں کو ہمارے اعمال کے مطابق جنّت و دوزخ میں بھیج دیگا۔ اور ہمارے اعمال لکھنے کے لئے فرشتے مقرر ہیں۔

ایک شاگرد۔ (اپنے ایک ساتھی سے) معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہمارے استاد کے دماغ کا توازن بگڑ گیا ہے۔

دوسرا شاگرد۔ ہاں معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ بہت بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں۔

نُعمان۔ مجھے اِس کی وجہ معلوم ہے۔ ایک روپیہ دو تو ابھی بتادوں۔

ہیوم۔ تمہاری سمجھ میں آیا یا نہیں۔ (کچھ جواب نہ پاکر) اچھا تم سب چلے جاؤ۔ میری طبیعت خراب ہے۔

تمام شاگرد چلے جاتے ہیں۔ ہیوم ایک آہ سرد کھینچتا ہے پھر اپنی بیوی کو بلانے کی خاطر گھنٹی بجاتا ہے۔

ہیوم۔ (عالمِ خیال میں) عموماً عورتیں بہت ناقص العقل ہوتی ہیں۔ ممکن ہے وہ ابھی تک خدا کی معتقد ہو۔

کیٹی۔ (اندر داخل ہوکر) ابھی چائے تیار نہیں ہوئی۔ ذرا توقف کیجئے۔

ہیوم۔ مجھے چائے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے یہ بتاؤ کہ خدا کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟

کیٹی۔ مبارک ہو کہ تمہاری محنت رائیگاں نہیں گئی۔ بہت عرصہ غور و فکر کرنے کے بعد مَیں اِس نتیجے پر پہنچی ہوں۔ کہ دراصل خدا کا کوئی وجود نہیں۔ پہلے جو وقت مَیں عبادت میں گزارتی تھی اب پرندوں اور کیاریوں کی دیکھ بھال میں صرف کرتی ہوں......

ہیوم۔ (قطع کلام کرکے) اچھا تم چلی جاؤ اور ولسن کو بھیج دو۔

کیٹی چلی جاتی ہے اور تھوڑی دیر بعد ولسن اندر داخل ہوتا ہے۔

ولسن۔ اباجان۔ مجھے اپنے دوستوں کے ساتھ تماشے میں جانا ہے۔ آج آپ کے ساتھ باغ نہیں جاؤنگا۔

ہیوم۔ اچھا مت جانا۔ لیکن یہ بتاؤ کہ اب خدا کے متعلق تمہارا کیا عقیدہ ہے؟

ولسن۔ آپ شاید میرا امتحان لینا چاہتے ہیں۔ لیکن اب جبکہ تمام دنیا آپ کے علم سے فائدہ اُٹھا رہی ہے تو مَیں کس طرح جاہل رہ سکتا ہوں۔ مرتے دم تک مَیں ایسی کسی چیز کے وجود کا معتقد نہیں ہو سکتا جو نظر نہ آتی ہو۔

ہیوم۔ اچھا تم جاؤ اور نینسی کو بھیج دو۔ (اصل میں نینسی سات سال کی بچّی ہے میری باتوں کا اُس کے دل پر بالکل اثر نہ ہوا ہوگا۔

ولسن نینسی کو بھیج دیتا ہے۔ چھوٹی بچّی ہنستی ہوئی آکر اپنے باپ کی ٹانگوں سے لپٹ جاتی ہے۔

ہیوم اُسے گود میں اُٹھا لیتا ہے اور کہتا ہے۔

ہیوم۔ پیاری نینسی! خدا کسے کہتے ہیں؟

نینسی۔ اباجان! پہلے تو مَیں جانتی تھی کہ وہ ہمارا آسمانی باپ ہے لیکن ایک دفعہ آپ نے بتایا تھا کہ وہ ایک کھلونا ہوتا ہے اُس سے افریقہ کی بیوقوف لڑکیاں کھیلتی ہیں۔ مجھے یقین تو نہ آتا لیکن جب امی جان اور آکا بائی نے بھی ویسا ہی کہا۔ تو مجھے اعتبار آگیا کہ خدا نام ہے ایک پتھر کے کھلونے کا جس سے چھوٹی بچیاں کھیلتی ہیں.........

ہیوم نینسی کو بھی بھیج دیتا ہے۔ نُعمان اندر داخل ہوتا ہے۔

نُعمان۔ میرے محترم استاد کیا حال ہے؟ اگر تم کو صبح کے چار روپوں کا رنج ہے تو مَیں واپس کئے دیتا ہوں۔ مجھے تو صرف ایک روپیہ کی ضرورت تھی۔

ہیوم کچھ دیر خاموش رہتا ہے۔ اچانک کامیابی کی ایک لہر اُس کے چہرے پر دوڑتی ہے۔ منہ سُرخ ہو جاتا ہے۔

ہیوم (کھسیانی ہنسی کے ساتھ) میرے بیوقوف نُعمان! خدا کے متعلق تمہارا کیا عقیدہ ہے۔

نُعمان۔ حکیم جٖنفنس کا خیال ہے کہ نیم کی کونپلیں فسادِ خون میں مفید ہیں۔

ہیوم۔ (مقیاس الساعت کو گھورتے ہوئے) ارے ظالم جلدی کر

وقت ضائع ہو رہا ہے .... میرے سوال کا جواب دے۔

نعمان - کل صبح میں گرجا گھر گیا تو یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ بجائے عبادتِ الٰہی کے لوگ تاش کھیل رہے ہیں۔

ہیوم - (روتے ہوئے) ہائے ظالم! .... یہ تو میرے سوال کا .... جواب نہیں ہے .... رحم کر .... ورنہ میری رُوح .... آہ میری رُوح .... دائمی عذاب میں مبتلا ہو جائیگی۔

نعمان - اور دریافت کرنے پر معلوم ہُوا کہ وہ آپ ہی کے فلسفیانہ خیالات کا اثر ہے۔ جو وہ لوگ ....

اناج کا آخری دانہ پانی میں ڈوب جاتا ہے۔ ہیوم لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے۔ دھماکے کی آواز سُن کر تمام شاگرد اور ہیوم کے بیوی بچے اندر آجاتے ہیں۔ ہیوم کے منہ سے ایک سفید دُھواں نکلتا ہے۔ فرشتہ ظاہر ہوتا ہے اور اس دُھوئیں کو اپنی مٹھی میں لیکر غائب ہو جاتا ہے۔

کیٹی - (چلا کر روتے ہوئے) ہائے! میرا عزیز شوہر اس جہاں سے رخصت ہو گیا۔

ایک شاگرد - آج صبح ہی سے اُن کی طبیعت علیل تھی۔

نعمان - اصل واقعہ یہ ہے کہ آج صبح ایک فرشتہ آیا تھا اور ہیوم کو اُس کی موت کا پیغام دے گیا تھا۔ یہ بھی کہہ گیا تھا کہ اگر وہ موت سے پہلے ایک ایسا شخص تلاش کرے جو خدا کے وجود کا معتقد ہو تو اُس کی رُوح جنّت میں جائیگی۔ ورنہ دوزخ میں۔ چنانچہ وہ آخر دم تک اُس شخص کو ڈھونڈنے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔

ایک شاگرد - ناکامیاب کوشش کیوں؟ تم تو اپنے آپ کو خدا کے وجود کا معتقد بتاتے ہو۔

نعمان - ہاں۔ اور میں مُنکر کب ہوا ہوں۔

دوسرا شاگرد - پھر تم نے اس بات کا اقرار ہیوم کے سامنے کیوں نہ کر لیا؟

نعمان - اِس کی وجہ سُننے سے پہلے ایک روپیہ دلواؤ۔

ایک شاگرد فوراً روپیہ دے دیتا ہے

نعمان - (ایک روپیہ لیکر) اصل بات یہ ہے کہ جب فرشتہ پہلی مرتبہ باہر گیا تو دروازے پر میں نے اس سے ملاقات کی۔ اور اُسے یقین دلا دیا تھا کہ ہیوم کو کسی شخص کے تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں صدق دل سے خدا کے وجود کا معتقد ہوں۔ اور اُسے تنبیہ کر دی تھی کہ استاد کی رُوح دوزخ میں نہ جانے پائے۔ چنانچہ فرشتے کے قول کے مطابق حضرت آدم کے بعد ہیوم ہی "پہلا جنّتی" ہے

پردہ گرتا ہے۔

(ماخوذ) فضل حق قریشی

رباعی

یارب وہ کونسا ہے مزاہست وبود میں ۔۔۔ جو دل ہے ذرّے ذرّے کا جوشِ نمود میں
شاخِ شجر کو چیر کے غنچہ عیاں ہوا ۔۔۔ اور مُسکرا کے کھل گیا ذوقِ وجود میں

(ترجمہ از فارسی)

فلسفۂ اشراق

فلسفۂ اشراق یا نوفلاطونیت کی تاریخ بیان کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ فلسفۂ ماقبل کا خلاصہ بیان کر دیا جائے۔ تاکہ ناظرین اوراق کو اُن تغیرات کے سمجھنے میں آسانی ہو جو آئندہ رونما ہوئے اور جن کی بنا پر اِس نئی علمی تحریک یعنی (فلسفۂ اشراق) کی بنیاد قایم ہوئی۔ اور فلسفے کی سرگرمیوں کا مرکز یونان یا ایتھنز سے تبدیل ہو کر سکندریہ (مصر) قرار پا گیا۔

(۱) فلسفۂ ماقبل اشراق پر ایک طایرانہ نگاہ

ہم لکھ چکے ہیں کہ سُقراط سے پہلے یونانی فلسفہ، جیسا کچھ بھی تھا۔ سوفسطائیوں کے ہاتھوں میں بازیچۂ اطفال بن کر رہ گیا تھا، جن کے نزدیک فلسفیانہ غور و فکر کا مقصد صرف یہ تھا کہ عوام پر اپنی قابلیت کا سکہ جمایا جا سکے یا اُن کے قلوب میں ہر شے کے متعلق شکوک پیدا کئے جا سکیں، چنانچہ اِن لوگوں کی بدولت یونان میں لاادریت کی بنیاد پڑی۔ لیکن اِس تحریک کا مقابلہ کرنے کے لئے قدرت نے سُقراط کو پیدا کر دیا۔ جس کی آغوش سے افلاطون جیسا شخص تعلیم پا کر نکلا اور اُس کا شاگرد ارسطو جیسا حکیم ہوا۔ اِن دونوں نے لاادریت کے اثر کو زایل کر دیا۔ لیکن جب ارسطو کے بعد پھر لاادریت کا زور ہوا تو کوئی ارسطو اُس کا مقابلہ کرنے کے لئے میدان میں نہ آیا۔ اگرچہ ارسطو کے بعد فلسفے میں کئی مذاہب پیدا ہو گئے۔ مثلاً لاادریت، ابیقوریت۔ رواقیت اور مجلس جدید لیکن اِن سب میں، لاادریت بہت زبردست تھی۔ کیونکہ اِس مذہب کے مقلدین نے طالیس سے لیکر ارسطو تک تمام فلاسفہ سے خوشہ چینی کی تھی اور جس مذہب میں جو بات مفید مطلب نظر آئی اُسے اختیار کر لیا اور ہر طرح مسلح ہو کر کامیابی کے ساتھ فلسفہ کے قلعہ پر گولہ باری شروع کر دی۔ اُن کے اعتراضات کے سامنے تمام حکمتِ قدیمہ بیکار ہو کر رہ گئی۔ اگرچہ فلاسفہ اُن کے اعتراضات کا جواب دیتے تھے۔ لیکن عوام الناس پر انہی کا اثر غالب تھا، اور اُن کی نظر میں فلسفہ ایک ظنی امر باقی رہ گیا تھا، حالانکہ فلسفے کا مقصد یہ ہے کہ یقین پیدا کرے۔ سوائے فلاسفہ کے عوام کو فلسفیانہ صداقتوں پر مطلق ایمان نہ تھا۔

لیکن سُقراطی فلسفہ کا ایک پہلو ہنوز زندہ تھا۔ یعنی فلسفۂ اخلاق اور فلاسفۂ مابعد مثلاً افلاطون اور زینو وغیرہ نے اِس شعبے کو خاص ترقی دی۔ لہذا لے دے کر فلسفے کا سہارا یہی علم اخلاق رہ گیا تھا اور زینو نے اِس علم کی بنیاد (Common sense) یعنی عامۃ الناس کے تجربہ و مشاہدہ پر رکھی تھی۔ اگرچہ یہ بنیاد مابعد الطبیعات کے لئے مناسب نہیں۔ لیکن اخلاقیات کے لئے موزوں ہو سکتی ہے کیونکہ ہر شخص جانتا ہے کہ چوری کرنا بُری بات ہے۔ سچ بولنا اچھی بات ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

بہرکیف اِس پہلو سے قطع نظر کر کے فلسفے کے جسقدر اہم مسائل تھے۔ سب کے کاندھوں پر شکوک اور شبہات کا انبار لاد دیا گیا اور یہ بات ظاہر ہے کہ بنانا مشکل ہے، بگاڑنا آسان ہے۔ اعتراضات کی ایسی ہوا چلی کہ فلاسفہ ناامید ہو گئے۔ اُنہوں نے دیکھا کہ طالیس نے اِس سوال سے فلسفیانہ غور و فکر کا آغاز کیا تھا، کہ کائنات کا آغاز کس طرح ہوا؟ لیکن آج صدیاں گزر جانے کے بعد بھی کوئی تسلی بخش جواب اِس سوال کا نہیں مل سکا۔ پس اِس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے فلسفے کو ظنیات میں داخل کر دیا۔ "عقل" جب اِس طرح سپر انداز ہو جائے تو خواہ مخواہ ایمانیات کے قلعہ میں پناہ گزین ہونا پڑیگا۔

سکندریہ کے مشرق سے فلسفۂ اشراق کا طلوع

سکندریہ گزشتہ سطور میں فلسفہ کا جو نقشہ پیشِ ناظرین کیا جا چکا ہے۔ اِس کو ملاحظہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکالنا دشوار نہیں ہے کہ فلسفہ اندریں حالات، یونان میں زیادہ دنوں تک قیام نہ کر سکتا تھا۔ جب ایک شے کسی ملک میں مقبول نہ ہو تو وہ ؏

اگر ماند شبے دیگر نمی ماند

کی مصداق ہو جائیگی۔ حالت یہ تھی کہ ہر فیلسوف اور ہر مذہب ادعا میں پیش پیش تھا۔ لیکن بارِ ثبوت دوسروں کے کاندھے پر رکھنا چاہتا

تھا - دعاوی بہت تھے لیکن دلائل کم - سوالات ہر جگہ ملتے تھے۔ لیکن اُن کا حل کہیں دستیاب نہ ہوتا تھا - انسان اپنی عقل و دانش کی بنا پر جسقدر مذاہب قائم کر سکتا ہے اہلِ یونان نے سبھی قایم کر چھوڑے تھے - لیکن ہر جگہ "ہنوز دلی دور است" کا نقشہ نظر آتا تھا - قاعدہ ہے کہ جب کوئی شخص سوال یا شبہ وارد کرتا ہے تو اُس کی وجہ سے عقلا میں تحریکِ معنوی پیدا ہوتی ہے اور اس طرح فلسفے میں نئی نئی راہیں کھلتی ہیں - لیکن اب تو جسقدر سوالات ہو سکتے تھے سب وارد کیے جا چکے تھے بلکہ پُرانی شراب نئی بوتلوں میں بھی ڈالی جا چکی تھی لہٰذا وہی پرانے سوالات، کسی دماغی تحریک کا باعث کس طرح ہوتے؟

جب اربابِ دانش اور فلاسفۂ یونان بذاتِ خود سوالات کا جواب نہ دے سکے تو انہوں نے ترکِ وطن پر کمر باندھی اور اُن مقامات پر مدارس قائم کیے جہاں اس سے پہلے فلسفے کا چرچا مطلق نہ تھا - اس زمانہ میں دو ہی شہر ایسے تھے جہاں فلسفیانہ غور و فکر کو نشو و نما نصیب ہو سکتی تھی - ایک روم دوسرا سکندریہ - ان لوگوں کے لئے بالکل وہ مسائل پرانے اور فرسودہ تھے لیکن رومی اور مصری افراد کے لئے بالکل نئے ثابت ہوئے اور انہوں نے نہایت دلچسپی کے ساتھ اُن میں حصہ لینا شروع کر دیا -

الغرض یونان سے نکلکر فلسفہ، روم اور سکندریہ میں پناہ گزیں ہوا، لیکن رومن فلسفہ، دراصل یونانی فلسفے کی ادنی اور کم سواد تقلید سے آگے نہ بڑھ سکا - بیشک فلسفے نے رومن شاعری، فصاحت و بلاغت، قانون اور ادبیات سب فنون کو رنگیں اور مزین کر دیا لیکن رومیوں کی قومی زندگی میں اُسے کوئی خاص مرتبہ حاصل نہیں ہوا، اور نہ اربابِ ہوش نے اُسے اپنی ایمانیات میں داخل کیا - یہی وجہ ہے کہ وہاں سے کوئی شخص ارسطو کا ہم پلہ پیدا نہیں ہوا -

سکندریہ (مصر) میں معاملہ کچھ اور ہی تھا - مصریوں نے بذاتِ خود غور و فکر کر کے فلسفۂ یونان میں مختلف مذاہب پیدا کئے اور نئے خیالات اور عقاید اس میں داخل کر کے، اپنی جدت طرازی کا ثبوت بہم پہنچایا - فلاطونس، پراقلیس اور فرفوریس جیسے مشہور حکماء نے اُسے چار چاند لگا دئے اور ان کے شاگردوں نے مسیحت کو بھی اپنے رنگ میں رنگیں کر دیا -

سکندریہ کی عظمت کا راز اُس کے مرکزِ تجارت ہونے میں مضمر تھا، دنیا کے مختلف ممالک کے باشندے بسلسلۂ تجارت یہاں آتے تھے - اور .... فلاسفہ اور اُن کی علمی مجلسوں کا حال اپنے ہموطنوں کو سناتے تھے - لہٰذا اِس شہر کو وہی مرتبہ حاصل ہو گیا جو آج آکسفورڈ یا کیمبرج کو حاصل ہے - یہی وجہ ہے کہ سکندریہ تمام شہروں سے گوئے سبقت لے گیا اور اس کی شہرت کے آگے ایتھنز اور روم کی کچھ حقیقت باقی نہ رہی - در و دیوار سے علم و فن کی صدا آنے لگی - گلی کوچوں میں مدرسے قائم ہو گئے گویا حزقیلؑ نے جو کچھ اصفہانؓ کے متعلق لکھا ہے - وہ لفظاً لفظاً سکندریہ پر صادق آ سکتا ہے - مرد درکنار عورتیںؓ بھی فلسفہ اور حکمت کا درس دینے لگیں - لیکن بُرا ہو مذہبی تعصب اور جنون کا !!!

مسیحیوں نے چند روز تک تو فلاسفہ کے ساتھ علمی مناظرے کئے لیکن جب دیکھا کہ ہم عقل، اور دانش کی رُو سے بازی نہیں لیجا سکتے تو اوچھے ہتھیاروں پر اُتر آئے اور وہی کام شروع کر دیا - جو متعصب اور جنونی لوگ کیا کرتے ہیں - بیگناہ افراد کو محض اس جرم میں قتل کیا کہ وہ ایسے علوم پڑھاتے تھے - جن کو پڑھنے کے بعد لوگ مسیحیت کے خلافِ عقل ہونے پر بے شمار دلائل قایم کر سکتے تھے اور اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ یونان اور سکندریہ - انطاکیہ اور روم غرضکہ جہاں جہاں اُن کا بس چلا فلسفے کے مدارس جبراً بند کرا دئے - جس طرح بیگناہ یونانی اور رومی رعایا کو بزور شمشیر عیسائی بنایا اُسی طرح فلسفے کا پڑھنا پڑھانا بھی جرم قرار دیا گیا - حد ہے کہ سکندریہ کا مشہورِ عالم کتب خانہ جس میں پانچ لاکھ سے زیادہ قلمی کتابیں تھیں - اُن لوگوں کے ایماء اور حکم سے آگ کی نذر کر دیا گیا - جن کو آج "اولیا" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے - مسیحیوں نے ہزار سال تک، علم و حکمت کی شمع گل کرنے کے لئے سر توڑ کوشش کی ہزارہا انسانوں کو محض اس جرم میں قتل کر دیا کہ وہ فلسفہ حاصل کرتے تھے یا عقل سے کام لیتے تھے - محکمۂ احتسابؒ کی خونیں تاریخ اس پر شاہد ہے جسٹینینؒ کے فرامین ان لوگوں کی علم دشمنی پر گواہ ہیں - ہائی پیشیاؒ جیسی فرشتہ سیرت، معصوم صفت عالمہ فاضلہ کا پاک خون، جو سکندریہ کی سڑکوں پر دن دہاڑے بہایا گیا - آج بھی اپنی بیگناہی اور سینٹ سرل کے تعصب مذہبی پر باواز بلند گواہی دے رہا ہے - اور اسی طرح ہائی پیشیا کے بہت سے بھائی اور بہنیں سرل جیسے رحمدل اسقفوں، مذہبی پیشواؤں کی

توجہات کا نشانہ ہو گئے۔ برونو، گیلیلیو، کاپرنیکس اور بہت سے حکماء کی رقت انگیز زندگیاں، اُن کی "بے نظیر رحمدلی" پر نوحہ خوانی کر رہی ہیں۔ لیکن اسکندریہ کے کتب خانہ کو نذرِ آتش کرنا ایسا واقعہ ہے جو ان سب پر فوقیت رکھتا ہے یہ وہ نقصانِ عظیم ہے جس کی تلافی ناممکن ہے۔ مورخین لکھتے ہیں کہ کریسی لیس نے ۷۰۵ (سات سو پانچ) تصانیف چھوڑی تھیں۔ آج ایک تصنیف بھی نہیں ملتی۔ اسی طرح ہزارہا نہیں بلکہ پانچ لاکھ سے اوپر کتابیں ہمیشہ کے لئے صفحۂ ہستی سے ناپید ہو گئیں۔ افسوس کہ میں اس جگہ زیادہ تفصیل کے ساتھ نہیں لکھ سکتا۔ مندرجۂ ذیل کتابیں اس مبحث پر کافی روشنی ڈال سکتی ہیں:-

(۱) معرکۂ مذہب و سائنس۔
(۲) یورپ کے ارتقائے ذہنی کی تاریخ۔ مؤلفۂ ڈاکٹر ولیم ڈریپ
(۳) تاریخِ اخلاقِ یورپ۔
(۴) آغاز و عروجِ عقلیت۔ مؤلفۂ ڈاکٹر ہارٹ پول لیکی۔
(۵) تنازع مابینِ سائینس۔ مؤلفۂ ڈاکٹر وہائٹ۔

فی الجملہ صدیوں تک اسکندریہ علم و فن کا مرکز بنا رہا اور تمام دنیا کے مذاہب بھی اپنے خیالات کی اشاعت کرتے رہے جن کی وجہ سے مذہب اور فلسفہ میں اختلاط لازمی تھا۔ یہیں افلاطون کے جانشین لاادریوں کے نام لیوا، یہودی اور مسیحی علما، مصری بُت پرست۔ صوفیائے۔ پاک طینت، مادہ پرست۔ عناصر پرست مدارس قائم کئے ہوئے اپنے اپنے خیالات کی اشاعت میں مصروف تھے۔ گویا اسکندریہ مختلف مذاہب اور خیالات کا اکھاڑا بنا ہوا تھا۔

فائیلو

واضح ہو کہ "الگزینڈرین اسکول" میں وہ تمام حکما شامل ہیں۔ جنہوں نے یونانی لاادریت سے تنگ آ کر "فلسفۂ نو" کی آغوش میں پناہ لی تھی۔ لیکن ہم ان تمام حکماء کو کسی ایک اسکول (مذہب) کا پابند قرار نہیں دے سکتے، ہاں یہ لوگ اسکندریہ کی علمی تحریک میں ضرور مشترک طور سے حصہ لینے والے قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ ان لوگوں میں نوفلاطونی یا اشراقیون سب سے زیادہ نامآور گزرے ہیں۔

فائیلو (یہودی النسل) ان لوگوں کا سرغنہ اور سردار گزرا ہے یہ شخص جناب مسیحؑ سے چند سال پیشتر اسکندریہ میں پیدا ہوا تھا۔ اس کی تعلیم و تربیت اگرچہ یہودی علما اور یہودی مدارس کے ماتحت ہوئی تھی لیکن یونانی فلسفے کا اثر، سکندریہ کی فضا میں سرایت کر چکا تھا۔ چونکہ جوہر قابل تھا اس لئے اُس پر یونانی فلسفے نے اپنا رنگ اچھی طرح جما دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مذہب اور فلسفہ کی آمیزش سے اک نیا مذہب یعنی اشراق پیدا ہو گیا۔ فائیلو سے پہلے، یہودی مذہب اور توریت وغیرہ کی تفسیر و تشریح محض نقلی رنگ میں کی جاتی تھی لیکن فائیلو پہلا شخص ہے جس نے نقل میں عقل کا پیوند لگایا۔ گویا توریت اور فلسفے کو سمو کر ایک معجون مرکب تیار کر دی۔ یہ شخص اگرچہ افلاطون اور مجلس جدیدہ کی تعلیمات سے بیحد متاثر ہوا تھا۔ لیکن پھر بھی اُس کا دماغ مشرقی تھا۔ اور مذہب خصوصاً یہودی مذہب اُس کے رگ و پے میں سرایت کر چکا تھا۔ اس لئے اگر فلسفہ انسان کو تشفی کامل نہیں عطا کر سکتا تو نہ کرے۔ ایک چیز اور بھی ہے جو آڑے آ سکتی ہے۔ وہ "ایمان" ہے جو دراصل عطیۂ الٰہی ہے جس کا مبدا دماغ نہیں بلکہ رحمتِ خداوندی ہے، اور ہیٹنیہ P یعنی پرہیزگاری اور تقویٰ اختیار کرنے سے یہ نعمتِ عالیہ حاصل ہو سکتی ہے۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ فائیلو نے یہ عقیدہ کہ "عقلِ انسانی انتہائی معیارِ صداقت نہیں ہے" افلاطون سے نہیں لیا بلکہ کارنیاڈیز سے، لیکن پھر بھی یہ تخیل دراصل افلاطون ہی کے اس خیال پر مبنی ہے "کہ عقلِ انسانی ذاتِ باریؔ سے واقف نہیں ہو سکتی۔ ہاں اُس کی ہستی کا اثبات کر سکتی ہے"۔ پس اگر عقل خدا کی ماہیت دریافت کرنے سے قاصر ہے۔ تو لامحالہ "انتہائی یا آخری معیارِ صداقت" قرار نہیں دی جا سکتی۔ اسی لئے عقل کے اوپر ایک معیار ہونا چاہیئے۔ اور وہ معیار ایمان ہے۔ ممکن ہے افلاطون نے خوبی یا نیکی کو ایمان کا ہم پلہ قرار دیا ہوا کیونکہ وہ مکالمات میں لکھتا ہے کہ نیکی ایسی شے نہیں جو مدرسہ میں حاصل ہو سکے بلکہ یہ تو ایک نعمتِ ربانی ہے۔ بالفاظِ دیگر۔

این سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

بہرکیف اس نقطہ سے فائیلو کا فلسفہ آئندہ چلکر آلٰہیات کی صورت میں مبتدل ہو جاتا ہے۔ گویا فلاسفی، تھیالوجی بنجاتی ہے۔ خدا، بقول فائیلو "ایک ناقابلِ اظہار حقیقت ہے۔ یعنی

تواں در بلاغت بہ سحباں رسید
نہ در کُنہ بیچونِ سبحان رسید

کوئی شخص بذریعۂ الفاظ خدا کی ماہیت کو کماحقہ، بیان نہیں کر سکتا نہ

وہ حیطۂ عقل میں آسکتا ہے۔ اُس کے موجود ہونے کا علم تو ہو سکتا ہے مگر اُس کی ذات کا علم نہیں ہو سکتا۔

اگرچہ ہم خدا کو پورے طور سے نہیں جان سکتے لیکن اُس کی خدائی یا الوہیت کا تھوڑا بہت علم ضرور حاصل کر سکتے ہیں۔ اور یہ بات بواسطۂ عقلِ اول ممکن ہو سکتی ہے۔ واضح ہو کہ فائیلو کی یہ اصلاح لوگاس[19] یا لاگاس مختلف صوفیانہ مذاہب میں ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ لاگاس ایک یونانی لفظ ہے۔ اور انگریزی سیکڑوں الفاظ ایسے ہیں جو اِس مشہور اصلاح کی ترکیب سے بنے ہیں مثلاً تھیالوجی۔ تھیاس بمعنی خدا اور لوجیا یا لوگیا بمعنی بیان۔ اسی طرح سائیکالوجی۔ فزیالوجی وغیرہ خود انگریزی لفظ بمعنی منطق، لاگاس ہی سے مشتق ہے جس کے معنی کئی ہیں لفظ، قول، بحث، عقل، بیان، گفتگو وغیرہ وغیرہ۔

خدا، چونکہ وراء الوراء اور عقلِ انسانی سے بالاتر ہے۔ انسان کی دانش و فہم، اُس تک پہنچ نہیں سکتی۔ اِس لئے کسی "واسطہ" یا "وسیلہ" کی ضرورت لاحق ہے جو خدا اور انسان کے درمیان رشتہ یا تعلق پیدا کرا سکے، اور اُس کی مرضی انسان پر آشکارا کر سکے۔

علاوہ بریں خدا مجرد[20] ہے وہ مادہ سے کسی طرح تعلق پیدا نہیں کر سکتا، مادی اور کثیف دنیا کو بھلا اُس لوزِ مجرد سے کیا تعلق؟ اِس لئے ایک ہستی ایسی ہونی ضرور ہے جو ایک طرف خالق سے وابستہ ہو۔ دوسری طرف مخلوق سے، جو خدا اور بندوں کو باہم ملا دے اور انسان کی "شفاعت" کر سکے۔ صوفیائے قدیم اس واسطۂ فرضی کو عقلِ اول کہتے تھے۔

فائیلو اِس[21] عقل کو خدا کا تصور قرار دیتا ہے۔ اس تصور کے دو پہلو ہیں،

(۱) تصور، بحیثیت تصور، جبکہ وہ خدا کے ذہن میں مستور ہو۔ تو "عقلِ کل" کہلاتا ہے اور جب وہ "تصور" بحیثیتِ خالق، کائنات کو پیدا کرتا ہے۔ تو عقلِ فعال[22] کہلاتا ہے۔ خدا چونکہ علتِ تامہ ہے اِس لئے معلول کا سرزد ہونا لازمی ہے۔ جب سے خدا ہے اُسی وقت سے "معلول" بھی ہے۔ اس معلول یعنی عقلِ اول نے کائنات بنائی۔ غرضکہ تین حقایق کا وجود ثابت ہوا۔ اول خدا۔ دوم عقل سوم کائنات۔

اس تفصیل سے دو باتیں سمجھ میں آسکتی ہیں۔ اولاً فائیلو نے فلاطونیت اور مشرقی تصوف دونوں کو باہم مرلوط کر دیا۔ ثانیاً فلسفے میں ایک نئے باب کا اضافہ ہو گیا۔ یعنی فائیلو نے دوبارہ فلسفے اور مذہب کو متحد کر دیا۔ یہی آمیزش یا اتحاد، الگزینڈرین اسکول کا طغرائے امتیازی ہے۔ "عقل" تو کائنات کی گتھی سلجھانے میں ناکام رہی اور لوگوں نے اِس مشکل کو حل کرنے کی مختلف ترکیبیں بھی سوچیں لیکن ہر ترکیب یا تجویز کا نتیجہ لاادریت ہی پر منتہی ہوا۔ اندریں حالات طبقۂ صوفیا رہنمائی کے لئے آمادہ ہوا تاکہ جو عقدہ ناخنِ عقل سے وا نہیں ہوا وہ ایمان سے حل ہو جائے۔

بہر حال فائیلو نے فلسفے کو ایمان کے ماتحت کر دیا حالانکہ فلسفہ نام ہے۔ کائنات کے اسرار کی عقلی تشریح کا۔ ممکن ہے کہ "عقل" اِس راز کی پردہ کشائی نہ کر سکے لیکن دقت تو یہ ہے کہ اگر عقل کو ایمانیات کے ماتحت کر دیا جائے تو پھر وہ اپنے منصبِ قدیمہ پر بحال نہیں رہ سکتی ہے بلکہ عقل کسی چیز کے ماتحت رہکر "عقل" نہیں کہلا سکتی خصوصاً فلسفے میں تو، یا عقل کو خود مختار بنائیے یا برطرف کر دیجئے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ جہانتک عقل کام کر سکتی ہے وہاں تک آپ تابعِ عقل ہیں۔ اور جہاں عقل قاصر ہو وہاں ایمان کو اُس کا قائم مقام بنا دیا جو باتیں حیطۂ عقل سے خارج ہیں۔ ہمیں اختیار ہے کہ اُن پر ایمان رکھیں یا نہ رکھیں، لیکن ہم کسی طور پر بھی اِس ایمان کو فلسفیانہ یا عقلی رنگ میں تسلیم نہیں کر سکتے۔ مثلاً خدا کی ماہیت کا سمجھنا عقلِ انسانی سے خارج ہے کوئی شخص خدا کو نہیں سمجھ سکتا کہ وہ کیا ہے۔ پس اِس کے متعلق اعتقادیات کی جسقدر تعلیم ہوگی

آنانکہ وصفِ حسنِ تو تعزیر می کنند
خواب ندیدہ را ہمہ تعبیر می کنند

کا مصداق ہوگی، عقلی طور سے ثابت نہیں ہو سکتی۔

(باقی آئندہ)

پروفیسر یوسف سلیم

تنقیدِ شعری

ڈھونڈھے ہے اُس مُغنیِّ آتش نفَس کو جی
جس کی صدا ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے (غالبؔ)

موسیقی کے اثرات مختلف ہوتے ہیں۔ بعض راگوں کو سنکر رُوح احساسات میں کھو جاتی ہے۔ غم افزا۔ دھیمے دھیمے سُر۔ درد کا ہلکا ہلکا احساس پیدا کرتے ہیں۔ بعض راگ دل میں جوش و خروش پیدا کرتے ہیں۔ بعض راگوں سے عشرت و نشاط کے نغمے نکلتے ہیں۔ "دیپک" کا عنصرِ امتیازی سوز و گداز ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اگر کوئی ماہر گویا اِس راگ کو ادا کرے تو جل کر مر جائے۔ میں نے دیپک کسی سے نہیں سُنا۔ لیکن اُس کی ایک آدھ راگنی ضرور سُنی ہے۔ بال گندھرکی "دھنس باندھ لیو نا سکھے ہیں رام چندر" جو تلنگ کا مود میں گائی گئی ہے۔ دل میں ایک ایسی موجِ اضطراب پیدا کرتی ہے۔ جسے تقریباً روحانی کوفت کہا جا سکتا ہے۔ غالبؔ بھی اِس شعر میں کسی ایسے مغنّی کو ڈھونڈتا ہے۔ جس کا راگ اُس کی رُوح کو درد کے اثرات سے لبریز کر دے۔ تاکہ شاعر کاہش و اندوہِ حیات سے چھوٹ جائے۔ اور ایک طوفانِ نغمہ میں دنیا سے رخصت ہو۔ یہ شعر شاعرانہ موت کی آرزو کا اظہار کرتا ہے۔ غالبؔ نگارخانۂ حیات سے اِس طرح رخصت ہونا چاہتا ہے کہ راگ کے شعلے اُس کی روح کو تحلیل کئے دیتے ہوں۔ "ڈھونڈے ہے" اِس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ مغنّیِ آتش نفس جس کی صدا میں شعلے لرز رہے ہوں آسانی سے نہیں ملتا۔ "آتش نفس" مغنی کے اضطراب و التہاب۔ اس کے سانس کی تابش کام و دہن کی سوزش۔ اور نغمے کی حدّت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

"صدا" کو "جلوۂ برقِ فنا" سمجھنا غالب کی خصوصیاتِ شاعری میں سے ہے۔ بوڈلیر کا قول ہے کہ شاعرانہ کیفیات میں ایک درجہ ایسا آتا ہے جب اختلالِ حواس واقع ہو جاتا ہے۔ آنکھیں پردۂ ابد تک دیکھنے لگتی ہیں۔ اُسوقت رنگ شاعر کے لئے نغمے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اور نغمے رنگین صورتیں اختیار کر لیتے ہیں۔ اسی کیفیت میں غالبؔ نے یہ شعر کہا ہے۔ ؎

نشہ ہا شادابِ رنگ و ساز ہا مستِ طرب
شیشۂ مے سروِ سبزِ جوئبارِ نغمہ ہے

"مغنّیِ آتش نفس" کی تلاش میں اسی کیفیت سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ مغنیِ آتش نفس ایسا ہو کہ اُس کی صدا۔ اُس کے نغموں کی لرزش، اُس کے ترنّم کا گداز "برقِ فنا" کی صورت اختیار کرے۔ اور "برقِ فنا" اُس کی ہستی کو جلا کر خاک کر دے یعنی نغمے صرف صورت ہی اختیار نہ کریں بلکہ ایک خاص نور ریز اور شعلہ آفریں صورت اختیار کریں۔

ایڈیٹر

دُنیائے ادب

آمد و آورد

ادبی دنیا میں آمد و آورد کے الفاظ نہایت فریب دہ ہیں۔ ناواقفوں نے آمد کا مفہوم یہ سمجھ لیا ہے کہ ادھر شاعر نے ہاتھ میں قلم پکڑا اُدھر سرچشمۂ غیب سے مضمون اور معنی کا سیلاب اُس کے دماغ میں اُمنڈنے لگا۔ اور وہاں سے صفحاتِ قرطاس پر پھیل گیا۔ یہ محض طفلانہ خیال ہے۔ اگر کوئی شاعر بغیر کد و کاوش کے شعر پر شعر کہے جاوے تو اُس کی حیثیت قافیہ پیمائی اور تُک بندی سے بڑھ کر نہ ہوگی۔ ایسے کلام کا شمار ادبِ عالیہ میں نہیں ہو سکتا۔ اور نہ وہ زندہ رہنے کی چیز ہے۔ ممکن ہے کہ بعض اوقات جبکہ شاعر کی طبیعت جوش پر ہو دو چار اعلیٰ درجے کے برجستہ شعر نکل آئیں لیکن اِن کی حقیقت دریا میں قطرہ کے سی ہے۔ بالعموم اسی کلام کو زندگیٔ جاوید حاصل ہوتی ہے۔ جو کسی بڑے شاعر کی جگر کاوی کا نتیجہ ہو۔ اساتذۂ سخن کی بھی تمام ادبی پیداواروں کو یکساں قبولِ عام کی سند حاصل نہیں ہوتی۔ ان کا وہی شجرِ کلام سرسبز و شاداب ہو کر بارآور ہوتا ہے جسے اُنھوں نے اپنے خونِ جگر سے سینچا ہے۔ شیکسپیر کو ہملٹ (جہان گیر) اتھیلو (جعفر) اور "وینس کے سوداگر" کو جو شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی وہ کمیڈی آف ایررس (بھول بھلیاں) مڈسمر نائٹ ڈریم (جام اُلفت) اور ونٹرس ٹیل (مریدِ شک) کو میسر نہیں۔ اسپینسر کے "پریتولین" کو جو اعلیٰ رتبہ ملا وہ "ملکہ پری" کے دوسرے قصوں کو نصیب نہیں ہے۔ شبلی کی نظم "صبائے مغرب" کی فرحت بخشی "بغاوتِ اسلام" کی اندوہناکی کی ضد ہے براؤننگ کی نظم "رنگ اینڈ دی بُک" میں جو اثر و دلکشی موجود ہے اس سے "سارڈیلو" کے صفحات خالی ہیں۔ کولرج کے "قدیم ملاح" سے ہر شخص واقف گر ہوتا ہے۔ لیکن اُس کے مذہبی خیالات کی خشکی سب کو بیزار کر دیتی ہے۔ جانسن کا "تذکرہ شعراء" بیسیوں بار زیورِ طبع سے مزین ہوا۔ لیکن "ریسلاس" کا نام صرف کتابوں کی فہرست میں پایا جاتا ہے۔

میر تقی میر کی غزلوں میں بہتر نشتر پوشیدہ ہیں۔ لیکن اجگر نامہ، شکار نامہ ساقی نامہ وغیرہ صرف ان کی بزرگی کی یادگار ہیں۔ میر حسن کی مثنوی سحرالبیان نے سب کے دلوں کو مسحور کر لیا۔ لیکن ان کی غزلوں کا جادو کسی پر نہ چل سکا سودا کے قصائد کی ایک عالم میں دھوم ہے۔ لیکن اُن کی جو بیس مثنویاں ہجو یا ہزل کی پست سطح سے کبھی نہ اُبھریں۔ میر انیس آسمانِ مرثیہ پر آفتاب بنکے چمکے لیکن ان کی غزلوں میں ستاروں کی سی ٹمٹماہٹ بھی نہیں پائی جاتی تھی، اسی لئے وہ ناپید بھی ہو گئیں۔ داغ جب تک رامپور میں رہے بڑے بڑے شاعروں سے معرکہ رہا۔ مقابلہ و مسابقت کے جوش میں زمینِ شعر پر خونِ جگر سے لالہ کاریاں کیں۔ داغہائے دل کی بہاریں دکھائیں، اور نہایت سرسبز و شاداب "گلزار" تیار کیا۔ حیدرآباد آئے تو یہاں کی امیرانہ زندگی نے انھیں عیش پرست و سہل انگار بنا دیا۔ چنانچہ اس دور میں اُنھوں نے کئی چمن لگائے لیکن کوئی بھی "گلزار" کی شادابی کو نہ پہونچ سکا۔ شوقِ معنی آفرینی کی برکانی مدت نے غالب کے دل و جگر کو سیلِ آتش بنا دیا تھا۔ اس لئے ان کے ہر شعر میں بجلی کی سی گرمی تیزی۔ چمک اور تڑپ پائی جاتی ہے۔ امیر مینائی کا شعر ہے ؎

خشک سیروں تنِ شاعر کا لہو ہوتا ہے
تب نظر آتی ہے اک مصرعۂ تر کی صورت

وہ اپنی قادر الکلامی اور فنی مہارت کی مدد سے ضخیم دو اوین مرتب کرتے ہیں لیکن رنگ پھیکا رہتا ہے۔ کیونکہ ان میں خونِ جگر کی آمیزش نہیں ہے گوہر انتخاب اور جوہرِ انتخاب میں وہ میر اور درد کا رنگ بھرنا چاہتے ہیں۔ کام کٹھن ہے۔ ایک ایک مصرعہ کی تیاری میں ان کے بدن کا سیروں لہو خشک ہوتا ہے۔ اس لئے ہر دو انتخابات میں اکثر موتی کی لڑیاں نظر آتی ہیں۔ الغرض ہر شاعر کا وہی کلام زندہ رہتا ہے جو کد و کاوش کے بعد سرانجام پائے۔ یہ ممکن ہے کہ کوئی خیال یا جذبہ شاعر کے دل و دماغ میں فوراً پیدا ہو۔ لیکن مؤثر و دلپذیر پیرائے میں اسکا اظہار دشوار امر ہے۔ شاعری میں "آمد" کوئی اہمیت نہیں رکھتی یہ محض ایک دل خوش کن لفظ ہے۔ بڑے سے بڑا شاعر بھی کوئی ایسا عظیم الشان کارنامہ پیش نہیں کر سکتا جسکی تکمیل کیلئے اُس نے خون پانی ایک نہ کیا ہو۔ جب شاعر اپنا جگر خون کرتا ہے تو لعل اُگلتا ہے۔ چنانچہ تمام شعراء کی جانب سے آتش فرماتے ہیں ؎ . . . .

یونانی

سکندر اور ہندی فلسفی

اپنے حملہ کے دوران میں سکندر نے دس ہندی فلسفی گرفتار کئے۔ جو سندھیوں کو اُس کے مقابلہ کے لئے اُکساتے تھے۔ یہ فلسفی دانائی اور حاضر جوابی میں عدیم النظیر تھے، سکندر نے اس بات کا امتحان کرنا چاہا۔ اور ہر ایک سے سوال کئے اور کہا کہ اگر جواب غلط ہوا تو قتل کر دیئے جاؤ گے۔ پہلے ایک فلسفی سے پوچھا گیا کہ مُردوں کی تعداد زیادہ ہے یا زندوں کی۔ جواب ملا کہ زندہ انسانوں کی۔ کیونکہ مردوں کا شمار ہی کیا ہے۔ پھر حسبِ ذیل گفتگو ہوئی۔

سکندر۔ سب سے بڑے جانور کہاں پیدا ہوتے ہیں زمین پر یا سمندر میں۔

دوسرا فلسفی۔ زمین پر کیونکہ سمندر بھی زمین کا ایک حصّہ ہے،

سکندر۔ سب سے دانا جانور کون ہے۔

تیسرا فلسفی۔ جو کسی نے آج تک نہیں دیکھا۔

سکندر۔ تم نے سندھیوں کو کیا کہکر لڑائی کے لئے اُبھارا تھا

چوتھا فلسفی۔ صرف یہی کہ یا باعزت زندگی بسر کرو۔ یا مردوں کی طرح کٹ مرو۔

سکندر۔ دن بڑا ہے یا رات؟

پانچواں فلسفی۔ دن ہے۔ کم از کم ایک دن! جیسا سوال ویسا جواب

سکندر۔ انسان ہر دلعزیز کیسے ہو سکتا ہے۔

چھٹا فلسفی۔ طاقتور بنکر۔ لیکن لوگوں کو مرعوب نہیں کرنا چاہئے۔

سکندر۔ انسان دیوتا کیسے بن سکتا ہے،

ساتواں فلسفی۔ دیوتا بننے کے لئے وہ کام کرنا چاہئے جو انسانوں کے لئے ناممکن ہے۔

سکندر۔ موت ہمہ گیر ہے یا زندگی۔

آٹھواں فلسفی۔ زندگی موت سے طاقتور ہے۔ کیونکہ یہ اپنے ساتھ لاکھوں حوادث و بلیّات لاتی ہے۔

ایک ہندوستانی فلسفی نے سکندر کو نظم و نسقِ مملکت کے لئے ایک نصیحت کی۔ اور وہ یہ تھی۔ ایک پُرشکن، خشک کھال کو زمین پر بچھایا۔ اور اُس کے کناروں کو روندا۔ جب کھال کے ایک کنارے پر دباؤ پڑتا تو یہ دوسری جگہوں سے اُبھرتی، آخرکار اس نے اپنا پاؤں عین درمیان میں دھرا۔ اور کھال زمین کے ساتھ ہموار ہو گئی۔ اس تمثیل سے اس نکتہ کی طرف اشارہ تھا کہ بادشاہ کو سلطنت کے عین وسط میں سرحدوں سے زیادہ وقت صرف کرنا چاہئے۔

(پلوٹارک)

فرانسیسی

زندگی

زندگی ایک آزمائش ہے ــــ ہمارے علما ہمیں رات دن یہی سناتے رہتے ہیں۔ میں نہیں جانتا۔ لیکن کم از کم یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہم اس مقولے کو تسلیم نہیں کر سکتے۔ زندگی اُن بچّوں کے لئے کیسے آزمائش ہو سکتی ہے جو پیدا ہوتے ہی مر جاتے ہیں۔ یا ان غریبوں کے لے جن کے دماغ جواب دے چکے ہیں۔ کیا خوب! اِن اعتراضات کا جواب کئی دفعہ دیا جا چکا ہے۔ بجا۔ جواب تو ہے لیکن برہانِ قاطع نہیں، دُنیا امتحان کے کمرہ سے مشابہ نہیں، بلکہ کمہار کے گھر کی طرح ہے۔ جہاں ہر قسم کے برتن نامعلوم اغراض کے لئے

بنتے ہیں۔ بہت سے برتن بنتے بنتے ٹوٹ جاتے ہیں۔ اور پھینک دیئے جاتے ہیں۔ استعمال ہونے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ دوسرے مضحکہ خیز اغراض کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ یہی ہمارا حال ہے،

وقت گذرتا جاتا ہے اور ہماری عزیز ترین خواہشات کا خون کرتا جاتا ہے۔ تعریف و توصیف کے خواب کو باطل کرتا ہے۔ عشق اور اس کی دلفریب لغزشوں کو بھلا دیتا ہے۔ ایمان اور امید کی بنیادوں کو کھوکھلا کرتا ہے۔ اور معصومیت کے پودے کو پیرہنِ برگ سے عریاں کرتا جاتا ہے۔ کم از کم اسے ہمارے لئے ہمدردی اور رحم چھوڑ دینا چاہئے ہمدردی انسانی خاصہ ہے۔ خدا نہ کرے کہ ہم پرانے دیوتاؤں کے دشمنوں کی طرح پتھر کے بن جائیں۔ ہمیں مصیبت زدہ لوگوں کی غمگساری کرنی چاہئے۔ کیونکہ وہ بلاؤں کا شکار ہو رہے ہیں خوش قسمت لوگوں سے بھی ہمدردی کرنی چاہئے۔ کیونکہ یہ لکھا ہے کہ جو لوگ ہنستے ہیں۔ ان پر مصیبتیں آنے والی ہیں۔ (اناطول فرانس)

اطالوی

مسرّت

شاید دنیا میں کسی چیز کا اتنا ذکر نہیں ہوتا جتنا کامیاب زندگی کا مگر بہت کم لوگ ایسے ہیں جو اسے صحیح طور پر جانتے ہیں۔ ہر شخص کا مدعا یہ ہے کہ مسرت حاصل کرے۔ لیکن ہزاروں میں سے کوئی یہ نہیں جانتا کہ مسرت کسے کہتے ہیں۔ ہم اندھا دھند اس کی تلاش کرتے ہیں۔ اور جلدبازی کی وجہ سے بھٹکتے رہتے ہیں۔ اور منزلِ مقصود سے دور جا پڑتے ہیں۔ اسی لئے ہمیں یہ معلوم کر لینا چاہئے کہ ہمارا منتہائے نظر کیا ہے۔ اگر ہم غلطی پر نہیں تو ہمیں روزانہ معلوم ہوتا جائیگا۔ کہ ہماری سعی کس حد تک مشکور ہوئی ہے۔ لیکن ہم گمراہ لوگوں کے ہاؤ ہو سے متاثر ہو کر ان کے پیچھے چل پڑیں تو خاک چھانتے پھریں گے۔ ہمیں اک رہبرِ کامل کی ضرورت ہے۔ کیونکہ یہ سفر نرالا ہے۔ کسی دوسرے سفر میں شاہراہ منزل تک پہنچاتی ہے۔ یا اگر کوئی آدمی راستہ بھول جائے تو عوام اسے ٹھیک راستہ بتا دیتے ہیں۔ لیکن برعکس اس کے اس سفر میں شاہراہ سب سے زیادہ خطرناک ہے۔ اور لوگ بجائے رہبری کے قعرِ ذلت میں گرا دیتے ہیں۔ دنیا کی رسوم کو نہیں بلکہ عقلِ سلیم کو مشعلِ ہدایت سمجھنا چاہئے۔ ہم ایک شکست خوردہ فوج کی طرح ہیں۔ پہلے ایک سپاہی گرتا ہے۔ پھر دوسرا۔ اس پر گرتا ہے۔ پھر تیسرا دوسرے پر گرتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس۔ حتیٰ کہ میدان زخمیوں سے پٹ جاتا ہے غضب یہ ہے کہ ہم دوسروں کی نقل سے تباہ ہوتے ہیں۔ نشاطِ آور زندگی کے سوال کا فیصلہ کثرتِ رائے سے نہیں ہو سکتا ہے۔ نظامِ عالم ایسا نہیں کہ بہترین چیز سے زیادہ آدمی خوش ہوں، عوام فیصلہ نہیں کرتے بلکہ ہر مقولے کو سوچے سمجھے کے بغیر تسلیم کرتے چلے جاتے ہیں۔

دنیا دہی خوشی سے سر پھر جاتا ہے لیکن جب کبھی ایک آدمی ہوش میں آتا ہے تو اسے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ جو اس نے کیا ہے نہ کیا جاتا تو بہتر تھا۔ جس چیز سے وہ ڈرتا تھا۔ حقیقت میں وہ ان تمام سے اچھی تھی۔ جن کے لئے اس نے دعائیں کیں۔

مسرّت وہ نہیں جو دیرپا نہ ہو۔ سکون دماغی توازن کو کہتے ہیں جس میں واقعات کی ندی کے اتار چڑھاؤ سے کوئی فرق نہیں آتا۔ (سینکا)

جرمنی

بیداد و تغافل

اُنھوں نے میرا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ بعض نے دوستی کی وجہ سے بعض نے دوست بنکر۔ اُنھوں نے میری شراب زندگی کو زہر آلود

کر دیا ہے۔ بعض نے دوست پکڑا اور بعض نے کھلی مخالفت سے۔ مگر وہ جس کے ہاتھوں مجھے سب سے زیادہ تکلیف پہونچی ہے وہ ایسی ہے جس نے نہ مجھے چاہا ہے نہ مجھ سے نفرت کی ہے

(لاسٹنے)

جاپانی

سات گیت

(۱)

آہ! شبنم میں چاہتا ہوں کہ زندگی کا گرد و غبار تجھ سے دھولوں

(۲)

سر راہ ایک شخص مسافروں کو دیکھنے کا مشتاق تھا۔ ایک گدھا آیا اور اسے کھا گیا۔

(۳)

اے پیاری چڑیا۔ اُن ننھی ننھی جانوں کو دق نہ کر۔ جو میرے پھولوں میں دکھائی دے رہی ہیں۔

(۴)

ایک تالاب ویرانے میں بے حرکت نظر آتا ہے . . . . . .

کچھ عرصہ تک نہ کوئی آواز آتی ہے نہ پانی میں ہیجان برپا ہوتا ہے۔
یکایک ایک مینڈک اُس میں کود پڑتا ہے۔

(۵)

میدان جنگ میں شگفتہ پھول ہیں۔
یہی ہے جو بیس ہزار بہادروں کا نشان باقی رہ گیا ہے۔

(۶)

جو کبھی نوجوان تھے۔ آج بوڑھے ہو چکے ہیں، ان کے بال سفید ہیں اور لاٹھیوں کا سہارا لئے قبروں کے پاس جھکے ہوئے ہیں

(۷)

اے جھینگر! تیری مسرت ناک آواز سُن کر کسے خیال آسکتا ہے کہ تیری زندگی اتنی تھوڑی ہے۔

(باشو)

چینی

تنہائی

میں نے جھونپڑا آبادیوں میں بنایا۔ لیکن مجھے گھوڑوں اور گاڑیوں کی آواز سنائی نہیں دیتی۔

کیا تم سنو گے کہ یہ کیونکر ممکن ہے؟

جو شخص دنیا سے دل لگاتا ہے آبادیوں میں بھی صحرا پیدا کر لیتا ہے۔ میں پھول چنتا ہوں۔ یا دور کی پہاڑیوں پر نظر جما کر کھڑا رہتا ہوں

جب اندھیرا چھا جاتا ہے تو کوہسار کی ہوا تازہ اور فرحت بخش ہوتی ہے۔ پرندوں کے جوڑے واپس آشیانوں میں آتے ہیں۔ یہ تمام چیزیں معنی خیز ہیں۔ لیکن جب ہم اُنھیں لحاظ کا جامہ پہنانا چاہتے ہیں تو یکایک جواب دے دیتی ہیں۔

(ثاؤ جاین)

انگریزی

مشین

تجل کو میں مدت سے جانتا ہوں۔ لیکن میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اس کی دیوانگی کس دن سے شروع ہوئی۔ آج دو ماہ ہوتے ہیں کہ

میں اور وہ لاہور اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر چہل قدمی کر رہے تھے۔ کہ فرنٹیر میل کا شاندار انجن شاں شاں کرتا ہوا داخل ہوا۔ تجمل نے میرا بازو زور سے دبایا۔ اور گاڑی کھڑے ہونے کے بعد بھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے انجن کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر بولا

"خوفناک۔ بہت ہی خوفناک۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا اس ہیبت مشین کا ہر پہیہ حقیر انسان کو کچلنے کے لئے بیتاب ہے"۔

میں نے ہنس کر پوچھا۔

تو مشین میں جان ہوتی ہے؟ مشین سوچتی بھی ہے؟

تجمل نے میری طرف حیرت سے دیکھا۔

"یہ آپ نے کیا ارشاد فرمایا۔ مشین تو زندگی کا مظہر ہے۔ زندگی نام ہی حرکت کا۔ اور مشین تو سراپا حرکت ہے۔ وہ زندگی سے کس طرح خالی ہوسکتی ہے"۔

میں خاموش ہو گیا۔ تجمل ایک مشہور و معروف سائنس داں تھا۔ اُس کے آگے معمولی انسانوں کو زبان کھولنے کی کیا جرأت ہو سکتی تھی۔

واپسی پر ہم ایک کارخانہ کے قریب سے گذرے۔ مشینوں کی گڑگڑاہٹ سُنکر تجمل چونکا۔ اور وحشت زدہ نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ میں نے پوچھا۔

"خیر باشد۔ کیا بات ہے"۔

"ان جنوں کی گفتگو سُن رہا ہوں"

میں نے حیرانی سے پوچھا "کون سے جن"

"یہی جو مزدوروں کی جان کے پیاسے ہیں۔ مشینیں۔ جاندار مہیب۔ خوفناک اور ظالم مشینیں"۔

اب مجھے معلوم ہوا۔ اُس کا دماغ خراب ہو گیا تھا۔

اس کے بعد کچھ عرصہ تجمل سے ملاقات نہیں ہوئی۔ دوستوں کے ذریعہ معلوم ہوا کہ وہ کسی نئی ایجاد کی فکر میں ہے۔ آخر ایک دن صبح کے وقت میں اس کے گھر گیا تو وہ اپنے عمل گاہ میں موجود تھا۔ اُس کے سامنے شطرنج کی بساط تھی۔ اور مقابل میں ایک انسان نما مشین تھی، جو شطرنج کھیل رہی تھی۔ اس کا قد معمولی انسان کے برابر تھا۔ لیکن چوڑائی میں مشین انسان سے تگنی تھی۔ موٹے موٹے ہاتھ سر کی جگہ ایک مربع لوہے کی تختی تھی۔ جس پر بڑی بڑی آنکھیں بنی ہوئی تھیں۔ چال چلتے وقت اس مشین کے اندر سے گڑگڑاہٹ کی آواز آتی تھی۔ جب شہ کہنا منظور ہوتا تھا تو مشین اپنا سر ہلاتی تھی۔

میں حیرانی سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ پہلے بھی ایسی مشینیں بنائی گئی ہیں۔ جو انسان کی طرح کام کاج کرتی تھیں۔ لیکن ایسی سوچنے والی مشین جو شطرنج جیسے دماغی کھیل میں مصروف ہو سکے ایک نئی بات تھی۔

یکایک تجمل نے مڑ کے میری طرف دیکھا۔ اور شہ مات کہکر اُٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے دیکھا کہ مشین کی مصنوعی آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہوئی اور اس کے بعد اُس کا تمام بدن جنبش میں آیا۔ میں دروازے کی طرف دوڑا۔ مشین نے اپنے آپ کو بڑی گڑگڑاہٹ کے ساتھ تجمل پر گرا دیا۔

خوف کے مارے میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں بے اختیار باہر بھاگا۔ ابھی تک کمرے میں سے خوفناک چیخوں اور مشینری کی گڑگڑاہٹ کی آواز آ رہی تھی۔

دوسرے دن مجھے ہسپتال میں ہوش آیا مجھے بتایا گیا کہ تجمل بالکل کچلا ہوا پایا گیا۔ مشین کونے میں موجود تھی اس کے منہ پر شیطنت کا سا رنگ تھا

(ماخوذ)

شعر کی تخلیق

شاعر کو اپنے موضوع کے لئے دور نہیں جانا پڑتا۔ اُس کے مضامین خود اُس کے دل میں اور اس کے آس پاس ہیں۔ اس کے لئے خیالات کی دنیا اصلی دُنیا سے دور نہیں ہے۔ بلکہ اسی میں شامل ہے۔ وہ شاعر کہلانے کا اسی وجہ سے مستحق ہے کہ اُسے اس بات کا احساس ہے۔ جہاں کہیں آسمان کی نیلی چھت ہے۔ اور اس کے نیچے گناہ و ثواب کے ہنگامے برپا ہیں۔ جہاں کہیں شادی و غم کی کشمکش ہے۔ شاعر کے جذبات میں تلاطم نمودار ہوتا ہے۔

کیا ہر جاں بلب مریض کے کمرے میں ایک الم انگیز ڈرامے کا آخری منظر دکھائی نہیں دیتا؟ خواہ ایک دہقان دم توڑ رہا ہو۔ یا ایک چیونٹی مر رہی ہو۔ شاعر کے دل کو ٹھیس لگتی ہے۔

کیا شادی بیاہ آج کل نہیں ہوتے؟ ہوتے ہیں اور آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔ پھر یہ شکایت کس طرح بجا ہو سکتی ہے کہ سرد انگیز

ڈرامے زندگی میں نہیں ہوتے؟ کیا انسان اتنے سنجیدہ ہو گئے ہیں کہ انہیں ہنسی سے نفرت ہو گئی ہے؟ نہیں فطرتِ انسانی رہتی دُنیا تک نہیں بدلیگی۔ لیکن شاعر کو اُس کے مطالعہ کے لئے آنکھیں کھولنی چاہئیں

(کارلائل)

جرمنی

رات

رات کے وقت میں بے اختیار اس خیال سے بیدار ہو جاتا ہوں کہ اسی وقت ایک جہاز سمندر کی لہروں کو چیرتا ہوا کنارے سے آلگا ہے ایک سرخ روشنی جھلک رہی ہے۔ ایک خوبصورت نامعلوم نازنین درد و کرب سے کروٹیں بدل رہی ہے۔ میرا دیرینہ رفیقِ وطن سے دور سمندر میں غرق ہو رہا ہے۔ اور میری ماں تنہا بیٹھی ہوئی میرا نام آہستہ آہستہ لے رہی ہے۔ (ہرمن ہیس)

شاعر

گھر کی چھت سے ستارے نظر آتے تھے۔ صحن میں اتنا شور تھا کہ خدا کی پناہ۔ ! گھر کیا تھا۔ بھڑوں کا چھتا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ادھر اُدھر چوہے بھی دوڑتے پھرتے تھے۔ پاس ہی ایک شراب خانہ بھی تھا ۔ ۔ ۔ یہاں بے کسی تھی۔

اس گھر میں ایک مریض لیمپ کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ دنیا اُس پر ہنستی تھی۔ لیکن وہ دن کے وقت دل خوش کن خواب دیکھتا تھا۔ اور رات بھر غیر فانی اشعار کہتا تھا۔

اس تنگ گھر میں صرف ایک بستر تھا۔ یا ایک بنیڈ کہ صرف سانس لینے کی جگہ تھی۔ وہ غربت اور کس مپرسی کی حالت میں تھا جس طرح سیکڑوں برس پہلے ناصرہ میں ایک اللہ کا بندہ دن کاٹتا تھا۔

دنیا جو عروسِ ہزار داماد ہے۔ اُسے طعنے دیتی تھی۔ اسے ناکارہ اور دیوانہ کہتی تھی۔ لیکن جب وہ حیرت سے اپنے شعر پڑھتا تھا تو زہر آلود دنیا کی قدم پر سے ہٹ جاتی تھی۔

اس کا لباس تار تار تھا۔ اس کی خشک روٹی میں ایک ہمسایہ کا حصہ بھی شامل تھا۔ شاعر آہیں بھرتا تھا۔ اور کہتا تھا "آہ! شاعری" یہ کہکر وہ شکوۂ ایام ختم کر دیتا تھا۔

اسی طرح وہ شدتِ مرض میں رات کے وقت لیمپ کے پاس بیٹھا رہتا تھا۔ اور غیر فانی اشعار کہتا تھا۔

وہ دنیا کی پروا نہیں کرتا تھا۔ اور دن کے وقت خواب دیکھتا تھا

(آرنو ہالز)